وحرام على قرية اهلكنها انهم لا يرجعون (الانبیاء)

"اور جس قوم کو ہم نے ایک دفعہ ہلاک کر دیا اُس کا پھر اُبھرنا محال ہے"

تذکرہ

اُردو

ہرگز نہیں یہ تو ایک عبرت ہے سو جو چاہے اِس سے عبرت پکڑ لے

جس میں مسلمانان عالم کو ان کی اجتماعی موت و حیات کے متعلق پیغام اخیر دیا گیا ہے

جلد دوم

مقدمہ کتاب ماہیت ایمان و حکمت عبادات وغیرہ

لِلمُفتقر اِلی اللہ الرحمٰن

حضرت علامہ محمد عنایت اللہ خان المشرقی رحمۃ اللہ علیہ

ناشِر
التذکرہ پبلیکیشنز
المشرقی ہاؤس ۴۴/۲ ذیلدار روڈ، اچھرہ لاہور

فون نمبرز: ۴۱۱۲۲۸ ☆ ۴۱۵۱۱۶ - ۰۴۲ ○ فیکس: ۷۵۸۷۳۹۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

تمام حقوق تصنیف و طبع و ترجمہ حسب ضابطہ پبلشر محفوظ ہیں

کتاب	----------	تذکرہ ---(جلد دوم)
حصہ (جلد دوم)	----------	مقدمہ کتاب ماہیت ایمان و حکمت عبادات وغیرہ
مصنف	----------	حضرت علامہ محمد عنایت اللہ خان المشرقی
مطبوعہ (پہلی بار)	----------	مارچ 1924ء شعبان 1342ھ
		(یکے بعد دیگر 11 ایڈیشن شائع ہوئے)
مطبوعہ (بارہویں بار)	----------	مارچ 1980ء ربیع الثانی 1400ھ
طباعت (موجودہ)	----------	31 مئی 1997ء
پبلشر	----------	خاکسار حمید الدین احمد ابن علامہ مشرقی
		(منیجنگ ڈائریکٹر التذکرہ پبلیکیشنز)
مطبع	----------	رفاعی پرنٹرز---لاہور
ڈسٹری بیوٹرز	----------	التذکرہ پبلیکیشنز' 34-ذیلدار روڈ ○ اچھرہ-لاہور
کتبہ	----------	محمد یوسف دہلوی ابن مولوی محمد دین مرحوم
ٹائٹل	----------	خورشید عالم گوہر قلم
کمپوزنگ	----------	حاجی ثناء اللہ قصوری طیبہ کمپوزنگ سنٹر اچھرہ' لاہور
ترتیب و تزئین (سابقہ)	----------	وحید الدین اکبر المشرقی' ظہیر الدین اظہر المشرقی
سائز	----------	20x26/8
ضخامت	----------	312 صفحات
ہدیہ	----------	300 روپے فی جلد

ناشر

التذکرہ پبلیکیشنز

المشرقی ہاؤس، ۳۴ ذیلدار روڈ، اچھرہ لاہور

ترتیب

تذکرہ (جلد دوم)------ مصنف: حضرت علامہ مشرقی

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	از ٹائٹل	1
2	پرنٹ لائن	2
3	ترتیب... تذکرہ (جلد دوم)	3
4	عشق کا انتخاب دیکھ کوشش رائیگاں نہ دیکھ	4
5	حیات حضرت علامہ مشرقی... ایک نظر میں مع تصویر	5-8
6	تمہید... حمید الدین المشرقی	9-10
7	تبصرہ تصانیف حضرت علامہ مشرقی	11-16
8	فہرست مضامین تذکرہ (جلد دوم)	17-22
9	فہرست آیات تذکرہ (جلد دوم)	23-30
10	ٹائٹل... تذکرہ (مقدمہ کتاب ماہیت ایمان وغیرہ	31
11	تہدیہ بحضور خدائے عزوجل	32
11	پیش لفظ	33
12	پیغام بیگم سعیدہ علامہ مشرقی	34
13	مقدمہ... تذکرہ جلد دوم (272 صفحات)	35-306
14	فہرست و تعارف تصانیف مشرقی	307-312

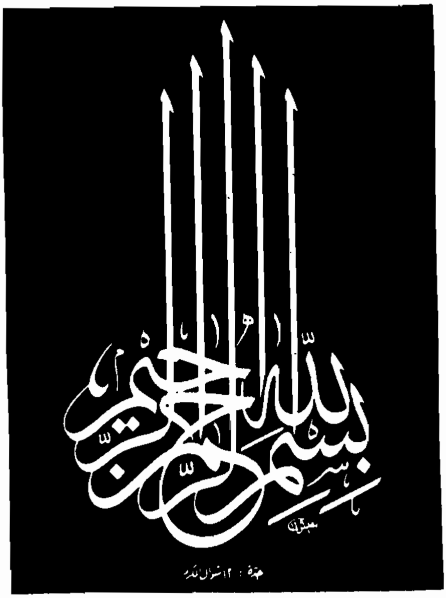

عشق کا انتخاب دیکھ کوشش رائیگاں نہ دیکھ

☆ حضرت علامہ مشرقیؒ اس پختہ عزم اور عقیدے کے ساتھ عمر بھر جدوجہد کرتے رہے کہ اگر ہم مسلمان ہیں تو پھر غلامی ہمارا مقدر نہیں ہو سکتی۔

☆ مسلمانوں کی آزادی اور سربلندی حضرت علامہ مشرقیؒ مرحوم کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔

☆ حضرت علامہ مشرقیؒ خلوص کے پیکر جرات رندانہ کے مالک بلند ہمت اور عزم و استقلال کی ایک مضبوط چٹان تھے۔ آپ نے اپنے نصب العین کی تکمیل کے لئے برطانوی سامراج سے ٹکر لی اور اپنے وقت کی اس جابر ترین سلطنت کو بتایا کہ جب مسلمان اپنی بات پر اڑ جاتا ہے تو وہ پہاڑوں کے دل دہلا اور سمندروں کے سینے چیر دیتا ہے۔

☆ ہماری نگاہ ان مقاصد پر ہونی چاہیئے جو شہرہ آفاق انسان لے کر اٹھا تھا اور اس کی اس تحریک پر ہونی چاہیئے جس نے قوم سے ایک پیسہ وصول کئے بغیر خدا اور اس کے دین پر کٹ مرنے والے ہزاروں دیوانے اور سرفروش پیدا کئے۔

☆ ہماری قومی زندگی حضرت علامہ مشرقیؒ کی وفات کے بعد ایک بہت بڑے خلا سے دو چار ہے اور کوئی موجود نہیں جو اسے پر کر سکے۔

☆ مورخ نے جب پچھلی نصف صدی کے واقعات پر قلم اٹھایا تو وہ حضرت علامہ مشرقیؒ کی تنظیمی صلاحیتوں کو اور خاکسار نوجوانوں کی سرفروشانہ جراتوں کو خراج تحسین ادا کئے بغیر آگے نہیں بڑھے گا۔

☆ حضرت علامہ مشرقیؒ نے بتایا کہ حقائق کو کس طرح بے باکانہ اور تلوار کی دھار پر پیش کرنا پڑتا ہے۔

☆ ضروری نہیں کہ ہر تحریک کو کامیابی نصیب ہو۔ کامیابی بسا اوقات ناکارہ انسانوں کو بھی ملت کا سرتاج بنا دیتی ہے اور وہ کرگس ہو کر بھی ضیغم کہلانے لگتے ہیں۔

☆ حضرت علامہ مشرقیؒ بے نظیر تنظیمی قابلیت کے انسان تھے قدرت نے اپنی گوناگوں صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو آج مسلمانوں کی سیاست ملی کا نقشہ ہی اور ہوتا۔

تیری نظر کے سامنے ہے چاند بھی چکور بھی
عشق کا انتخاب دیکھ کوشش رائیگاں نہ دیکھ

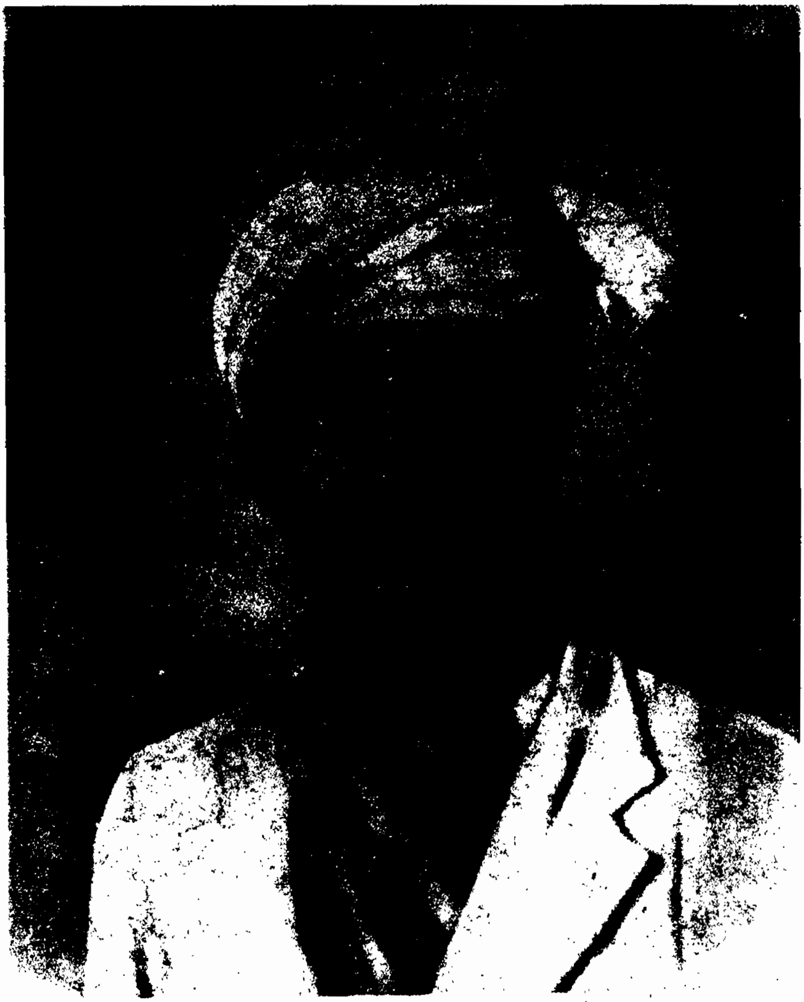

حیات حضرت علامہ المشرقیؒ۔ ایک نظر میں

۲۵ اگست ۱۸۸۸ء حضرت علامہ محمد عنایت اللہ خان المشرقیؒ بمقام امرتسر پیدا ہوئے ○ ۱۹۰۷ء اٹھارہ برس کی عمر میں پنجاب یونیورسٹی سے، ایم اے (ریاضی) کا امتحان پاس کیا اور ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ○ ۱۲-۱۹۰۶ء کیمبرج یونیورسٹی میں قیام اور میدان علم میں امتیازی مقام، تین ٹرائی پوز کے چھ سالہ کورس دو سال میں پاس کئے، اور تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے۔ ۳۵۰ پونڈ کا وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۹۱۷ء میں پرنسپل اسلامیہ کالج پشاور اور پھر جلد ہی سیکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا کا منصب ○ ۱۹۲۴ء تذکرہ کی تصنیف، ۱۹۲۶ء میں نوبل

پرائز کی پیشکش کی گئی ○ ۱۹۲۶ء موتمر خلافت قاہرہ (مصر) میں شرکت۔ انگریز کی کسی محکوم مسلمان بادشاہ کو کٹھ پتلی خلیفہ بنانے کی سازش حضرت علامہ مشرقیؒ نے ناکام بنا دی۔ اور اسلامیان عالم کو روحانیت انگیز پیغام اور ولولہ انگیز پروگرام پیش کیا۔ جو کہ خطاب مصر کے نام سے مشہور ہے۔

○ دورۂ یورپ' مشہور سائنسدان آئن سٹائن سے ملاقات میں مسئلہ تسخیر کائنات قرآنی نکتہ نگاہ سے پیش کیا ☆ ہٹلر سے قوموں کے عروج و زوال پر تبادلہ خیالات ○ ۱۹۳۱ء برصغیر پاکستان و بھارت میں خاکسار تحریک کی بنیاد موضع پانڈو کی میں رکھی۔ اور پہلے جیش کی کمان انہوں نے خود کی ○ ۱۹۳۴ء تین سال کے عرصہ میں برصغیر میں خاکسار تحریک کی بے پناہ مقبولیت اور لاکھوں انسانوں کی خیبر سے لے کر راس کماری تک آزادی وطن کے لیے تحریک میں شمولیت ○ ۲۳ نومبر ۱۹۳۴ء خاکسار تحریک کے آرگن ہفت روزہ "الاصلاح" کا اجراء۔ ۱۹۳۶ء حکومت پنجاب و سرحد کو تین مطالبات پیش کئے (۱) اسلامی بیت المال کا قیام (۲) ریڈیو سٹیشن کا قیام (۳) اوقاف ○ ۱۹۳۸ء میں حضرت علامہ کی زیر صدارت مذاہب عالم کانفرنس اندور منعقد ہوئی ○ ۱۹۳۹ء لکھنؤ میں شیعہ سنی فساد کو ختم کرانے کے لیے خاکسار اعظم کا شاندار اقدام اور سات کانگریسی وزارتوں کا خاتمہ۔ خاکسار تحریک کی بے مثال فتح ○ ۱۹۴۰ء ۱۹ مارچ کربلائے لاہور' ۳۱۳ نہتے خاکساروں کا پولیس سے مقابلہ۔ دہلی سے حضرت علامہ مشرقیؒ کی گرفتاری۔ خاکسار تحریک پر ہندوستان گیر پابندیاں۔ حضرت علامہ مشرقیؒ کے مکان پر پولیس کا چھاپہ' آنسو گیس کا بکثرت استعمال۔ ابن علامہ مشرقیؒ محترم احسان اللہ خان اسلم۔ انگریزی پولیس کے استبداد کا شکار ہو گئے۔ انا للہ و انا علیہ راجعون۔

○ ۱۹۴۲ء میں حضرت علامہ مشرقیؒ کے ایماء پر مشہور کانگریسی لیڈر راج گوپال اچاریہ نے ویلور جیل سے رہائی کے بعد کانگریس کے سٹیج سے مطالبہ پاکستان کے حق میں قرارداد پیش کی ○ ۱۹۴۳ء ویلور جیل سے تین سال کی قید تنہائی کے بعد خاکسار اعظم کی رہائی ○ ۱۹۴۳ء قحط بنگال میں خاکساروں کی بے مثال اور تاریخی خدمت خلق ۔ اس وقت بنگال کے وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کا تحریری عہدنامے سے انحراف اور خاکساروں کو چوبیس گھنٹے کے اندر

اندر بنگال سے نکل جانے کا گورا شاہی حکم۔ خاکساروں کا دو ہزار میل کلکتہ سے لاہور تک احتجاجاً" پیدل مارچ ○ ۱۹۴۷ء خاکسار اعظم حضرت علامہ مشرقیؒ نے قائداعظم مسٹر جناح کو حصول پاکستان کے لیے غیر مشروط تعاون کی پیش کش کی۔ امپیریل ہوٹل دہلی میں وسیع تر پاکستان (یعنی پورا پنجاب' پورا بنگال' اور پاکستان کے دونوں بازوؤں کے درمیان کاری ڈور کا مطالبہ) کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کو یادداشت پیش کی۔ اور حصول پاکستان کے لیے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ ۱۹۴۷ء کے جون میں دہلی میں تین لاکھ خاکساروں کا عظیم الشان کیمپ۔ خاکسار تحریک کو منتشر کر دیا گیا۔ ○ ۱۹۴۷ء قیام پاکستان کے بعد مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان دس لاکھ انسانوں کو تبادلہ آبادی کی تجویز۔ تاکہ ہر دو حصوں کے رہنے والوں میں رشتوں' ناطوں کے ذریعے باہمی اخوت اور محبت پیدا ہو کر کہ استحکام پاکستان کا باعث ہوگا۔ ○ اگست ۱۹۴۸ء میں انڈو پاکستان اسلام لیگ قائم کی جس کا مقصد ساڑھے پانچ کروڑ بھارتی مسلمانوں کا تحفظ اور ان علاقوں کو پاکستان میں شامل کرانے کی جدوجہد جو کہ اسلامی ثقافت کی آماجگاہ تھے۔ ○ ۱۹۴۸ء ساڑھے پانچ کروڑ بھارتی مسلمانوں کے تحفظ کا مسئلہ یو این او میں پیش کیا۔ اس وقت کے سیکرٹری جنرل مسٹر ٹریگونی نے حضرت علامہ مشرقیؒ کو صورتحال کی وضاحت کے لیے نیویارک پہنچنے کی دعوت دی لیکن حکومت پاکستان نے پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا۔ ○ ۱۹۵۰ء ۲۸ مئی کو لاہور میں عظیم الشان خطاب جس میں استحکام پاکستان کے لیے لازمی عسکری تربیت کے نفاذ پر زور دیا۔ ۲۸' ۲۹' ۳۰ دسمبر ۱۹۵۰ء کو منٹو پارک لاہور میں پاکستان میں بہنے والے دریاؤں کے رخ موڑنے کے بھارتی منصوبے کا انکشاف کیا اور کشمیر کو حاصل کرنے کی اہمیت واضح کی۔ اس کی پاداش میں علامہ صاحب کو سیفٹی ایکٹ کے تحت ۱۸ ماہ تک بغیر مقدمہ چلائے میانوالی کی بدترین جیل میں نظر بند رکھا گیا۔ ○ ۱۹۵۱ء ۲۶ دسمبر کو بنیادی اصولوں کی رپورٹ کی اشاعت پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ صاحب نے وحدت مغربی پاکستان "ون یونٹ" کی تجویز پیش کی اور غریبوں کو امیروں اور جاگیرداروں کے استحصال سے بچانے کے لیے طبقاتی بنیاد پر الیکشن کرانے کا فارمولا پیش کیا۔ ○ ۱۹۵۲ء جولائی کو خاکسار اعظمؒ میانوالی جیل سے رہا ہوئے۔ ملک میں بدترین صورتحال کو سنبھالنے کے لیے مخلوط حکومت کی تجویز پیش

کی۔ ○ ۱۹۵۵ء مسئلہ تسخیر کائنات اور انجام کائنات پر خاکسار اعظمؒ نے دنیا بھر کے تقریباً بیس ہزار سائنسدانوں کو ایک تاریخی خط لکھا جو کہ انسانی مسئلہ (HUMAN PROBLEM) کے نام سے مشہور ہے۔ ○ ۱۹۵۶ء استحکام و سالمیت کے پیش نظر پاکستان میں مضبوط مرکز کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لسانی، علاقائی اور فرقہ وارانہ تعصبات کو مٹانے کے لیے اخوت، محبت، مساوات اور عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ کے قیام پر زور دیا۔ ○ ۱۹۵۷ء کشمیر کو بزور شمشیر حاصل کرنے کے لیے سرحدوں پر "جہاد کیمپ" لگائے۔ "ڈاکٹر خاں صاحب قتل کیس" میں بے گناہ گرفتاری اور ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد عدالت سے باعزت رہائی۔ ○ ۱۹۶۲ء ایوب خاں آمریت میں حضرت علامہ صاحب کو ان کی رہائش گاہ پر نظر بند رکھا گیا۔ ○ خاکسار تحریک کے احیاء کے لیے راولپنڈی میں خاکساروں کے کنوینشن کا انعقاد۔ ○ ۱۹۶۳ء ۲۷ اگست داعی اجل کو لبیک کہا۔ ۲۹ اگست کو لاہور میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔ اس روز کاروباری ادارے بند رہے۔ شہر میں مکمل ہڑتال رہی۔ پاکستان اور بیرون پاکستان سے لاکھوں فرزندان توحید اس مرد حق آگاہ کے سفر آخرت میں شریک ہوئے۔ ۲۷ اگست ۱۹۶۳ء کو نو بجکر پانچ منٹ پر میو ہسپتال لاہور میں انتقال

حضرت علامہ مشرقیؒ کا مزار مبارک ذیلدار روڈ اچھرہ لاہور میں ہے ○ ۱۹۹۳ء میں خاکسار تحریک کے مرکزی جنرل کیمپ مینار پاکستان لاہور میں بانی خاکسار تحریک حضرت علامہ مشرقیؒ کے صاحبزادے حمیدالدین المشرقی کو خاکساروں نے "تاحیات قائد خاکسار تحریک" منتخب کیا۔

بسم اللہ الرحمان الرحیم

تمہید

کیا آپ محض ذہنی' فکری اور دماغی عیاشی کے حصول کیلئے یا پھر اپنے دوست احباب پر رعب ڈالنے یا انہیں مرعوب کرنے یا اپنی لائبریری کی زینت بنانے یا پھر رسما" یا عقیدتا" "تذکرہ" جیسی یادگار عالم شاہکار تصنیف کو خریدنا یا پڑھنا چاہتے ہیں تو

برائے مہربانی!

اسے خریدنے یا پڑھنے کی زحمت نہ کیجئے تو یہ آپ کا خدا' رسول خدا ﷺ' قرآن' اسلام' ملت اسلامیہ' پبلشر اور شہرت سے بے نیاز مصنف پر احسان عظیم ہو گا۔

کیوں کہ

ہم ایک طویل عرصہ کے بعد "تذکرہ" جس میں مسلمانان عالم کو ان کی اجتماعی موت و حیات کے متعلق پیغام اخیر دیا گیا ہے کی اشاعت محض رسما" یا عقیدتا" نہیں کر رہے بلکہ

ہمارے پیش نظر

خالصتا" وہی عظیم مقصد' وہی مشن' وہی پروگرام' وہی نصب العین اور وہی جذبہ جو اس عالم گیر شہرت یافتہ کتاب کے مصنف جناب حضرت علامہ محمد عنایت اللہ خان المشرقیؒ کے مد نظر تھا موجود ہے۔

ویسے بھی

قرون اولیٰ سے لے کر اب تک 1418 برس میں خدا اور رسولؐ پر' اور قرآن اور اسلام پر لکھو کھہا کتب شائع ہو چکی ہیں مگر اولیٰ سا نتیجہ پیدا نہیں ہو سکا جب تک اسلام دلوں دماغوں اور جسموں پر تھا ہم مسلمان روئے زمین کے تین براعظموں پر حاکم اور غالب تھے مگر جب سے یہ کاغذوں پر آیا ملت اسلامیہ فرقوں' گروہوں' پارٹیوں' ذاتوں اور خطوں میں منقسم ہو کر رہ گئی۔ امت مسلمہ کی جماعت بکھر گئی' مرکزیت ختم ہو چکی' زندہ امیر یا خلیفہ موجود نہیں اور دماغوں سے خدائی نصب العین محو ہو چکا ہے۔

اس کے برعکس

ملت کفر متحد ہے' عالمی سطح پر ایک جماعت بن چکی ہے اور ایک ہی نظام اور پروگرام بلکہ نصب العین کے تحت چل رہے ہیں آپس میں مل جل کر ملت اسلامیہ کے خلاف منظم طور پر برسرپیکار ہیں وہ اقوام متحدہ کی آڑ میں مسلمانوں سمیت کمزور اور نحیف قوموں کا استحصال کر رہے ہیں وہ دنیاوی ترقی کے بام عروج پر ہیں جبکہ ملت اسلامیہ ملت کفر کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہے۔

ان حالات میں

قرآن کو جزدانوں اور الماریوں' اسلام کو حجروں اور رسموں' مسلمانوں کو فرقوں اور عقیدوں سے بالاتر ہو کر قرون اولیٰ کے مسلمانوں جیسا جذبہ پھر سے دلوں' دماغوں' ذہنوں اور جسموں پر پیدا کر کے عالمی سطح پر ایک مرتبہ ایمان والوں کی جماعت کے قیام کے لئے از سر نو جدوجہد کرنے کی بے حد ضرورت ہے جو ہر سطح پر دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب کر کے خدائی حکم اور رسولؐ مشن کو تکمیل تک پہنچاوے چاہے کافروں کو برا ہی کیوں نہ لگے۔

اسلام کے ایسے ہی غلبے' قوت' طاقت' بادشاہت اور حکومت کا خواب "صاحب تذکرہ" نے دیکھا اور اسے حقیقت کا روپ دینے کے لئے تا زندگی مصروف جدوجہد رہے۔

کیا ہم نے تذکرہ پڑھنے کے بعد بھی محض لفظی' وارثی' زبانی' قولی اور رسمی مسلمان ہی رہنا ہے؟ یا پھر صرف واہ واہ کہتے رہنا ہے؟ کیا اسے پڑھنے کے بعد بھی عمل سے راہ فرار اختیار کرنی ہے؟ تو پھر ایسے علم یا پھر ایسے اسلام کا کیا فائدہ جو نتیجہ نہ پیدا کر سکے؟

جس راہ سے منزل نہ ملے دھوکہ ہے
طاعت جو حکومت نہ دے دھوکہ ہے
آسانی نتیجہ ہے سدا سختی کا
اسلام جو مغلوب رہے دھوکہ ہے
(حضرت علامہ مشرقیؒ)

ہم بخدا "تذکرہ" کی اشاعت محض تجارتی نقطہ نظر سے نہیں کر رہے بلکہ ہم دلی طور پر اس عظیم الشان مشن کی تکمیل اور کامیابی چاہتے ہیں جس کی بنیاد ہادی برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے رکھی تھی اور جسے پون صدی قبل عظیم ریاضی دان' رینگلر سکالر' بیچلر سکالر' فاؤنڈیشن سکالر' سائنسی و مذہبی مفکر اعظم اور نقیب فطرت حضرت علامہ محمد عنایت اللہ خان المشرقیؒ نے پھر سے قرآن کی ایک ایک آیت کھول کھول کر بیان کی تاکہ مسلمان پھر سے جاگ اٹھیں اور اپنے اصل کی طرف لوٹ کر پھر سے گھروں سے نکل پڑیں ٹولیاں بن کر یا سب مل کر اور فقط ایمان والے بن کر' اللہ والے بن کر اور نبیؐ کے سچے اور کھرے پیروکار نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اطاعت گذار بن کر روئے زمین پر اسلام کا بول بالا کر دیں۔

بہرنوع چودھویں صدی کے اس زوال کے زمانے میں اگر مسلمان کو یہ عذر ہے کہ اس کو معلوم نہیں رہا کہ قرن اول کے چند صد عرب کن حکموں پر عمل کر کے اور کس کردار کے مالک ہو کر بیس بائیس برس میں ہی غلبے کی اکثر منزلیں طے کر گئے تھے تو میرا یقین ہے کہ یہ تصنیف اس عذر کا پورا جواب ہے۔ اس اہتمام حجت کے بعد مذہب کو دوکان نہ بنانے والے چند درد مند انسانوں کی ضرورت ہے جو غلبے کی نیت سے اس کردار کو پھر شروع کر دیں' ہر عمل میں اور ہر آن غلبے کی نیت کو کمزور نہ ہونے دیں اور غالب آنے والی جماعت کو روز بروز بڑھانے کی جدوجہد مسلسل رہے۔ گوشت پوست کی اس دنیا میں غالب آنا صرف خون سے کھیل ہے۔ جو قوم جس وقت تک یہ کھیل کھیلتی رہی غالب ہے۔ شکست اور زوال اس وقت آتے ہیں جب قومیں اس سبق کو بھول جاتی ہیں۔ آپ جہاں کہیں بھی رہتے ہیں ایسی غالب' حاکم اور خادم خلق جماعت کا قیام شروع کر دیں۔ اللہ بس وماسویٰ ہوس

اب نیستاں سے یہی ایک نوا باقی ہے
نہ سنی یہ بھی تو پھر تیری سزا باقی ہے

حمید الدین المشرقی
(قائد خاکسار تحریک)
منیجنگ ڈائریکٹر — التذکرہ پبلی کیشنز

مورخہ: 21 مئی 1997ء
بوقت: رات ساڑھے بارہ بجے

دنیائے علم و خبر کے مفکر اعظم اور نقیب فطرت

حضرت علامہ مشرقی کی تہلکہ مچا دینے والی تصانیف

خریطہ

حضرت علامہ محمد عنایت اللہ خان المشرقیؒ (1963ء - 1888ء) نے 1902ء تا 1909ء کے درمیان 14 برس کی عمر میں 126 رباعیوں اور 170 شعروں پر مشتمل ایک فارسی تصنیف 7 فروری 1924ء کو شائع کی جو خریطہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ جس کا دیباچہ اردو میں تحریر کیا۔ خریطہ کے اس ولولہ انگیز اور روح پرور دیباچے کو پڑھ کر تقریباً" پانچ ہزار شاعروں نے اقرار کیا کہ انہوں نے شاعری ترک کر دی ہے اس کے بعد حضرت علامہؒ نے نصف صدی تک شاعری کو خیر آباد کہہ دیا۔

تذکرہ

اول - دوم - سوم

○ کتاب تذکرہ 3 ستمبر 1920ء میں حضرت علامہ محمد عنایت اللہ خان المشرقیؒ نے پشاور میں لکھنا شروع کی اور 1922ء تک اسے ہزارہا صفحات پر لکھ ڈالا۔ دو برس بعد یعنی 1924ء میں اس کی پہلی جلد (جدید ترتیب کے مطابق جلد اول دوم) امرتسر کے مقام سے شائع کی گئی۔

○ مفکر اعظم اور نقیب فطرت کا قرآن حکیم کے حقائق عالیہ پر دس جلدوں میں ایک مبسوط علمی تبصرہ جس میں مسلمانان عالم کو انکی اجتماعی موت و حیات کی متعلق آخری پیغام دیا گیا۔

○ صدر اسلام سے لے کر آج تک قرآن حکیم کی حکمت بالغہ پر کوئی کتاب اس قدر مدلل' اس قدر یقین انگیز' اس قدر نتیجہ خیز تما" نہیں لکھی گئی۔

○ اس کا ایک ایک ورق الہٰی حکمت کا حیرت انگیز مرقع اور اس کی ایک ایک دلیل قرنوں کی غفلت زدہ امت کے لئے چونکا دینے والا تازیانہ ہے۔

○ یہ تصنیف جلیل انبیائے کرام علیہ الصلواۃ والسلام کے پیغام اور بالخصوص قرآن حکیم کی ایک مکمل اور ناقابل بدل ایک اٹل اور علمی تشریح ہے۔ جس کو فرض اور ظن سے سروکار نہیں۔

○ قرون اولیٰ کے صحیح اسلام کے ماسوا تمام مذاہب وادیان کی ناسخ تمام اگلی بے نتیجہ تفاسیر اور تشاریح کی اغلاط کی قاطع اور انسان کے مابین سب اعتقادی فرقہ بندی کی صریح مخالف ہے۔

خطاب مصر

تذکرہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ جب 1926ء میں قاہرہ (مصر) میں موتمر خلافت کا انعقاد ہوا تو شیخ الاسلام نے حضرت علامہ مشرقیؒ کو دنیائے اسلام کے اہم ترین مسائل کے متعلق رائے دینے کے لئے

دعوت دی"

13 مئی 1926ء کو قاہرہ (مصر) میں اس موقع پر جو باطل شکن اور معرکتہ آلاراء تقریر آپ نے کی وہ مصر اور برصغیر پاک و ہند میں "خطاب مصر" کے نام سے مشہور ہوئی۔ جس میں مسلمانان عالم کو آنے والے خطرات سے بچانے، طاقتور بنانے کے لئے ایک عالمگیر پروگرام پیش کیا گیا۔

اشارات

خاکسار اعظم حضرت علامہ مشرقیؒ نے یکم اگست 1931ء میں "اشارات" کے نام سے قوم کی اصلاح کے لئے عملی پروگرام پیش کر دیا۔

جس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ۔

- قوم اور اس کے راہنماء ایک مشترکہ عمل سے جنم لیتے ہیں۔
- انہوں نے اسلام کی ماہیت اور اس کو غالب کرنے کا طریقہ کار بتلا دیا۔
- انہوں نے کہا کہ اگر مسلمان اس وقت سنبھل گئے اور میری کتاب "اشارات" کی تجویز کو محکم طور پر پکڑ لیا تو اب بھی زندگی کی قطعی امید ہو سکتی ہے۔

قول فیصل

15 نومبر 1935ء میں " قول فیصل" میں قوموں کا زوال اور اس کا علاج اور خاکسار تحریک کے پروگرام کی مکمل تشریح کر دی گئی۔

- وہ عظیم الشان تصنیف جس نے " خاکسار تحریک" کو چند برسوں کے اندر اندر نہ صرف ملک گیر بلکہ عالمگیر بنا دیا۔
- وہ انقلاب انگیز تصنیف جس نے مسلمانان ہند کو صدیوں بعد حجروں سے نکال کر بلا لحاظ مذہب و تفریق ایک ہی صف میں کھڑا کر کے عملاً" مساوات پیدا کر دی۔
- مسلمانوں کے اندر پھر سے بے مزد خدمت خلق کا عظیم الشان اور ناقابل یقین جذبہ پیدا کر دیا۔

مقالات (اول دوم)

- بانی خاکسار تحریک حضرت علامہ محمد عنایت اللہ خان المشرقیؒ کے مقالات" کی پہلی جلد 27 جنوری 1937ء میں طبع ہوئی۔
- ہفت روزہ الاصلاح کے مقالات افتتاحیہ" کا نقش ثانی ہے۔ جو 23 نومبر 1934ء سے 5 جون 1936ء تک شائع ہوئے۔
- مقالات کی دوسری مجلد 2 ستمبر 1943ء کو شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس میں جریدہ الاصلاح کے 5 جون 1936ء سے 16 جولائی 1937ء تک کے مقالات افتتاحیہ شامل ہیں۔

ان مقالوں میں قوم کو اس کی قوتوں کے زوال سے متعلق باخبر کیا گیا ہے' ہوش بلکہ شعور پیدا کیا گیا ہے۔ کہ قوم کن مصائب اور مشکلات میں مبتلا ہے' قوم میں کیا اخلاق اور اعمال موجود ہیں' کیا ہیں جن کا زوال ہو چکا ہے اور جن کو پھر حاصل کرنے کی امنگ پیدا ہونی چاہیے۔
ان مقالات کو پڑھنے کے بعد چند دنوں میں بڑے مخلص آدمی گوشوں سے نکل پڑے' جان و مال کی عظیم الشان قربانیاں فوراً" ہونے لگیں۔ لکھو کھا مسلمان یکدل اور ہمخیال ہوگئے۔ محبت کی نہریں پھوٹ بہیں اور خدمت خلق کا حیران کن منظر پیدا ہو گیا۔

مولوی کا غلط مذہب

○ مولوی کا غلط مذہب میں 25 ستمبر 1936ء تا 28 اگست 1938ء تک حضرت علامہ محمد عنایت اللہ خان المشرقیؒ کے علاوہ تحریک کے دیگر زعماء نے اپنے مقالوں کے ذریعہ سے علمائے سوء کی جاہلانہ تعلیمات کے بخیئے ادھیڑ کر مولوی کے تین سو سالہ مذہبی تخیل کو رد کر دیا ہے۔
ان بیانات کو شاید معاندانہ اور مخالفانہ سمجھا جائے یا مولوی سے کسی ذاتی مخالفت کی تمہید یقین کی جائے لیکن بقول مشرقیؒ
" میں مولویوں اور علمائے دین کا دشمن نہیں ہوں مجھے ان سے کوئی ذاتی کاوش نہیں میں صرف ان کے بگڑے ہوئے مذہبی تخیل اور کم نظری کا دشمن ہوں اور مسلمان کی ذہنیت کو جلد از جلد بدلنا چاہتا ہوں۔
"

خاکسار آئین (انگریزی)

برصغیر کی آزادی کے لئے خاکسار اعظم حضرت علامہ مشرقیؒ نے انگریزی اقتدار کا چیلنج قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ اگر ہندوستانی ایک ایسا آئین پیش کر دیں جس پر ہندوستان کے تمام عناصر متفق ہوں تو ہم ہندوستان کو آزاد کر دیں گے۔ آپ نے نہایت قلیل مدت میں ایک متفقہ آئین جون 1945ء میں مرتب کر کے اکتوبر 1945ء میں شائع کر دیا۔ دراصل یہ آئین حقیقی معنوں میں حقوق انسانی کا علمبردار ہے۔

حریم غیب

○ حضرت علامہ مشرقیؒ نے پچاس سال کے بعد قید کے دوران ایک حیرت انگیز واقع کی وجہ سے پھر شاعری کو تھوڑی مدت کے لئے اختیار کیا۔ حریم غیب 27 اکتوبر 1952ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آگئی۔
○ حریم غیب کے 18 سو اشعار 10 فروری 1951ء سے 20 مئی 1951ء تک دوران کے صرف دو ماہ آٹھ دن میں چار گھنٹے روزانہ مصروفیت کی اوسط سے کہے گئے ○حریم غیب میں دین اسلام کی ماہیت کو علمی نقطہ نظر سے واضح کر کے مسلمان کو اس کے فرائض سے آگاہ کیا گیا اور ظن کے بالمقابل علم کے مقام کی قطعی تشریح کی گئی۔ الغرض شعر زدہ امت کے لئے راہ پر آنے کی ایک گنجائش حضرت علامہ مشرقیؒ نے

پھر پیدا کی ہے۔ کیا عجب کہ اسے پڑھنے کے بعد امت مسلمہ سرخرو ہو سکے۔

دہ الباب

○ حضرت علامہ مشرقیؒ نے دوران قید "دہ الباب" کے تقریباً" تیرہ سو اشعار یعنی (24 دسمبر 1951ء تک کے) دو ماہ گیارہ دن میں مکمل کئے۔ دہ الباب 10 نومبر 1952ء میں شائع ہوئی۔ 64 مختلف عنوانات کے تحت یہ نظمیں ہیں اہم اہم واقعات اور آیات کی تشریح کتاب کے آخر میں " فرہنگ دہ الباب" میں کر دی گئی تاکہ قاری کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

○ دہ الباب میں بڑا مسئلہ علم کا دنیا پر حکم اور اس کا نبوۃ کی طرف ارتقاء ہے۔ اس مسئلے کی اہمیت کا اندازہ لگانے کو ابھی بڑا وقت چاہیے۔ زمین کے کسی بڑے سے بڑے حقدم اور متنور حصے نے بھی تاحال علم کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا اور اس کو ابھی تک زیادہ سے زیادہ موجودہ سیاسی حاکموں کی دست پخت لونڈی قرار دیا ہے۔ لیکن اسلام کو چونکہ پچھلے چودہ سو برس سے دنیا کی سیاست کی تشکیل میں بڑا دخل رہا ہے اور بہت کچھ جو اس وقت تک انسان کی معاشرت میں انقلاب برپا ہوا دین انبیاء کے بے پناہ زور سے ہوا ہے اس لئے یہ امر اٹل ہے کہ انسان کی آئندہ زندگی کی تشکیل بھی اسلام پر ہو کر رہے گی

ارمغان حکیم

○ حضرت علامہ مشرقیؒ نے اپنی قید کے دوران ہی شاعری پر تیسری تصنیف مکمل کی جو 23 نومبر 1952ء کو شائع ہوئی۔ جس میں تقریباً" چودہ سو اشعار یعنی (9 جولائی 1952ء تک کے) صرف تین ماہ چار دن پونے چار گھنٹے کی روزانہ کی اوسط کے حساب سے کہے گئے۔

○ انہوں نے ارمغان حکیم میں غزل کے رنگ میں بلندی فکر کو جلا دی۔ جس نے شعر فہم طبقے میں ایک نئی ہلچل پیدا کر کے اس وقت کی شاعری کو بے قیمت کر دیا۔ ارمغان حکیم میں حضرت علامہؒ کا ایک اہم مقالہ بعنوان " شاعری پر نقد و نظر اور خریطہ کا دیباچہ" جو قرآن کی تعلیمات کا ماخذ ہے شامل ہے۔

حدیث القرآن

○ حدیث القرآن سائنسی و مذہبی مفکر و فلاسفر اور عالم باعمل انسان حضرت علامہ مشرقیؒ کی وہ معرکتہ الآراء تصنیف جس میں مصنف نے قرآن کی تعلیمات کو انتہائی سادہ اور آسان لفظوں میں واضح کر کے قرآن کی علمی حیثیت کو اجاگر کیا ہے۔

○ حدیث القرآن کی تصنیف اول تا آخر قید خانہ میں ہوئی۔

○ 30 مئی 1951ء کو اسے شروع کیا گیا اور دوران رمضان میں ہی 19 جون 1951ء تک یعنی (کل 20 دنوں میں) مکمل ہوئی اور 25 نومبر 1952ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔

○ مصنف نے "دو الباب" کی تمہید میں "حدیث القرآن کے متعلق وضاحت کی ہے کہ "حدیث القرآن" میں میں نے قرآن حکیم کے اختصار کو چند لفظوں میں دے دیا ہے جو صاحب نظر کو یک لخت چونکا دے تاکہ قرآن حکیم کی علمی تصویر اس میں نیا ولولہ پیدا کر دے۔ کسی امت کی نجاح اس میں ہے کہ اس کے پاس حقیقت ہو اور اگر مسلمان کے پاس دنیا کی تمام موجودہ حقیقتوں میں بڑی حقیقت موجود ہے۔ تو وقت ہے کہ وہ اس کو لے کر نکلے اور دنیا کو نئی راہ پر لگا دے۔ چودہ سو برس کے "طول آمد" کے بعد یہی نسخہ ہے جو کسی قوم کو نئی زندگی دے سکتا ہے۔

○ مصنف کی یادگار عالم نوبل انعام یافتہ تصنیف تذکرہ کی دس جلدوں کا اختصار

○ قرآنی نقطہ نظر سے مقام خدا' مقام انبیاء' مقام الکتاب' مقام انسان' مقام فطرت' تمکن فی الارض کی علمی تشریح۔ ○ قرآن کو سمجھنے کے لئے بلندی نگاہ کیا ہو؟ صلائے عام بہ ساکنان زمین' اور ہوشمندان زمین کو ایک پر مغز خطاب۔

○ قرآن حکیم کے عظیم ترین نصب العین اور پروگرام کی تشریح پر جامع مستند کتاب حدیث القرآن کا مطالعہ ضروری ہے۔

○ حال ہی میں آسٹریلوی سائنس دانوں نے کلوننگ کا نظریہ پیش کر کے دنیا میں تہلکہ برپا کر دیا ہے حضرت علامہ مشرقیؒ نے اس نظریہ کی نشاندھی اپنی کتاب حدیث القرآن میں 46 برس قبل کر دی تھی۔

تکملہ (اول دوم)

(سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ------- اول دوم)

قرآن حکیم کی تعلیمات پر حرف آخر

○ دنیائے علم و خبر کے مفکر اعظم حضرت علامہ مشرقیؒ کی ترتیب نزول قرآن کے عین مطابق سیرت النبیؐ کے موضوع پر یہ حیرت انگیز تصنیف 1960ء میں دو حصوں میں شائع ہو کر جب لوگوں تک پہنچی تو اس نے تہلکہ مچا دیا۔

○ چودہ سو برس میں پہلی قرآن حکیم کی دل کو تسلی دینے والی تشریح۔

○ رسالت مآب کی تیئس برس کی مکی و مدنی زندگی کے جلال و جمال کی داستان۔

○ قرآن حکیم کی تعلیمات کا ایک مکمل' مفصل اور حیران کر دینے والا' دیانت دارانہ جائزہ۔

○ سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انتہائی علمی و تحقیقی تاریخ' قرآن کے نزول کی صحیح اور جامع ترتیب و تشریح۔

جسے مصنف نے دسمبر 1957ء کی یخ بستہ سردیوں میں (میانوالی جیل میں ایک تنگ نظر امریکی مصنف کی تصنیف پڑھ کر) لکھنا شروع کیا۔ اور تیس دن کی قلیل مدت میں اسے ایک ہزار صفحات پر لکھ کر رسول

ﷺ خدا کے متعلق مغرب کے تنگ نظر مصنفین اور مستشرقین کے انتہائی غلط' مضحکہ خیز' بے سروپا اور بے ہودہ اعتراضوں کا مثبت دلائل کے ساتھ دندان شکن جواب دیا۔

"تکملہ" کے مطالعہ کے بعد انسان محو حیرت ہو جاتا ہے کہ

قرآن کا بنی نوع انسان کے نام کیا زندہ رہنے والا پیغام تھا جو صدیوں تک اوجھل رہا! جس کو صرف مدینہ کے مٹھی بھر رسول ﷺ خدا کے ساتھی تھوڑا بہت سمجھ کر اٹھے اور صرف دس برس میں تمام عرب پر ایسے چھا گئے کہ اس چھا جانے کا بے پناہ زور تین سو برس تک قائم رہا۔

انسانی مسئلہ

○ حضرت علامہ مشرقیؒ کا دنیا کے تقریباً" بیس ہزار مشہور سائنس دانوں کے نام قرآن حکیم کی تعلیم سے اخذ کیا ہوا مراسلہ جو جولائی 1951ء سے بھیجنا شروع کیا گیا اور نومبر 1955ء تک امریکہ' یورپ اور روس کے مقتدر سائنس دانوں کو بھیجا گیا جس میں ان کی توجہ اس طرف منعطف کی گئی کہ مقصد پیدائش کائنات صرف انسان کا صحیفہ فطرت کو مکمل طور پر مسخر کرنا ہے - اس کے سوا کچھ نہیں چنانچہ اس وقت عالمان فطرت کا تسخیر کائنات کی طرف متوجہ ہونا اسی مراسلے کی وجہ سے ہے۔

○ انسانی مسئلہ کی اشاعت کے فوراً" بعد پورے یورپ' امریکہ اور روس مقصد پیدائش کائنات اور تسخیر کائنات کی طرف رجوع ہوئے۔ اسی خط کی بدولت آج یورپ' روس اور امریکہ کے سائنس دان چاند اور دوسرے خطوں پر پہنچے۔

انسانی مسئلہ کے ٹائٹل پر درج ذیل شائع شدہ قرآنی آیات میں ہی اس مراسلے کا مکمل مقصد واضح ہے۔

○ اے لوگو! خدائے لایزال نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب تمہارے لئے مسخر کیا ہے۔ بیشک اس پیغام میں سوچنے والی قوم کے لئے ضروری ہدایات موجود ہیں۔○ اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اور جو کچھ زمین میں ہے خدا ہی کا ہے تاکہ برے عمل کرنے والوں کو برائی کی سزا دے اور عمدہ عمل کرنے والوں کو ان کے عمدہ عمل کی جزا (انہی چیزوں میں سے) دے۔ (القرآن)

میری تصانیف کا مقصد اس قدر ہے کہ

قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی ادنیٰ سی عملی اور علمی آگ پاکستان کے زوال یافتہ مسلمان میں پیدا ہو جائے اور وہ آگے بڑھنے کے قابل ہو۔ یہی امید ہے جو مجھے کھینچے لئے جا رہی ہے اور کیا عجب کہ ایک گروہ یہاں یا کسی اور اسلامی ملک میں پیدا ہو جائے تو مسلمان کی بگڑی بن سکتی ہے۔ (حضرت علامہ مشرقیؒ)

التذکرہ پبلی کیشنز ○ المشرقی ہاؤس

34 - ذیلدار روڈ' اچھرہ لاہور - 54600

فون: 411228 ☆ 415116 - 042

فہرست مضامین تذکرہ

جلد دوئم

جو مضامین کتاب کے متن میں وارد ہوئے ہیں اُن کو جلی قلم سے لکھا گیا ہے جو حواشی میں آئے ہیں اُن کا قلم مہین ہے ۔

مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ
مقدمہ		لفظ استخلاف کی تشریح	۹-۱۰	علم طبقات الارض کی تشریح	۳۷-۲۷
از صفحہ ۱ تا ۱۰۰		ڈارون کا نظریہ ارتقا	۱۱-۲۷	طبقات الارض کی تعمیر کے بواعث	۲۸
کتاب ماہیت		مسئلہ ارتقا کی تشریح	۱۱-۲۷	رکازات زمین کے وجود کی توجیہ	۲۸-۲۹
ایمان و		مسئلہ ارتقا اور معرفت خدا	۱۱	صحیفۂ فطرت کی کتاب سے مشابہت	۲۹
حکمت عبادات		شق اول و دوم (مسئلہ تکوین و ترتیب کائنات)	۱۱	طبقات الارض کی تعمیر کے پانچ زمانے	۳۰
از صفحہ ۱۰۰ تا ۲۷۲		شق سوم (مسئلہ تنازع للبقا)	۱۲	القدیمۃ الاولیٰ کے رکازات	۳۰
		شق چہارم (مسئلہ انتخاب طبیعی)	۱۳	القدیمۃ الاخریٰ کے رکازات	۳۰-۳۱
		شق پنجم (مسئلہ تدریج تکوین)	۱۴	کوئلے کی کانوں کا ذکر قرآن حکیم میں	۳۰
مسلمانانِ عالم کا عالمگیر انحطاط	۱	ستۃ ایام کے یوم کی تشریح	۱۴-۱۶	الحیاۃ الوسطیٰ کے رکازات	۳۱-۳۲
انحطاط کے وجوہ	۲	تعین قدا حد قدر کی تشریح	۱۵-۱۶	صلاحیت بقا کی تشریح	۳۳-۳۴
عدم نظام عمل	۳	ارتقائے انسان کے متعلق قرآنی شہادت	۱۶	الجدیدۃ القصویٰ کے رکازات	۳۴
اسلام مدعی مذہب فطرت ہے	۴	شق ششم (مسئلہ اجتماع و استمرار)	۱۷	الجدیدۃ الادنیٰ کے رکازات	۳۵-۳۶
مسلمان ناقابلِ فنا امت ہیں	۴	شق ہفتم (مسئلہ بقائے اصلح)	۱۸	مسئلہ وحدت اصل و نسل کی قرآنی شہادت	۳۶-۳۷
فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا کا مفہوم	۴	شق ہشتم (مسئلہ وحدت کائنات و وحدت حیات)	۱۹	ستۃ ایام کی تشریح	۳۷
اسلام ایک تعمیری فلسفہ ہے	۵	تشریح معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۲۰-۲۱	تمدن انسانی اور صلاحیت بقا	۲۸-۳۴
اسلام کی مسخ شدہ صورت	۶	حرکت زمین کے متعلق قرآنی شہادت	۲۱	مغربی عمران اور صلاحیت بقا	۳۵
قرآن حکیم کی حکمت سالطہ نقادوں کی نظر میں	۶	حرکت اجرام فلکی کے متعلق قرآنی شہادت	۲۲	ایمان و اعمال صالحہ کی ماہیت	۳۵
ایمان کی ماہیت	۶	حرکت شمس کا انکشاف اور قرآنی شہادت	۲۳	آیۂ استخلاف کا صحیح مفہوم	۳۶-۳۷
ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ	۷	مسئلہ تعقل خدا کا ابطال از روئے قرآن	۲۳-۲۵	آیۂ استخلاف کا قرآنی پیش نہاد	۳۸-۳۹
آیۂ استخلاف کا میثاق ایزدی اور مسئلہ		مسئلہ ارتقا کی صحت پر اس کتاب کے مباحث کا انحصار نہیں	۲۵	وراثت زمین کا قرآنی پیش نہاد	۳۹
ارتقا و بقائے اصلح	۸-۱۰	مسئلہ ارتقا کی علمی تصدیق	۲۶	آمنوا وعملوا الصالحات کے مفہوم کی پہلی شق (صبر)	۳۹
مسئلہ ارتقا کے مخترع اور مبلغ	۸	مسئلہ انتخاب طبیعی پر حملہ	۲۷	صلح کی قرآنی تعریف کی ایک جھلک	۴۰

مضامین	صفحہ
آیۂ استخلاف کا سیاسی مفہوم	۴۱
آیۂ استخلاف کا شانِ نزول	۴۲
آیۂ استخلاف ایک مشروط میثاق ہے	۴۳
قرآن حکیم کی تعلیم کا عرب اُمت پر اثر	۴۴
ایمان اور اعمال صالحہ کا ابتدائی مفہوم	۴۵
مسلمانانِ عالم کے زوال کی وجوہات	۴۵-۴۶
قرآنی مطالب کی توضیح کے متعلق اہل عرب کی ذمہ داری	۴۶
قرآن حکیم کی مروجہ سطحی تعظیم اور تعلیم	۴۷
قرآن حکیم کے مطالعے میں فنونِ ادبیہ کا التزام	۴۷
فنونِ ادبیہ کے اختراع کی تاریخ	۴۷
یونانی فلسفے کا قرآن سے تصادم	۴۸-۶۱
یونانی فلسفے کے مضر اثرات	۴۸-۵۲
نفاق کے معانی کی پہلی شق (وحدتِ اُمت)	۴۹
آیۂ لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کی تشریح	۵۰-۵۲
قرآن کی تنظیم کا صحیح مقصد	۵۲
قرآن کی حکمت کاملہ کے متعلق دعاوی	۵۳-۵۵
قرآن کے کامل ہونے کے متعلق دعاوی	۵۶
قرآن کا دعوئے کتاب مبین ہونا ہے	۵۷
قرآن کے آسان ہونے کا دعوےٰ	۵۷
مجسمۂ بصائر ہونے کا دعوےٰ	۵۷
پیکرِ علم ہونے کا دعوےٰ	۵۸
تدبر کے متحمل ہونے کا دعوےٰ	۵۸
علم کی ابتدائی تعریف	۵۸
قرآن میں اجتہاد کرنے کے اصل اصول	۵۹
علم اسرار التنزیل	۵۹
مسلمانوں کی ناقدر شناسیِ قرآن اور اکابرِ جدید فلسفہ	۶۰
اَلْکِتٰبُ الْمُبِیْن کی تشریح	۶۰-۶۲
عرب تخیل کا قرآن سے تصادم	۶۱-۱۰۰
مطالب قرآن پر عرب توہمات کا اثر	۶۱-۶۴
عرب شاعری کا اثر	۶۳-۶۴
معلقات، جمہرات اور منتخبات السبعہ کی تشریح	۶۳

مضامین	صفحہ
قرآن شعر نہیں	۶۴
قرآن کی واحد فضیلت علم ہے فصاحت نہیں	۶۴-۶۶
قرآن کو عربی زبان میں نازل کرنے کی قرآنی وجوہات	۶۶
عرب نفاق آرائی کا قرآنی مطالب پر اثر	۶۶-۶۷
قرآن اپنی صداقت کے باعث خود بخود بلیغ ہے	۶۷
عربی النسل اقوام کی ہلاکت کے بواعث	۶۸
قرن اول کا قرآن پر عمل	۶۹
قرون اولیٰ کی اسلامی فتوحات کا اندازہ ایک حد تک	
کم ہے۔	۶۹
قرآن پر تدبر کرنے کی ابتدائی تاریخ	۷۰
آیات قرآنی کی ترتیب کی تاریخ	۷۰
کن معانی میں قرآن کا مثیل پیدا کرنا محال ہے	۷۱
قرآن کو ٹھیر ٹھیر کر پڑھنے کی غرض و غایت	۷۲
جمع احادیث کے متعلق عرب کی خوش اعتقادی	۷۳
عرب فرقہ بندی کی وجوہات	۷۴
عرب توہمات اور فرقہ بندی	۷۴-۷۷
عرب کیوں وراثتِ زمین سے محروم کر دیئے گئے	۷۷-۷۹
اتقا کا اصلی مفہوم (اتحاد)	۷۹
عرب نفاق کا اسلامی جماعت پر اثر	۸۰-۸۱
ظلم اور فسق کی قرآنی اصطلاحات	۸۱
پیغمبرانِ جہان کی تبشیر و تنذیر کی نوعیت	۸۱
دین اسلام پر عرب تخیل اور یونانی فلسفے کے	
مضر اثرات۔	۸۲-۸۶
دین اسلام میں ظنیات کا حلول	۸۲-۸۵
علم کی قرآنی تعریف	۸۳-۸۴
بیکن کا مسئلہ استقرا اور تعریف علم	۸۳
علم آخرت کے متعلق قرآنی ارشاد	۸۴
سبع اسباق کی تشریح	۸۵
اہل عرب کی ہلاکت کے بواعث	۸۶
دین اسلام کی غلط اشاعت میں اہل عرب کی ذمہ داری	۸۶
وارثین زمین کی قرآنی تعریف	۸۷

مضامین	صفحہ
علم اور ظن کا قرآنی تقابل	۸۷
صاحب علم قوم کا دنیوی اور اخروی اجر	۸۷
رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ کی تشریح	۸۷
علم کا حاصل کرنا صالح عمل ہے	۸۷
حیوٰۃ دنیا کی تعریف از روئے قرآن	۸۷
کلام الٰہی کے متعلق مفسرین کی غلط بینیاں	۸۸-۹۶
قرآن شعر و فصاحت کا منکر ہے	۸۸
تورات کا مُسْتَبِیْن ہونا	۸۹
قرآن ہدایت اور صرف ہدایت کا مدعی ہے	۸۹
تورات، انجیل اور قرآن کے بارے میں الٰہی ارشادات	۸۹-۹۰
عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ کی تشریح	۹۱
قرآن لغت اور حدیث سے بے نیاز ہے	۹۱
قرآن کے لغت سے بے نیاز ہونے کا مفہوم	۹۱-۹۲
قرآن کن معنوں میں محفوظ ہے	۹۲
حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ کی تشریح	۹۲
قرآن کے مفصل ہونے کے متعلق الٰہی ارشاد	۹۳
علم کا تتبع کرنا سبیل خدا پر چلنے کے مترادف ہے	۹۳
قرآن کی کفایت کے متعلق الٰہی ارشاد	۹۴
قرآن کی فضیلت علم ہے۔	۹۴
قرآن کا معجزات کی فرمائش کو مسترد کرنا اسلام کی عظمت	۹۴-۹۵
سبیل خدا کا مفہوم تحصیل علم ہے	۹۵
عوام کی نظر میں قرآن کی تعلیم و تنظیم کا معیار	۹۶-۹۸
ایک استعارۂ قرآنیہ کی حقیقت کا پہلو	۹۷-۹۸
تکذیب آیات کا ابتدائی مفہوم	۹۸
دین اسلام کی مسخ حقیقت کا تیسرا باعث	۹۹
کتاب کے آئندہ مضامین کی تقسیم	۹۹-۱۰۰
فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا کی تشریح	۱۰۰

۴ تکیفِ ایمان و منتہائے اسلام

از صفحہ ۱۰۱ تا ۱۱۵

مضامین	صفحہ
قرون اولیٰ کے ایمان کا کیف	۱۰۱-۱۱۶

مضامین	صفحہ
خدا کی عینی شہادت کا حصول	۱۰۱
صحیفۂ فطرت کا مشاہدہ اور معرفت خدا	۱۰۲
مشاہدۂ فطرت ایمان ہے	۱۰۳
لرزش قلب کا موجود ہونا ایمان ہے	۱۰۳
ملازمت خدا کی عملی شہادت قرون اولیٰ میں	۱۰۴
تعلقات دنیوی کا انقطاع ایمان ہے	۱۰۴
عبودیت خدا کی شہادت قرون اولیٰ میں	۱۰۵
شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کی تشریح	۱۰۵
عبادۃ کا الٰہی مفہوم	۱۰۵-۱۱۳
قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی استعداد قبول	۱۰۹-۱۱۶
سجود کا قرآنی مفہوم	۱۰۷
رکوع کا قرآنی مفہوم	۱۰۷-۱۰۸
عبادۃ کا قرآنی مفہوم اور قرآن کی اصطلاح	
بے نیازی کی مثال	۱۰۸
بنی اسرائیل کی نوعی عبادۃ کی تشریح	۱۰۹
مختلف مذاہب میں عبادت کے مسخ شدہ طریقے	۱۱۰-۱۱۱
اسلامی عبادات کی اصلیت رفتہ رفتہ مسخ ہو رہی ہے	۱۱۱
اسلام میں تسبیح کا غلط استعمال	۱۱۲
إِيَّاكَ نَعْبُدُ کی تشریح	۱۱۲
مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ کی تشریح	۱۱۳
سچے مومنوں کی قرآنی تعریف	۱۱۴
قولی ایمان از روئے قرآن محض کچھ شے نہیں	۱۱۴
ایمان کے لاینفک لوازمات کے متعلق	
الٰہی ارشاد	۱۱۵
جَنّٰتٌ اور الْجَنَّةُ یعنی جنت کا الٰہی مفہوم	۱۰۵-۱۱۶
قرون اولیٰ کے ایمان کا صحیح نصب العین	۱۱۶-۱۲۲
ایمان کا شدت حب سے ترادف	۱۱۷
ایمان اور ترک ماسوا	۱۱۷
صادق اور صدق کی تشریح۔	۱۱۷
عبادت اطاعت احکام الٰہی ہی ہے۔	۱۱۸
وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ	

مضامین	صفحہ
کی تشریح	۱۱۸
شرک کی ابتدائی شرح	۱۱۹
لفظ حق کی ابتدائی تشریح	۱۱۹
مَغْفِرَة کا صحیح مفہوم	۱۱۹
شرک کن معنوں میں ناقابل عفو گناہ ہے	۱۱۹
الْجَنَّة کے حصول کے متعلق قرآنی ارشاد	۱۲۰
تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ کا صحیح مفہوم	۱۲۰-۱۲۲
غزوۂ احد کا ذکر	۱۲۱
مُؤْمِنِين، شُهَدَآء، ظَالِم اور کافر کی تشریح	۱۲۱
قربانی جان و مال کے الٰہی ارشاد کی لم	۱۲۲-۱۲۵
إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کا صحیح مفہوم	۱۲۳-۱۲۴
مُصِيبَة کا قرآنی مفہوم	۱۲۳-۱۲۶
مُصِيبَة اعمال بد کی سزا ہے	۱۲۴-۱۲۶
تشریح سَيِّئَة اور حَسَنَة	۱۲۹-۱۳۲
كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ اور مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ	
اور عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ کا مفہوم	۱۲۸
حُسنِ عمل کا الٰہی مفہوم	۱۳۰
الْحُسْنٰى کا بلند معیار از روئے قرآن	۱۳۱
كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ کا صحیح مفہوم	۱۳۱
صَلَوٰت کے مفہوم کی تشریح	۱۳۲
نبی کریم پر درود بھیجنے کا صحیح مفہوم	۱۳۲
منافقین عرب پر درود بھیجنے کا الٰہی مفہوم	۱۳۳
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ کے مطالب	۱۳۴
نماز کے التحیات کے مطالب	۱۳۴
الْخَيْرٰت کی قرآنی اصطلاح کا صحیح مفہوم	۱۳۴-۱۳۶
قَرْضًا حَسَنًا کا الٰہی مفہوم	۱۳۷-۱۳۸
شُکر کے صحیح معانی	۱۳۸
کیا زکوٰۃ صرف ایک مذہبی رسم تھی؟	۱۳۹-۱۴۰
ایمان کی اہم قرآنی شرائط	۱۴۰
ایمان کی تخصیص کسی مذہب سے نہیں	۱۴۰
قربانی مال و جان کی الٰہی غرض	۱۴۱-۱۴۲

مضامین	صفحہ
اتقا کے الٰہی مفہوم کی اہم شق استقلال درکار ہے	۱۴۲
ایمان کامل کا نتیجہ زمین میں تمکن ہے	۱۴۳
الْقَوْلُ الثَّابِتُ کا صحیح مفہوم	۱۴۳-۱۴۴
يُثَبِّتُ اللّٰهُ کا قرآنی مفہوم	۱۴۴
کیفیت اتقا	۱۴۵-۱۶۳
اتقا کا الٰہی مفہوم اتحاد امت اور اعتصام	
بِحَبْلِ اللّٰهِ ہے۔	۱۴۵
اعتصام بحبل اللّٰہ کے معانی	۱۴۶
أَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ کا صحیح مفہوم	۱۴۶
الْمَعْرُوف اور الْمُنْكَر کی قرآنی اصطلاحات	
کی تشریح۔	۱۴۶-۱۵۱
قرآنی اصطلاحات کی شرح میں لغت کا بسا اوقات	
گمراہ کن ہونا۔	۱۵۱
اتقا کا نتیجہ از روئے قرآن دنیاوی احیا	
اور تمکن ہے۔	۱۵۲-۱۵۳
يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا کی تشریح	۱۵۲
فَضْل کے قرآنی معانی	۱۵۲
کفر اور اتقا کا مقابلہ از روئے قرآن	۱۵۳
تقوے کا غلط مروج مفہوم	۱۵۴-۱۵۵
اتقا کے تشریح شدہ مطالب کی فہرست	۱۵۴
متقی قوم کی دنیا اور آخرت دونوں از روئے	
قرآن درست ہیں۔	۱۵۵-۱۵۶
وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ کی تشریح اور اس کا	
غلط مروج مفہوم	۱۵۶-۱۵۷
پیر پرستی کے خلاف قرآنی شہادت	۱۵۶-۱۵۷
متقی قوم کی دنیاوی حالت کیونکر درست ہے	۱۵۸
أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ کی تشریح اور کون اشخاص اس	
خطاب کے مصداق ہیں۔	۱۵۸
متقی قوم کے لیے روئے زمین کی بادشاہت	
وقف ہے۔	۱۵۹
تقویٰ اور توحید کا عملی مفہوم قرون اولیٰ میں	۱۶۰-۱۶۳

مضامین	صفحہ
مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ کی تشریح	۱۶۱
دِیْن کے معانی	۱۶۱
لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا صحیح مفہوم۔	۱۶۱
اتقا کا نتیجہ پیش بندی اور حفظ نفس ہے	۱۶۲
مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ کا صحیح مفہوم۔	۱۶۲
اتقائے خدا کا نتیجہ دشمن کو مرعوب اور مغلوب کرنا ہے۔	۱۶۳
کافر قوم کی خصوصیات۔	۱۶۳
صاحب ایمان قوم کا دشمن پر غالب رہنا اٹل ہے۔	۱۶۳-۱۶۶
کفر اور ایمان کے انتہائی درجے	۱۶۴
دنیاوی تمکن کا ایمان والوں کی شان حال ہونا اٹل ہے	۱۶۵
مظفر و منصور ہونا صرف پیغمبر ہی سے مخصوص نہیں	۱۶۵
صاحب ایمان قوم پر ملائکہ کا نزول	۱۶۵
ایمان اور تقوا آپس میں توام ہیں	۱۶۶
ایمان کی طاقت قرون اولیٰ میں اور ایمان والوں کا دنیاوی تمکن اور عروج۔	۱۶۶-۱۶۸
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے مفہوم کی پہلی شق	۱۶۸
سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ کا صحیح مطلب۔	۱۶۸
اطاعت رسول	۱۶۹-۱۷۲
اطاعت رسول کی کیفیت قرون اولیٰ میں اور تحویل قبلہ کا حکم۔	۱۶۹
اطاعت رسول از روئے قرآن ایمان کی ایک اہم شق تھی۔	۱۷۰
اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ کا صحیح مفہوم قرون اولیٰ میں اور اسکا اطلاق زمانہ حال میں۔	۱۷۰-۱۷۱
رسول خدا کی وفات کے بعد اطاعت رسول کا مفہوم	۱۷۱
امت اسلام کیلئے ایک امیر کی ضرورت۔	۱۷۱
اطاعت خدا اور اطاعت رسول کا تراوف قرون اولیٰ میں	۱۷۱

مضامین	صفحہ
ظلم کی قرآنی اصطلاح بمعنی عصیان امیر	۱۷۲
اتقائے خدا اور اطاعت امیر	۱۷۲
صحیح توحید کا نتیجہ استحکام جماعت ہے۔	۱۷۳
قربانی مال و جان اور اطاعت امیر کی غرض و غایت تقویت قوم تھی۔	۱۷۳
تقویت قوم کو وحی کا منتہائے نظر تھا	۱۷۴-۱۷۵
انسان کیلئے وحی کی ضرورت۔	۱۷۴
کتاب وحی کا مآل حفظ نفس کے اصول پیش کرنا تھا۔	۱۷۵-۱۷۶
قرآن کے نازل ہونے کا مآل امت کو حفظ نفس کے اصول سکھلانا ہے۔	۱۷۶
ظلمت جہل سے نور علم کیطرف نکالنا ہی	۱۷۶
اَلظُّلُمٰتِ اور النُّوْرِ کی تشریح۔	۱۷۶
اتقا اور تسلیم خدا کا مآل امت کو دنیا میں بے خوف و خطر کر دینا ہے۔	۱۷۷
اِسْلَام اور اِحْسَان کی قرآنی مصطلحات کی توضیح۔	۱۷۷
اسلام کے سب اوامر و نواہی کا منتہا سیاسی اور اجتماعی غلبہ تھا	۱۷۸-۱۸۲
حفظ نفس از روئے قرآن نعمت خدا ہے۔	۱۷۸
اتحاد، اطاعت اور اتقا لازمہ ایمان ہیں	۱۷۹
اَعْلَوْنَ بننا رضائے خدا کی علامت ہے	۱۷۹
تاسیس بیت المال کی حکمت۔	۱۸۰
ایثار مال کا مصدق ایمان محرک عشق اور مطہر قلب ہونا۔	۱۸۰-۱۸۱
ایثار مال کے انسان کی اجتماعی بہتری کے لیئے ہونے کی قرآنی شہادت۔	۱۸۱
رسول خدا کے مبعوث ہونے کی واحد غرض و غایت۔	۱۸۲
جنّت کی قرآنی اصطلاح کا اخروی جنت اور دنیاوی بادشاہت دونوں پر اطلاق۔	۱۸۲

مضامین	صفحہ
ایمان کے لازمات کی فہرست۔	۱۸۲-۱۸۳
ایمان کی ساٹھ شاخیں۔	۱۸۳
اَلْهُدٰى اور دِيْنِ الْحَقِّ کی تشریح۔	۱۸۳
شاہ محمد تغلق کے سکوں پر کتبے۔	۱۸۳
اسلام کا منتہائے حید از روئے قرآن دنیا میں غالب بنکر رہنا ہے۔	۱۸۴-۱۸۵
سیاسی تمکن کے منتہائے وحید ہونے کی قرآنی شہادتیں	۱۸۴
رؤیا کی حقیقت۔	۱۸۴
غلبہ اسلام و اتحاد عالم	۱۸۵-۱۹۰
اسلام کے سیاسی تمکن اور غلبے میں بنی نوع انسان کا اتحاد مضمر تھا۔	۱۸۵-۱۸۶
دین اسلام کی دعوت اتحاد کی پہلی مشترک اساس توحید ہے۔	۱۸۶-۱۸۷
تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ کی تشریح۔	۱۸۶
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی توضیح۔	۱۸۶
عِبَادَة کا صحیح مفہوم توحید کا اصلی مفہوم ہے	۱۸۶
دوسری مشترک اساس سب انبیاء کو بلا تفریق منجانب اللہ ماننا ہے۔	۱۸۷-۱۸۸
ایمان صرف عمل کا نام ہے زبان کی اس سے کچھ تعلق نہیں	۱۸۷
تیسری مشترک اساس آپس میں فرقہ بند نہ بننا ہے۔	۱۸۸-۱۹۳
كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً کا صحیح مفہوم۔	۱۸۸-۱۸۹
بنی نوع انسان کی وحدت نسل۔	۱۸۹
مقتضائے طبیعت اتحاد ہے۔	۱۸۹
غیر انسانی انواع کے افراد کا آپس میں اتحاد مقتضائے طبیعت	۱۸۹
انبیائے کرام اندرونے قرآن ایک ہی پیغام کے حامل تھے	۱۹۰
خدائے عزوجل کا مقصود بنی نوع انسان کو متحد کرنا ہے	۱۹۰
مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً کا صحیح مفہوم	۱۹۱
اَلْاِسْلَام کی قرآنی اصطلاح کی حقیقت	۱۹۱
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً کا صحیح مفہوم	۱۹۲

مضامین	صفحہ
مشیت خدا اور منشائے خدا میں فرق	۱۹۳
تفرقے کا باعث خود انسان ہو خدا نہیں	۱۹۳
وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً کی تشریح	۱۹۴
وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ کی تشریح	۱۹۵-۱۹۶
تمکن اسلام و نقش توحید	۱۹۶-۲۰۲
توحید کا اعلیٰ منظر اور دعوت اتحاد	۱۹۶-۱۹۷
توحید کی قوت اور نافعیت	۱۹۷-۱۹۸
الاسلام کی حنیفت	۱۹۷
توحید کی نافعیت کی تشریح	۱۹۸
توحید کا پیدا کیا ہوا اخلاق	۱۹۸-۲۰۲
القائے خدا کا پیدا کیا ہوا ایفائے عہد	۱۹۸
ایفائے عہد کی اسلام میں اہمیت	۱۹۸-۱۹۹
قرآن حکیم کے احکام کی گرانقدر حکمت اور آیہ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ کی تشریح	۱۹۹-۲۰۰
توحید کا پیدا کیا ہوا عجز و انکسار قرون اولیٰ میں۔	۲۰۰-۲۰۱
إِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا کی ایک مستحسن تشریح	۲۰۰-۲۰۱
علو اخلاق اور شجاعت خدا ترسی قرون اولیٰ میں۔	۲۰۲
القائے خدا کے حق منظر کی ایک نمونہ صدی ہجری کی مثال	۲۰۲
۵۔ حکمت عبادات	۲۰۳-۲۴۰
نقش توحید علو اخلاق اور القائے خدا کا تبلیغی اثر صدر اسلام میں۔	۲۰۳
دین اسلام کی اولیٰ اور عملی حیثیتیں	۲۰۳-۲۰۴
دین اسلام کے عالمگیر جماعت پیدا کرنے والی قوت اور تمکن پیدا کرنے کے وسائل	۲۰۴

مضامین	صفحہ
اسلام کا ہر امر اپنی قوت پیدا کرنے اور بنی نوع انسان کو اپنے میں جذب کر لینے کا جادو ہے۔	۲۰۵
حکمت الصلوٰۃ	۲۰۵-۲۴۰
الصلوٰۃ کی ماہیت	۲۰۵
الصلوٰۃ سے مقصود خارجی نظم و نسق پیدا کرنا ہی ہے۔	۲۰۶
الصلوٰۃ اور اطاعت امیر	۲۰۶
الصلوٰۃ اور مساوات	۲۰۶
الصلوٰۃ اور انہاء عن الفحشاء والمنکر	۲۰۶
الصلوٰۃ اور اطاعت امام کی غرض و غایت	۲۰۶
مساجد خدا کے اندر موجودہ بد نظمی	۲۰۶
الفحشاء کا اصلی مفہوم	۲۰۶-۲۰۹
نماز میں خدا کے حضور میں نمازی کی عاجزانہ گزارش	۲۰۷-۲۱۰
الفحشاء کے مفہوم کی پانچ شقیں	۲۰۹
اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کا صحیح مفہوم	۲۱۰-۲۲۴
الهُدیٰ اور دین الحق کے الفاظ کی الصراط المستقیم سے مناسبت	۲۱۰
نعمت کا اصلی مفہوم اندروئے قرآن اور اس کی صحیح تشریح۔	۲۱۰-۲۲۳
المغضوب علیہم اور الضالین کا غلط مروج مفہوم	۲۱۰
الصراط اور أنعمت علیہم کا مروج مفہوم بال سے باریک اور تلوار سے تیز راہ کا فلسفیانہ مفہوم	۲۱۰-۲۱۱
صراط مستقیم پر چلنے کا مفہوم قطعاً اعتدال پر رہنا ہے	۲۱۱
نعمت کا مفہوم اندروئے قرآن سراسر دنیاوی ہے	۲۱۲

مضامین	صفحہ
نعمت کا لفظ دنیاوی نعمتوں کے معنوں میں	۲۱۲-۲۱۳
نعمت کا لفظ انسانی نا قدر شناسی کے بیان کے ضمن میں	۲۱۳-۲۱۴
نعمت کا لفظ تذکیر آلاء اللہ کے ضمن میں۔	۲۱۴-۲۱۵
نعمت کا لفظ بنی اسرائیل سے خطاب کے ضمن میں۔	۲۱۵-۲۱۶
نعمت کا لفظ قرون اولیٰ کے مسلمانوں سے خطاب کے ضمن میں	۲۱۶-۲۱۸
نعمت کا لفظ توفیق عمل کے معنوں میں	۲۱۹-۲۲۰
انبیائے کرام کے بارے میں أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ کے الفاظ کا صحیح مفہوم	۲۲۱-۲۲۲
نعمت کے اصلی مفہوم کی فہرست	۲۲۲
المغضوب علیہم کی تشریح	۲۲۳
الضالین کی شرح اور ضلال کا صحیح مفہوم	۲۲۳
صراط مستقیم	۲۲۴-۲۴۶
صراط مستقیم کی دعا میں حصول نعمت کے لئے اضطراب	۲۲۳-۲۲۴
صراط مستقیم کے الفاظ میں اختصار راہ کا مفہوم	۲۲۴
صراط مستقیم اور خط مستقیم میں مماثلت	۲۲۴-۲۲۵
وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا کا صحیح مفہوم	۲۲۵
اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی دعا اجتماعی دعا ہے انفرادی نہیں	۲۲۵
نماز کے اندر متکلم کی واحد اور جمع کی ضمیریں	۲۲۵
صراط مستقیم کا اصلی مفہوم اندروئے قرآن۔	۲۲۶-۲۴۶
صراط مستقیم کے مفہوم کی پہلی شق اتحاد ہے	۲۲۶

مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ
صراط مستقیم کے مفہوم کی گذشتہ شقوں کی فہرست	۲۲۶	صراط مستقیم حفظ نفس اور ابقا اتحاد اور توحید		مساجد ضرار کی ویرانی اور نماز گذاروں کا کبر و غرور	۲۵۱
قرآنی رکوع سے ہر موقع پر پہلے مضمون کا انقطاع ضروری نہیں ہوتا	۲۲۶	اتقاء اور اطاعت امیر کے مترادف ہے۔	۲۳۵	مساجد کی نفاق آرائی اور نماز گذاروں کا اخلاقی انحطاط	۲۵۲-۲۵۱
سعی و عمل میں استقلال اور نتائج کے بارے		دار السلام کے صحیح معانی	۲۳۵	الصلوٰۃ کا صحیح منتہائے نظر وسعت قلب و سماحت	
میں توکل صراط مستقیم ہے۔	۲۲۷	تمسک قانون خدا صراط مستقیم ہے۔	۲۳۶	پیدا کرنا ہے۔	۲۵۲
ایمان کے لوازم پر عمل صراط مستقیم ہے۔	۲۲۷	خوف عذاب آخرت اور بیم روز جزا صراط مستقیم ہے	۲۳۶	الصلوٰۃ تنگ دلی، بخل اور نفاق کی قاطع ہے	۲۵۲
اُمت کی تقویت کیلئے ایثار مال صراط مستقیم ہے	۲۲۷	صراط مستقیم پر چلنے کا واحد نتیجہ دنیوی تعزز		منافقین کی الٰہی تعریف۔	۲۵۳
"الکتاب" کا الٰہی مفہوم۔	۲۲۷	اور نعمت خدا کا حصول ہے۔	۲۳۷-۲۳۶	الصلوٰۃ کا پیش نظر اتحاد اور اصلاح بین الناس ہی ہے	۲۵۳
کتاب خدا کی نور سے تشبیہ۔	۲۲۷	سعی و عمل کیلئے شرح صدر کر دینا صراط مستقیم ہے	۲۳۸	الصلوٰۃ کا نسیان مسلمانوں اور مساجد کو تفریق سے	
کتاب خدا کے مقاصد بارے میں اختلاف نہ پیدا		صراط مستقیم کے الٰہی مفہوم سے مسلمانان عالم کی محض		باز نہ رکھنے کی الٰہی حکمت۔	۲۵۴-۲۵۳
کرنا اور عبادت شیطان کرنا صراط مستقیم ہے	۲۲۸	بے خبری۔	۲۳۹-۲۳۸	مسجد ضرار کا ذکر اور "الظالمین" کا الٰہی مفہوم۔	۲۵۶-۲۵۵
مناسک اور ظواہر مذاہب کو پیش نظر رکھکر		مکارم اخلاق پر قائم ہو جانا صراط مستقیم ہے۔	۲۴۰	"اتقا" بمعنی اتحاد، "ظلم" بمعنی تفرقہ اور ظلم کے الٰہی معانی کی تعیین	۲۵۶
باہمی نزاع پیدا کرنا صراط مستقیم کے نقیض ہے	۲۲۸	صراط مستقیم پر چلنے کی سیاسی اغراض و غایات	۲۴۱	عصر حاضر کی اکثر مسجدیں صحیح معنوں میں مساجد ضرار ہیں۔	۲۵۶
آیہ لکل امۃ جعلنا منسکا الخ کے صحیح مفہوم کی تشریح	۲۳۴-۲۲۸	خدا کی راہ میں پیہم سعی و عمل کرتے رہنا ہی صراط مستقیم ہے	۲۴۲	"المتقین" کا صحیح الٰہی مفہوم اور مبنی بر عمارت مسلمانوں کا تحفظ	۲۵۷
تمام امت کا صورتاً اور عملاً ایک مرکز پر جمع		دنیا میں غالب کے رہنے کی حکمت پر کاربند ہو جانا صراط مستقیم ہے	۲۴۲	امامت کا جلیل القدر منصب اور تقرری کی شرائط	
ہونا صراط مستقیم ہے۔	۲۲۹	"محسنین" کی صحیح تعریف۔	۲۴۲	اور مسلمانوں کا اسکے صحیح منشا سے متعلق نسیان محض	۲۶۱-۲۵۸
آیہ سیقول السفہاء الخ کے صحیح معانی کی تبیین	۲۲۹	جہاد بالسیف، ہجرت وطن اور اطاعت امیر صراط مستقیم ہے	۲۴۳	آیہ اذ ابتلیٰ ابراہیم ربہ بکلمٰت الخ کا صحیح مفہوم	
"منسک" کے معانی۔	۲۲۹-۲۲۸	"من الذین انعم اللہ علیہم" کے معانی کی تبیین۔	۲۴۵-۲۴۳	اور مشاہیر قرآن کی حیرت انگیز غلط بیانی۔	۲۶۱-۲۵۸
"مناسک" اور "عبادۃ" میں فرق۔	۲۲۹	"النبیین" اور "الصدیقین" اور "الشہداء" اور "الصالحین"		**منتہائے الصلوٰۃ**	۲۷۱-۲۶۱
ابراہیم کی توحید پر عامل ہونا صراط مستقیم ہے	۲۳۲-۲۳۰	کی ہیئت کا صحیح مفہوم اور ان کے مقام حاصل کرنے کیلئے عمل کی خصوصی ہے۔	۲۴۴	الصلوٰۃ سے جماعت کا باہمی اتحاد، اطاعت امیر	
"ذکر خدا" کا صحیح مفہوم۔	۲۳۲-۲۳۰	اولوالامر کی اطاعت کی اہمیت۔	۲۴۴	مساوات، پابندی وقت وغیرہ وغیرہ مدنظر تھا۔	۲۶۲-۲۶۱
الصلوٰۃ کا صحیح منتہائے نظر ذکر خدا ہے۔	۲۳۰	رسُل کے بھیجنے کی واحد غرض و غایت ان کی اطاعت ہی تھی	۲۴۴	صراط مستقیم کے الٰہی مفہوم کی مکمل فہرست۔	۲۶۲-۲۶۱
الصلوٰۃ کے بتعہد وقت ادا کرنے کی حکمت۔	۲۳۰	قرآن کے "الصراط المستقیم" کا صحیح اور واحد مفہوم	۲۴۶-۲۴۴	سچے مومن بننے کی شرائط اور اقامت الصلوٰۃ کا صحیح مفہوم	۲۶۴-۲۶۳
"مسلم" بننے کا صحیح مفہوم۔	۲۳۰	"الصراط المستقیم" کے الفاظ کا قرآن میں ورود	۲۴۵	ایمان اور اقامت الصلوٰۃ کا لازم و ملزوم ہونا۔	۲۶۳
"نسک" کے الٰہی مفہوم کی تشریح	۲۳۱	موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے "الصراط المستقیم" پر چلنے کی توضیح	۲۴۵	الصلوٰۃ کا میثاق یہود بنی اسرائیل سے اور اقامت	
"فلا ینازعنک فی الامر" کا الٰہی مفہوم	۲۳۲	مومنین اور محسنین کے بلند مقام حاصل کرنے کی شرائط	۲۴۶	الصلوٰۃ کی قرآنی شرائط۔	۲۶۵-۲۶۴
خاطر زمین و آسمان کے مشرق اور مغرب کی کچھ تخصیص نہیں	۲۳۲	خوف و رجا کا دلوں کے اندر موجود ہونا ہی اس کا محرک ہے	۲۴۸-۲۴۶	"جنٰت یتساءلون عن المجرمین" کا دنیاوی مفہوم اور	
اقوام عالم کے بالمقابل برگزیدہ اور برتر ہو کر رہنا		"ایاک نعبد" کے صحیح معانی۔	۲۴۷	متقی کے میثاق سے اسکا تقابل۔	۲۶۶-۲۶۵
صراط مستقیم ہے۔	۲۳۳	الصلوٰۃ کی اہمیت اور اسکے نصب العین کا مسلمانان		"کمال" کے قرآنی معانی کی مزید تشریح۔	۲۶۶
زمین خدا پر عدل و انصاف سے حکومت کرنا صراط مستقیم ہے	۲۳۳	عالم کے دلوں سے محو ہو جانا۔	۲۵۰-۲۴۸	الصلوٰۃ کے صورتاً بگڑ جانے کے دلائل۔	۲۶۷-۲۶۶
سُبُل السلام پر چلتے رہنا صراط مستقیم ہے۔	۲۳۴	مغرب کی شہنشہی تعلیم و تبلیغ کا مسلمانوں کی حیات		"سبعاً من المثانی" کی وحی کے بارے میں خدا کا احسان جتلانا اور اسکی اہمیت۔	۲۶۸
الظلمٰت اور النور کے الٰہی مفہوم کی بنیادی تشریح	۲۳۴	پر مہلک اثر۔	۲۵۰-۲۴۹	سورہ فاتحہ کن معنوں میں تمام قرآن کا ملخص ہے۔	۲۶۹-۲۶۸
دار السلام کیطرف پہنچنے کی سعی کرنا صراط مستقیم ہے	۲۳۵	دین خدا کو لہو و لعب سمجھنے کے نتائج۔	۲۵۱-۲۵۰	قرآن کا منشا نوع انسان کو الظلمٰت سے النور کی طرف نکالنا ہے اور ان الفاظ کے صحیح مطالب	۲۷۰-۲۶۹

فہرست آیاتِ تذکرہ

(جلد دوم)

اس فہرست میں صرف اُن آیات قرآنی کا حوالہ دیا گیا ہے جن کے الفاظ مع مطالب متن کتاب یا حواشی میں آئے ہیں۔ جہاں صرف آیت کا شمار لکھ کر حوالہ دیا گیا اُن کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

شمارہ	شمارہ آیت مع سورۃ	صفحہ کتاب
	۱-الفاتحۃ (۷)	
۱	(۱:۱)	۲۴۷
۲	(۲:۱)	۲۴۶
۳	(۳:۱)	۹۱، ۲۴۷
۴	(۴:۱)	۱۲، ۲۴۷
۵	(۵:۱)	۱۶۹، ۲۲۰، ۲۲۴
۶	(۶:۱)	۲۲۰، ۲۲۴
۷	(۷:۱)	۲۲۰، ۲۳۶
۲۹۳	۲-البقرۃ (۲۸۶)	
۸	(۲۳:۲)	۶۵
۹	(۲۶:۲)	۷۸
۱۰	(۳۰:۲)	۱۶۹
۱۱	(۴۰:۲)	۲۱۶
۱۲	(۴۳:۲)	۱۰۸
۱۳	(۴۵:۲)	۱۱۱، ۲۴۹، ۲۹۱
۱۴		۲۶۶، ۲۹۸
۱۵	(۴۷:۲)	۲۱۶
۱۶	(۵۴:۲)	۷۸
۱۷	(۵۵:۲)	۷۸
۱۸	(۵۷:۲)	۷۹
۱۹	(۶۱:۲)	۲۶۸، ۲۲۳
۲۰	(۱۱۲:۲)	۱۷۷
۲۱	(۱۲۲:۲)	۲۱۹
۲۲	(۱۲۳:۲)	۲۵۸
۲۳	(۱۲۹:۲)	۵۴
۲۴	(۱۳۶:۲)	۱۸۵، ۱۸۷
۲۵	(۱۳۷:۲)	۱۸۷
۲۶	(۱۳۸:۲)	۱۸۷
۲۷	(۱۴۲:۲)	۲۲۹
۲۸	(۱۴۳:۲)	۱۰۵، ۱۷۰
۲۹	(۱۴۴:۲)	۱۳۹
۳۰	(۱۴۵:۲)	۱۳۹
۳۱	(۱۴۸:۲)	۱۳۷
۳۲	(۱۵۰:۲)	۲۱۸
۳۳	(۱۵۱:۲)	۵۴
۳۴	(۱۵۲:۲)	۲۴۸
۳۵	(۱۵۳:۲)	۲۴۸
۳۶	(۱۵۴:۲)	۱۳۹
۳۷	(۱۵۵:۲)	۱۲۳
۳۸	(۱۵۶:۲)	۱۲۳
۳۹	(۱۵۷:۲)	۱۲۳
۴۰	(۱۶۵:۲)	۱۱۷، ۱۱۹
۴۱	(۱۹۸:۲)	۲۰۷
۴۲	(۱۹۹:۲)	۲۰۷
۴۳	(۱۸۹:۲)	۲۴۸
۴۴	(۱۹۸:۲)	۲۳۰
۴۵	(۲۰۰:۲)	۲۳۰
۴۶	(۲۱۱:۲)	۲۱۵
۴۷	(۲۱۳:۲)	۱۸۸، ۲۲۸
۴۸	(۲۲۸:۲)	۱۴۸
۴۹	(۲۲۹:۲)	۱۴۸، ۱۷۵
۵۰	(۲۳۱:۲)	۱۴۸، ۲۱۷
۵۱	(۲۳۲:۲)	۱۴۸
۵۲	(۲۳۳:۲)	۱۴۸
۵۳	(۲۳۴:۲)	۱۴۸
۵۴	(۲۳۶:۲)	۱۴۸
۵۵	(۲۴۱:۲)	۱۴۹
۵۶	(۲۶۷:۲)	۲۰۷
۵۷	(۲۶۸:۲)	۲۰۷
۵۸	(۲۷۳:۲)	۱۲۸، ۲۰۱
۳۹۲	۳-آلِ عمران (۱۹۹)	
۵۹	(۳:۳)	۸۹
۶۰	(۱۳:۳)	۸۷
۶۱	(۱۸:۳)	۱۹۱، ۲۰۳
۶۲	(۱۹:۳)	۱۹۱
۶۳	(۴۱:۳)	۲۲۲
۶۴	(۴۲:۳)	۱۰۸
۶۵	(۵۳:۳)	۵۲
۶۶	(۹۳:۳)	۱۸۷
۶۷	(۷۵:۳)	۱۹۸
۶۸	(۸۳:۳)	۱۸۵، ۱۸۸، ۱۹۷
۶۹	(۸۴:۳)	۱۹۷
۷۰	(۹۶:۳)	۱۷۳
۷۱	(۱۰۰:۳)	۲۲۶
۷۲	(۱۰۱:۳)	۲۲۹، ۱۴۵
۷۳	(۱۰۲:۳)	۱۴۵، ۲۱۷، ۲۲۶، ۲۵۲
۷۴	(۱۰۳:۳)	۱۴۵، ۱۵۱، ۲۲۶،
۷۵	(۱۰۴:۳)	۱۴۵
۷۶	(۱۱۱:۳)	۲۲۳
۷۷	(۱۱۲:۳)	۱۰۷
۷۸	(۱۱۳:۳)	۱۳۷
۷۹	(۱۱۴:۳)	۱۳۶
۸۰	(۱۱۹:۳)	۱۲۷
۸۱	(۱۳۷:۳)	۸۹
۸۲	(۱۳۸:۳)	۱۰۷، ۱۱۶، ۱۲۱، ۱۵۴، ۱۶۹
۸۳	(۱۳۹:۳)	۱۲۰
۸۴	(۱۴۰:۳)	۱۴۲، ۱۲۰
۸۵	(۱۴۱:۳)	۱۲۰
۸۶	(۱۴۲:۳)	۱۲۰
۸۷	(۱۵۳:۳)	۱۴۲
۸۸	(۱۶۳:۳)	۵۴
۸۹	(۱۶۴:۳)	۱۲۴
۹۰	(۱۶۵:۳)	۱۲۴
۹۱	(۱۶۶:۳)	۱۲۴
۹۲	(۱۶۸:۳)	۱۲۶
۹۳	(۱۷۰:۳)	۲۱۶
۹۴	(۱۷۳:۳)	۲۱۶
۹۵	(۱۸۰:۳)	۱۳۹
۹۶	(۱۹۴:۳)	۱۲۲
۹۷	(۱۹۵:۳)	۱۵۳
۹۸	(۱۹۶:۳)	۱۵۳
۹۹	(۱۹۷:۳)	۱۵۳
۱۰۰	(۱۹۹:۳)	۱۴۲، ۱۴۵، ۱۵۰
۶۶۹	۴-النساء (۱۷۷)	

شمارہ	شمارہ آیت مع سورہ	صفحہ کتاب
۱۰۱	(۵:۴)	۱۴۹
۱۰۲	(۶:۴)	۱۴۹
۱۰۳	(۱۱:۴)	۱۸۹
۱۰۴	(۱۵:۴)	
۱۰۵	(۱۶:۴)	۱۸۹
۱۰۶	(۱۷:۴)	۱۸۹
۱۰۷	(۱۹:۴)	۱۴۹
۱۰۸	(۲۳:۴)	۱۸۹
۱۰۹	(۲۵:۴)	۱۴۹
۱۱۰	(۲۹:۴)	۱۸۹
۱۱۱	(۳۰:۴)	۱۸۹
۱۱۲	(۳۲:۴)	۱۸۹
۱۱۳	(۳۳:۴)	۱۸۹
۱۱۴	(۳۴:۴)	۱۸۹
۱۱۵	(۳۵:۴)	۱۸۹
۱۱۶	(۳۶:۴)	۱۸۹
۱۱۷	(۴۸:۴)	۱۲۰
۱۱۸	(۵۸:۴)	۲۴۱
۱۱۹	(۵۹:۴)	۱۷۹، ۲۴۴
۱۲۰	(۶۲:۴)	۱۲۵
۱۲۱	(۶۴:۴)	۲۴۵
۱۲۲	(۶۶:۴)	۲۴۳
۱۲۳	(۶۷:۴)	۲۴۳
۱۲۴	(۶۸:۴)	۲۴۳
۱۲۵	(۶۹:۴)	۲۴۳، ۲۲۰
۱۲۶	(۷۰:۴)	۲۴۳
۱۲۷	(۷۲:۴)	۱۲۵
۱۲۸	(۷۹:۴)	۱۲۳، ۱۲۷
۱۲۹	(۸۰:۴)	۱۷۱
۱۳۰	(۸۲:۴)	۵۸
۱۳۱	(۱۰۳:۴)	۱۸۹، ۲۳۰
۱۳۲	(۱۰۴:۴)	۱۶۴
۱۳۳	(۱۱۳:۴)	۵۴
۱۳۴	(۱۱۴:۴)	۱۴۹
۱۳۵	(۱۱۶:۴)	۱۱۹
۱۳۶	(۱۳۵:۴)	۲۰۲، ۲۵۷
۱۳۷	(۱۴۲:۴)	۲۵۳
۱۳۸	(۱۴۳:۴)	۲۵۳
۱۳۹	(۱۴۵:۴)	۲۵۳
۱۴۰	(۱۷۶:۴)	۲۴۴
۷۷۹	۵-المائدۃ (۱۲۰)	
۱۴۱	(۳:۵)	۲۱، ۷۷، ۵۶

شمارہ	شمارہ آیت مع سورہ	صفحہ کتاب
۱۴۲	(۶:۵)	۲۱۷
۱۴۳	(۷:۵)	۲۱۸
۱۴۴	(۸:۵)	۲۰۲
۱۴۵	(۱۱:۵)	۱۷۸، ۲۱۶
۱۴۶	(۱۲:۵)	۲۶۴
۱۴۷	(۱۳:۵)	۲۶۶
۱۴۸	(۱۵:۵)	۱۷۶، ۲۳۵، ۲۷۰
۱۴۹	(۱۶:۵)	۲۳۵، ۲۷۰، ۱۷۲
۱۵۰	(۲۰:۵)	۲۱۵
۱۵۱	(۲۲:۵)	۲۱۹
۱۵۲	(۲۳:۵)	۲۱۹
۱۵۳	(۳۵:۵)	۱۵۶
۱۵۴	(۴۴:۵)	۸۹، ۹۶
۱۵۵	(۴۵:۵)	۹۶
۱۵۶	(۴۶:۵)	۸۹
۱۵۷	(۴۷:۵)	۹۶
۱۵۸	(۴۸:۵)	۱۳۵، ۱۹۳
۱۵۹	(۵۰:۵)	۹۲
۱۶۰	(۵۵:۵)	۱۰۷
۱۶۱	(۵۶:۵)	۱۵۰، ۱۵۳، ۱۷۹
۱۶۲	(۵۷:۵)	۲۵۰
۱۶۳	(۵۸:۵)	۲۵۰
۱۶۴	(۱۰۶:۵)	۱۲۶
۱۶۵	(۱۰۹:۵)	۲۲۱
۱۶۶	(۱۱۰:۵)	۲۲۱
۱۶۷	(۱۱۲:۵)	۱۷۹
۹۵۵	۶-الانعام (۱۶۶)	
۱۶۸	(۴۴:۶)	۲۵۴
۱۶۹	(۴۵:۶)	۲۵۴
۱۷۰	(۴۷:۶)	۸۱، ۲۵۶
۱۷۱	(۴۸:۶)	۸۱
۱۷۲	(۸۷:۶)	۲۳۴
۱۷۳	(۸۸:۶)	۲۳۴
۱۷۴	(۹۲:۶)	۸۹
۱۷۵	(۹۹:۶)	۱۵
۱۷۶	(۱۰۰:۶)	۱۰۳، ۱۱۵
۱۷۷	(۱۱۵:۶)	۸۹، ۹۲، ۹۳
۱۷۸	(۱۱۶:۶)	۴۰، ۹۲، ۹۳، ۱۵۱
۱۷۹	(۱۱۷:۶)	۹۳
۱۸۰	(۱۱۸:۶)	۹۳
۱۸۱	(۱۲۶:۶)	۲۳۸
۱۸۲	(۱۳۷:۶)	۲۳۸

شمارہ	شمارہ آیت مع سورہ	صفحہ کتاب
۱۸۳	(۱۲۸:۶)	۲۳۸
۱۸۴	(۱۳۴:۶)	۹
۱۸۵	(۱۴۲:۶)	۱۱۵
۱۸۶	(۱۵۲:۶)	۲۴۰، ۲۴۱
۱۸۷	(۱۵۳:۶)	۲۴۰، ۲۴۱
۱۸۸	(۱۵۴:۶)	۲۴۰، ۲۴۲
۱۸۹	(۱۵۵:۶)	۸۹
۱۹۰	(۱۵۶:۶)	۸۹
۱۹۱	(۱۵۸:۶)	۹۰
۱۹۲	(۱۶۰:۶)	۱۳۱
۱۹۳	(۱۶۱:۶)	۱۳۰
۱۹۴	(۱۶۲:۶)	۲۳۱
۱۹۵	(۱۶۳:۶)	۲۳۱
۱۹۶	(۱۶۴:۶)	۲۳۱
۱۹۷	(۱۶۶:۶)	۱۳
۱۱۶۱	۷-الاعراف (۲۰۶)	
۱۹۸	(۱۶:۷)	۱۹۵
۱۹۹	(۱۷:۷)	۱۹۵
۲۰۰	(۱۸:۷)	۱۹۵
۲۰۱	(۲۷:۷)	۲۰۷
۲۰۲	(۲۸:۷)	۲۰۷
۲۰۳	(۲۹:۷)	۲۰۴، ۲۰۶، ۲۰۸، ۲۱۱، ۲۵۷
۲۰۴	(۳۴:۷)	۱۳، ۱۷۷
۲۰۵	(۳۵:۷)	۱۳، ۲۴۳، ۱۷۷
۲۰۶	(۵۲:۷)	۵۸، ۹۰، ۹۲، ۱۷۵
۲۰۷	(۵۴:۷)	۱۴۱
۲۰۸	(۵۶:۷)	۲۰۵
۲۰۹	(۹۵:۷)	۱۲۷
۲۱۰	(۱۲۸:۷)	۳۹
۲۱۱	(۱۲۹:۷)	۹
۲۱۲	(۱۳۰:۷)	۱۲۷
۲۱۳	(۱۳۷:۷)	۱۹، ۴۰
۲۱۴	(۱۳۸:۷)	۴۰
۲۱۵	(۱۵۲:۷)	۲۲۳
۲۱۶	(۱۵۴:۷)	۸۹
۲۱۷	(۱۵۶:۷)	۱۵۶
۲۱۸	(۱۵۷:۷)	۱۷۲
۲۱۹	(۱۵۸:۷)	۲۰۴
۲۲۰	(۱۶۲:۷)	۲۶۰
۲۲۱	(۱۶۸:۷)	۱۲۷
۲۲۲	(۱۷۶:۷)	۸۵
۲۲۳	(۱۸۲:۷)	۹۸

شمارہ	شمارہ آیت مع سورہ	صفحہ کتاب
۲۲۴	(۱۸۳:۷)	۹۸
۲۲۵	(۱۸۴:۷)	۶۳
۲۲۶	(۱۸۷:۷)	۸۴
۲۲۷	(۱۸۹:۷)	۴۰
۲۲۸	(۱۹۰:۷)	۴۰
۲۲۹	(۲۰۳:۷)	۵۷
۲۳۰	(۲۰۶:۷)	۱۰۷
۱۲۳۶	۸-الانفال (۷۵)	
۲۳۱	(۱:۸)	۱۶۹، ۲۶۳
۲۳۲	(۲:۸)	۱۰۳، ۲۶۳
۲۳۳	(۳:۸)	۱۸۰، ۲۶۳
۲۳۴	(۴:۸)	۱۸۰، ۲۶۳
۲۳۵	(۷:۸)	۱۸۴
۲۳۶	(۸:۸)	۱۸۴
۲۳۷	(۱۱:۸)	۱۳۲، ۱۳۴
۲۳۸	(۱۲:۸)	۱۳۴
۲۳۹	(۲۰:۸)	۱۷۰
۲۴۰	(۲۱:۸)	۱۷۰
۲۴۱	(۲۲:۸)	۱۷۰
۲۴۲	(۲۴:۸)	۱۷۱
۲۴۳	(۲۵:۸)	۱۷۱، ۲۴۵
۲۴۴	(۲۶:۸)	۱۲، ۱۲۴
۲۴۵	(۲۹:۸)	۱۵۲
۲۴۶	(۳۱:۸)	۷۱
۲۴۷	(۳۵:۸)	۱۱۱
۲۴۸	(۴۵:۸)	۱۳۴، ۱۴۴، ۱۰۶
۲۴۹	(۵۳:۸)	۲۱۲
۲۵۰	(۶۳:۸)	۱۷۶، ۱۹۸
۲۵۱	(۶۴:۸)	۹۷
۲۵۲	(۶۵:۸)	۱۶۴
۲۵۳	(۶۶:۸)	۱۹۴
۲۵۴	(۷۴:۸)	۱۱۴، ۱۲۵
۱۳۶۵	۹-التوبة (۱۲۹) ۔	
۲۵۵	(۴:۹)	۱۹۹
۲۵۶	(۱۳:۹)	۱۵۷، ۱۵۸
۲۵۷	(۲۰:۹)	۱۱۵
۲۵۸	(۲۱:۹)	۱۱۵
۲۵۹	(۲۲:۹)	۱۱۵
۲۶۰	(۳۱:۹)	۱۸۹
۲۶۱	(۳۲:۹)	۱۸۴، ۲۷۱
۲۶۲	(۳۳:۹)	۱۸۴

شمارہ	شمارہ آیت مع سورہ	صفحہ کتاب
۲۶۳	(۳۴:۹)	۱۳۸
۲۶۴	(۳۵:۹)	۱۳۸
۲۶۵	(۳۹:۹)	۹
۲۶۶	(۴۴:۹)	۱۵۸
۲۶۷	(۴۵:۹)	۱۵۸
۲۶۸	(۵۰:۹)	۱۲۵
۲۶۹	(۶۷:۹)	۱۴۹
۲۷۰	(۷۰:۹)	۷۶
۲۷۱	(۷۱:۹)	۱۵۰
۲۷۲	(۸۴:۹)	۱۳۳
۲۷۳	(۸۸:۹)	۱۳۴
۲۷۴	(۸۹:۹)	۱۳۴
۲۷۵	(۹۷:۹)	۸۰
۲۷۶	۹۹:۹)	۱۳۳
۲۷۷	(۱۰۳:۹)	۱۳۳، ۱۸۱
۲۷۸	(۱۰۴:۹)	۱۳۹
۲۷۹	(۱۰۷:۹)	۲۵۵
۲۸۰	(۱۰۸:۹)	۲۵۵، ۲۵۷
۲۸۱	(۱۰۹:۹)	۲۵۵
۲۸۲	(۱۱۰:۹)	۲۵۵
۲۸۳	(۱۱۱:۹)	۱۴۰
۱۴۷۴	۱۰-یونس (۱۰۹)	
۲۸۴	(۱:۱۰)	۵۳
۲۸۵	(۳:۱۰)	۱۰
۲۸۶	(۱۹:۱۰)	۱۹۱
۲۸۷	(۲۵:۱۰)	۲۳۵
۲۸۸	(۲۷:۱۰)	۱۲۸
۲۸۹	(۳۴:۱۰)	۲۴
۲۹۰	(۴۴:۱۰)	۱۲۱
۲۹۱	(۵۷:۱۰)	۹۰
۲۹۲	(۶۲:۱۰)	۱۵۸
۲۹۳	(۶۳:۱۰)	۱۵۸
۲۹۴	(۶۴:۱۰)، ۸۲	۱۵۸، ۱۸۵
۲۹۵	(۱۰۳:۱۰)	۱۶۶
۱۵۹۷	۱۱-هود (۱۲۳)	
۲۹۶	(۱:۱۱)	۵۵
۲۹۷	(۱۰:۱۱)	۱۲۸، ۲۱۴
۲۹۸	(۱۳:۱۱)	۶۵، ۶۶
۲۹۹	(۱۴:۱۱)	۶۶
۳۰۰	(۱۸:۱۱)	۲۰۳
۳۰۱	(۵۶:۱۱)، ۸۸	۹، ۴۳

شمارہ	شمارہ آیت مع سورہ	صفحہ کتاب
۳۰۲	(۱۱۸:۱۱)	۱۹۴
۳۰۳	(۱۱۹:۱۱)، ۱۲۰	(۱۹۴)، ۶۴، ۹۰
۱۷۰۸	۱۲-یوسف (۱۱۱)	
۳۰۴	(۱:۱۲)	۵۷، ۶۱
۳۰۵	(۲:۱۲)	۶۱، ۶۶
۳۰۶	(۶:۱۲)	۲۱۳
۳۰۷	(۱۲:۱۲)	۱۹۲
۳۰۸	(۲۴:۱۲)	۲۰۸
۳۰۹	(۲۸:۱۲)	۲۴۷
۳۱۰	(۱۱۱:۱۲)	۸۷، ۹۰، ۹۲
۱۷۵۱	۱۳-الرعد (۴۳)	
۳۱۱	(۴:۱۳)	۱۱۵
۳۱۲	(۶:۱۳)	۱۲۷
۳۱۳	(۲۲:۱۳)	۱۲۹
۳۱۴	(۳۴:۱۳)	۱۱۹
۳۱۵	(۳۷:۱۳)	۹۰
۳۱۶	(۳۸:۱۳)	۲۴۴
۱۸۰۳	۱۴-ابراهیم (۵۲)	
۳۱۷	(۱:۱۴)	۵۵، ۲۶۹
۳۱۸	(۴:۱۴)	۴۶، ۶۶
۳۱۹	(۵:۱۴)	۲۷۰
۳۲۰	(۶:۱۴)	۲۱۵
۳۲۱	(۷:۱۴)	۲۴۸
۳۲۲	(۸:۱۴)	۱۴۱
۳۲۳	(۱۲:۱۴)	۲۴۷
۳۲۴	(۱۳:۱۴)	۴۳، ۹۶
۳۲۵	(۱۴:۱۴)، ۱۵	۴۳، ۹۶، ۱۵۹
۳۲۶	(۲۳:۱۴)	۲۷۱
۳۲۷	(۲۶:۱۴)	۱۴۳
۳۲۸	(۳۴:۱۴)	۲۱۲
۱۹۰۲	۱۵-الحجر (۹۹)	
۳۲۹	(۱:۱۵)	۵۷
۳۳۰	(۹:۱۵)	۹۲
۳۳۱	(۲۱:۱۵)	۱۲۹
۳۳۲	(۸۶:۱۵)	۲۶۸
۳۳۳	(۹۰:۱۵)	۷۴
۳۳۴	(۹۱:۱۵)	۷۴، ۱۴۳
۳۳۵	(۹۲:۱۵)	۷۴
۳۳۶	(۹۳:۱۵)	۷۴

شمارہ	شمارہ آیت مع سورہ	صفحہ کتاب
۲۰۳۰	۱۶-النحل (۱۲۸)	
۳۳۷	۸:۱۶	۲۵
۳۳۸	۳۲:۱۶	۱۵۹
۳۳۹	۳۶:۱۶	۱۸۷
۳۴۰	۴۴:۱۶	۱۵۱،۸۳،۵۹
۳۴۱	۴۵:۱۶	۱۲۸
۳۴۲	۴۹:۱۶	۱۰۷
۳۴۳	۵۳:۱۶	۲۱۴
۳۴۴	۶۴:۱۶	۹۰
۳۴۵	۷۱:۱۶	۲۱۴
۳۴۶	۷۲:۱۶	۲۱۴
۳۴۷	۷۹:۱۶	۱۰۲
۳۴۸	۸۱:۱۶	۲۱۴
۳۴۹	۸۳:۱۶	۲۱۴،۱۵۴
۳۵۰	۸۹:۱۶	۱۷۶،۹۴،۹۰،۵۹
۳۵۱	۹۰:۱۶	۲۰۸
۳۵۲	۹۱:۱۶	۱۹۸
۳۵۳	۹۳:۱۶	۱۹۲
۳۵۴	۱۰۲:۱۶	۱۴۴،۹۰
۳۵۵	۱۰۳:۱۶	۹۱
۳۵۶	۱۱۴:۱۶	۲۱۹
۳۵۷	۱۱۶:۱۶	۲۳۲
۳۵۸	۱۲۱:۱۶	۲۳۲
۳۵۹	۱۲۲:۱۶	۲۳۲
۳۶۰	۱۲۵:۱۶	۹۵
۳۶۱	۱۲۷:۱۶	۱۵۲
۳۶۲	۱۲۸:۱۶	۱۵۲
۲۱۴۱	۱۷-بنی اسرآئیل (۱۱۱)	
۳۶۳	۲:۱۷	۸۹
۳۶۴	۵:۱۷	۱۳۰
۳۶۵	۶:۱۷	۱۳۰
۳۶۶	۷:۱۷	۱۳۰
۳۶۷	۹:۱۷	۲۷۰،۲۳۵
۳۶۸	۱۱:۱۷	۱۸۹
۳۶۹	۳۶:۱۷	۸۳
۳۷۰	۳۷:۱۷	۲۰۰
۳۷۱	۳۹:۱۷	۸۳
۳۷۲	۴۹:۱۷	۲۹
۳۷۳	۵۰:۱۷	۲۹
۳۷۴	۵۱:۱۷	۲۹
۳۷۵	۵۳:۱۷	۱۸۹
۳۷۶	۵۶:۱۷	۱۰۷

شمارہ	شمارہ آیت مع سورہ	صفحہ کتاب
۳۷۷	۵۷:۱۷	۱۵۷
۳۷۸	۸۱،۷۵:۱۷	۲۰۱۷
۳۷۹	۸۲:۱۷	۲۱۳
۳۸۰	۸۸:۱۷	۷۱
۳۸۱	۱۰۶:۱۷	۷۲
۳۸۲	۱۱۰:۱۷	۱۱۲
۲۲۵۱	۱۸-الکھف (۱۱۰)	
۳۸۳	۱:۱۸	۵۵،۱
۳۸۴	۲:۱۸	۱
۳۸۵	۵:۱۸	۱۹۶
۳۸۶	۲۳:۱۸	۱۹۲
۳۸۷	۵۴:۱۸	۱۸۹
۲۳۴۹	۱۹-مریم (۹۸)	
۳۸۸	۵۶:۱۹	۲۲۰
۳۸۹	۵۷:۱۹	۲۲۰
۳۹۰	۵۸:۱۹	۲۲۰
۳۹۱	۵۹:۱۹	۲۶۶
۳۹۲	۹۷:۱۹	۱۵۱،۷۹،۶۶
۳۹۳	۹۸:۱۹	۷۹
۲۴۸۴	۲۰-طٰہٰ (۱۳۵)	
۳۹۴	۱۴:۲۰	۱۰۹
۳۹۵	۴۹:۲۰	۱۱
۳۹۶	۵۰:۲۰	۱۱
۳۹۷	۸۰:۲۰	۲۲۳
۳۹۸	۸۱:۲۰	۲۲۳
۳۹۹	۸۲:۲۰	۲۲۳
۲۵۹۶	۲۱-الانبیاء (۱۱۲)	
۴۰۰	۵:۲۱	۸۸
۴۰۱	۳۰:۲۱	۲۲،۲۰
۴۰۲	۳۱:۲۱	۲۲
۴۰۳	۳۲:۲۱	۲۲
۴۰۴	۳۳:۲۱	۲۲
۴۰۵	۴۸:۲۱	۸۹
۴۰۶	۵۰:۲۱	۹۰
۴۰۷	۷۳:۲۱	۱۳۶،۱۰۸
۴۰۸	۹۰:۲۱	۲۴۷،۱۳۶،۱۱۰
۴۰۹	۱۰۵:۲۱	۸۷،۴۰
۴۱۰	۱۰۶:۲۱	۸۷،۴۰
۴۱۱	۱۰۷:۲۱	۸۷

شمارہ	شمارہ آیت مع سورہ	صفحہ کتاب
۲۶۷۴	۲۲-الحج (۷۸)	
۴۱۲	(۳۴:۲۲)	۲۳۱،۱۷۳
۴۱۳	(۳۵:۲۲)	۲۳۱،۱۷۳
۴۱۴	(۳۷:۲۲)	۲۳۲
۴۱۵	(۴۶:۲۲)	۸۳
۴۱۶	(۴۷:۲۲)	۱۶
۴۱۷	(۵۴:۲۲)	۲۲۷
۴۱۸	(۶۷:۲۲)	۲۳۷،۲۳۲،۲۲۹
۴۱۹	(۶۸:۲۲)	۲۳۳
۴۲۰	(۶۹:۲۲)	۲۳۳
۴۲۱	(۷۲:۲۲)	۱۵۰
۴۲۲	(۷۴:۲۲)	۱۱
۴۲۳	(۷۷:۲۲)	۱۰۵
۴۲۴	(۷۸:۲۲)	۱۰۵
۲۷۹۲	۲۳-المؤمنون (۱۱۸)	
۴۲۵	(۱۹:۲۳)	۱۱۵
۴۲۶	(۴۵:۲۳)	۱۰۹
۴۲۷	(۴۶:۲۳)	۱۰۹
۴۲۸	(۴۷:۲۳)	۱۰۹
۴۲۹	(۵۰:۲۳)	۲۲۲
۴۳۰	(۵۲:۲۳)	۷۹،۴۹
۴۳۱	(۵۳:۲۳)	۷۴،۴۹
۴۳۲	(۵۴:۲۳)	۴۹
۴۳۳	(۵۵:۲۳)	۱۳۵
۴۳۴	(۵۶:۲۳)	۱۳۵
۴۳۵	(۶۰:۲۳)	۱۳۷
۴۳۶	(۶۱:۲۳)	۱۳۵
۴۳۷	(۶۶:۲۳)	۸۸
۴۳۸	(۶۷:۲۳)	۸۸
۴۳۹	(۶۸:۲۳)	۸۸
۴۴۰	(۶۹:۲۳)	۸۸
۴۴۱	(۷۰:۲۳)	۸۸
۴۴۲	(۷۲:۲۳)	۲۲۷
۴۴۳	(۷۳:۲۳)	۲۲۷
۲۸۵۶	۲۴-النور (۶۴)	
۴۴۴	(۲۱:۲۴)	۲۰۹
۴۴۵	(۴۵:۲۴)	۳۷
۴۴۶	(۴۶:۲۴)	۳۷
۴۴۷	(۵۵:۲۴)	۲۱۲،۲۹۵،۱۳۷،۷
۲۹۳۳	۲۵-الفرقان (۷۷)	

شمارہ	شمارہ آیت مع سورہ	صفحہ کتاب
۴۴۸	(۶:۲۵)	۹۵
۴۴۹	(۳۰:۲۵)	۴۶
۴۵۰	(۳۱:۲۵)	۴۶
۴۵۱	(۳۲:۲۵)	۴۶، ۷۲
۴۵۲	(۶۳:۲۵)	۲۰۰، ۲۰۱
۴۵۳	(۷۲:۲۵)	۲۰۱
۳۱۶۰	۲۶۔الشعراء (۲۲۷)	
۴۵۴	(۳:۲۶)	۸۰
۴۵۵	(۴:۲۶)	۸۰
۴۵۶	(۲۲:۲۶)	۱۱۰، ۲۱۳
۴۵۷	(۵۷:۲۶)	۱۱۶
۴۵۸	(۵۸:۲۶)	۱۱۶
۴۵۹	(۵۹:۲۶)	۱۱۶
۴۶۰	(۱۳۲:۲۶)	۱۱۶
۴۶۱	(۱۳۳:۲۶)	۱۱۶
۴۶۲	(۱۳۴:۲۶)	۱۱۶
۴۶۳	(۱۴۷:۲۶)	۱۱۶
۴۶۴	(۱۴۸:۲۶)	۱۱۶
۴۶۵	(۲۲۴:۲۶)	۶۴
۴۶۶	(۲۲۵:۲۶)	۶۴
۴۶۷	(۲۲۶:۲۶)	۶۴
۳۲۵۳	۲۷۔النمل (۹۳)	
۴۶۸	(۱:۲۷)	۵۷، ۱۶۵
۴۶۹	(۲:۲۷)	۹۰، ۱۶۵
۴۷۰	(۶:۲۷)	۵۴
۴۷۱	(۱۲۴:۲۷)	۱۰۷
۴۷۲	(۴۶:۲۷)	۱۲۷
۴۷۳	(۹۰:۲۷)	۱۰۲، ۱۹۱
۴۷۴	(۷۷:۲۷)	۹۰
۴۷۵	(۸۹:۲۷)	۱۳۱
۴۷۶	(۹۰:۲۷)	۱۳۱
۳۳۴۱	۲۸۔القصص (۸۸)	
۴۷۷	(۲:۲۸)	۸۷
۴۷۸	(۵:۲۸)	۱۸
۴۷۹	(۶:۲۸)	۱۸
۴۸۰	(۳۴:۲۸)	۹۵
۴۸۱	(۴۳:۲۸)	۸۹
۴۸۲	(۴۷:۲۸)	۱۲۵
۴۸۳	(۴۹:۲۸)	۸۹، ۹۱
۴۸۴	(۵۴:۲۸)	۱۲۹
۴۸۵	(۵۵:۲۸)	۲۰۰
۴۸۶	(۵۸:۲۸)	۱
۴۸۷	(۵۹:۲۸)	۱، ۸۱
۴۸۸	(۷۷:۲۸)	۳۳
۴۸۹	(۶۸:۲۸)	۳۳، ۱۹۱
۴۹۰	(۸۴:۲۸)	۱۲۸
۳۴۱۰	۲۹۔العنکبوت (۶۹)	
۴۹۱	۳۰۲ (۶:۲۹)	۱۷۳، ۱۸۱، ۲۰۱
۴۹۲	(۱۹:۲۹)	۲۴
۴۹۳	(۲۰:۲۹)	۲۴
۴۹۴	(۳۹:۲۹)	۱۵۰
۴۹۵	(۴۵:۲۹)	۲۰۷، ۲۰۹، ۲۳۰
۴۹۶	(۴۹:۲۹)	۹۴
۴۹۷	(۵۰:۲۹)	۹۴
۴۹۸	(۵۱:۲۹)	۹۰، ۹۴
۴۹۹	(۵۲:۲۹)	۹۴
۵۰۰	(۶۷:۲۹)	۲۱۸
۵۰۱	(۶۹:۲۹)	۲۴۲
۳۴۷۰	۳۰۔الروم (۶۰)	
۵۰۲	(۹:۳۰)	۳۹، ۷۶
۵۰۳	(۲۷:۳۰)	۲۴
۵۰۴	(۳۰:۳۰)	۴، ۱۰۰، ۲۳
۵۰۵	(۳۶:۳۰)	۱۲۷
۵۰۶	(۴۷:۳۰)	۱۶۶
۳۵۰۴	۳۱۔لقمان (۳۴)	
۵۰۷	(۲:۳۱)	۵۳
۵۰۸	(۳۶:۳۱)	۹۰
۵۰۹	(۱۰:۳۱)	۲۱۴
۵۱۰	(۳۱:۳۱)	۲۱۲
۵۱۱	(۳۴:۳۱)	۱۶۲
۳۵۳۴	۳۲۔السجدۃ (۳۰)	
۵۱۲	(۴:۳۲)	۱۴
۵۱۳	(۵:۳۲)	۱۴
۵۱۴	(۶:۳۲)	۱۴
۵۱۵	(۷:۳۲)	۱۴
۵۱۶	(۸:۳۲)	۱۴
۵۱۷	(۹:۳۲)	۱۴
۵۱۸	(۱۳:۳۲)	۱۹۶
۵۱۹	(۱۶:۳۲)	۲۴۶، ۲۶۳
۵۲۰	(۲۳:۳۲)	۸۹
۵۲۱	(۲۴:۳۲)	۴
۳۶۰۷	۳۳۔الاحزاب (۷۳)	
۵۲۲	(۹:۳۳)	۴۲، ۲۱۶
۵۲۳	(۳۲، ۳۳، ۳۴:۳۳)	۲۱۹، ۲۳۳
۵۲۴	(۷۲، ۵۶:۳۳)	۱۳۲، ۴۳
۳۶۶۱	۳۴۔السبا (۵۴)	
۵۲۵	(۱۷:۳۴)	۹۶
۵۲۶	(۲۸:۳۴)	۲۰۴
۵۲۷	(۳۹:۳۴)	۱۰
۳۷۰۶	۳۵۔الفاطر (۴۵)	
۵۲۸	(۱:۳۵)	۳۴
۵۲۹	(۳:۳۵)	۲۱۴
۵۳۰	(۱۵:۳۵)	۳۴
۵۳۱	(۱۶:۳۵)	۳۴
۵۳۲	(۱۷:۳۵)	۳۴
۵۳۳	(۲۷:۳۵)	۲۸
۵۳۴	(۳۲:۳۵)	۱۳۶
۵۳۵	(۳۹:۳۵)	۲۶۵
۵۳۶	(۴۳:۳۵)	۱۹۳
۵۳۷	(۴۴:۳۵)	۳۹
۳۷۸۹	۳۶۔یٰس (۸۳)	
۵۳۸	(۱:۳۶)	۵۳
۵۳۹	(۲:۳۶)	۵۳
۵۴۰	(۳:۳۶)	۵۳
۵۴۱	(۴:۳۶)	۵۳
۵۴۲	(۳۴:۳۶)	۱۱۵
۵۴۳	(۳۸:۳۶)	۲۳
۵۴۴	(۳۹:۳۶)	۲۳
۵۴۵	(۴۷:۳۶)	۴۳
۵۴۶	(۶۰:۳۶)	۲۲۸
۵۴۷	(۶۱:۳۶)	۲۲۸
۵۴۸	(۶۶:۳۶)	۱۷۳
۵۴۹	(۶۷:۳۶)	۱۷۳
۵۵۰	(۶۹:۳۶)	۶۴
۵۵۱	(۷۰:۳۶)	۶۴
۵۵۲	(۷۷:۳۶)	۱۷۴
۵۵۳	(۷۹:۳۶)	۳۱
۵۵۴	(۸۰:۳۶)	۳۱

شمار	شمارہ آیت مع سورۃ	صفحہ کتاب
۳۹۷۱	۳۷-الصّٰفّٰت (۱۸۲)	
۵۵۵	(۵:۳۷)	۱۵
۵۵۶	(۱۱۳:۳۷)	۲۳۶
۵۵۷	(۱۱۵:۳۷)	۲۳۶
۵۵۸	(۱۱۶:۳۷)	۲۳۶
۵۵۹	(۱۱۷:۳۷)	۲۳۶، ۸۹
۵۶۰	(۱۱۸:۳۷)	۲۳۶
۵۶۱	(۱۱۹:۳۷)	۲۳۶
۵۶۲	(۱۲۰:۳۷)	۲۳۶
۵۶۳	(۱۲۱:۳۷)	۲۳۶
۵۶۴	(۱۲۲:۳۷)	۲۳۶
۵۶۵	(۱۴۱:۳۷)	۱۶۵
۵۶۶	(۱۴۲:۳۷)	۱۶۵
۵۶۷	(۱۴۳:۳۷)	۱۶۵
۴۰۵۹	۳۸-صٓ (۸۸)	
۵۶۸	(۵:۳۸)	۲۱
۵۶۹	(۲۶:۳۸)	۲۳۴
۵۷۰	(۲۹:۳۸)	۵۹
۵۷۱	(۴۵:۳۸)	۲۵۸، ۲۶۰
۵۷۲	(۸۲:۳۸)	۱۹۶
۵۷۳	(۸۳:۳۸)	۱۹۶
۵۷۴	(۸۴:۳۸)	۱۹۶
۵۷۵	(۸۵:۳۸)	۱۹۶
۴۱۳۴	۳۹-الزُّمر (۷۵)	
۵۷۶	(۱:۳۹)	۵۳
۵۷۷	(۲:۳۹)	۱۷۲
۵۷۸	(۳:۳۹)، ۃ	۱۷۲، ۲۱+
۵۷۹	(۸:۳۹)	۲۱۴
۵۸۰	(۱۰:۳۹)	۱۵۹
۵۸۱	(۱۱:۳۹)	۱۹۱
۵۸۲	(۱۲:۳۹)	۱۹۱
۵۸۳	(۱۴:۳۹)	۱۹۱
۵۸۴	(۲۷:۳۹)	۵۵، ۱۶۷
۵۸۵	(۲۸:۳۹)	۵۵، ۱۶۷
۵۸۶	(۴۸:۳۹)	۱۲۸
۵۸۷	(۴۹:۳۹)	۱۶۴، ۲۱۳
۵۸۸	(۵۱:۳۹)	۱۳۸
۵۸۹	(۶۳:۳۹)	۱۲۹
۵۹۰	(۶۴:۳۹)	۴۱
+	+	+

شمار	شمارہ آیت مع سورۃ	صفحہ کتاب
۴۲۱۹	۴۰-المؤمن (۸۵)	
۵۹۱	(۲:۴۰)	۵۳
۵۹۲	(۱۴:۴۰)	۱۹۷
۵۹۳	(۲۱:۴۰)	۳۹
۵۹۴	(۲۲:۴۰)	۹۶
۵۹۵	(۵۱:۴۰)	۱۶۶
۵۹۶	(۵۳:۴۰)	۸۹
۵۹۷	(۵۷:۴۰)	۱۵
۵۹۸	(۶۰:۴۰)	۲۲۸، ۲۵۴
۵۹۹	(۸۲:۴۰)	۳۹
۴۲۷۳	۴۱-حٰمٓ (۵۴)	
۹۰۰	(۳:۴۱)	۵۸
۹۰۱	(۱۸:۴۱)	۱۴۹
۹۰۲	(۳۰:۴۱)	۱۲۶، ۱۶۵
۹۰۳	(۳۱:۴۱)	۱۶۵
۹۰۴	(۳۲:۴۱)	۱۶۵
۹۰۵	(۳۷:۴۱)	۱۰۷
۹۰۶	(۴۲:۴۱)	۵۵
۹۰۷	(۴۴:۴۱)	۹۰
۹۰۸	(۵۱:۴۱)	۲۱۳
۴۳۲۶	۴۲-الشّوریٰ (۵۳)	
۹۰۹	(۳۰:۴۲)	۱۲۵
۹۱۰	(۴۸:۴۲)	۱۲۷
۹۱۱	(۵۱:۴۲)	۱۹۱
۹۱۲	(۵۲:۴۲)	۲۲۷
۴۴۱۵	۴۳-الزّخرف (۸۹)	
۹۱۳	(۲:۴۳)	۵۷، ۹۰
۹۱۴	(۳:۴۳)	۹۰، ۹۶، ۷۷
۹۱۵	(۴:۴۳)	۹۰، ۷۷
۹۱۶	(۵:۴۳)	۹۰، ۷۷
۹۱۷	(۴۳:۴۳)	۲۳۶
۹۱۸	(۵۹:۴۳)	۲۲۱، ۲۲۲
۹۱۹	(۶۰:۴۳)	۱۰، ۱۹
۹۲۰	(۶۱:۴۳)	۲۳۶
۹۲۱	(۶۳:۴۳)	۲۳۵
۹۲۲	(۶۴:۴۳)	۲۳۵
۹۲۳	(۶۵:۴۳)	۲۳۵
۴۴۷۴	۴۴-الدّخان (۵۹)	

شمار	شمارہ آیت مع سورۃ	صفحہ کتاب
۹۲۴	(۲:۴۴)	۵۷
۹۲۵	(۲۵:۴۴)	۱۱۳، ۲۱۶
۹۲۶	(۲۶:۴۴)	۱۱۳، ۲۱۶
۹۲۷	(۲۷:۴۴)	۱۱۶، ۲۱۶
۹۲۸	(۲۸:۴۴)	۱۱۶
۹۲۹	(۵۸:۴۴)	۵۷، ۹۶
۴۵۱۱	۴۵-الجاثیۃ (۳۷)	
۹۳۰	(۲:۴۵)	۵۳
۹۳۱	(۲۰:۴۵)	۵۸، ۹۰
۴۵۴۶	۴۶-الاحقاف (۳۵)	
۹۳۲	(۲:۴۶)	۵۳
۹۳۳	(۱۲:۴۶)	۸۹، ۹۰
۹۳۴	(۱۵:۴۶)	۲۱۳
۹۳۵	(۳۵:۴۶)	۸، ۸۱
۴۵۸۴	۴۷-محمّد (۳۸)	
۹۳۶	(۳۹:۴۷)	۱۱۸
۹۳۷	(۳۸:۴۷)	۱۰، ۱۸۱
۴۶۱۳	۴۸-الفتح (۲۹)	
	(۱:۴۸)	۲۴۲
۹۳۸	(۲:۴۸)	۲۱۷، ۲۴۲
۹۳۹	(۲۰:۴۸)	۲۳۳
۹۴۰	(۲۷:۴۸)	۱۸۴
۹۴۱	(۲۸:۴۸)	۱۸۳
۹۴۲	(۲۹:۴۸)	۱۶۸
۴۶۳۱	۴۹-الحجرات (۱۸)	
۹۴۳	(۱۰:۴۹)	۱۶۰، ۹۷
۹۴۴	(۱۲:۴۹)	۷۵
۹۴۵	(۱۳:۴۹)	۱۶۰، ۲۳۷
۹۴۶	(۱۵:۴۹)	۱۱۵
۴۶۷۶	۵۰-قٓ (۴۵)	
۵۴۷	(۹:۵۰)	۱۱۵
۵۴۸	(۳۸:۵۰)	۲۵
۴۷۳۶	۵۱-الذّٰریٰت (۶۰)	
۹۴۹	(۵۶:۵۱)	۱۱۸
۹۵۰	(۵۷:۵۱)	۱۱۸
+	+	+

شمارہ	شمارہ آیت مع سورۃ	صفحہ کتاب
۴۷۸۵	۵۲-الطور (۴۹)	
۶۵۱	(۲۹:۵۲)	۸۵
۶۵۲	(۳۰:۵۲)	۸۵، ۷۱
۶۵۳	(۳۱:۵۲)	۸۵
۶۵۴	(۳۳:۵۲)	۷۱
۶۵۵	(۳۴:۵۲)	۷۱
۴۸۴۷	۵۳-النجم (۶۲)	
۶۵۶	(۱:۵۳)	۲۰
۶۵۷	(۲:۵۳)	۲۰
۶۵۸	(۳:۵۳)	۲۰
۶۵۹	(۴:۵۳)	۲۰
۶۶۰	(۵:۵۳)	۲۰
۶۶۱	(۶:۵۳)	۲۰
۶۶۲	(۷:۵۳)	۲۰
۶۶۳	(۸:۵۳)	۲۰
۶۶۴	(۹:۵۳)	۲۰
۶۶۵	(۱۰:۵۳)	۲۰
۶۶۶	(۱۱:۵۳)	۲۰
۶۶۷	(۱۲:۵۳)	۲۰
۶۶۸	(۲۳:۵۳)	۸۲، ۸۳
۶۶۹	(۲۸:۵۳)	۸۷
۶۷۰	(۲۹:۵۳)	۸۷
۶۷۱	(۳۰:۵۳)	۸۷
۶۷۲	(۳۱:۵۳)	۸۷
۶۷۳	(۳۹:۵۳)	۱۲
۶۷۴	(۶۲:۵۳)	۱۰۷
۴۹۰۲	۵۴-القمر (۵۵)	
۶۷۵	(۱۷:۵۴)	۵۷
۶۷۶	(۲۲:۵۴)	۵۷
۶۷۷	(۲۶:۵۴)	۱۶۲
۶۷۸	(۳۴:۵۴)	۲۱۲
۶۷۹	(۳۵:۵۴)	۲۱۲
۶۸۰	(۴۰:۵۴)	۵۷
۴۹۸۰	۵۵-الرحمٰن (۷۸)	
۶۸۱	(۶:۵۵)	۱۰۷
۶۸۲	(۱۳:۵۵)	۱۵
۶۸۳	(۲۹:۵۵)	۲۴
۶۸۴	(۵۶:۵۵)	۵۲
۶۸۵	(۷۰:۵۵)	۱۳۶

شمارہ	شمارہ آیت مع سورۃ	صفحہ کتاب
۶۸۶	(۷۴:۵۵)	۵۲
۵۰۷۶	۵۶-الواقعة (۹۶)	
۶۸۷	(۱:۵۶)	۸۴
۶۸۸	(۲:۵۶)	۸۴
۶۸۹	(۳:۵۶)	۸۴
۶۹۰	(۲۳:۵۶)	۵۱
۶۹۱	(۷۵:۵۶)	۵۱
۶۹۲	(۷۶:۵۶)	۵۱
۶۹۳	(۷۷:۵۶)	۵۱، ۱۹۹
۶۹۴	(۷۸:۵۶)	۵۱، ۱۹۹
۶۹۵	(۷۹:۵۶)	۵۰، ۵۱، ۵۲، ۱۹۹
۶۹۶	(۸۰:۵۶)	۵۱، ۱۹۹
۶۹۷	(۸۱:۵۶)	۵۱
۶۹۸	(۸۲:۵۶)	۵۱
۶۹۹	(۸۳:۵۶)	۵۱
۷۰۰	(۸۴:۵۶)	۵۱
۷۰۱	(۸۵:۵۶)	۵۱
۵۱۰۵	۵۷-الحدید (۲۹)	
۷۰۲	(۷:۵۷)	۹
۷۰۳	(۱۱:۵۷)	۱۳۷
۷۰۴	(۱۲:۵۷)	۲۷۱
۷۰۵	(۱۸:۵۷)	۱۸۰
۷۰۶	(۲۲:۵۷)	۱۲۵
۷۰۷	(۲۳:۵۷)	۱۲۵
۵۱۲۷	۵۸-المجادلة (۲۲)	
۷۰۸	(۷:۵۸)	۱۴۸
۷۰۹	(۲۲:۵۸)	۱۰۴، ۱۷۹
۵۱۵۱	۵۹-الحشر (۲۴)	
۷۱۰	(۲:۵۹)	۱۵۵
۷۱۱	(۱۳:۵۹)	۱۶۳
۷۱۲	(۱۴:۵۹)	۱۶۳
۷۱۳	(۱۸:۵۹)	۱۶۲
۷۱۴	(۲۳:۵۹)	۱۲۲
۷۱۵	(۲۴:۵۹)	۱۲۲
۵۱۶۴	۶۰-الممتحنة (۱۳)	
۵۱۸۸	۶۱-الصف (۱۴)	
۷۱۶	(۴:۶۱)	۱۲۸

شمارہ	شمارہ آیت مع سورۃ	صفحہ کتاب
۷۱۷	(۸:۶۱)	۱۸۴، ۲۷۱
۷۱۸	(۹:۶۱)	۱۸۴، ۲۱۰
۷۱۹	(۱۰:۶۱)	۱۸۴
۷۲۰	(۱۱:۶۱)	۱۸۲
۷۲۱	(۱۲:۶۱)	۱۸۲
۷۲۲	(۱۳:۶۱)	۱۸۲
۵۱۹۹	۶۲-الجمعة (۱۱)	
۷۲۳	(۲:۶۲)	۵۴
۵۲۱۰	۶۳-المنٰفقین (۱۱)	
۷۲۴	(۷:۶۳)	۱۴۱
۵۲۲۸	۶۴-التغابن (۱۸)	
۷۲۵	(۱۱:۶۴)	۱۲۶
۷۲۶	(۱۷:۶۴)	۱۳۷
۵۲۴۰	۶۵-الطلاق (۱۲)	
۵۲۵۲	۶۶-التحریم (۱۲)	
۷۲۷	(۸:۶۶)	۲۷۱
۷۲۸	(۱۲:۶۶)	۲۲۲
۵۲۸۲	۶۷-الملک (۳۰)	
۷۲۹	(۲:۶۷)	۲۶
۷۳۰	(۱۵:۶۷)	۲۹
۵۳۳۴	۶۸-القلم (۵۲)	
۷۳۱	(۲:۶۸)	۲۱۸
۷۳۲	(۴۹:۶۸)	۲۱۲
۵۳۸۶	۶۹-الحاقة (۵۲)	
۷۳۳	(۴۱:۶۹)	۷۲
۷۳۴	(۴۲:۶۹)	۷۲
۷۳۵	(۴۳:۶۹)	۷۲
۵۴۳۰	۷۰-المعارج (۴۴)	
۷۳۶	(۴:۷۰)	۱۶
۷۳۷	(۱۹:۷۰)	۲۵۲
۷۳۸	(۲۰:۷۰)	۲۵۲
۷۳۹	(۲۱:۷۰)	۲۵۲
۷۴۰	(۲۲:۷۰)	۲۵۲
۷۴۱	(۲۳:۷۰)	۲۵۲

شمارہ	شمارہ آیت مع سورہ	صفحہ کتاب
۵۴۵۸	۷۱- نوح (۲۸)	
۷۴۲	(۷۱: ۱۳)	۱۷
۷۴۳	(۷۱: ۱۴)	۱۷
۷۴۴	(۷۱: ۱۷)	۱۷
۵۴۸۶	۷۲- الجن (۲۸)	
۵۵۰۲	۷۳- المزمل (۲۰)	
۷۴۵	(۷۳: ۴)	۷۳
۷۴۶	(۷۳: ۲۰)	۱۳۸
۵۵۲۲	۷۴- المدثر (۵۶)	
۷۴۷	(۷۴: ۳)	۲۰۶
۷۴۸	(۷۴: ۴)	۲۰۶
۷۴۹	(۷۴: ۵)	۲۰۶
۵۶۰۲	۷۵- القیٰمة (۴۰)	
۵۶۳۳	۷۶- الدھر (۳۱)	
۵۶۸۳	۷۷- المرسلٰت (۵۰)	
۷۵۰	(۷۷: ۴۸)	۱۰۸
۷۵۱	(۷۷: ۴۹)	۱۰۸
۵۷۲۳	۷۸- النبا (۴۰)	
۵۷۶۹	۷۹- النزعٰت (۴۶)	
۵۸۱۱	۸۰- عبس (۴۲)	
۵۸۴۰	۸۱- التکویر (۲۹)	
۵۸۵۹	۸۲- الانفطار (۱۹)	
۵۸۹۵	۸۳- التطفیف (۳۶)	
۵۹۲۰	۸۴- الانشقاق (۲۵)	
۵۹۴۲	۸۵- البروج (۲۲)	

شمارہ	شمارہ آیت مع سورہ	صفحہ کتاب
۵۹۵۹	۸۶- الطارق (۱۷)	
۵۹۷۸	۸۷- الاعلیٰ (۱۹)	
۶۰۰۴	۸۸- الغاشیة (۲۶)	
۶۰۳۴	۸۹- الفجر (۳۰)	
۶۰۵۴	۹۰- البلد (۲۰)	
۶۰۶۹	۹۱- الشمس (۱۵)	
۶۰۹۰	۹۲- الیل (۲۱)	
۷۵۲	(۹۲: ۱۹)	۲۱۸
۷۵۳	(۹۲: ۲۰)	۲۱۸
۶۱۰۱	۹۳- الضحیٰ (۱۱)	
۷۵۴	(۹۳: ۱۱)	۲۱۸
۶۱۰۹	۹۴- الانشراح (۸)	
۶۱۱۷	۹۵- التین (۸)	
۷۵۵	(۹۵: ۴)	۱۲
۷۵۶	(۹۵: ۵)	۱۲
۶۱۳۶	۹۶- العلق (۱۹)	
۷۵۷	(۹۶: ۴)	۱۷۵
۷۵۸	(۹۶: ۵)	۱۷۵
۷۵۹	(۹۶: ۶)	۱۷۵
۷۶۰	(۹۶: ۷)	۱۷۵
۷۶۱	(۹۶: ۸)	۱۷۵
۶۱۴۱	۹۷- القدر (۵)	
۶۱۴۹	۹۸- البینة (۸)	
۶۱۵۷	۹۹- الزلزال (۸)	
۶۱۶۸	۱۰۰- العدیٰت (۱۱)	

شمارہ	شمارہ آیت مع سورہ	صفحہ کتاب
۶۱۷۹	۱۰۱- القارعة (۱۱)	
۶۱۸۷	۱۰۲- التکاثر (۸)	
۶۱۹۰	۱۰۳- العصر (۳)	
۶۱۹۹	۱۰۴- الھمزة (۹)	
۶۲۰۴	۱۰۵- الفیل (۵)	
۶۲۰۸	۱۰۶- القریش (۴)	
۶۲۱۵	۱۰۷- الماعون (۷)	
۷۶۲	(۱۰۷: ۴)	۲۵۲
۷۶۳	(۱۰۷: ۵)	۲۵۲
۷۶۴	(۱۰۷: ۶)	۲۵۲
۷۶۵	(۱۰۷: ۷)	۲۵۲
۶۲۱۸	۱۰۸- الکوثر (۳)	
۶۲۲۴	۱۰۹- الکفرون (۶)	
۷۶۶	(۱۰۹: ۶)	۱۶۱
۶۲۲۷	۱۱۰- النصر (۳)	
۷۶۷	(۱۱۰: ۱)	۱۶۱
۷۶۸	(۱۱۰: ۲)	۱۶۱
۷۶۹	(۱۱۰: ۳)	۱۶۱
۶۲۳۲	۱۱۱- اللھب (۵)	
۶۲۳۶	۱۱۲- الاخلاص (۴)	
۶۲۴۱	۱۱۳- الفلق (۵)	
۶۲۴۷	۱۱۴- الناس (۶)	

تمت بالخیر

قرآن مجید کی کل آیات کی تعداد ۶۲۴۷ ہے جن میں سے مندرجہ صدر حساب سے کم و بیش ۷۶۹ یعنی ۱/۸ یا ان آیات کی تشریح گویا تخمیناً قرآن کا آٹھواں حصہ پہلی جلد میں آگیا ہے۔ عربی افتتاحیہ میں علیٰ ہذا القیاس قریباً ۹۲۶ آیات آچکی ہیں گویا اس منتخب کتاب میں ہی کتاب الٰہی کے ساتویں حصے کی تشریح ہوگئی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تذکرہ

مقدمہ کتاب ماہیت

ایمان و حکمت عبادات وغیرہ

التذکرہ پبلیکیشنز

تہدیہ بحضور خدائے عزوجل

1342ھ میں تذکرہ کی پہلی جلد' چودھویں صدی کے وسط یعنی 1350ھ میں خاکسار تحریک اور اب 1370ھ میں حریم غیب' دہ الباب' حدیث القرآن' اور ارمغان حکیم کی دکھ میں لکھی ہوئے تصنیفیں شعرو نثر میں بہ حکم خاتم النبین رسول صلعم پیش کر رہا ہوں تاکہ

بنی نوع انسان کی تاریخ میں پہلی دفعہ

قرآن حکیم اور پیدائش کائنات کا آخری مقصد عیاں ہو جائے۔

تیری درگاہ سے قبولیت کی نئی امید ہے تاکہ بھٹکی ہوئی دنیا راہ راست پر آجائے۔ آمین

مقام شکر ہے کہ تیس برس کے بعد مغرب کے مشاہیر مستشرقین نے

میرے تذکرہ کی صرف پہلی جلد کو دیکھ کر اعلان کر دیا ہے کہ " اس اسلام میں جو میں نے پیش کیا ہے' تعمیر اقوام کا انتہائی طور پر کامیاب اور عالم آرا لائحہ عمل موجود ہے اور یہ اسلام بالفاظ دیگر الٰہی اصلاح مدن کا عکس اور بے خطا مرقع ہے"۔ ان کی نگاہوں میں "تذکرہ چودہ سو برس کی اسلامی تحریروں کے بنجر میں واحد گلستان ہے"۔ وغیرہ وغیرہ الحمدللہ علی ذلک

اب مغرب کے علمان فطرت جوق در جوق میرے بتائے ہوئے

مقصد پیدائش کائنات پر جمع ہو رہے ہیں تاکہ انسانی ارتقاء کی راہ کھلے۔ بار الٰہا مدد کر۔

عنایت اللہ خان المشرقی

2 جمادی الاول 1374ھ مطابق 28 دسمبر 1954ء

چودھویں صدی ہجری کے اختتام اور پندرھویں صدی ہجری کے آغاز پر "تذکرہ" (حضرت علامہ محمد عنایت اللہ خان المشرقیؒ) کی موجودہ اشاعت اس نقطۂ نظر اور مصمم ارادہ کے ساتھ شروع کی جا رہی ہے کہ مطبوعہ "تذکرہ" کی اشاعت کے بعد اس کے غیر مطبوعہ حصوں کو بھی منظر عام پر لایا جائے۔ اور دریا کو کوزے کے اندر بند کر کے سب کو مزید تشنہ لب نہ رکھا جائے۔ جلد اول "تذکرہ" کے یہ حصے آپ کے ہاتھوں میں اسی مقصد کے حصول کی جانب پہلا قدم کے طور پر ہیں۔ جلد اول کے ان چار حصوں کو دو جلدوں میں تقسیم (یعنی دیباچہ مع افتتاحیہ اور مقدمہ مع کتاب تذکرہ) کر دیا ہے اور ان جلدوں کو اول اور دوئم کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ جبکہ مطبوعہ جلد دوئم کو بطور جلد سوئم شائع کیا جائے گا۔ اور اس کے بعد تذکرہ کے غیر مطبوعہ حصوں کی اشاعت شروع کی جائے گی۔ جن کے مسودات ادارہ کے پاس محفوظ ہیں۔ تذکرہ کے ان حصوں کی اشاعت تذکرہ کے قاری کو چونکا دے گی کیونکہ کتاب کے یہ حصے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اور قرآن حکیم کی تعلیمات کے مکمل لب و لباب کو بیان کرتے ہیں۔

"تذکرہ" کے ان حصوں کی اشاعت کے لیے کچھ مدت درکار ہے۔ جہاں عوام نے 74 برس تک انتظار کیا اب کچھ مدت اور انتظار کر کے دعا گو رہیں کہ ہم اس مشن میں کامیابی اور کامرانی سے ہم کنار ہو کر یونہی ملک و ملت اور خصوصاً مسلمانان عالم کی خدمت سرانجام دیتے رہیں اور اپنے قیام کے مقصد کے حصول (کہ مسلمانان عالم کو بہترین، جامع مستند اور نفع بخش ادب سے متعارف کرایا جائے) میں لگے رہیں۔

آج تذکرہ کی یہ اشاعت شروع کر کے ہم کسی حد تک ان فرائض سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں جو ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ ملت اسلامیہ کو اپنے عائد فرائض سے عہدہ برآ ہوتے رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیا عجب کہ مسلمانان عالم اس عظیم الشان زندہ صحیفہ میں دیئے گئے عروج اور بیداری کے غیر مختتم درس کو حاصل کر کے اسلام کی ڈانواں ڈول کشتی کو پار لگانے کا سوچیں۔ گو ایٹم بم اور جدید ٹیکنالوجی کے اس زمانے میں کند تلواروں اور پیٹ پر پتھر باندھنے کے ہتھیاروں سے غلبہ حاصل کرنے کی امید رکھنا باؤلا پن ہے لیکن لوہے کے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ایمان اور یقین، عزم اور ارادہ اتحاد اور ولولے کے ہتھیار ہمیشہ بدرجہا زیادہ کار آمد رہے ہیں۔ جن کے ذریعے سے کمزور لازماً ابھرتا رہا ہے۔ اور کچھ عجب نہیں آج بھی مسلمانوں کا کوئی گروہ کسی جگہ پوری تیاری کے ساتھ ساتھ ان دل اور جگر کے ہتھیاروں کے ساتھ ہی ابھرے۔ اور دنیا کو پھر حیران کر دے"

فطرت

آ قوموں کی میں کہ دوں تقدیر کی منطق کیا\
فطرت کی سمجھ جتنی قوم اتنی ہی زور آور\
ہر شے بہ جز انسان کو بتلا دی ہے رہ اپنی\
آدم کے لئے فطرت ہر علم کا ہے مصدر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آج ایک مدت کے بعد حضرت علامہ المشرقیؒ کے پیغام کی از سر نو صحیح، بہترین اور جامع خطوط پر وسیع اشاعت میرے لیے انتہائی خوشی کا باعث ہے۔

آج اس پیغام کی دوبارہ اشاعت پر میں خود میں ایک بے پناہ توانائی محسوس کر رہی ہوں۔ اس بے پناہ توانائی نے میری کمزوریوں اور کمزور ہونے کے مسلسل احساس کو یکلخت ختم کر کے مجھے طاقتور بنا دیا ہے۔

علامہ صاحب کی وفات کے بعد ان کے پیغام کا قوم تک صحیح طریقہ سے نہ پہنچنے سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا۔ درمیان میں جو جنریشن گیپ GAP GENERATION (جسکا پر ہونا ناممکن ہوتا ہے) آنے والا تھا۔ التذکرہ پبلی کیشنز جیسے فعال ادارہ کے قیام سے یہ خطرہ کافی حد تک ٹل گیا ہے۔

ایسے کٹھن وقت میں اس ادارہ کا قیام درحقیقت ایک جہاد کا سا نصب العین رکھتا ہے۔ ادارہ نے جس ذمہ داری سے اس کام کو سنبھالا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اس ضمن میں میں ادارہ کی جانب سے تمام اقدامات پر مطمئن ہوں۔

میں ان کے لیے دعا گو ہوں کہ یہ اپنے عظیم مقصد کے حصول میں کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ اور ایک بار پھر اس پیغام کی وسیع اشاعت کے ذریعے مسلمانانِ عالم میں عمل کی بے پناہ لہر موجزن کر دیں۔

[illegible]

مورخہ: 30 ستمبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلد دوم

مقدمہ کتاب ماہیت ایمان و حکمت عبادات وغیرہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝ (۱۸: ۱-۲)

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۗ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِیْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۝ (۲۸: ۵۸-۵۹)

مسلمانانِ عالم گذشتہ دو صدیوں سے ایک مسلسل انحطاط کے گرداب میں مبتلا ہیں۔ اِس تنزل کی سُرعت، اور ہبوط کی تیز رفتاری جس قدر خوفناک ہے اُسی قدر وہ عالم جمود اور فقدانِ حسّ درد انگیز ہے جو مسلمانوں کو کامل طمانیت اور سکونِ دل کے ساتھ قطعی ہلاکت اور یقینی موت کی طرف لیجا رہا ہے۔ ملت کے ہر فرد میں وہ قوائے ظاہری و باطنی جو تمدّن کی جان، اور عمران کی رُوحِ رواں ہیں مفقود ہو چکے ہیں۔ وہ جذباتِ آہنی جن کی زد بنیادِ اقوام کو کپکپا دیتی ہے نرم پڑ چکے ہیں۔ قوم کا ایک ایک متنفّس انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بیکار ہو گیا ہے۔ حسیاتِ دینی کا اہم اور مفید تر حصہ زائل، اور امتیازاتِ دنیوی کی تحصیل میں مُسلمانوں کا تعطّل

ضرب المثل ہو گیا ہے۔ قوّتِ ارادی اور قدرتِ اقدامِ عمل تنظیمِ جماعت اور تقسیمِ کار، قوائے عاملہ کا اتحاد و تمرکز، استقلال اور استمدادِ باہمی کا دستور العمل، مطاوعت و انقیاد کا جذبۂ مشترک، اور سیادت و قیادت کا ملکۂ سلیم، جن کے التزام کے بغیر اقوام کیا افراد بھی چھوٹے سے چھوٹا کام پایۂ تکمیل کو نہیں پونہچا سکتے محض چند مہمل کلمات رہ گئے ہیں جو حقیقت سے بے بہرہ، اور معانی سے ناآشنا ہیں۔ اِس حالت میں تعجب نہیں اگر حصولِ مُراد کی ہر کوشش میں مسلمانوں کو بالآخر ناکامی کا سامنا ہوتا ہو؛ ہر تدبیر جو وہ اپنی بہتری کی اُمید میں عمل میں لائیں نامُرادی سے بدل جاتی ہو؛ ذہنی انتشار، اور جماعتی تفریق و تشتت کا ہولناک عفریت اُن کی قوّتِ عمل کو بے اثر کر دیتا ہو؛ اور حرماں نصیبی ان کے کمزور اخلاق پر غلبہ پا کر اُن کے جذبۂ ایمان کو کچل دیتی ہو۔

مَیں ایک مُدت سے اِس دردناک نظارے کو بکراہِ تمام دیکھ رہا ہوں۔ گذشتہ سَو سال کے تاریخی شواہد، اور سیاسی نامۂ اعمال کی روح فرسا سرگذشت نے ثابت کر دیا ہے کہ اُمت حاضرہ اب اخلاقی تنزل کے اُن انتہائی مدارج تک پونہچ چکی ہے جہاں اُن کا کوئی فعل، کوئی طریقِ عمل، روئے زمین کے کسی حصے پر صلاحیت سے تکمیل کو نہیں پونہچتا۔ اگر نظامِ عمل کے عام فقدان کے باوجود، بالفرض کسی فرد یا جماعت کو ایک طریق کار کی طرف جانے کی توفیق عطا ہوئی ہے تو پیشتر اِسکے کہ کوئی مفید نتیجہ نکلے، مخالف اثرات اور تشتت کے ہلاکت آفرین جراثیم نے اُس جماعت کی انتظامی قوّت کو اندر ہی اندر سلب کر دیا ہے! قوم کی جس تحریک کی طرف دیکھو یہی حال ہے۔ گذشتہ قرن کے اندر ترکوں کی سب سے اہم مُلکی تحریک، جو ایک نقطۂ نظر سے منظّم، اور یک مقتدر وزیرِ اعظم (مدحت پاشا) کے سیاسی تخیل کا نتیجہ تھی، دستوری حکومت کے اصول کی سی سالہ تبلیغ اور بالآخر اس کا انعقاد ہے۔ مگر یہ ایک کُھلی حقیقت ہے کہ انجمنِ اتحاد و ترقی چند لمحوں کے لیے بھی یورپ کی اِس عجیب و غریب صنعت کی 'حسناتِ جاریہ' اور 'برکاتِ لامتناہیہ' سے بہرہ اندوز نہ ہو سکی، اور ترکوں کی سلطنت کے لیے اِس کا رسمی نفاذ بالآخر اعلانِ شکست ثابت ہوا!

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولا برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

تاریخ کے صفحات خونیں کو اور اُلٹ دیجئے، یہی رنگ نظر آئے گا۔ سوڈان میں مہدی کا ہولناک خروج، مصر میں محمد عبدہٗ کی نیم سیاسی تبلیغ، ہندوستان میں ہنگامۂ غدر، جنگ بلقان کا المناک حشر، ایران میں مجلس شوریٰ کا انعقاد وغیرہ وغیرہ، سب کے سب اہم اور ہمہ گیر انقلابات تھے، لیکن اگر بہ امعانِ نظر اُن کے سقوط کے اصلی اسباب کی چھان بین کی جائے تو ہر نامرادی اور فساد کی تہ میں عدم نظامِ عمل اور وسائل کی یاس انگیز کمی، استقلال کا فقدان اور ذہنی طوائف الملوکی، جدوجہد کا تشتت اور غلط اندازۂ کار، آرا کا ہولناک تفرقہ اور قوتوں کا المناک انتشار، ایک ہلاکت آفرین معجون کی صورت میں نظر آئے گا۔ کم و بیش یہی صورت قوم کے ادنیٰ مشاغل کی ہے۔ کوئی مُلکی تحریک یا مقامی تجویز، اجتماعی انجمن یا سیاسی مجلس، خیراتی مصرف یا تجارتی شرکت، علمی مشغلہ یا انتظامی سلسلہ، ایسا نہیں جو مسلمانوں کی مختصر پسندانہ کارفرمائی سے ایک اقلِ قلیل مُدت میں کالعدم نہ ہوگیا ہو!

ہمچوں سپند پیش تو اے مختصر پسند!
در نالہ تمام کنم ماجرائے دل

مگر فی الحقیقت جو حوادث دنیائے اسلام پر اس چودھویں صدی کے آغاز میں رونما ہو رہے ہیں اُن کی مثال اسلام کی گذشتہ ہزار سالہ تاریخ کا تاریک سے تاریک صفحہ بھی پیش نہیں کرسکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بالآخر صدیوں کی مُزمن بیماری نے مریض کے ہر عضو کو مضمحل، اور ہر جوڑ کو درد آمود کردیا ہے۔ اعضا کی پیہم شکست، اور طاقت کے مسلسل زوال نے دفعۃً خوفناک علامات پیدا کردی ہیں۔ دل، دماغ، اور جگر، سب کے سب مرض کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔ سلامتی اور بقا کی چند آخری گھڑیاں ہلاکت اور فنا کے مہیب دیو سے قطعی اور فیصلہ کن مجادلہ کرنے کو ہیں۔ حیات مستعار کے چند عارضی لمحات عدم کی بیکراں ازلیت اور ابدیت کے محیط میں پیوست ہونے کو ہیں! اگر معیشت

اور ممات کی یہ اندوہناک کشمکش فی الحقیقت کذب اور یقین، فساد اور امن، باطل اور حق کی آخری آویزش ہے تو فیصلہ اٹل ہے: فنا کی لازوال حقیقت کے سامنے کسی باطل اور فاسد ہستی کی کچھ وقعت نہیں، وہ مٹ کر رہے گی، اور تمام کوششیں جو اسکو فروغ دینے کے لئے اس اخیر وقت میں کی جائیں گی بیکار ثابت ہوں گی۔ لیکن اگر اسلام سراپا **حقانیت** ہے، مجسمہ **صدق** اور سرچشمہ **حقیقت** ہے، شارع قدرت کی عالمگیر سنتوں میں سے ایک **سُنّت** ہے، تو فطرت کا عدل اور تسویہ اس امر کا مجاز ہو نہیں سکتا کہ ایک حقیقت کے نفوذ و اجراء کے ضمن میں دوسری حقیقت قربان کر دی جائے، یا کائناتِ فطرت کی اپنی طاقتیں ہی ایک دوسری کی تخریب و تعدیم پر آمادہ ہو جائیں!

فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا، لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ، ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ق
وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ (۳۰ : ۳۰)

دینِ اسلام خدا کی بنائی ہوئی وہ فطرت ہے جس پر اُسنے تمام انسانوں کو پیدا کیا، اِس سے کسی فرد کو مفر نہیں، اور خدا ساز فطرت میں کسی ردّ و بدل کا امکان نہیں۔ دنیا کو نباہنے کا یہی صحیح اسلوب عمل اور صراطِ مستقیم ہے، لیکن اکثر لوگ اِس حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا ○ (۳۳ : ۶۲)

اور تُو قانونِ خدا میں کوئی ردّ و بدل ہرگز نہیں پائے گا۔

اِس قطعی استدلال کی بنا پر میرا ایمان ہے کہ قانونِ فطرت کی کوئی مُضمر حقیقت اسلام کو فنا نہیں کر سکتی، مُسلمانانِ عالم کا روئے زمین پر بالآخر بطور ایک غالب عنصر کے رہنا لابدی ہے؛ اور جب تک زمین و آسمان اور کُل کائنات موجود ہے یہ صورت قائم ہو کر رہے گی۔ اگر موجِ حوادث کے تلاطم اور واقعات کی لشکر انگیزی نے بظاہر اس کُلیے سے انحراف پیدا کر دیا ہے تو وہ استثنائی اور عارضی ہے، اسکی حقیقت سوا اِسکے نہیں کہ مخالف ا

٭ دینِ اسلام کے متعلق قرآن کا دعوےٰ ہے: فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا، یعنی یہ کہ تمام ساکنانِ زمین کو اِسی پر مجبول کر دیا ہے، اور یہی اُن کی فطرت ہے! ایک بڑے اور حیرت انگیز دعوے کا اعلان ہے جسکو دو اور دو چار کی طرح عیاں کر دینا ہر مُسلمان کا فرض ہے، صرف کہہ دینے سے کوئی شخص اِسکو مان نہیں سکتا۔ یوں تو اِس دعوے کے صحیح مفہوم کو سرسری نظر سے پالینا بھی از بس مشکل ہے۔ اور اِسی لئے کہا گیا ہے کہ اکثر لوگ اِس حقیقت کبریٰ کا علم نہیں رکھتے۔ بہر نوع یہی نکتہ اِس کتاب کے طول و عرض میں پیشِ نظر ہے، گو کہ نتائج اخیر پر جاکر مترتب ہوں گے۔

اثرات کے دباؤ نے ایک غیر مانوس صورت نمایاں کر دی ہے جو ہٹ کر رہے گی! دینِ اسلام کے عالم آرا تعمیری† فلسفے کا یہی وہ بنیادی پتھر ہے جس نے اس کے قیام و استحکام کا ذمہ ابتدائے آفرینش سے لیا، اور جو آج تیرہ سو سال کے مصائب و نوائبِ ہائلہ کے باوجود اسکی حیات کو قطعی، اور اسکے قانون کو ازلی اور ابدی قرار دیتا ہے۔ صانع قدرت نے اس اصلیت کا انکشاف فطرت کے ہر اصول اور ہر طرز عمل میں کیا ہے، جب تک صداقت صداقت ہے، اُس کا غلبہ، جہاں کہیں وہ ہو، یا جس پیرایہ میں ظاہر ہو، ناگزیر اور اٹل ہے۔ اگر دنیا میں کذب و ریا، مکر و تلبیس، ظلم و خدع کے لاانتہا فساد انگیز اثرات کے باوجود فطرت کے اصول قائم، اور قانونِ خدا کی حکومت مسلط ہے تو اس کا اصلی راز یہی ہے، اگر ہوا و ہوس کی چند روزہ گرم بازاری، اور خواہشاتِ سفلی کی عارضی رَوا روی کے باوجود سطح زمین اب تک بحیثیت مجموعی جادہ اعتدال سے منحرف نہیں ہوئی تو اس کا حقیقی باعث یہی ہے۔ باطل اور فاسد ہستی کے تصادم کا ایک مستقل حقیقت پر اثر بعینہٖ مثل اس پتھر کے نقش کے ہے جو ایک اتھاہ سمندر کی سطح پر پھینکنے سے خفیف تموج تو چند لمحوں کے لیئے پیدا کر دیتا ہے، مگر اپنی ہستی کو ابد الآباد کے لیئے کالعدم کر دیتا ہے!

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

اسلام کا زندہ اثر آج اگر اس قلیل مدت کے بعد، فی الحقیقت نابود ہو گیا ہے تو دو صورتیں ہیں، کائناتِ قدرت کا مسئلۂ قیام نیز ختم ہے، فطرت کی عظیم الشان تعمیر کا نظم و نسق بھی اپنی بنیاد سے ہٹ چکا ہے، کیفیات کے طلوع و غروب کی عمر بھی پوری ہونے کو ہے، اجسام کا جذب و اتصال، اجزا کا مزج و خلط، احوال کی مداولت، آثار کا حلول، تراکیب کا فعل و رد عمل، یہ سب کچھ بھی اپنی اپنی مہلت پا کر رخصت ہو رہے ہیں اور بالآخر معمول فطرت کے اس حیرت انگیز استیلائے اثر کے بعد، زوالِ عالم کی منزل قریب ہے! اور اگر یہ حالت نہیں تو آج خود نفسِ اسلام بلکہ مقاصدِ قرآن کے اندر، حقیقت کی روح قطعاً نہیں رہی، اُسکی قوتِ تاثیر و نفوذ اپنا ظرف چھوڑ کر کسی دوسرے قالب میں

† فلسفۂ اسلام کو عالم آرا اور تعمیری ہر دو ثابت کرنا اس کتاب کا منتہائے نظر ہے۔

منتقل ہوگئی ہے؛ اُسکا دائرۂ علم و عمل مُندرِس، اور اُسکی رُؤیائے قلب محو ہوگئی ہے! معنی کی عروسِ منفعل، بدسلوک نااہل مسلمان کی رفاقت سے بیزار ہو جانیکے بعد، صورت کے تنگ و تاریک اور الفاظ کے مہلک سوخ حُجلوں کے اندر، اِس تغافل، بے اعتنائی، اور بیدردی کا شکار ہوئی ہے کہ آج اُسکی ہستی کا اعتراف بھی کسی متنفس کو نہیں رہا!

دنیائے حقیقت نوازی کی جنگ آج اِس قتیلِ غفلت کی اِنہی فاسد اور ناکارہ ہڈیوں سے ہے جن کے ڈھیر کی المناک سرگذشت، مہلت✝ کے پردۂ خفا نے قرنہا قرن تک مستور رکھی! زمانے کا باطل رُبا مگر جیرت جسم ہاتھ آج قصاب خانۂ روح و عمل کی اِسی مدبوحِ حیا نعش کو سپردِ زمین کر رہا ہے جس کے ایام سعید کا عہد حیات، مہرِ نیمروز کی کرنوں سے بھی درخشاں تر حقیقت تھی! آہ! لیکن قالب کا مکین اگرچہ رخصت ہوچکا ہے، اور حقیقت کی مضطرِ قرار روح بہتر اور صالح تر جسموں میں حلول کر گئی ہے، مگر زمانے کی عجائب نمائی، بلکہ ربِ لم یزل کے تقاضائے غیرت نے کم از کم اِس مُردہ ڈھانچے کی اِس قدر حُرمت تو ضرور برقرار رکھی ہے کہ آج صدہا برس کی موت کے بعد بھی اُس کے اصلی خط و خال کا نقشہ صاحبِ نظر سے نہاں ہو نہیں سکتا۔ قرآن عظیم اب بھی جہل و نسیان کی ظلمات کے اندر وہ سطیع و نطیق حکمت ہے کہ عمیق نظروں میں سیاہی کا تقابل اُسکی سپیدی اور چمک کو اور بھی دوبالا کر رہا ہے! مطالب کی غلط فہمیوں، اور مقاصد کی دور افتادگیوں کے باعث جس قدر اسکی ہر بات عوام کے نزدیک ناقابلِ التفات اور بے معنی ہورہی ہے، اُسی قدر صحیح القلب نقادکی نظروں میں اسکی عظمت کا رنگ کُھلتا جا رہا ہے! اسلام کی از سرِ نو حیات کے دن لامحالہ اُس وقت پھرنے لگیں گے جب کہ بد اعمالی، کفر، اور تکذیب کے ہوش رُبا جمود، اور عالم گیر شکست و ریخت کے مُحیط الکل عجز میں خود مُسلمانوں کا کوئی غمزدہ اور دل باختہ بندۂ خدا، قرآن حکیم کی طرف پھر متوجہ ہوگا، اور نافہمی، غلط عملی، سیہ بینی، باطل آرائی اور عدم تعین کے حجاب در حجاب کو اُس کے ماتمی اور پژمردہ چہرے سے اُلٹ کر، ایمان کی اصلیت کو بے نقاب کر دے گا۔ اُسی دن حقیقت کی روٹھی ہوئی دُلہن پھر

✝ خلافت عباسیہ کے عہد انحطاط (چوتھی صدی ہجری) یا اسکے کچھ دیر بعد سے آجتک جزنانہ جزوی امن یا عالم آرا خوف کا دنیائے اسلام پر گذرا ہے میرے نزدیک 'مُہلت' کی ایک صورت ہے جو لامحالہ آخری اور انتہائی عذاب کا پیش خیمہ ہے۔ اِسی زمانے میں اسلام رفتہ رفتہ صرف ایک 'صورت' و 'رسم' کا نام رہ گیا۔ 'معنی' اور 'روح' دونوں نکلتے گئے!

مٹ جائے گی اور اسلام کے ویران گھر کو یکدم آباد کردے گی!

اسی بنا پر قرآن کریم کا وہ مُبشرانہ اور فیصلہ کُن وعدہ جو آیہ کریمہ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ[1] (۳ : ۱۳۸) میں ہے، ایک ایسی حقیقت کے ساتھ مشروط ہے جس کا التزام اجتماعی غلبے کے استمرار و تسلسل کے لیئے بمنزلہ روح ہے۔ ایمان کی جانفزا صداقت، مرگ و زیست کی ہر کشمکش کے قیام کے لیئے اکسیرِ اعظم ہے؛ وہ ہر کامرانی کی کلید، اور ہر کامیابی کی تمہید ہے؛ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے لیئے مومیائی اور مرے ہوئے حوصلوں کے لیئے آبِ حیات ہے؛ اسکی ہر افزایش میں کُشادِ کار کا راز، اور ہر کاہش میں نامرادی کا بھید ہے؛ وہ فتح کی ہر منزل پر نئی روح، اور شکست کی ہر علامت پر نئی زندگی بخشتی ہے؛ وہ اجماعِ اُمّت کا مرکز، نظم و نسق کا محور، اور انتہائی جدّ و جہد کی اساس ہے؛ اسکی کشش اتّصال، فاسد اور متفرق طاقتوں کو جمع کرکے قُوّتِ دفاع کو دیوارِ آہن کی طرح مضبوط کردیتی ہے؛ اسکا انجذابی اثر، اشتات و انتشار کے اجزا کو سمیٹ کر اقدامِ عمل کی توفیق دیتا ہے؛ جس متنفس کو حیات کی جانکاہ مسافرت میں ایسا سچا رہنما نصیب ہو، اُسکے ہر گام پر فتح و نصرت شاملِ حال ہے؛ اور جس قوم کو تحفظ و بقا کے اندوہناک مجادلے میں ایسا جارحانہ اور مدافعانہ حربہ عطا ہُوا ہو، اُسکا مخالف اثرات پر تسلط یقینی، اور تغلب اور تمکّن فی الارض ایک طے شدہ امر ہے:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۚ وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۲۴ : ۵۵)

تم میں سے جن لوگوں کا ایمان سچے دل سے قائم رہا، اور جنہوں نے اسکے علاوہ تن دہی سے اعمال صالحہ بھی کیئے، اُن سے اللہ جل شانہٗ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں قیام عطا فرمائے گا جیسے اُن لوگوں کو قیام عطا فرمایا تھا جو اُن سے پہلے ہو گذرے ہیں؛ وہ اس دین کو جو اُس نے اُنکے لیئے پسند کیا ہے جما کر رہے گا، اور بعد ازاں اُس خوف کو بھی جو اُنہیں دشمن سے لاحق ہے امن سے بدل دیگا۔ ان کا مسلک عمل یہ ہے کہ میرے غلام بنکر میرے حکموں پر چلتے ہیں (يَعْبُدُونَنِي)، اور طاعت گذاری میں کسی دوسری شئے کو میرے ہم مقام

---

[1] اور نرم پڑ کر ہمت نہ ہارو، اور آزردہ خاطر نہ ہو کیونکہ اگر تم ایمان والے ہو تو آخر کار سب میں تمہاری ہی جیت ہے۔

نہ کریں (لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا)۔ اور جنہوں نے اس تمکن اور قیام کے بعد اطاعت احکام سے انحراف کیا، اور اپنی بداعمالیوں کے باعث اس نعمتِ عظمیٰ کی بیقدری کی (کَفَرَ)، تو وہی فاسق ہیں؛ [+] (اور وہی اجتماعی ہلاکت کے اہل ہوں گے [+] (۴۶ : ۳۵))

شارعِ قدرت کا یہ حتمی میثاق، نہ صرف اسلام بلکہ تمام اقوامِ عالم کی حیات و ممات کا مکمل اور آخری فیصلہ ہے۔ قرآن کریم کی حجت بالغہ، اور شریعتِ خدا کی حکمت جامعہ و مانعہ، جہد للبقا اور مقاومۃ للنفس کے اُس طبعی نتیجے پر تیرہ سو برس پہلے پونہچ چکی ہے، جو فلسفہ دان فارابی، ہیکل اور ڈارون [¥] کے مسئلہ ارتقا و انتخاب طبیعی کی اصطلاح میں "بقائے اصلح" کے نام سے معروف ہے۔ اِس آیہ کریمہ میں دو باتوں کا فیصلہ کر دیا ہے: اولاً یہ کہ "استخلاف فی الارض"

[+] آیاتِ ماقبل، (۲۴ : ۴۰-۵۴)، و مابعد (۲۴ : ۵۶)، کے ربط کو پیشِ نظر رکھکر، مجاہدت، شرک، کفر اور فسق کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کی لغت میں یہ چاروں اصطلاحیں، اور ان کی مثل اور الفاظ جن کا ذکر آگے آئے گا، اس قدر جامع اور مانع ہیں کہ ان کی صحیح اور ناقابلِ انکار تشریح کرنا، در اصل قرآن کی تمام حکمت اور لائحہ عمل کو عیاں کر دینا ہے۔ یہاں پر یَعْبُدُوْنَنِیْ سے لیکر فٰسِقُوْنَ تک جو ترجمہ کیا گیا ہے وہ اپنی اندر قت ہے، مگر اس کا کافی ثبوت کتاب کے آیندہ اوراق میں مل رہیگا۔ قرآنِ حکیم کا ربط بھی اس قدر ظاہر اور باہر نہیں کہ اس کو کتاب کے محض ابتدائی اوراق میں واضح کیا جا سکے۔ اس کے لیئے بے انتہا غور و فکر اور صحیح علم کی ضرورت ہے۔

[+] سورۂ احقاف کے اخیر میں ہے: فَهَلْ یُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ۝ (۴۶ : ۳۵) "تو کیا ماسوا فاسق قوم کے کوئی اور قوم بھی ہلاک ہو سکتی ہے؟" گویا فاسق قوم کی ہلاکت قطعی ہے۔ اس بنا پر ترجمے میں اس ضروری ایضاح کا سبب ظاہر ہے۔

[¥] مسئلۂ ارتقا، جس کی مجمل تشریح آیندہ موقع پر کر دی جائے گی، منجملہ ان عالم آرا مسائل کے ہے جس کی اختراع و ابداع اور تصدیق کے متعلق چند سرآوردہ ناموں کا انتخاب کر لینا از بس مشکل ہے۔ مختلف قرون کے علما نے اس مسئلے پر بحثیں کیں، اور ہر بار متعدد اضافے ہوتے رہے۔ اہل یونان اور رومۃ الکبریٰ کے زمانۂ عروج میں اسکے اعتراف کے آثار پائے جاتے ہیں؛ مگر ماسوا ہراقلیطس (المتوفی ۴۷۵ قبل مسیح) اور لوقریطس (المتوفی ۵۵ قبل مسیح)، مشہور شاعر کے کوئی پُرانا فلسفی اسکے متعلق مفید معلومات بہم نہیں پونہچاتا۔ اہل ہند کی پُرانی کتابوں میں کہیں کہیں اسکا مشکوک سا ذکر پایا جاتا ہے۔ اسلام کے عہدِ عروج میں مختلف حکمانے اس مسئلے کو لیا، اور اسکے متعلق بہت کچھ چھان بین کی۔ اس سلسلے میں، الفارابی (المتوفی ۳۳۹ھ-۹۵۰ء)، ابن سینا (المتوفی ۴۲۹ھ-۱۰۳۷ء)، ابن باجہ (المتوفی ۵۳۳ھ-۱۱۳۸ء)، اور ابن مسکویہ (المتوفی ۴۲۲ھ-۱۰۳۰ء)، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یورپ کے عہدِ ارتقا میں جو نام سب سے زیادہ سربرآوردہ ہیں، ہیکل (المتولد ۱۲۴۴ھ-۱۸۳۴ء)، والیس (المتولد ۱۲۳۸ھ-۱۸۲۳ء)، ہکسلے (المتوفی ۱۳۱۳ھ-۱۸۹۵ء)، اور ڈارون (المتوفی ۱۲۹۹ھ-۱۸۸۲ء) کے نام ہیں۔ موخر الذکر کی کتاب "اصل الانواع" مطبوعہ ۱۲۷۶ھ-۱۸۵۹ء نے آج اس مسئلے کو پایہ ثبوت تک اس قدر پونہچا دیا ہے کہ اب اسکی تحقیق و تدوین کا تمام سہرا ڈارون کے سر پر ہے۔ لیکن اس عظیم الشان نظریئے کی ارتقائی شق کے دعوے کو اول اول جن علما نے مستقل صورت دی وہ حکمائے اسلام ہی ہیں۔ ابن خلدون نے تاریخ العبر کے مقدمے میں بھی ضمناً اسکی طرف اشارہ کیا ہے۔ اصل کتاب میں ہم نے ابو نصر محمد الفارابی کا نام بتخصیص پیش کیا ہے نہ صرف اسلیئے کہ مسئلہ ارتقا کی ابتدائی تدوین و تحقیق میں الفارابی کو بہت بڑا دخل تھا بلکہ اسلیئے کہ اس حکیم اجل کی عالمِ اسلام میں خاص قدر و منزلت تھی۔ وفیات الاعیان میں ابن خلکان نے بو علی سینا کے اس استادِ معظم کو اسلام کا سب سے بڑا حکیم کہا ہے!

یعنی بقاء واستبقاء کے لئے ایمان شرط ہے، اور اللہ کا وعدہ اُنہی لوگوں سے کیا گیا ہے جو ایمان رکھتے ہوں۔ ثانیاً یہ کہ ایمان کامل کے ہوتے ہوئے اعمالِ صالحہ کا اکتساب لازمی امر ہے۔ جس جماعت کے افراد میں یہ دونوں باتیں موجود ہوں وہی اصلح ہے؛ اُسی کی صیانت اور سلامتی کا ذمہ قانونِ فطرت نے اپنے

✣ قرآن کریم میں استخلاف کا لفظ، آیہ استخلاف سے قطع نظر، چار موقعوں پر آیا ہے۔ جو یہاں پر اس وسیع التاویل لفظ کے مطلب کی صحیح توضیح کے خیال سے لکھ دیئے جاتے ہیں۔ پہلا موقع سورۂ انعام میں ہے:

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِن بَعْدِكُم مَّا يَشَاءُ كَمَا أَنشَأَكُم مِّن ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ (۶: ۱۳۳)

اور اے پیغمبر! جہاں تمہارا پروردگار بڑا رحم والا ہے وہاں بڑا بے نیاز بھی ہے، وہ اگر مناسب سمجھے تو تم سب کو دنیا سے اٹھا لے جائے، اور تمہارے بعد جس میں اہلیت دیکھے تمہارا جانشین کر دے، جیسا کہ آخر دوسرے لوگوں کو ہلاک کر کے اُن کی بقیہ نسل سے تم کو فروغ دے ہی چکا ہے۔

(یشاء کے معنی ہم نے مناسب سمجھنا کئے ہیں، اس کا ثبوت فلسفۂ عمل کے عنوان یعنی دوسری جلد میں آئیگا)۔ دوسرا موقع سورۂ اعراف میں ہے:

قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۷: ۱۲۹)

اس پر موسیٰ نے جواب دیا کہ لوگو! اب وہ وقت قریب آلگا ہے کہ تمہارا خدا تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے، اور تم کو ملک میں اُسکا جانشین بنائے۔ پھر دیکھے کہ تم کیا کیسی روش اختیار کرتے ہو۔

تیسری جگہ سورۂ ہود میں ہے:

فَإِن تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُم مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ (۱۱: ۵۸)

اس پر ہودؑ نے اُن سے کہا کہ اگر تم نے ان احکام سے گریز کیا تو کم از کم میں نے اپنا پیغام تم تک پہنچا دیا، اور اس نافرمانی کا نتیجہ لامحالہ یہ ہوگا کہ خدائے علیم تم کو ہلاک کر کے کسی دوسری قوم کو تمہارا جانشین کر دے گا، اور وہ اس قدر صاحب قوت ہوں گے کہ تم اُن کا کچھ بگاڑ بھی نہ سکو گے اور یاد رکھو کہ میرا پروردگار ہر قوم کے اعمال کو بغور تمام دیکھ رہا ہے۔

ایک موقع جس میں استخلاف کا لفظ ذرا مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے، سورۂ حدید میں ہے:

آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ فَالَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَأَنفَقُوا لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ (۵۷: ۷)

لوگو! خدا کو خدا مانو، اور رسول کو اُسکا بھیجا ہوا پیغامبر سمجھ کر اُسکے احکام کی تعمیل کرو، اور اُس مال میں جسکا وارث اگلوں کو تباہ کر کے تم کو بنایا ہے (اعلائے خدا میں) صرف کرو، کیونکہ جو لوگ احکام کی پیروی کرتے رہے، اور جنہوں نے ایثار مال کیا، اُن کو خدا کے ہاں سے اجر عظیم ہے۔

(آمنو کے ان معانی کی تشریح آگے آئے گی، یہاں اس سے بحث نہیں۔) ان چاروں مثالوں سے یہ امر واضح ہے کہ استخلاف کے معانی قرآن کریم میں ایک قوم کو ہلاک کر کے دوسری کو اُسکا جانشین بنانا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ نہ اس سے مراد بالخصوص وہ سلسلۂ خلافت ہے جس کا مرکز آجکل قسطنطنیہ ہے۔ اگرچہ وہ بھی اِسمیں شامل ہے۔ نہ اس سے مراد خاص کر عرب کا استخلاف ہے، نہ عجم کا۔ نہ مشرق کا اور نہ مغرب کا۔ جو قوم ایک کے ہلاک ہوتے پیچھے اُسکے مُلک اور دولت کی وارث ہوئی وہی مستخلف ہے۔ خواہ وہ چین کی ہو یا روم کی۔ یہی بقاء واستبقاء ہے، اور اسی لحاظ سے ہم نے یہ معانی متن میں لکھے ہیں۔

استخلاف کے ان معانی کی حتمی تائید قرآنِ عظیم کی دو اور آیتوں سے ہوتی ہے جن کے نفس موضوع کا مقابلہ سورۂ ہود کی متذکرۂ صدر آیت (۱۱: ۵۸) سے کرنا چاہیئے۔ سورۂ توبہ میں ہے: إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۹: ۳۹)

اگر اے عافیت پسند عرب کے لوگو! تم اس موقع پر لڑائی کے واسطے ہمہ تن مستعد نہ ہوئے تو خدا تم کو دردناک سزا دے گا اور تمہارے سوا کسی دوسری مستعد

اوپر لیا ہے۔ قرونِ ماضیہ کی اقوام متمدنہ کی طرح اُسکا غلبہ اور استخلاف قائم رہیگا جب تک ایمان اور صلاحیتِ عمل اُن میں باقی رہے، اور فسق و کفر کی حد تک نہ پہنچیں!

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما!

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۹) قوم کو تم سے بدل دے گا، اور وہ اِس قدر صاحبِ قوت ہوں گے کہ تم اُن کا کچھ بگاڑ بھی نہ سکو گے، اور یاد رکھو کہ خدا وہ بے نیاز خدا ہے کہ وہ ہر بات کر سکتا ہے'۔ یہاں 'یستبدل' اور 'یستخلف' کا ترادف عیاں ہے۔ سورۂ محمد میں بھی 'یستبدل' اِنہی معنوں میں ہے: وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ ٪ (۴۷: ۳۸) یعنی اگر تم نے اِن احکام سے سرتابی کی تو کچھ پروا نہیں وہ خدائے عظیم تمہارے سوا کسی اور قوم کو تم پر لا بٹھائے گا۔ پھر وہ تم جیسے بدعمل نافرمان اور نفس پسند بھی نہ ہوں گے"۔ اِن آیات قرآنی سے صاف ظاہر ہے کہ استخلافِ اقوام در اصل اُن کا استبدال ہی ہے۔ جو قوم بادشاہت زمین کی اہل نہ رہی، جو قانونِ خداسے سرتابی کرنے کے باعث اپنی قوتیں سلب کر چکی اُس کا روئے زمین پر سے یک بینی و دو گوش نکالے جانا قطعی ہے۔ جو وارث زمین ہے وہی 'مستخلف' ہے وہی بہتر اور صالح تر ہے، وہی ناقابلِ ضرر اور قوی تر ہے، اور اُسیکا اس دنیا پر باقی رہنا طے شدہ امر ہے۔

خَلَفَ کا استعمال استخلاف اور بقا کے معنوں میں کئی جگہ ہوا ہے۔ یہاں پر تین موقعے قابل ذکر ہیں: وَلَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنَا مِنۡکُمۡ مَّلٰٓئِکَۃً فِی الۡاَرۡضِ یَخۡلُفُوۡنَ ○ (۴۳: ۶۰)، "اور اگر ہم مناسب سمجھتے تو تمہی کو فرشتے بنکر اس زمین میں تمہارا جانشین کر دیتے"۔ ثُمَّ جَعَلۡنٰکُمۡ خَلٰٓئِفَ فِی الۡاَرۡضِ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ لِنَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ ○ (۱۰: ۱۴)، "پھر ہم نے اُن کے ہلاک ہوئے پیچھے تم کو زمین میں ان کا جانشین بنایا کہ دیکھیں کہ تم کیا سعی و عمل کرتے ہو"۔ وَمَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَہُوَ یُخۡلِفُہٗ ۚ (۳۴: ۳۹)، "اور جو ایثارِ مال بھی تم کرتے ہو خدا اُسکو بقا نصیب کرتا ہے اور اسکا عوض دیتا ہے"۔ اِن مثالوں سے ظاہر ہے کہ خلف اور استخلف در اصل ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ اور اِنہی معنوں میں اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً ؕ (۲: ۳۰) ہے؛ یعنی "میں زمین میں ایک قائم مقام بنانے والا ہوں"۔

ایک اور بات جو ضمناً اِن آیتوں اور بالخصوص (۷: ۱۲۹)، (۱۱: ۵۷)، (۱۰: ۱۴) سے مترشح ہے، یہ ہے کہ مستخلف فی الارض کا مقام حاصل کرنے، اور اُسکو قائم رکھنے کے لیے 'عمل' کرنا شرط ہے۔ آیۂ استخلاف میں شرط 'عمل صالح' ہے۔ اب یہی یہ بات کہ عمل صالح کیا شے ہے۔ اِس کا جواب اس کتاب کے طول و عرض میں ملے گا۔ اور 'صلاح' کی تعریف از روئے قرآن کرنا آسان کام نہیں۔

تیسری بات جو اِن آیات میں غور طلب ہے یہ ہے کہ 'الارض' کا استعمال (۷: ۱۲۹)، (۴۳: ۶۰)، اور (۲: ۳۰) میں مطلق معنوں میں ہوا ہے، اِس سے کوئی خاص حصہ زمین مراد نہیں، جیساکہ آیۂ استخلاف کے 'الارض' کے متعلق بعض مفسرین کا خیال ہے، اور وہاں 'الارض' کے معنی زمینِ مکہ لیے ہیں۔ یہ بحث کتاب کے متن میں کی جائے گی، لیکن یہاں اِس بات کا اظہار ضروری ہے کہ 'الارض' کا لفظ مطلق ہے۔ (۷: ۱۲۹) سے کچھ شبہ پڑتا ہے کہ موسیٰ کی مراد خطۂ مصر ہو گر تاریخ شاہد ہے کہ بنی اسرائیل کو استخلاف سرزمین مصر میں ایک مدت مدید کے بعد حاصل ہوا، اِس سے پیشتر وہ ملک شام میں بادشاہ بن چکے تھے۔ (۱۰: ۱۴) سے بھی خفیف سا شبہ پڑتا ہے۔ لیکن اِس سے پہلی آیت (۱۰: ۱۳) کو ملا کر پڑھنے سے یہ شبہ رفع ہو جاتا ہے۔ بہر نوع اِن آیات کے غائر مطالعے کے بعد یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ قرآن کا استخلاف فی الارض کے الفاظ سے اقوامِ عالم کا اِس بسیط زمین پر اجتماعی بقا حاصل کرنا مراد ہے، اِسے کم و بیش کچھ نہیں۔ وہ شرعی یا مذہبی حل جو اِس اصطلاح کے گرد اگرد مرورِ وقت یا کسی تکرار کے باعث پیدا ہو گیا ہے خود لوگوں کا پیدا کردہ ہے، قرآن کریم کو اِس سے کچھ سروکار نہیں۔

ڈارون کا نظریۂ ارتقا† نشأ آفرینش سے لیکر ظہورِ انسان تک، ہر ذی حیات شئے کی انفرادی

† مسئلہ ارتقا کی تخفیف و توہین جس انداز سے آج مسلمانانِ عالم اپنی کمی علم اور غلبۂ جہل کے باعث کر رہے ہیں، اُس سے کم از کم یہ تشریح ہوتا ہے کہ انحطاط پذیر اقوام میں اپنے آبائی کارناموں کی یاد کس سرعت سے محو ہو جاتی ہے۔ صفحہ ۸ کے تحت المتن میں چند مسلم اسلامی حکمائے عظام کا ذکر کیا گیا تھا جنہوں نے اس مسئلے کی تصدیق و تثبیت میں مستقل حصہ لیا، اسکو علم کلام کا اہم جزو قرار دیا، علم فطرت کی ایک بڑی حد تک توسیع کر کے مختلف ثبوت اسکی تائید میں بہم پونہچائے، اور صاف اور غیر مشکوک الفاظ میں ارتقا کی نوعیت بیان کی۔ لیکن آج چونکہ مغربی حکمانے اس نظریئے کو پایۂ ثبوت تک پونہچا دیا ہے، اور اس سے مستقل نتائج اخذ کر کے حقائق کی راہیں ڈھونڈھ رہے ہیں، مسلمان اس سے یکسر بیزار ہو گئے ہیں، اور اسکی تضحیک کر کے اپنی نادانی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ مسئلہ ارتقا و انتخاب طبیعی، آج مغرب کے تمام پہنائے علم و تحقیق میں وہ عظیم الشان انکشاف ہے جس کی عظمت اور نافعیت کا صحیح اندازہ لگانا قانون فطرت کے صحیح علم کے بدون از بس مشکل ہے۔ اس مسئلے نے صحیح معنوں میں فطرت کے سرِ عظیم کو ایک بہت بڑی حد تک آشکار کر دیا ہے! اس نے حیات کے حجاب کبیرہ کو چاک کر کے انسان کو معرفت نفس کا پہلا اور گراں قدر سبق دیا ہے! اس نے انسان کو شناسائی خدا میں مستقل مدد دی ہے! اس نے وحدت خدا اور وحدت ماسوا، وحدت مکان اور وحدتِ مکین کو ثابت کرنے میں اہم حصہ لیا ہے! اس نے انسان کا دائرۂ علم و عمل بیحد وسیع کر کے اسکو صحیح معنوں میں خدا کا قائم مقام بنا دیا ہے! نہیں بلکہ اسنے زوال و بقائے اُمم کے وہ پنہاں اصول بھی ایک حد تک عیاں کر دیئے ہیں جو الہامی کتابوں، اور بالخصوص قرآن حکیم کے سوا آجتک اور کہیں نہیں ملے۔ جو لوگ اس مسئلے سے اس لیئے بیزار ہیں کہ انہیں اسکو خود اختیاری کے باعث تعطل خدا کی شان پائی جاتی ہے، یا اسکی خالقیت میں ایک ناقابل برداشت تعویق ثابت ہوتی ہے، اُن کے دلوں میں خدا کی عظمت اور قدرت، ازلیت اور ابدیت کا اندازہ بہت کم ہے۔ قرآن میں مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ[1] (۲۲: ۷۴)، اس امر کی شہادت ہے۔ اکثر لوگ اُس خلّاقِ عظیم کا اندازہ انسانی قوتوں اور بشری واماندگیوں کو پیش نظر رکھکر کرتے ہیں، اور اسی لیئے اصلیت کی لاانتہا وسعت تک نہیں پونہچ سکتے۔ مختصر الفاظ میں اس مسئلے کا یہ دعوےٰ ہے:۔

۱۔ اِس عالمِ کون و مکان اور پہنائے زمین و آسمان کے اندر آفرینش کے ابتدائی ایام سے لیکر آجتک ایک ارتقائی اور تغیری، ایک تدریجی اور ترکیبی انقلاب واقع ہو رہا ہے جو تخلیق کا فوری اور بلاواسطہ باعث ہے، حرکت اور حرارت اس تکوین کی علل اُولیٰ ہیں۔ علت انتہائی وہ علّۃ العلل وجود ہے جس نے سب اشیا کو اپنی اپنی جبلت عطا کر کے اپنے اپنے کام پر لگا دیا ہے؛

قرآن حکیم کا محاکمہ اس امر کے متعلق موسیٰ علیہ السلام کے ان الفاظ سے ظاہر ہے:۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝ (۲۰: ۴۹-۵۰)

فرعون نے طنز اندازہ سوال پوچھا کہ اے موسیٰ! وہ تم دونوں بھائیوں کا پروردگار کون ہے؟ موسیٰ نے جواب دیا کہ وہ وُہ رب بے مثال ہے جس نے عالم کائنات کی ہر مخلوق شئے کو اسکی جبلت اور خلقت عطا فرما کر اپنا اپنا راہ راست دکھلا دیا ہے۔

۲۔ عالمِ موجودات کی سب ذی حیات مخلوق، بشمولیت نباتات و خوردبینی حیوانات، ایک سلسلۂ تکوین کی مختلف کڑیاں ہیں جنکو بقدر اُنکے اعضائے رئیسہ و غیر رئیسہ کی سہولت اشکال ترکیب کے ایک تدریجی سلسلے میں مرتب کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب تکوین آفرینش کے مختلف مراحل میں ایک معین ترتیب سے ہوئی اور بتدریج ہوئی ہے، اس دبستان کا کمال اوج انسان ہے جسکے اعضا کی تقویم سب اعلیٰ حیوانات سے بہر نوع بہتر ہے؛

---

[1] لوگوں نے خدا کی عظمت کا اندازہ ہرگز اس طرح پر نہیں کیا جیسا کہ کرنے کا حق تھا۔

جنس قوی سے تغلب اور اجتماعی جدوجہد کی داستان، حفظ نفس اور ترقی نسل کے متواتر اجتہاد کی سرگذشت

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۱) لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ (۹۵: ۴-۵)

(اے ساکنانِ زمین! اس عالم کائنات کا ہر ذرہ اس بات کا شاہد ہے کہ) ہم نے انسان کو احسن الخلق بنایا، اُسکے اعضا میں بہترین صلاحیت اور استعداد پیدا کی۔ پھر اِس صلاحیت کے انحطاط کے باعث اسکو (اُسی) کمتر سے کمتر مخلوق کی طرف لوٹا لائے (جو کبھی زمانے میں تھا)۔

(ہم نے التین الزیتون کی شہادت پیش نہیں کی، ان کی تشریح میں ابھی بہت دیر ہے۔ مگر رَدَدْنَاهُ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ انسان اپنی نشاۃ اول کے ابتدائی مراحل میں اسفل سافلین تھا۔ اسفل سافلین کی علمی تشریح آگے چلکر ہوگی۔)

۳۔ "دنیا ایک عظیم الشان امتحان گاہ جدوعمل ہے جسمیں ہر ذی حیات فرد بلطور ایک مجاہد کے ہے۔ سب کے سب اپنے اپنے دائروں کے اندر، ایک لامتناہی کشمکش، اور غیر منقطع مزاحمت میں لگے ہیں۔ قیام و بقا کا تمامتر حصر اسی جدوجہد پر ہے۔ ہر جنس، نوع، اور فرد، جغرافیائی اور استطاعتی حدود کے اندر، اپنی ہمسایہ مخلوق کے بالمقابل صف آرا ہے، فطری اور مقامی موانعات کا مقابلہ کر رہی ہے، بہتر اور قوی تر اجناس سے نبرد آزما ہے، دشمن سے عہدہ برآ ہونے کی تجویز میں لگی ہے، کمتر اور کمزور تر مخلوق پر متسلط ہونے کی سعی کر رہی ہے۔ الغرض اپنی بہبودی اور بچاؤ، اپنی تقویت اور دفاع کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ اِس مقام نظر سے عالم حیوانات و نباتات کی سب مجتمعات باقیہ، قوی تر اجناس و انواع کی جارحانہ دستبرد کے باعث، ایک متصل خوف کے ماحول میں گھری ہیں جس سے بچ نکلنا، اور جسکو امن سے بدل دینا ہر زندہ مخلوق کا منتہائے وحید ہے۔"

قرآن حکیم کا تمام دستور العمل من وعن اِس فردی اور اجتماعی جدوجہد کا مؤید ہے۔ چند مثالیں صفحہ ۱۰ کے تحت المتن میں لفظ استخلاف کی بحث کے ضمن میں گذر چکی ہیں، مگر لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۝ (۵۳: ۳۹) کا اٹل اصول قرآن عظیم کے ہر ورق پر جلی حروف میں لکھا ہے۔ آیۂ استخلاف کا نفس موضوع بھی اِسی خوفِ عدو کو حفظ و امن میں بدل دینے کی معنی خیز داستان ہے؛ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا کا محفوظ مقام کسی قوم کو صرف اُس وقت نصیب ہو سکتا ہے جب وہ مُمَکَّن فی الارض بن چکے، اور بے سعی و عمل اِسکا حاصل کر لینا قطعاً محال ہے۔

جنس قوی کی جارحانہ دستبرد اور تشدد، اِس ابتلاگاہ سعی و عمل میں، وہ بدیہی امر ہے کہ اسکے لیے کسی بڑی چھان بین کی ضرورت نہیں۔ ادنیٰ مخلوق سے لیکر اشرف الخلق انسان تک ہر نوع اِس قاعدے پر عمل پیرا ہے؛ قوی ہر جا اپنی طاقت کا استعمال ضعیف جنس پر کر رہا ہے؛ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل کر اپنا پیٹ پال رہی ہے؛ کمزور قومیں زور آور قوموں سے ہر قسم خوف زدہ ہیں، اور ہر طرف دستِ زور بالا کی تعمیل بظاہر ہو رہی ہے۔ سورۂ انفال میں خدائے عظیم نے قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کو اِسی خوفِ عدو کا ماحول یاد دلا کر عیاں کر دیا تھا کہ دشمن پر غالب آکر محفوظ مقام حاصل کر لینا ہی انسانی ہے:

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ (۸: ۲۶)

اور مسلمانو! وہ وقت یاد کرو جب تم اِس زمین میں تھوڑی سی تعداد میں تھے، کمزور اور بے بس گنے جاتے تھے، اور ہر آن اِس خوف کے باعث سہمے رہتے تھے کہ دشمن تمہیں اُچک نہ لیجائیں۔ پھر خدائے ذو الجلال نے (تمہارے اعمال کو پسند فرما کر) تم کو اپنی پناہ میں لے لیا، اپنی مدد سے تم کو قوی

---

۵۱ انسان کو کچھ میسر نہیں مگر وہ جو بقدر اُسکی سعی کے ہے۔ ۵۲ مطالب کے لیے دیکھو صفحہ

صنفِ ضعیف کے سقوط، اور صنفِ اصلح کے بقا اور تدریجی ارتقا کی مسلسل روئیداد، طبقاتُ الارض کی

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۲) بنایا، اور دشمن پر فتح دے کر عمدہ قسم کی دنیاوی نعمتیں بخشیں، اور یہ سب اس لئے کہ تم ان نعمائے الٰہی کی دل سے قدر کرو۔ (لعلکم تشکرون)۔ (شکر کے ان معانی کا ثبوت بعد میں ملیگا، یہاں اس پر بحث نہیں)۔

٭ مختلف انواع و اجناس کا ظہور اور قیام، خارجی اور مقامی حال و احوال اور باطنی استعداد و صعود کے متفقہ زیرِ اثر رہتا ہے۔ جو نوعیں احوالِ طبیعت کی خارجی مزاحمت کے بالمقابل پوری نہ اتر سکیں، مٹتی گئیں، جنہوں نے اس کشمکش میں پورا حصہ لیکر اپنے آپ کو مستعد ثابت کیا، صعود کرتی گئیں۔ عالمِ حیات کا سب کون و فساد اسی عالم آرا اصول کے ماتحت ہو رہا ہے۔ "حفظِ نفس" اس مزاحمت کا محرکِ اوّل ہے۔ جس نباتی یا حیوانی نوع کا "استخلاف" زمین کے کسی حصے پر قائم ہے، وہ "صالح" ہے۔ جس کا تمکن فی الارض مٹتا جا رہا ہے وہ "غیر صالح" ہے۔ جو نوع سب سے متمکن، سب سے زیادہ مجاہد اور مستعد، سب سے زیادہ تکثر اور ارتقائی اہلیت رکھتی ہے وہی اپنے دائرے کے اندر "اصلح" ہے، اسی کا بقا قطعی ہے، فطرت خود بخود اسکا انتخاب کر کے اُسکو بے خوف و خطر کر دیتی ہے!

انسانی امتوں کے قیام و بقا کے متعلق قرآن حکیم نے بعینہٖ یہی از والی اصول پیش کیے جو آج مغرب کی تمام علمی تحقیقات اور مادی تقدم کے محور عمل بن چکے ہیں۔ سورۂ اعراف میں ہے:۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۙ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝ يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي ۙ فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۷ : ۳۴-۳۵)

اور ہر ایک گروہ کے صفحۂ ہستی سے مٹنے کی ایک میعاد مقرر ہے، پھر جب اسکی تباہی کے اسباب مکمل ہو چکتے ہیں تو اس سے ایک گھڑی نہ پیچھے رہ سکتے ہیں نہ ایک گھڑی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ پھر اگر اس وقت کوئی عذر پیش کرے گا تو ہم کہیں گے کہ اے بنی آدم! ہم نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جب کبھی ہماری طرف سے تم ہی میں سے ہمارے قاصد تمہارے پاس پہنچیں، اور ہمارے احکام تم پر واضح کر دیں، تو جس قوم نے ان احکام پر عمل کر کے حفظِ نفس کی راہ اختیار کر لی (اتقیٰ)، جو ہلاکت سے دامن بچا کر چلی (اتقیٰ)، اور صالح بن گئی (اصلح) اُسکو اس دنیا میں کسی قسم کا خوف و خطر نہیں!

آگے چلکر ہم اسی مجلد میں ثابت کرینگے کہ "اتقا" کی بعض اہم شرائط کیا ہیں؛ "اتقا" کی مکمل تشریح "عمل" کے عنوان (چوتھی مجلد) میں آئے گی۔ "صلاح" کی تعریف میں ابھی بہت دیر ہے۔ وہ عظیم الشان آیات جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عالمِ حیوانات کا قانونِ فنا و بقا بھی اسی انداز پر ہے جس پر انسانی امتیں چل رہی ہیں بہت بعد میں آئینگی۔ یہاں پر ہم نے صرف قرآن حکیم کی چند معاون آیات کو پیش کر دیا ہے۔ ان سے کچھ ثابت کرنا ابھی مقصود نہیں۔ لیکن اگر کتاب کے اس محض ابتدائی حصے میں کوئی نتیجہ خیز اور قابلِ ذکر بات ان آیات سے مستنبط ہو سکتی ہے تو یہ ہے کہ کتابِ الٰہی نے کس التزام کے ساتھ استخلاف فی الارض کی شرط کو جا بجا سعی و عمل، امتحان و ابتلا، تگ و دو قرار دیا ہے جو سلسلۂ ارتقا کی اصلی روح رواں ہے۔ چنانچہ اسی ضمن میں سورۂ انعام کی آخری آیت نہایت قابلِ لحاظ ہے:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (۶ : ۱۶۶)

اے ساکنانِ زمین! خداوندِ عظیم الاختیار خدا ہے جس نے تمکو اس زمین میں اپنا نائب اور قائم مقام مقرر کیا ہے (کہ تم اسکی حکومت اور انتظام کو اپنے ہاتھ میں لو)، اور تم میں سے ایک قوم کو دوسری قوم پر کئی درجے فضیلت اس لئے دی ہو کہ معیشت کی اس مسابقانہ کشمکش میں وہ تمہاری اُن قوتوں اور صلاحیتوں کا امتحان لے جو اُس نے تم کو دیں۔ جانے رہو کہ اگر تم اس ابتلا میں پورے نہ اُتر سکے، اور دوسروں سے پیچھے رہ گئے، تو لامحالہ خدا تمہارا جلد جلد سزا دینے والا ہے، اور اگر اپنی سعی و عمل کے باعث سبقت لے گئے تو اس میں بھی شک نہیں کہ وہ عیوب پر بڑا پردہ ڈالنے والا

مٹی میں دبی ہوئی ہڈیوں کی زبانی ہے۔ اس تمام پیچیدہ مسئلے کی تہ میں یہ بات ظاہر کر دی گئی ہے کہ

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۳) (غفور) اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔

۵۔ "انسان کی تکوین کمتر مخلوق کے ارتقا سے ہوئی، مگر اس انقلابِ عظیم کی تکمیل میں قرنہا قرن گذر گئے، حتیٰ کہ ایک نوع کا انتقال اُس سے اگلی نوع میں بھی ہزارہا برس میں ہوا! اس مُدتِ مدید میں زمین بھی لاانتہا جغرافی اور طبعی، کیمیاوی اور تعمیری انقلابات کا مکین رہی، اور اب تک ہے۔ ارتقا کا سلسلہ بند نہیں ہوا، بلکہ جب تک زمین و آسمان موجود ہے، جاری رہیگا۔ اِس نقطۂ نظر سے بہت ممکن ہے کہ ایک مُدت کے بعد انسان اپنی قوتوں، صلاحیتوں، اور علم و عمل میں ارتقا کرتے ہوئے اس سے بھی بہتر مخلوق بن سکے جو اپنی صفات میں شارعِ کائنات کی ذات سے قریب تر ہو! اِس بنا پر زمین و آسمان کی تکوین کا سلسلہ انسانی نقطۂ نظر سے ایک بے پایاں سلسلہ ہے جو ہزار در ہزار بلکہ لکھو کھا برس سے چل رہا ہے اور ممکن ہے کہ لکھو کھا برس تک اِسی طرح چلتا رہے؟"

مسئلہ ارتقا کی اِس شق کے متعلق قرآن کریم میں وہ حیرت انگیز اور ناقابلِ انکار شہادت موجود ہے کہ اُس کا تمام و کمال یہاں پر لکھ دینا بہت کچھ پیش از وقت ہے۔ یہاں پر صرف چند آیات اور اُن کا مربوط ترجمہ لکھ دیا جاتا ہے۔ صحتِ مطالب کی ناقابلِ رد دلائل ایک ایک نقطہ کے متعلق اپنے اپنے موقع پر انشاءاللہ متن میں آئیں گی۔ سورۂ سجدہ میں ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ٥ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ٥ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ٥ الَّذِیْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ٥ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ٥ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ٥ (۳۲: ۴-۹)

لوگو! خدا وہ عظیم و جلیل خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کے اِس حیرت انگیز کارخانے کو چھ بڑے مدید الوقت اور طویل المیعاد دَوروں میں پیدا کیا، اور اب تختِ سلطنت (العرش) پر جا بیٹھا اس اور اِس عظمیٰ کو چلا رہا ہے۔ لوگو! اُسکے سوا نہ تمہارا کوئی کارساز ہے، نہ سفارشی۔ اُسی کی حکومت ہر جا چل رہی ہے، اُسی کا قانون ہر جگہ جاری و ساری ہے، تو کیا تم لوگ اِس کارخانہ جہان اور اِس عالم آرا حکومت سے کچھ عبرت نہیں پکڑتے!

وہ وُہ عظیم کار اور بزرگ اعمال خدا ہے کہ ایک عالم آرا قانون (الامر)، ایک امرِ مہتم (الامر)، ایک جلیل القدر فیصلہ یا معاملہ (الامر) کی تجویز آسمان سے لیکر زمین تک کر دیتا ہے، پھر وہ معاملہ، اپنی عظمت اور وسعت کے باعث، رفتہ رفتہ اور نامحسوس طور پر، ایک مُدتِ مدید میں (فِیْ یَوْمٍ) جس کی مقدار انسانی شمار کے لحاظ سے ایک ہزار برس یا اِس سے بھی زیادہ ہو، اُسکی مشیت کی طرف (اِلَیْهِ) صعود کرتا ہے (یَعْرُجُ)، اور اپنے اصل زور و اثر سے کمال کو پہنچ جاتا ہے! (گویا اُسکی عظیم الشان تجویزیں ہزارہا برس میں جاکر مکمل ہوتی ہیں، اُسکے قانون کا عالم انگیز نفوذ صدیوں میں چلکر محسوس ہوتا ہے، اسکی اٹل مشیت قرنوں کے امتداد کے باوجود پوری ہو رہتی ہے) یہ ہے وہ ہزاروں برس کے بعد کے حالات کا علم رکھنے والا (عٰلِمُ الْغَیْبِ)، اور آج کے حال و احوال کا صحیح پرکھنے والا (وَالشَّهَادَةِ)، غالب القوی (الْعَزِیْزُ)، صاحبِ عفو و درگذر (الرَّحِیْمُ) خدا جسکے رحم و تحمل اور کمالِ علم و عمل پر یہ کارگاہ لگ کر چل رہا ہے!

وہ وُہ صنّاعِ عظیم ہے جس نے ہر پیدا کردہ شے کو بہتر سے بہتر کر دیا ہے، اور انسان سی اشرف الخلق مخلوق کی ابتدا (بَدَاَ) مٹی سی حقیر اور کمتر مخلوق سے کی؛ پھر رفتہ رفتہ اِس بدءِ اول، اِس کمتر مخلوق، اور اِس خلقِ قدیم کی نسل کو ہزارہا برس کی تدبیر امر اور تشکیل نو [illegible]

عالم حیوانات کی کشمکش حیات میں جسمانی زور، یا جارحانہ قوت ہی کسی جنس کے قیام کے لیے کافی نہیں ہو سکتی

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۴) مادۂ تناسل ہے، جو ایک حقیر سا پانی کا نچوڑ ہے، جاری رکھا! پھر تناسل کے اس عظیم الشان مرحلے کو طے کرنے کے بعد اُس خلق جدید کے اعضا میں، ہزارہا برس کی مزید تجویز و تدبیر کے بعد، بہترین تناسب قائم کیا (ثُمَّ سَوّٰىهُ)! اور پھر اس احسن الخلق شے میں اُس خدائے عزیز و رحیم نے اپنی ناپیدا مثال صفات اور اوصاف کا ایک ایک شمہ ڈالا، اسکو اپنی جناب سے تھوڑا سا علم، تھوڑی سی قدرت، تھوڑی سی سمجھ وغیرہ وغیرہ عطا فرما کر گویا اپنی روح اسمیں پھونک دی (وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ)! اور آج اسے اشرف الخلق انسانو! اس نے تم کو ان تمام مرحلوں سے گذار کر وہ عظیم الشان نعمائے الٰہی، اور اوصافِ کبریا کے وہ عدیم المثال مظاہر عطا کیے ہیں، جن کا نام کان ہے، آنکھ ہے، اور ذہن سلیم ہے، جن کے ذریعے سے تم صحیح معنوں میں (سب کمتر مخلوق کے نقلی کانوں، آنکھوں، اور قلوب سے قطع نظر) سُن سکتے ہو، دیکھ سکتے ہو، اور سمجھ سکتے ہو! افسوس کہ تم ان حیرت انگیز نعمتوں کی بہت ہی کم قدر کرتے ہو، اور ان کو بہت ہی کم صحیح استعمال میں لاتے ہو (قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ)

(الف) ان جلیل الشان آیات کے مطالب تک پہنچنا آسان کام نہیں، مگر قرآن کے طالب العلم کو محولہ بالا مطالب کی ابتدائی تصدیق کے لیے سورۂ مومن کی اُس آیت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے جس میں انسان کی پیدائش کو اسقدر عظیم اور مہتم امر قرار دیا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش کا اُس سے مقابلہ کیا ہے: لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۴۰ : ۵۷) "لوگو! اگر چشم واشا ہ کرو تو لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچو کہ آسمانوں اور زمین کی تکوین کا سلسلہ بنی نوع انسان کے سلسلۂ تکوین سے بہت کہیں بڑھ کر ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے"! گویا انسان کی تکوین کوئی خالہ کا گھر نہ تھی کہ ایک مٹی کا پُتلا سا بنا کر رکھ دیا، اور پھر اُسمیں معاذ اللہ کسی شعبدہ باز نے پھونک مار کر جان پیدا کر دی، جیسا کہ جُہلا کا خیال آجکل ہے، بلکہ وہ ایک عظیم الشان تعمیری سلسلہ تھا جو ہزارہا سالوں کے بعد تکمیل پذیر ہُوا! یہی بات قرآن کی متنی عبارت سے ظاہر ہے: (۳۲ : ۹-۷) — نَسْلَهُ، اور سَوّٰىهُ اور فِيهِ، میں هُوَ کی غائب ضمیر، لَكُمُ کی مخاطب ضمیر کی طرف رجوع کرنا بھی اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ هُوَ کی ضمیر انسان کی پہلی خلقتوں کی طرف ہے، نہ کہ خود انسان کی طرف۔ علاوہ ازیں انسانی نسل کو ایک نطفۂ منی سے جاری کرکے پھر اُسکا تسویہ کرنا قطعاً بے معنی ہے (ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ ....ثُمَّ سَوّٰىهُ) بتّ کے فقرے سے ہی جو (۳۲ : ۷) میں ہے یہ ظاہر ہے کہ خلقت کی ابتدا مٹی سے ہوئی نہ کہ تکمیل۔ آج علم جدید کی حیرت انگیز تحقیق بھی انسان بلکہ تمام حیوانات کو اسی طین لازب سے بنایا ہوا قرار دیتی ہے: إِنَّا خَلَقْنٰهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ (۳۷ : ۱۱) "ہم نے انسان کو لیس دار کیچڑ سے پیدا کیا"۔ سورۂ الرحمٰن میں ہے: خَلَقَ الْإِنسٰنَ مِن صَلْصٰلٍ كَالْفَخَّارِ (۵۵ : ۱۴) "اُس نے انسان کو ٹھیکری کی مانند بجتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا"! یہ بجتا ہوا لیس دار کیچڑ انسان کی تخلیق کا وہ سامان اوّل ہے جو ہر تالاب اور دلدل، جوہڑ اور سمندر کی تہ میں، یا جھیلوں کے کنارے پر، کثرت سے نظر آتا ہے، اور جس کے ملوث قوام کے اندر یورپ کا دقیقہ رس عالم اپنی خوردبین کے ذریعے سے اُس خلاقِ عظیم کی کروڑ در کروڑ مجرد ہستیاں چھپی ہوئی دیکھتا ہے۔ یہ سب وجود اسقدر دقیق ہیں کہ اُن کی کُل کائنات صرف ایک خلیہ یا مجوف ہے جسکے اندر حیات کا عالم آرا کمین محفوظ بیٹھا ہے! یورپ کے طبعی فلسفی کا دعویٰ ہے کہ کل ذی حیات مخلوق اسی نفس واحدہ کے اجتماع اور ارتقا سے ہوئی، اور قرنہا قرن میں اپنی ارتقائی استعداد کے باعث ایک مکان سے دوسرے مکان، یا اور ایک جائے قرار سے دوسری جائے قرار میں منتقل ہو کر اس مقام پر پہنچی جسکا نتیجہ اشرف الخلق انسان ہے! قرآن حکیم نے اس مہتم بالشان حقیقت کو، یورپ کی روح فرسا علمی تحقیق سے کامل بارہ سو برس پہلے، اُن ناقابل تاویل اور نالائق جمود الفاظ میں ادا کیا ہے جن کی اصلیع پا کر مغرب کے سب حکمائے عظام کا اس کتاب عظیم کے آگے سر جھکا دینا قطعی ہے! سورۂ انعام میں ہے:

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيٰتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ۝ (۶ : ۹۹)

لوگو! وہی خلاق عظیم تو ہے جس نے تم جیسے اشرف الخلق وجود کی ابتدا اور تدریجی نشاء، اول ایک مجرد ہی نفس مطلق سے کی (أَنشَأَكُم)، پھر اُس نفس واحدہ کو ایک عارضی جائے قرار (فَمُسْتَقَرٌّ) اور ایک مکان مستقر سے دوسری جائے قرار میں بدلا، حتیٰ کہ اُسے آخری مکان قرار مستودع یعنی اشیداع

بلکہ اسکی حفاظت اور بقا کا اصلی راز صلاحیت' اور استعداد' ہے۔ جس نوعِ حیوانی نے سعی و ابتلا کے

بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۵) (مُسْتَوْدَعٌ) میں سے آیا ہو اَحْسَنُ الْخَلْقِ بشر کا قالب ہے۔ جو قوم ہمارے اعمال کو سمجھتی، اور اسکا صحیح علم رکھتی ہے، اسکو ہم نے اپنی قدرت کے یہ عجوبات (الْاٰیٰت) ان لفظوں میں بالتفصیل بیان کر دیے ہیں۔

'نَفْسٌ' کا لفظ نہایت معنی خیز ہے جسکے معنی مطلق جان کے ہیں۔ قرآن حکیم میں انسان کی پیدائش کے متعلق ہر جگہ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ کا ذکر ہے بَشَرٍ واحدًا کہیں ذکر نہیں لیکن یہ بحث اپنے موقع پر دوسری جگہ آئے گی)

قرآن کو کتاب خدا مان کر مسئلہ ارتقا کے درست ہونے، یا مسئلہ ارتقا کی عینی اور علمی شہادت پاکر قرآن حکیم کے منجانب اللہ ہونے کی آجتک اِس سے بہتر اور روشن تر شہادت کہیں موجود نہیں!

(ب) يَعْرُجُ کے لفظ سے جو سورۂ سجدہ کی محولہ بالا آیت (۳۲ : ۵) میں ہے، از روئے نحو یہ ظاہر ہے کہ اِس کا فاعل خدا ہونا چاہیئے (يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ... ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ)، اور اِلَيْهِ کی ضمیر کا مرجع الْاَمْر ہونا چاہیئے۔ مگر مفسرین نے يَعْرُجُ کا فاعل الْاَمْر اور ضمیر کا مرجع خلاف اسلوب کلام خدا کلما ہے، اور اِس آیت کا عجیب و غریب ترجمہ کر دیا ہے جس کے نقل کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ متذکرہ صدر ترجمے میں از روئے نحو عام مفسرین کا اتباع کیا گیا ہے، مگر انصافاً اس اتباع کی ضرورت بھی معلوم نہیں ہوتی۔ اور چونکہ يَعْرُجُ کے معنی یہاں پر بتدریج ارتقا کرنے کے ہیں۔ اِسلیئے اِس نقطۂ نظر سے معانی اور بھی زیادہ صاف ہو جاتے ہیں:

خداوند عظیم کار اور بزرگ اعمال خدا ہے کہ ایک امر مہتم کی تجویز آسمان سے لیکر زمین تک کر دیتا ہے اور پھر اس امر عظیم کی طرف ایک مدت مدید میں جسکی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار سال ہوتی ہے آہستہ آہستہ اور نامحسوس طور پر ارتقا کرتا ہے۔" گویا اس امر کی تکمیل کہیں ہزار برس میں جاکر ہوتی ہے۔ اِس صاف ترجمے سے ارتقا کا وجود اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

(ج) سورۂ سجدہ کی يُدَبِّرُ الْاَمْرَ والی آیت سے يَوْم کی تشریح فیصلہ کن ہے، اور ظاہر ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش ہماری گنتی کے چھ دنوں میں جو کہ وجود بھی اُسوقت نہ تھا، نہیں ہوئی، بلکہ ہزاروں برس یا کم از کم چھ ہزار برس میں ہوئی۔ لیکن یہ تعیین بھی درست نہیں۔ کیونکہ ایک دوسری آیت میں يَوْم کی اِس تعیین کو اُڑا دیا گیا ہے اور كَاَلْفِ سَنَةٍ "کمکر اُسکو غیر محدود کر دیا گیا ہے: وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (۲۲ : ۴۷) "اور یہ لوگ تم سے عذاب کے بارے میں جلدی مچا رہے ہیں، حالانکہ خدا اپنا وعدہ ہرگز خلاف نہیں کرتا اور تمہارے پروردگار کے نزدیک تو ایک دن بھی تمہارے شمار کے ایک ہزار برس کی مانند ہوتا ہے، پھر اُسکو کونسی جلدی پڑی ہے۔" اور سورۂ معارج میں تو يَوْم کی مدت پچاس ہزار برس لکھی ہے: تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۝ (۷۰ : ۴) "ملائکہ اور رُوح بس خدائے عظیم کی طرف ایک مدت مدید (يَوْم) میں ارتقا کرتی ہیں جس کی مقدار پچاس ہزار برس کے برابر ہے"! الْمَلٰٓئِكَة اور الرُّوْح کی تشریح میں ابھی بہت دیر ہے۔ لیکن ان آیاتِ الٰہی سے ظاہر ہے کہ 'يَوْم' ایک لامحدود مدت ہے جو ہزاروں بلکہ لاکھوں برس کی ہو سکتی ہے، اور ارض و سمٰوٰت کی پیدائش بھی لاکھوں برس میں ہوئی۔ ملائکہ اور روح کا پچاس ہزار برس میں عروج کرنا (خواہ اُن کی حقیقت کچھ ہی کیوں نہ ہو) ارتقا کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے جو ہر صاحب نظر پر واضح ہے۔ مُستقر یا ارض کے متذکرہ صدر الفاظ میں لفظ مِثْلَهُنَّ (ان کی) کی تخصیص کو سمجھنے کے لیئے مزید تشریح درکار ہے جو آیندہ اوراق (صفحہ ۳۶ - ۳۷) میں کر دی جائے گی۔

(د) انسان کے اپنی موجودہ حالت سے بہتر مخلوق بننے کے متعلق قرآن عظیم میں ایک خفیف سا اشارہ ہے جو 'استخلاف' کی بحث میں صفحہ ۱۰ کے تحت المتن میں ہوئی، گذر چکا ہے۔ یہاں پر اسکا اعادہ کیا جاتا ہے: وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ۝ (۴۳ : ۶۰) "اور اگر ہم چاہتے تو تم ہی کو فرشتے بناکر اس زمین میں تمہارا جانشین کر دیتے۔" یہاں 'مِنْكُمْ' کے الفاظ نہایت قابل لحاظ ہیں، لیکن یہ امر کہ آیا ملٰٓئِكَة بہمہ وجوہ انسان سے بہتر مخلوق ہیں یا نہیں نہایت بحث طلب ہے، اور اسکی تشریح اپنے موقع پر آئے گی۔

اِس عظیم الشان عمل میں موانعِ فطرت کا مقابلہ تندہی اور استقلال سے کیا، جو مخلوق موت

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۶) مسئلہ ارتقا کی باقی شقیں یہ ہیں:۔

۶۔ نفسِ واحدہ کے اجتماع اور استمرار سے مختلف نوعیں پیدا ہوئیں لیکن ہر نوعی اجتماع نہ صرف پہلے نوعی اجتماع سے بہتر اور صالح تر ہوا بلکہ ہر ایک صورتِ اجتماع میں بھی اسکے اپنے دائرے کے اندر اصلاح اور ارتقا کی تجویز قائم رہی، حتیٰ کہ وہ صنف بذاتِ خود اوجِ کمال کو پہنچ گئی۔ گویا ارتقا ایک شجر ہے جسکی متعدد متفرع شاخیں ہیں، اگرچہ اصل ایک ہی ہے، مختلف شاخیں اپنے اپنے خطوں پر پھولتی پھلتی گئیں، بلکہ شاخ در شاخ بن گئیں، ان پر مختلف پھول لگے، جو اس شق کی 'صالح ترین انواع' ہیں۔ بعض شاخیں اور پتے جھڑتے گئے، جو 'غیر صالح' انواع کی مصداق ہیں۔ اس تنے کی بلند ترین شاخ انسان ہے، جسکی کئی ایک فروع ہیں جو بلحاظ اختلافِ لون و نسل، اور امتیازِ فہم و ادراک، ایک دوسرے سے قوی تر، صالح تر اور ممیز تر ہیں۔ جس قوم یا نسل کی حکومت، صورتاً اور معناً، اس زمین کے بر و بحر پر قائم ہے وہی آج 'اصلح' ہے، اور اس عظیم الشان درخت کی چوٹی پر متمکن ہونا اسی کا طغرائے امتیاز ہے!

(الف) کتابِ خدا نے شجرے کی صورت کو نہایت بلیغ اور پُرمعنی الفاظ میں ادا کیا ہے، مگر ان کی حقیقت نااہل مسلمانوں کے ہاتھوں مدت ہوئی مسخ ہو چکی ہے۔ سورۂ نوح میں ہے: وَاللّٰهُ أَنْبَتَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا (۷۱: ۱۷) "اور اے ساکنانِ زمین! خدائے عظیم نے تم انسانوں کو زمین سے ایک درخت کی طرح اگایا"! گویا جب انسان کی زمین سے درخت کی مانند اگنے کی ظاہری صورت کوئی نہیں تو ان الفاظِ وحی کے لامحالہ کوئی اور عظیم الشان معانی ہیں جن کی تعلیم دینے کے لیے ربِ بے مثال نے ایک مستقل آیت بھیجنے کی تکلیف گوارا کی۔ مگر آجکل کے مسلمانوں کو جو کسی عزیز کے مرنے پر ایک رات میں پورے قرآن کو کئی بار دہرا کر مُردے کو ثواب پہنچانے میں مشغول ہیں، قرآنِ عظیم کے مطالب سے کیا غرض ہے! جب ایک ایک حرف کی تلاوت پر لاکھوں نیکیاں خود بخود ملی رہتی ہیں تو معانی جو کچھ بھی ہوں ہوتے رہیں، ان سے بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے! اسی سورۃ میں ایک اور مہتم بالشان مضمون ہے جو پوری دو آیتوں میں ادا کیا گیا ہے:

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۞ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۞ (۷۱: ۱۳-۱۴)

"اے لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اس خدائے عظیم سے عزت اور آبرو کی آس نہیں لگاتے، تم اسکے قانون پر چل کر بہترین بننے کی امید نہیں رکھتے، حالانکہ وہی ربِ بے مثال اور وہی منعمِ حقیقی تو ہے جس نے تم کو کئی طریقوں (اور تخلیق کے کئی مرتبوں) سے مرتقی کر کے پیدا کیا ہے، ادنیٰ مخلوق سے اعلیٰ مخلوق میں ترقی دیکر، اور ایک جبلت سے دوسری اعلیٰ جبلت میں بدل کر اشرف الخلق ہونے کا وقار بخشا ہے"!

کیا وَقَارًا اور أَطْوَارًا والی آیات کا ربط اس کے سوا کسی اور معانی میں ہو سکتا ہے؟ اور کیا نوح علیہ السلام ایسا اولوالعزم نبی اس ارتقا کی حقیقت معلوم کیے بغیر اپنی قوم کو خطاب کر رہا تھا؟

(ب) بنی نوعِ انسان کی سب مخلوق پر فضیلت خدائے عظیم کی اس زمین پر ہر شخص کو ہر طرح واضح ہے، اور جو انسانی نسل زمین کے بر و بحر اور طیبات رزق کی مالک ہے، اس کا تفضل بھی اظہر من الشمس ہے مگر زمین و آسمان کے مالک کا کلام انسان کی فضیلت تمام عالم کی مخلوق پر نہیں مانتا، اور اس کی ناپید کنار آسمانی فضا میں لامحالہ کسی شریف تر مخلوق کے وجود کی گواہی دے رہا ہے، لیکن اس نکتے کی تصدیق کے لیے مریخ سے چشمک زنی کی سعی کرنے والے یورپ کو ابھی نہ معلوم کتنی اور صدیاں درکار ہیں! سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۞

"اور بیشک ہم نے بنی آدم کو اشرف المخلوق بنا کر بڑی عزت دی، ان کو اس پہنائے زمین کے بر و بحر پر قابض کر کے صحیح معنوں میں اس زمین کا حکمران کر دیا

وحیات کی اِس مجاہدانہ کشمکش میں اپنی ظاہری اور باطنی قوتوں کا مناسب اور بہترین استعمال

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۷) اعلیٰ سے اعلیٰ نفسیں اُگلو دیں، اور اس کائنات عالم میں جسقدر مخلوق ہم نے پیدا کی ہے، اُن میں سے اکثر پر ان کو فضیلت عطا فرمائی۔

۷۔ طبقات الارض کی تہوں میں میلوں کی گہرائی پر دبی ہوئی ہڈیاں نہ صرف اس مخلوق کی یادگار ہیں جو انسان سے پہلے اِس زمین پر بس رہی تھی، بلکہ زمین کے اُن طبیعی اور جغرافی، مقامی اور تخلیقی انقلابات کی سلسلہ وار سرگذشت ہیں جو نشاء آفرینش سے ہوتے، اور آج ہو رہے ہیں۔ گویا زمین کے تہ در تہ طبقے 'کتاب' فطرت کے مرتب اوراق، اور اُن کی ہڈیاں وہ ناقابل محو حروف ہیں جن کی وساطت سے ماجرائے زمین کا سلسلہ وار پتہ لگ سکتا ہے۔ اسفل طبقے اعلیٰ طبقوں سے لامحالہ قدیم تر ہیں، اور اُن کے باقیماندہ[۱] آثار تکوین[۲] کے تدریجی سلسلے کی صحیح سند ہیں۔ اِن آثار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ شجر ارتقا کی ابتدا سب سے نیچے طبق میں اُن نہایت ابتدائی حیوانات سے ہوئی جو محض ایک خوردبینی مضغۂ گوشت تھے، مگر سطح زمین کے نزدیک کے اعلیٰ طبق میں فرعی ارتقا، اُس شدومد سے ہوا کہ بڑے بڑے جسیم اور زور آور حیوان (جن کے ڈھانچے آجکل کے بڑے سے بڑے حیوان سے بھی کئی گنا بڑے ہیں) روئے زمین پر مدتوں کثرت سے آباد رہے، اُن کا بالآخر سطح زمین سے محو ہو جانا، اور بظاہر ضعیف جنسوں کا لکھوکہا برس سے جاری رہنا، اِس امر کی دلیل ہے کہ مزاحمت حیات میں جسمی زور یا جارحانہ قوت ہی کفایت نہیں کرتی، بلکہ صلاحیت بقا اِن کے سوا کچھ اور شے بھی ہے۔ یہ صلاحیت فطرت کی اُن قوتوں کا، جو بقا کی راہ میں حائل ہیں، اور جو ہر مخلوق کے بالمقابل بقدر اسکی بساط کے نبرد آزما ہیں، مستعدی سے مقابلہ کرنا ہے۔ اگر چیونٹی کی نسل باوجود اپنے ضعف جسم کے ایک مدت مدید سے اِس زمین پر متمکن ہے، اور آنکہ ایک وہ عظیم و جلیل 'میمتھ' جو موجودہ ہاتھی سے کئی گنا بڑا تھا، تباہ ہو چکا ہے، تو اِس کا باعث لامحالہ یہی ہے کہ چیونٹی نے موانع طبیعت کا مقابلہ زیادہ مستعدی اور کامیابی سے کیا ہے۔

قرآن کریم کا تمام دستور العمل اِس حیرت انگیز اور گرانبہا حقیقت کا وہ مکمل اور آخری، اور ناقابل ترمیم اور ناپیدا مثال مرقع ہے، جسکے بالمقابل آج اِس بیسویں صدی کے یورپ کا علم و عمل، اسکے سب معاشرتی اصول اور اجتماعی حکمت، اسکا علمی تفلسف اور سیاست مدن، ابجد طفلاں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ یہ صلاحیت کی صحیح اور ناقابل انکار تعریف کرنا ہی اِس کتاب کا اہم موضوع ہے، اور اِسکی شہادت کتاب کے ہر ورق میں ملے گی۔ خود آیۂ استخلاف اِس حقیقت کبریٰ کی بصراحت تمام مؤید ہے۔ فی الحال مسئلہ ارتقا کی اس شق کی تائید میں ربانی صرف دو معنی خیز آیتوں کو پیش کیا جاتا ہے، لیکن مجھے خوف ہے کہ کتاب کے اِس ابتدائی حصے میں اُنکے صحیح مطالب اخذ کرنے میں غلط فہمی نہ پیدا ہو، اگرچہ فہم مطالب کے لیے اِن کا اعادہ کتاب کے متن میں اپنے موقع پر کیا جائے گا:

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ ۝ (۲۸: ۵-۶)

(اُدھر فرعون اپنی فرعونیت میں مصروف تھا، کمزور اور مظلوم رعیت کے مختلف فریقوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتا تھا، اور بنی اسرائیل کی بےکس قوم پر اُس کا ظلم ہو رہے تھے (۲۸: ۴)، اِدھر ہم اِس بات کے درپے تھے کہ اُنہی لوگوں کو جو اُسکے مُلک میں نہایت کمزور سمجھے جاتے ہیں، اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیں، اُن کو قانون خدا کا پابند بنا کر زمین کے سوار بنا دیں

---

[۱] سطح زمین کی عمیق تہوں میں مخلوقات قدیمہ کے ان آثار باقیہ کو طبقات الارض کی علمی اصطلاح میں رکاز کہتے ہیں۔ ان رکازات کی تفصیل عنقریب آئندہ تحت المتن صفحہ ۲۱-۲۹ میں آئیگی۔

کرتی رہی، اور حفظ نفس کے اصل اصول پر چلکر بہر مقابل سے فی الجملہ عہدہ برآ ہوئی،

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۸) اور بالآخر اسی سلطنت کا وارث بنائیں جس کی شمشیر فرعون اُن سے یوں تک بھول چڑھاتا تھا۔ نہیں بلکہ ہم چاہتے تھے کہ انکو اس زمین میں یکسر متمکن کر دیں، اور فرعون بادشاہ مصر، اور ہامان وزیر اعظم، اور اُن کے مغرور گروہ شاہی سپاہیوں کو جو یوں ہونہار پرتاؤ دیکرا ینٹھے اینٹھے پھر کرتے تھے، ایک دفعہ وہی تباہی اور ذلت اُن کی اپنی آنکھوں سے دکھا دیں جس کا چرچا انکے دلوں میں بنی اسرائیل کے مظلوم خشت پزوں کو کوڑے مارتے، اور اُن کی عورتوں اور بچوں کو بے دھڑک قتل کرتے وقت) رہا کرتا تھا! (فانظر تحت رقم)

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ (۷: ۱۳۷)

اور اس مبارک اور زرخیز سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بالآخر ہم نے انہی لوگوں کو کیا جو بظاہر کمزور گنے جاتے تھے۔ اور خدا کا کلمہ وعدہ نیک تو بنی اسرائیل کے حق میں اپنی تکمیل تک ٹھیک پہونچا، کیونکہ اُنھوں نے نہایت عزم اور استقلال سے دشمن کی سختیوں کی برداشت کی تھی، اُن کے ظلم و ستم کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا، اور سختی کی زیادت میں مدافعت کے لئے کمر کسے ہوئے تھے (بِمَا صَبَرُوا)، پھر ہم نے فرعون کے سب منصوبوں کو تہس نہس کر دیا؛ اُس کی قوم کی سب عظمت خاک میں ملا دی؛ اور جو اونچی اونچی عمارتیں وہ بنی اسرائیل کے آدمیوں کو بیگار میں پکڑ پکڑ کر بنوالتے تھے، ایک اقل قلیل مدت میں خاک میں ملا دیں!

کیا آج فرعون اعمال اور خون آشام یورپ کو اس قانونِ خدا، اس آئینِ موت وفنا، اس تعریف عدم صلاح کو پڑھکر کچھ لرزش نہیں ہوگی؟ کیا بیچارہ مظلوم مشرق کو، ان آیاتِ خدا کی صحیح روح جذب کر لینے کے بعد، "صلاح عمل" کی کوئی اور تعریف کر دینا باقی ہے!

مسئلہ ارتقا کی آخری شق یہ ہے:

۸۔ (الف) کرۂ فلک کے اس ناپید اکنار محیط میں، جسکی وسعت قطعاً ناقابلِ مساحت ہے، لاانتہا عظیم و جلیل کرے ہول انگیز فاصلوں پر ہر طرف پھیلے ہوئے اپنے اپنے مدارات پر چل رہے ہیں۔ منظار الوان کی ناقابل انکار شہادت[۱۵] نے آج یہ بات پایۂ ثبوت تک پہونچادی ہے کہ ان سب مجامع عوالم کی ترکیب اجزا میں وہی مشترک عناصر، ابخرہ اور فلزات، شامل ہیں جو زمین پر موجود ہیں؛ کوئی نیا عنصر یا فلزی اور ہوائی مرکب ابتک اُن کے کسی حصہ میں داخل ثابت نہیں ہوا۔ اس مشاہدے سے لامحالہ ثابت ہے کہ آسمان کے سب دور اور نزدیک کرے بشمولیت زمین، آفرینش کے محض ابتدائی مراحل میں ایک مشترک ہیولائے فضائی تھے جسکے مختلف حصے علیٰحدہ علیٰحدہ ہو کر (خارق المرکز قوت کے اثر سے) ٹھوس اجسام بن گئے، اور نئے مداروں پر چلنے لگے۔ طبعی نقطہ نظر سے فطرت کی وحدت اس بنا پر ایک آشکارا امر ہے جسکے لئے کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں!

(ب) اجرام سماوی سے قطع نظر کر کے پھر اگر تمام عالم حیات کی طرف نظر دوڑائی جائے تو فطرت کا طالب العلم لامحالہ اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ ماہیت "حیات" کا راز سب روئے زمین پر ایک ہے۔ اسکا کیف و ملال سب مخلوق میں یکساں ایک ہے، اسکے لوازمات اور ماجریات، تاثرات اور محسوسات ایک ہیں۔ پانی اسکا وہ مشترک اور عالم آرا توام ہے جسکے بغیر اس کا قائم رہنا محال ہے۔ ارتقائے حیات کے مختلف منازل میں بھی وہ شئے ہے جو ہر حال میں موجود ہے۔ اس بنا پر حیات کی روئے زمین پر وحدت بھی ایک بدیہی امر ہے!

---

[۱۵] اس حیرت انگیز حقیقت کو سرزمین ہند کے مشہور طبعی فلسفی ڈاکٹر بشیل چندر بوس نے حال ۱۳۳۶ھ و ۱۹۱۸ء ہی میں پایہ ثبوت تک پہنچا دیا ہے۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۹) (ج) مشاہدہ فلک نے ثابت کر دیا ہے کہ ہیولائے فضائی "سب کا سب ابھی ختم نہیں ہوا، بلکہ مختلف شکلوں میں، بعض مجامع النجوم کے گردا گرد، فضائے اثیری میں پڑا چکر کھا رہا ہے۔ اس بنا پر تخلیق عالم کا سلسلہ بھی ختم نہیں ہوا، بلکہ بتدریج نئے کرّے وجود میں آ رہے ہیں، یا پُرانے نسیاً منسیا ہو کر ہیولائے فلک بن رہے ہیں۔ الغرض یہ سب تعمیر و شکست ایک بے پایان سلسلہ ہے جس کا، کوتاہ نظر انسان کے محدود علم کے رو سے اٹل نتیجہ ایک ہی ہے: اور وہ یہ کہ تمام کائنات کی فطرت ایک ہی، اس کی علۃ العلل ایک ہے، صورتِ اتحاد ایک ہی، نسخۂ حیات ایک ہی، راز ممات ایک ہی، نظم و نسق اور مطاع بے مثال ایک ہے!

وحدت کائنات کا یہ ہوش رُبا انکشاف مغرب کے حکمائے عظام کو آج اُس جانگداز تلاش اور قرنوں کے پیہم مشاہدے کے بعد حاصل ہوا ہے جس کی مثال سطحِ زمین کا کوئی گذشتہ قرن حتماً پیش نہیں کر سکتا۔ مگر اسی عالم آرا اور حقیقت کشا توحید کا اعلان تیرہ سو برس پہلے اس پہنائے زمین میں یگانۂ عرب کے اُمّی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھوں اِس شدّ و مدّ سے ہوا کہ دنیا اُس نتیجہ خیز یقین کی مثال پھر پیدا نہ کر سکے گی۔ آج اِس توحید کے رسمی نام لیوا اگرچہ اُسی خدائے واحد کے اٹل قانون کے مطابق مٹ رہے ہیں۔ مگر خدا کا نوشتہ اٹل ہی، اور یورپ تثلیث سے بیزار، اور قرآن سے ناآشنا طبعی فلسفی تحسین و آفرین کہتے ہوئے نہ جانے کیا کیا معنی خیز سوال کر رہا ہے! سورۂ انبیاء میں ہے:

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا ۖ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (۲۱: ۳۰)

اے پیغمبر! کیا قانونِ خدا اور خدا کے منکروں نے، انکار کرتے وقت، اس عظیم الشان حقیقت پر نظر نہیں کی کہ آسمانوں کے لاانتہا کرّے بشمولیت زمین، پیدائش کے ابتدائی مراحل میں، باہم ملے ہوئے تھے (كَانَتَا رَتْقًا)، ان کے مواد کا باہمی انضمام اور اتصال تھا (كَانَتَا رَتْقًا)، ان کا ہیولا ایک تھا (كَانَتَا رَتْقًا)، پھر ہم ہی نے اُس ہیولائے فضائی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اِس حیرت انگیز سلیقے اور ترتیب، اس محیر العقول نظم و نسق کے ساتھ آسمان اور زمین کو بنایا (فَفَتَقْنَاهُمَا)۔ اور تمام عالم کے سب بالا و پست میں وحدت کائنات اور وحدت خدا کی بیّن اور ناقابل انکار، زندہ اور لازوال شہادت قائم کر دی! اور یہی نہیں بلکہ ہم ہی نے ہر ذی حیات شے کی حیات کا قوام پانی سی عام اور مشترک شے سے کر کے، تمام عالم کو وحدت حیات اور وحدت خلاق کا بدیہی ثبوت دے دیا! تو کیا اب بھی یہ لوگ اُس خدائے عظیم کی وحدت، اُسکی لاثانیت، اُسکی لاشریک حکومت، اُس کے عالم آرا تسلط، اُس کی عظیم کاری اور نظم پسندی پر ایمان نہیں لاتے؟

کیا آج سے تیرہ سو چالیس برس پہلے، جب کہ زمین خدا کے طول و عرض میں مغرب کی موجودہ علمی تحقیق کا نام و نشان تک نہ تھا، جب جہل و وہم کی ہوشربا ظلمت سب طرف یکسر چھائی ہوئی تھی، پہنائے برِّ و بحر کی سب سے جاہل، سب سے بے علم، مغلوب الوہم اور بے ہنر قوم کا ایک اَن پڑھ، یتیم اور مظلوم بشر اپنے زورِ مشاہدہ سے، اپنے خداداد علم، اور قلبِ سلیم کے باعث سب دوربینوں اور خوردبینوں سے بے نیاز ہو کر ملکوتِ زمین و آسمان کا وہ یکتا اور فرید الدہر عالم نہ بن گیا تھا جس کا اندازہ آج لگاتے ہوئے ہوش پاش پاش ہو جاتے ہیں! اور کیا وہ اِن آیاتِ خدا کے قلب پر نازل ہوتے وقت اُس صاحبِ کبریا و جبروت سے، جو اِس کائناتِ جہان کا باعثِ اوّل ہے، دو گز بلکہ اس سے بھی قریب تر بیٹھا ہوا گردوں کے اُفق اعلیٰ کا تماشہ بچشم خود نہ دیکھ رہا تھا؟ سورۂ نجم میں اللہ العالمین کی طرف سے اِس یتیم بچے کو یہی سند ملی ہے جس کی شہادت آیۂ رتق کے اِس حیرت انگیز انکشاف کے بعد مغرب کا ایک ایک حکیم بے اختیار دیگا:

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۝ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۝ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ ۝ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ۝ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۝ أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ (۵۳: ۱-۱۲)

مرتقی، متمکن، اور صحیح معنوں میں زور آور ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو آج وہ عظیم الجثہ افیال

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۰) اے صحنک زمین کے بے خبر بسنے والو! بالا والے عظمت خدا کے ناقدردان بندو!، بام آسمان کا وہ بلندیوں پر پہنچنے والا ستارہ جو شکست کے آخری مرحلوں سے گذر کر تم سے بدرجہا زیادہ قانون فنا و بقا سے باخبر ہو گیا ہے، اس بات کا شاہد ہے (وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ) کہ تمہارا رفیق محمدؐ نہ تو غلط چل رہا ہے، اور نہ کچھ بہک گیا ہے۔ وہ زمین و آسمان کے جو جو حقائق عالیہ تمہارے سامنے بول رہا ہے، کچھ اپنے وہم اور خواہش نفسانی سے نہیں بولتا، بلکہ وہ سب کے سب آسمانی انکشاف ہیں جو اس پر کیے جاتے ہیں! وہ خدائی آواز ہے جو اوج آسمان سے بول رہی ہے۔ اسکو یہ سب علمی اور حکمی معارف شدید القویٰ اور غالب الامر خدا نے خود سکھائے ہیں! اسی علم کے زور اثر سے وہ آج، اوج کمال پر پہنچکر، افق اعلیٰ پر متمکن ہے (فَاسْتَوَىٰ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ) افلاک الافلاک کی بلندیوں پر جم کر بیٹھا (فَاسْتَوَىٰ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ) ملکوت خدا کا تماشا کر رہا ہے! نہیں، بلکہ وہ اس سے بھی بلندتر ہو کر رفتہ رفتہ ازل تک کے عرش تک پہنچ گیا ہے (ثُمَّ دَنَا)، اور اس آستانہ کبریا و علم پر جبین نیاز گھستے گھستے (فَتَدَلَّىٰ) بقدر دو کمان بلکہ اس سے بھی کم فاصلے پر رہ گیا ہے! پھر جب وہ علم اور عجز، مشاہدہ اور ارادت، استعداد اور نیاز، ذوق اور شوق کے اس مقام منیع تک پہنچ چکا، تب کہیں اس ایزد بے مثال نے اپنے بندے کو وہ بات وحی کی جو تمہارے سامنے ہے! (فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ) بے خبرو، اور ناحقیقت شناس لوگو! ذہن اور قلب سلیم (الْفُؤَادُ) نے جو حقیقت حال دیکھی اس میں محمدؐ کو کچھ دھوکا نہیں ہوا، تو کیا تم لوگ قرآن حکیم کے ان برحق نتائج کے متعلق جنکی حقیقت اسنے بچشم خود دیکھی ہے، اس سے جھگڑا کرتے ہو (أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ)۔

کیا اس سے بہتر اور تمام تر معراج علم و کمال آج تک کسی بڑے سے بڑے یورپی فلسفی، بڑے سے بڑے حکیم، بڑے سے بڑے طبعی کو حاصل ہوا ہے؟ کیا جہل وہ وہم، ظن و گمان کے عالم آرا ماحول میں اتنی وسیع نظری، ایسی صاف بینی، اسقدر بلند نگہی، ایسے حقیقت کشائی کا حاصل ہو جانا، العیاذ باللہ، کسی دھوکہ باز بے علم، نفس پرست اور جاہ طلب آدمی کا کام ہو سکتا ہے؟ کیا آیہ رتق (۲۱: ۳۰) آیہ مستودع (۶: ۹۹) آیہ نبات (۱۰: ۱۷)، آیہ سافلین (۹۵: ۵) وغیرہ وغیرہ کا مضمون آج سے صدیوں پیشتر اس سید کائنات، اس حقیقت شناس اور خدا شناس اس خیرالوریٰ اور اعلم الناس بشر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے سوا کسی اور منتہی علم کسی دوسرے معلم حکمت، کسی ارسطاطالیس، یا افلاطون زمان کے منہ سے نکلا؟ کیا وہ مغرب کا سب سے بڑا "معلم الحکما" ارسطو (المتوفی ۳۲۱ سنہ قبل مسیح) جس کی حکمت اور پیش بینی پر آج یورپ بھی اپنی ہٹ دھرمی اور تعصب کے باعث اسقدر نازاں ہے، اور جسکی علم فطرت کے متعلق ہولناک غلطیوں کی عجیب و غریب تاویلیں پیش کر کے اس کے جہل پر پردہ ڈالنے کی سعی کر رہا ہے، فیثاغورس (المتوفی ۵۰۰ سنہ قبل مسیح) کے دو سو برس پیشتر کے صحیح دعاوی کے باوجود، زمین کو مرکز عالم قرار دینے، اسکو ساکن اور شمس و قمر کو اسکے گرد متحرک بتانے، اور پہنائے آسمان کو خالی فرض کر کے نجوم کو آسمان کے بلوری کروں میں نصب کیا ہوا یقین کرنے میں وہ مہلک غلطی، وہ المناک نادانی، وہ مضحکہ انگیز سوفیانہ کلام نہیں کر رہا تھا جسکے زیر اثر دنیا، کاپرنیکی نظام (سنہ ۹۳۶ھ ۱۵۳۰ عیسوی) کے شائع ہونے تک، کامل اٹھارہ سو برس تک پٹری بھٹکتی رہی؟ اور کیا وہ پھر اس فخر موجودات، اس حکیم عرب، اس مکی اور مدنی معلم الناس اور متعلم خدا کا لایا ہوا معجزنما کلام نہ تھا جسنے کاپرنیکس (المتوفی سنہ ۹۴۹ھ ۱۵۴۳ء) کے موجودہ مسلم نظام سے کامل نو سو برس پیشتر، نااہل مسلمان کی ناقدردانی اور نامرغشناسی کے باوجود، زمین کو بلکہ بلا استثنا تمام اجرام سماوی کو متحرک قرار دے کر ارسطو کی شرارت انگیز حکمت کا یکسر قلع قمع کر دیا تھا:

خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي
لِأَجَلٍ مُسَمًّى أَلَا هُوَ الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ (۳۹: ۵)

اور تحسیم الجسد اژدہے جو قرون خالیہ میں روئے زمین پر اس کثرت سے آباد تھے مسلط

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۱) لوگو! اُس رب بیمثال نے ہی آسمان کے لاانتہا ستاروں (اَلسَّمٰوٰتِ) اور زمین کے عظیم الشان کرّے کو پیدا کیا، اور اب رفتہ رفتہ ان اجرام سماوی کی حیرت انگیز ترتیب و رفتار طلوع و غروب کی تعیین سے رات کی ظلمت آراء اور کرّوں کے روشن جسم پر لپیٹ دیتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ دن کے نورانی حجاب کو رات کے سیاہ جسم پر اوڑھ دیتا ہے۔ اور بڑی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سورج اور چاند جیسے عظیم و جلیل کرّوں کو اُسنے اپنی مرضی کے تابع، اپنے حکم کا محکوم، اور اپنے اشارے پر مجبور کر رکھا ہے (سَخَّرَ)۔ یہ سب آسمانی کرّے، یہ شمس و قمر، یہ سماوات، اور زمین سب کے سب (کُلٌّ) ایک وقت مقررہ تک حرکت کر رہے ہیں (یَّجْرِیْ) اور منشائے ایزدی کو پورا کر رہے ہیں۔ لوگو! بگوش ہوش سُن رکھو کہ وہ خدائے بے ہمتا بڑا غالب القوی (اَلْعَزِیْزُ) اور بڑا پردہ پوش (اَلْغَفَّارُ) ہے۔

کیا پھر دشمن کی حجت کو یکسر توڑنے اور اسلام کے عالم آرا فلسفے کو ارسطاطالیسی نظام سے بدرجہا بلند اور عمیق تر جتلانے کے لئے اُس نے اسی یَّجْرِیْ کے قدرے مشکوک لفظ کی ناقابل انکار تشریح، آیہ رتق (۲۱: ۳۰) کے متابعد کر کے یہ دعوے نہ کیا تھا کہ "سمٰوٰت" اور زمین، اور شمس اور قمر سب کے سب بلا استثنا اپنے اپنے "فلک" اور اپنے اپنے مدار میں پڑے چل رہے ہیں، اور السّماء سے مراد "السّمٰوٰت" اور فلک کے قرآنی مفہوم سے قطع نظر، وہ محفوظ، اور ناقابل درک، وہ نادست رسیدہ اور نانظر یافتہ "چھت" ہے جسکے نیچے یہ سب ہنگامہ کائنات ہو رہا ہے، علاوہ جسکے محفوظ ہونے کا آج تمام یورپ قائل ہو چکا ہے:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۠ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا السَّمَاۗءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ښ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ (۲۱: ۳۰-۳۳)

اے پیغمبر! کیا منکرین خدا نے اس حقیقت پر نظر نہیں کی کہ آسمان کے لاانتہا کرّے (السّمٰوٰت) اور زمین پیدائش کے ابتدائی مراحل میں ملے ہوئے تھے (کَانَتَا رَتْقًا)، پھر ہم نے ان دونوں کو آپس سے الگ الگ کر دیا، اور سب زندہ اشیا کا قوام پانی بنا دیا۔ تو کیا یہ لوگ اس حیرت انگیز انکشاف کے بعد بھی خدا کی توحید پر ایمان نہ لائیں گے؟ اور ہم ہی نے زمین میں عظیم الشان پہاڑ اپنے اپنے موقع پر ڈال دیئے، کہ زمین (اپنی حرکت میں) انکو لیکر ایک طرف کو نہ جھک جائے (اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ)، اور اسکا مرکز ثقل قائم رہ سکے، اور کشادہ راہیں اُس میں بنا دیں کہ لوگ راہ پا سکیں۔ اور آسمان (السّمَاء) کو ایک مضبوط اور ناقابل شکست "چھت" بنا دیا، اسکے ہر حصے کو انسان یا دیگر مخلوق کے دست تصرف سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا (سَقْفًا مَّحْفُوْظًا)؛ خدا کی اس حیرت انگیز مضبوط کاری اور حفاظت پسندی کو دیکھنے کے باوجود لوگ اس کے حفظ و امان دینے والے احکام سے گریز کرتے ہیں۔ اور لوگو! وہ خدا ہی تو ہے جس نے رات اور دن کی عظیم الشان حقیقتوں کو نیست سے ہست کیا، اور شمس و قمر کے عظیم الشان کرّوں کو پیدا کیا۔ یہ سب کرّے، یہ شمس و قمر، یہ سمٰوات اور زمین، یہ لیل و نہار اپنے اپنے مداروں میں پڑے تیر رہے ہیں!

کیا جبال زمین کے قیام کی یہ حیرت انگیز تشریح موجودہ علم جر ثقیل کے اُس اصولی ضابطے، اور علم التجمیعات انٹیگرل کلکولس کے اُس اساسی قاعدے کے بالمقابل حرف بحرف پوری نہیں اُترتی، جسکے رُو سے کسی دوّار جسم کے مرکز ثقل کا محور پر واقع ہونا، اسکی یکساں اور ہموار حرکت کے لیئے لابدی ہے، اور جسکے بعد اُس محور کا، اُس جسم کا، بلکہ جسم کے اجزا کا ہر دم گردش کرتے رہنا اٹل ہے کیا اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ کے بعد کُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ" کا دعوٰے خود اس امر کی روشن دلیل نہیں ہے کہ بطلیموسی اور ارسطاطالیسی نظام ایک لغو نظام تھا جسکی تقلید ساکنان زمین صدیوں تک غلط اصول پر کی، اور جب ہر جرم فلکی کا ایک علیحدہ مدار (فلک) ہی تو لامحالہ زمین بھی اپنے مدار پر چل رہی ہے اور یکساں حرکت سے

ہو جاتے اور حضرت انسان کے لیئے گز بھر جگہ میسر نہ ہوتی۔ چیونٹی سے لیکر ہاتھی اور کنجشک

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۲) چل رہی ہے! نہیں کیا خود کاپرنیکی نظام کے اندر، جس کے اہم حصوں کو آج یورپ نے پایہ ثبوت تک پونچاکر تلاش حقیقت میں کامیاب ہونے کا سہرا ہمہ تن اپنے سر پر رکھا ہے، اور جسکی بعض شقوں پر نادیدہ ایمان بلا حیل و حجت قریباً تین سو برس تک قائم رہا، کیا خود اِس نظام کے اندر سورج کے ساکن فرض کر لینے کی وہ خطرناک غلطی کئی قرنوں تک نہایت التزام کے ساتھ جاری نہ رہی جس کو ہرشل (المتوفی ۱۲۳۸ھ ۱۸۲۲ء) نے، مدۃ العمر مشاہدے کے بعد ابھی پورے ڈیڑھ سو برس نہیں گذرے، ۱۱۹۸ھ ۱۷۸۳ء میں ان معرکۃ الآرا الفاظ میں درست کیا:۔

"سورج مع اپنے تمام نظام شمسی کے خود ایک خود ایک ضرور مرکز کے گرد چل رہا ہے اور موجودہ اوقات میں اس کی
سمت حرکت ایک مجمع النجوم کی طرف ہے جس کا نام "الجاثی علیٰ رکبتیہ" (ہرکولیس) ہے۔"

آہ! کیا پھر اسی عظیم الشان حقیقت اور محیر العقول صداقت کو محمد (صلعم) کے لائے ہوئے قرآن عظیم نے کامل بارہ سو برس پیشتر "کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ" کے عالم آرا الفاظ کے علاوہ (جس سے لامحالہ سورج کا کسی مرکز کے گرد چلنا ظاہر ہے) انہی شاندار اور شرمندہ کن الفاظ میں بصراحت تمام بیان نہیں کیا جن کو دُہرانے پر قرآن سے بیخبر اور محمد (صلعم) سے ناآشنا ہرشل قطعاً مجبور ہو گیا تھا!

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (۳۶ : ۳۸)

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝ (۳۶ : ۳۹-۴۰)

اور آفتاب ہے کہ اپنے کسی ایک جائے قرار کی طرف برابر چلا جا رہا ہے! لوگو! اُس قاہر القوی اور غالب العلم خدا کا باندھا ہوا اندازہ اس عظیم الشان شعلۂ نور کے حق میں یہی ہے (جس سے اِدھر اُدھر ہٹنے کی اُس بیچارے میں کچھ طاقت نہیں۔)

اور چاند کی حرکت کی ہم ہی نے منزلیں مقرر کر دی ہیں تو وہ اس انداز سے کہ اُس کا روشن حصہ گھٹتے گھٹتے بیساٹیڑھا اور پتلا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی سوکھی ہوئی ٹہنی۔ نہ تو سورج بیچارے میں طاقت ہے کہ اپنے سے کمزور چاند کو لپک کر پکڑ لے، نہ رات ہی سے بن پڑتا ہے کہ دن سے پہل کرے۔ اور یہ اجسام سب کے سب (بشمولیت زمین جسکا ذکر (۳۶ : ۳۳) میں ہوا) اپنے اپنے فلک، اور آسمان میں پڑے تیر رہے ہیں!

ہاں! لیکن اُس عزیز و علیم ہستی کے بالمقابل، جسکے دست قدرت میں سورج کا زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا کرہ محض بیچارہ ہے، غریب ہرشل کی کیا بساط تھی کہ علم میں سابقت کرتا!

مسئلہ ارتقا کی آخری شق کے تیسرے حصے (ج) کے متعلق بھی قرآن میں وہ فیصلہ کن شہادت موجود ہے جس سے خدائے عظیم کے متعلق تعطل کا نظریہ، (جس کا فلسفہ داں ابن باجہ اسقدر قائل تھا)، محض ساقط ہو جاتا ہے۔ "خَلَقَ" کا لفظ قرآن کریم میں ہر قسم کی مخلوق کی پیدائش کے متعلق استعمال ہوا ہے۔ خود اسی تحت المتن میں یہ اصطلاح اِنْسَان ((۹۵ : ۴) صفحہ ۱۳ ،(۳۷ : ۱۱) صفحہ ۱۵ ،(۵۵ : ۱۴) صفحہ ۱۵، (۷۱ : ۱۴) صفحہ ۱۶ ،(۳۲ : ۷) صفحہ ۱۴)، اَلسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ((۳۲ : ۴) صفحہ ۱۴ ،(۴۰ : ۵۷) صفحہ ۱۵ ،(۳۹ : ۵) صفحہ ۲۱)، لَیْل وَنَهَار، شَمْس وَقَمَر ((۲۱ : ۳۳) صفحہ ۲۲) بلکہ آیہ (۲۰ : ۵۰) صفحہ ۱۱ میں بلاتخصیص ہر شئے کی پیدائش کے بارے میں مستعمل ہوئی ہے۔ اِس نقطۂ نظر سے خدا کے ابداء و اعادۂ خلق کے متعلق وہ تمام دعاوی جو قرآن میں جابجا موجود ہیں، کسی ایک قسم کی مخلوق، (مثلاً انسان یا حیوانات یا نباتات) تکہی محدود نہیں ہو سکتے، بلکہ اُن سے مراد ہر قسم کی مخلوق کا بار بار پیدا کرنا ہے۔ اور جس میں لامحالہ نئے سموات، نئے ستاروں اور نئے کروں کی پیدائش شامل ہے۔ یہاں پر ایک دو موقعے قابل ذکر ہیں۔ سورۂ یونس میں ہے:

سے لیکر انسان تک جو جو نسلیں اِس وقت تک قائم ہیں اُن میں صلاحیت عمل کم و بیش باقی

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۳) قُلْ هَلْ مِن شُرَكَائِكُم مَّن يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ قُلِ اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ (۱۰: ۳۴)

اے پیغمبر! اِن لوگوں سے کہو کہ کیا تمہارے شریکوں اور ٹھیرائے ہوئے خداؤں میں کوئی ایسا بھی ہے جو مخلوق کو نیست سے ہست کرے اور پھر بار بار نئی مخلوق پیدا کرتا رہے؟ ان کو کہو کہ خدا ہی مخلوق کو نیست سے ہست کرتا ہے اور پھر اُسکو بار بار پیدا کرتا رہتا ہے تو تم کدھر کو بہکے چلے جا رہے ہو!

سورۂ عنکبوت میں یہی اشارہ ذرا واضح تر ہے۔ کیونکہ اعادۂ خلق کے عینی مشاہدے کی ترغیب دی گئی ہے، اگرچہ اِس خلق سے مراد مخلوقِ زمین ہی ہے:

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ۚ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۹: ۱۹-۲۰)

کیا منکرینِ خدا نے اِس بات پر نظر نہیں کی کہ خدا مخلوق کو کس طرح نیست سے ہست کرتا ہے اور پھر اُسکو بار بار پیدا کرتا ہے۔ بیشک نہیں کہ یہ سب کام (یعنی ابدا اور اعادہ) خدا پر بیحد آسان ہے۔ ان کو کہو کہ جاؤ زمین کے طول و عرض میں جاکر تماشا کرو کہ خدا نے مخلوق کی ابتدا کیونکر کردی ہے پھر وہی خدا ان سب کو نیست کرکے ایک دوسری پیدائش کی ابتدا (يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ) کریگا۔ اِس میں شک نہیں کہ خدا ہر شئے پر قادر ہے؛ (آیہ (۲۹: ۱۹) اس دنیا میں مخلوق کے اعادے کے متعلق ہے اور (۲۹: ۲۰) آخرت کے اعادے کے متعلق ہے)

سورۂ روم میں اعادۂ خلق کے ساتھ ساتھ سمٰوات اور زمین دونوں کا ذکر کرکے نوعِ مخلوق کو اور بھی عام کردیا ہے:

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ۚ وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۳۰: ۲۷)

لوگو! وہی سب قدیر تو ہے جو مخلوق کو نیست سے ہست کرتا ہے پھر اُسکو بار بار پیدا کرتا ہے، اور یہ سب کچھ اُسکے لیے بیحد آسان ہے! اور آسمانوں اور زمین میں اُسکی اس عظیم الشان طاقت کی دھاک بندھی ہوئی ہے، اور وہ خدا بڑا غالب القوی اور صاحب حکمت خدا ہے جو ایسا کر سکتا ہے!

آسمانوں میں قوت کی دھاک تبھی بیٹھ سکتی ہے جب اُن میں بھی تخلیق کا سلسلہ اُسی طرح جاری ہو جیسے یہاں پر ہے۔ لیکن ان شہادتوں سے قطع نظر جن کے مطالب میں مفسرین نے تاویل کی بہت کچھ گنجایش اختیار کرکے اُن کو متشابہ المعانی بنا دیا ہے، اور جن کے صحیح اور مربوط معانی اپنے اپنے موقع پر کتاب کے متن میں آئینگے، اور شہادتیں بھی ہیں جن سے لامحالہ ثابت ہوتا ہے کہ آسمان و زمین کا خلاق عظیم اُن کی پیدائش کے بعد بھی نئے نئے امور میں مصروف ہے، اور روز بروز نئے عظیم الشان کام کر رہا ہے۔ سورۂ الرحمٰن میں ہے:

يَسْأَلُهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (۵۵: ۲۹)

لوگو! جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کے آگے ہاتھ پھیلا رہا ہے، اُسی کا محتاج اور سوالی ہے۔ وہ بے کار اور معطل خدا نہیں بلکہ آئے دن کسی نہ کسی عظیم الشان کام میں مصروف ہے!

یَوْم کی تشریح پہلے گذر چکی ہے جس سے ظاہر ہے کہ کام بھی نہایت عظیم الشان ہونا چاہیئے۔ خدا کے بیکار نہ رہنے کے متعلق سورۂ ق میں بھی ایک پر معنی اشارہ ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ خدا ہر دم نئی تخلیق میں مصروف ہے اور تعطل کا دعوے محض باطل ہے؛

ہے۔ اگر افریقیہ کا قصیر الجسم ہاتھی رفتہ رفتہ کشمکش حیات سے شکست کھا کر معدوم ہو چکا ہے،

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۴) وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (۵۰: ۳۸)

اور لوگو! بالتحقیق ہم ہی نے آسمانوں اور زمین کے اس حیرت انگیز کارخانے کو، اور جو عظیم الشان کُرّے اور مخلوق
ان کے درمیان ہے اسکو چھ بڑے مدید الوقت دنوں میں پیدا کیا، اور باوجودیکہ کام اِسقدر تھا کہ اسکو دیکھکر عقل ششدر ہے
اور مدت یہ دراز تھی کہ تمہارے وہم و گمان میں نہیں آسکتی، لیکن ہماری یہ حالت ہو کہ تھکاوٹ نے ہم کو چھوا تک نہیں اور ہم
برابر اسی طرح نئے کاموں میں مشغول ہیں۔

نوعیتِ خلق کے متعلق سورۂ نحل میں ہے: وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۶: ۸)، "اور وہ خدائے عظیم اُن اشیا کو بھی پیدا کر رہا ہے جن کا تم کو سِرے سے علم ہی نہیں" جس سے کنایۃً بظاہر اُس مخلوق سمٰوٰت کی طرف معلوم ہوتا ہے جس کا علم حاصل کرنا کوتاہ بیں انسان کے لیے ممکن نہیں۔ بہر نوع یہ تمام اشارات اِس امر کی مجموعی شہادت ہیں کہ زمین و آسمان کا ربِ لم یزل تخلیق کائنات کے بعد تدبیرِ امر ہی میں معروف نہیں جس کا ذکر آیۂ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ (۳۲: ۵) صفحہ ۱۴ میں آچکا ہے بلکہ ہر قسم کی تخلیق کے نئے مہمات امور میں مشغول ہے اور جن میں نئے آسمانی کُرّوں کی پیدائش بھی شامل ہے۔ یہی مذہب آج یورپ کے طبعی حکما کا ہے، اور اُس لایزال و لم یزل خدا کے شایانِ شان بھی یہی ہے کہ ہر لحظہ کچھ نہ کچھ کرتا رہے جو لوگ اسکو آجکل کے کسی عیش پرست حکمران کی مانند سریرِ حکومت پر معطل اور مسند آرا سمجھتے ہیں، اُنکی شناسائی اُس احکم الحاکمین سے بہت کم ہے، اور معرفت کی پہلی بلکہ آخری منزل یہی ہے کہ اعمالِ خدا کا صحیح اور برای العین علم ہو، اسکی عظمت اور طاقت کا صحیح اندازہ ہو، اُس کے معمول سے پوری واقفیت، اور عادات کی کماحقہٗ شناخت ہو۔ مگر یہ بحث بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے جسکا یہاں پر چھیڑنا ضروری نہیں۔

مختصر الفاظ میں ڈارون کے مسئلہ ارتقا کا دعوےٰ یہ ہے جسکی شرح و بسط اوپر ہوئی۔ جو قرآنی شہادتیں اِس مسئلے کی تائید میں پیش ہوئیں، اُنکی بحث دراصل "علم القرآن" کے متعلق ہے، جو اِس کتاب کا اخیر ترین حصہ ہے۔ اُن کا یہاں پر لکھ دینا کم از کم ایک ایسی کتاب کے لیے جسکا منتہا علم و یقین کی طرف بالدلیل اور بتدریج رہنمائی کرنا، اور فرض و اعتقاد کے عنصر کو بیدخل کر کے قرآن کو سب انسانی علم سے بالاتر اور عالم آرا حقیقت ثابت کر دینا ہو، بہت کچھ پیش از وقت ہے۔ ہم نے اِس تصنیف کے ابتدائی اوراق میں اِن مباحث عالیہ کو محض اسلیے جاری ہے کہ کلامِ الٰہی کے اُن متلاشیوں پر جو اسکی ہر آیت میں ایک مستقل حقیقت کے موجود ہونے کا یقین رکھتے ہیں، مسئلہ ارتقا کی اہمیت (جو فی الحقیقت انسانی علم کا معراج ہے) ایک حد تک واضح ہو جائے، اور ساتھ ہی اُن علمائے علم فطرت کے ذہنوں میں جو قرآن کو لاشے سمجھکر اُس سے بیزار ہو گئے ہیں، اِس عجیب و غریب کتاب کی وقتِ مطالب اور عمقِ نظر کا اندازہ ابتدا سے ہو جائے۔ وہ آیندہ اوراق میں بچشم خود دیکھیں کہ قرآن کسقدر اس عظیم الشان مسئلے کا مؤید ہے، اسکا دستور العمل کہانتک اِس حقیقت کبریٰ کے عین مطابق ہے۔ اُس کا تمام لائحہ عمل کیونکر "حفظِ نفس" کے منتہائے وحید کی طرف جا رہا ہے، کس انتہائی شدت سے "اجتماعی سلامتی" کے درپے، اور "انفرادی سعی و عمل" کا مؤید ہے۔ نہیں بلکہ جوں جوں اُنکا علم قرآن کے حقائق عالیہ کے متعلق وسیع ہوتا جائے، وہ آجکل کے رسمی اور لفظی اسلام کو نظر انداز کر کے اُس یقین انگیز اسلام کی ماہیت کی طرف متوجہ ہوں جس نے ایک عالم کے اعمال اور اخلاق میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا، جس نے افراد کے دلوں میں وہ ہیجانِ عمل، وہ سلیقۂ نظم و نسق، وہ اتحاد اور ارتباط جاری کر دیا تھا جو ابتدائے آفرینش سے آجتک ہر زندہ اور مرتقی قوم کا خاصّہ ہے، وہ اِس حیرت انگیز کتاب الٰہی میں بطور خود وہ عظیم الشان اصول فنا و بقا دیکھیں جن کا اجرا روزِ اوّل سے صفحۂ زمین پر ہو رہا ہے جن کی تاریخ بزبانِ حال شاہد ہے، جن سے قومیں فلک الافلاک پر چڑھ جاتی ہیں، یا تحت الثریٰ میں گر کر ملیامیٹ ہو جاتی ہیں۔ اِس نقطۂ نظر سے یہ تحت المتن جسکی طوالت کا اندازہ مصنف نے کتاب کی تحریر کے وقت نہیں کیا تھا اور جو بعد میں فرمایش پر لکھا گیا، محض ایک ابتدائی تحریر ہے جس کا محولہ بالا اوراق کے نفس موضوع سے تعلق ابھی یہاں نہیں ہو سکتا، اور نہ مسئلہ ارتقا کو صحیح فرض کر کے قرآن کی صحت کو ثابت کرنا ہمارا مطمح نظر ہے۔

یا امریکہ کا ہندوئے احمر منقطع النسل ہونے کو ہے تو مسئلہ ارتقا کے رُو سے اُن کی مدافعانہ جدوجہد

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۵) کتاب کے متن کا سلسلہ استدلال بجائے خود ایک مستقل شے ہے جس میں اس تحریر کو چنداں دخل نہیں۔ البتہ اگر کتاب خدا کا علم، اِن مباحث کے ضمن میں مسئلہ ارتقا کو اپنی آغوش میں لیکر، اپنے آپ کو یورپ کے اُس علم سے بدرجہا وسیع تر ثابت کر دے جس کے باعث وہ آج اوجِ کمال پر چڑھ گیا ہے تو منکرین کیلئے یہ امر بجائے خود قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی روشن اور ناقابل انکار دلیل ہے!

مسئلہ ارتقا کی بحث آیۂ استخلاف کے الفاظ "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" سے شروع ہوئی تھی۔ عمل صالح کی مکمل اور ناقابل انکار تشریح کر دینا فی الحقیقت قرآن کے تمام دستور العمل کو از سرِ نو آشکار کرنا ہے۔ اور یہ صلاحیت عمل ہی مسئلہ انتخاب طبیعی کی وہ مضبوط اساس ہے جس پر اقوام کے بقاء و استخلاف کا سب سے بڑا مدار ہے۔ پس آج اِس علم و شہادت کے زمانے میں قرآن کریم کا طبعی تعلق اِس مسئلے سے ہے، اگرچہ حکمائے مغرب کو اِس کا علم نزول قرآن کے صدیوں بعد حاصل ہوا ہو۔ یا صالحات کے عظیم الشان لفظ کے معانی قرنوں تک بگڑتے بگڑتے نہایت محدود، یا قطعاً محجوب ہو گئے ہوں، اور اپنا اصلی اثر کلیۃً کھو چکے ہوں! یہ حقیقت اور بھی واضح تر اِس وقت ہو جاتی ہے جب کلام الٰہی کا طالب العلم کامل غور و تعمق کے بعد لامحالہ اِس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ قرآن کریم درحقیقت اقوامِ عالم کے فنا و بقا کے اسباب کی مکمل داستان ہے جو شارع کائنات نے تذکیر و اعتبار کے لیے انسان کے حوالے کر دی ہے، اور جس کے لائحہ عمل کو نباہنا در اصل اِس روئے زمین پر اپنی مدت قیام کو دراز کرنا ہے۔ سورہ ملک میں مالک زمین و آسمان نے اِس حقیقت کو بوضاحت تمام بیان کر کے موت و حیات کے سوال کو خاتمے کر دیا ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۚ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۙ (۶۷ : ۲)

لوگو! وہ مالک الملک اور صاحبِ اختیار خدا ہے جس نے اجتماعی موت و حیات کے قانون کو رائج کر دیا ہے تاکہ اِس بات کی آزمائش کرے کہ تم میں سے کونسی قومیں حُسنِ عمل کرتی ہیں، جبتک صالح ہیں اُن کو بقا نصیب کرے، جب غیر صالح بن جائیں محو کو صفحۂ زمین سے یکسر محو کر دے! اور لوگو! یاد رکھو کہ وہ شارع کائنات بڑا زبردست اور بڑا شدید العقاب (اَلْعَزِیْز) ہے اور تائب اقوام کے اجتماعی عیوب پر بڑا پردہ ڈالنے والا بھی ہے (اَلْغَفُوْرُ)۔

آج اِس مسئلہ ارتقا کی تائید و تثبیت انسانی علم و یقین کے قریب قریب ہر شعبے نے اِس حیرت انگیز طریقے پر کی ہے کہ مغرب کے لیے اِس کا منکر ہو جانا قطعاً غیر ممکن ہو گیا ہے۔ سطح زمین کے موالید ثلاثہ کی کامل تدوین و تنظیم نے اِس حقیقت کو اور بھی آشکار کر دیا ہے۔ طبقات الارض کی تمام داستان من و عن اِسکی مؤید ہے، عالمِ افلاک کے پیہم مشاہدے اِسی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، روئے زمین کے طبعی انقلابات یہی کہہ رہے ہیں، اجناس حیوانات کی داستانِ حیات یہی سبق دے رہی ہے، اطلال دنیا کی روداد یہی ہے، احوال جہان کی سرگذشت بھی اسی قطع کی ہے، جنین اور میں تخلیق انسان کا تنوع یہی ثابت کر رہا ہے۔ طبعیات، ریاضیات، کیمیا، تشریح الابدان وغیرہ وغیرہ اکثر یقینی علوم اِسکی ساعت میں ہیں۔ خود انسان کی اصل حیوانیت فطرت زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ انسان کسی ادنیٰ مخلوق کا ترقی کردہ ترقی یافتہ فرد ہے۔ عام تخیل کہ بندر ارتقا کرتے کرتے انسان بن گیا جہلا کی نامنصفانہ تشریح ہے، اِسکو اِس مسئلہ سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ خود بندر کو انسان سے بظاہر ہے۔ تاہم اِس میں شک نہیں کہ اِس مسئلے کے نفس دعوے میں بھی وقتاً فوقتاً ارتقا ہوتا رہا۔ روئے زمین پر تدریجی انقلاب کا اعتراف (شق اول) انسان کو غالباً اُسوقت سے ہے جسکی صحیح تعیین بہت مشکل ہے۔ قدیم ہندو فلسفہ تکوین عالم کے متعلق عجیب و غریب دعاوی پیش کرتا ہے جن کی مماثلت موجودہ مسئلے سے ایک خفیف سی ہے۔ یونانی حکما نے قدامت مادہ کے نظریے کی ترویج کی۔ مگر کوئی خاص مسئلہ مدوّن کیا اسلامی حکما نے پہلی، دوسری، تیسری اور آٹھویں شقوں کے متعلق مستقل دعاوی مرتب کیے۔ مگر باقی تمام شقوں کی تدوین اور تحقیق (بلکہ ایک رو سے تمام مسئلے کی تصدیق)، ہمہ تن علم جدید کا کارِ نمایاں ہے۔ مسئلہ انتخاب طبیعی، (یعنی چوتھی اور ساتویں شق)، کا دعوے اوّل اوّل سنہ ۱۲۲۳ھ ۱۸۰۸ء اور بعد ازاں سنہ ۱۲۴۷ھ ۱۸۳۱ء میں یورپ کے دو غیر معروف طبعی فلسفہ دانوں نے کیا۔ مگر ڈارون اور ولیس نے سنہ ۱۲۷۴ھ ۱۸۵۸ء میں اِسکو از سرِ نو

اور صلاحیت کا خاتمہ ہو گیا ہے!†

(تتمہ تحت المتن صفحہ ۲۶) دریافت کرکے پایہ تحقیق تک پہنچا دیا۔ اس وقت سے آجتک اس مسئلے کی روز افزوں شہادت برابر مل رہی ہے حتیٰ کہ آج اسکو علم جدید کی بدیہیات میں شامل کر لینا مغربی حکماء کے نزدیک کچھ قابل اعتراض نہیں۔ اصل کتاب میں اسکے متعلق 'نظریے' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے (دیکھو صفحہ ۱۱) مگر 'نظریہ' کا لقب فی الحقیقت اس کے شایانِ شان نہیں، اگرچہ قرآن حکیم کی مستقل اور ناقابل بدل حقیقت کے بالمقابل اس ناممکل اور غیر مستقل مسئلے کو یہی لقب دینا زیادہ موزوں ہے!

مسئلہ ارتقا کی محولہ بالا چوتھی شق، یعنی مسئلہ انتخاب طبیعی (صفحہ ۱۳) کی صداقت پر جو ناگہاں حملہ حال ہی (یعنی ۱۳۴۱ھ ۱۹۲۲ء) میں جامعہ کیمبرج (انگلستان) کے دو نامعروف الاسم حکما ڈاکٹر ولس اور ڈاکٹر یول نے کیا ہے اس قابل نہیں کہ اسکی باضابطہ تردید یا تشریح اس کتاب میں کیجا سکے۔ ابھی تک کسی قابل ذکر علمی حلقے نے ان حکما کے دعوے کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا، اور چند اشتباہی اور مشترک النتائج دلائل کی بنا پر انتخاب طبیعی کے اصل اصول کو مشکوک قرار دینا بہت کچھ پیش از وقت بلکہ قطعاً ناروا ہے۔ ان حضرات کا دعوےٰ ہے کہ انواع و اجناس کا نشو و نما روئے زمین پر تخلف 'بقائے اصلح' کے قاعدے کے ماتحت رہ کر نہیں ہوا، بلکہ ہر نوع بقدر اپنی قدامتِ ظہور اور مدت قیام کے روئے زمین پر توسیع و تمکن حاصل کرتی رہی حتیٰ کہ کسی ایک باقی یا فنا شدہ نوع کے رقبہ توسیع کا حال ضرب و تقسیم کے حسابی قاعدوں کے ذریعے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے ان کے نزدیک ہر جنس کے تعدد انواع کی توسیع بھی روئے زمین پر ہوتی رہی۔ بہت ممکن ہے کہ صلاحیت اور قدامت کے اعداد و شمار کے درمیان کوئی اتفاقی تعلق ظاہر ہوا ہو جس کی وجہ سے حساب لگانے میں یک گونہ سہولت پیدا ہو گئی ہو، مگر ظاہر ہے کہ فطرت کا یہ کارگاہ عظیم انسان کے تسلیم کیئے ہوئے وضعی قاعدوں کی پابندی سے مطلقاً بے نیاز ہے۔ جب کون و مکان کے ہر شعبہ بقا و حیات کی بنیاد سعی و عمل پر ہے تو سعی و عمل کا قیام ہی عین صلاحیت ہے، اور علیٰ ہذا القیاس صلاحیّت کا وجود ہی عین قیام و بقا ہے! پس اس مقام نظر سے مدت قیام کی درازی اور صلاحیت دو مترادف اشیا ہیں جن کی اصل ایک ہی ہے۔ یہی قرآن عظیم کا دعوےٰ ہے۔ اور یہی مسئلہ ارتقا کا اصل اصول۔ اگر قدامتِ ظہور اور تکثر و تمکن فی الارض میں کوئی ظاہری تعلق پیدا ہو گیا ہے تو وہ بھی اسی ضمنی ترادف کی وجہ سے ہے نہ اس وجہ سے کہ قانون بقا و فنا کے متعلق کوئی نیا انکشاف ہوا ہے جس کا اعتراف پہلے لوگوں سے نہیں ہو سکا۔

† اژدہوں اور افیال کے متعلق اس اجمال کی تفصیل کے لیئے علم طبقات الارض کی مفصلہ ذیل معلومات کا یہاں پر لکھ دینا ضروری ہے:۔

قشر الارض، یعنی کرۂ زمین کے سطحی غلاف کی تفحص اور تلاش کرنے سے فطرت کے طالب العلم پر یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ سطح زمین کا وہ حصہ جو انسان کے دست قدرت میں ہے، اور جہانتک اسکی کُدال کی زد پہنچ سکتی ہے، دو قسم کے احجار پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ جو نسبتہً مختصر سا ہے اُن چٹانوں کا ہے جو وقتاً فوقتاً زمین کے بطن سے سیّال حالت میں آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں سے نکل کر سطح زمین پر جمتی گئیں، اور بعدازاں اس مُثَل مذاب کے عظیم الشان تودے بن گئے۔ یہ سب چٹانیں نہایت سخت ہیں، انکے زمین پر پھیلاؤ کی کوئی ترتیب نہیں، ان کے اندر کسی قدیم حیوان کے بقیۂ آثار کا نشان تک نہیں۔ جہاں جہاں غلاف زمین کا کوئی کمزور حصہ ہے وہاں یہ چٹانیں اسکو پھاڑ کر نمودار ہو گئی ہیں۔ قدامت کے لحاظ سے ان کی ترکیب میں کچھ کچھ کیمیاوی تغیر و تبدل ہوا ہے مگر ماہر فن کے لیئے ان احجار منقلبہ کی شناخت کچھ مشکل نہیں، اور اگر کوئی شئے مشتبہ نظر آئے تو خوردبین اسکا یکدم فیصلہ کر دیتی ہے۔

دوسری قسم چٹانوں کی وہ ہے جو طبق طبق یعنی تہ در تہ ہے۔ ایک تہ نہایت سلیقے سے دوسری تہ کے اوپر جمی ہے۔ انکی سطحیں بھی قریب قریب ہموار ہیں۔ ہر ایک تہ کا رنگ اس کے اِدراتی اجزا، اسکی ظاہری ساخت، اسکی خوردبینی بافت اور کیمیاوی ترکیب دوسری تہ سے جُدا ہے، کوئی نرم ہے

قرآن حکیم نے اِس آیۂ کریمہ میں آفرینش کی بقاو فنا، اور اقوام کے عروج وزوال کا وہ مہتم بالشان کلیہ بیان کر دیا ہے جس کی صرف پہلی شق کی اصلیت کو یورپ کے طبعی فلسفی طبقات الارض کی مسلسل تفتیش و تفحص کے بعد ابھی پہنچے ہیں۔ غیر ناطق حیوانات میں چونکہ ایمان کی انسانی طریق پر گنجائش نہیں اور عمل مقتضائے طبیعت ہے، اِس لیئے فطرت کے حال واحوال کا ان کی ضروریاتِ زندگی سے تطابق

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۷) کوئی سخت، کسی کے اجزا نہایت باریک ذرات سے بنے ہیں، کسی میں چھوٹے چھوٹے سامل آب کے گھسے ہوئے گول پتھر جُڑکر چٹان بن گئے ہیں، کسی کے سالمات اِسقدر نفیس ہیں کہ بمشکل تمام اُن کے اتصال کو شناخت کیا جا سکتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ سورۂ فاطر میں اِنہی حیرت انگیز اور جلیل الشان چٹانوں کیطرف اشارہ ہے جن کی حقیقت کُشا سرگذشت کم ہمن اور کوتاہ نظر انسان نے ہزاروں برس تک سُننے سے انکار کیا، اور ابھی ڈیڑھ سو برس نہیں گذرے، کہ مغرب کے چند طبعی حکما اپنی جان جوکھوں میں ڈالکر ان سے ہمکلام ہوئے، اور اُن کی جگ بیتی داستان کو سُن کر ایک عالم کو محو کر دیا! نہیں، بلکہ قرآن حکیم کے ایک اہم حصے پر عمل کرکے دنیا کو معرفت خدا کے فلک الافلاک پر پونہچا گئے!

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُوْدٌ ۝ (۳۵ : ۲۷)

اے ساکنانِ زمین! کیا تم نے اِس حیرت انگیز حقیقت پر غور نہیں کیا (اَلَمْ تَرَ کا ترجمہ جو اسی آیۂ کریمہ کے شروع میں ہے) کہ پہاڑوں کے اندر عظیم الشان طبقے ہیں جن میں سے کوئی سفید ہے کوئی سُرخ، اُن کے رنگ جدا جدا ہیں اور بعض اُن میں سے ایسے بھی ہیں جو بھُجنگ کالے ہیں اگر تم جاؤ ان کو دیکھو کہ وہ کیا داستان سُنا رہے ہیں، سفید کیا انکشاف کر رہے ہیں، سُرخ کیا کہہ رہے ہیں، خدا کی عظمت اور معرفت کا کیا گراں بہا سبق دے رہے ہیں، کالے کیا بے بہا نعمتیں بخش رہے ہیں!)

اِن طبقوں کی متوازی حدیں، انکی ہموار سطحیں، انکی ظاہری ساخت اور خوردبینی بافت، اِن کے مختلف اور متقابل رنگ بلا محالہ اِس نتیجے پر پونہچا دیتے ہیں کہ یہ سب احجار پانی کی تہ میں، اور سمندروں کی وساطت سے بنے۔ سطح زمین کے مختلف نالوں اور دریاؤں کے گدلے اور ذرات آمیز پانی جھیلوں اور سمندروں کے پانی میں ملکر ساکن ہوگئے۔ وہاں پر آہستہ آہستہ انکی تلچھٹیں (رسوبات) تہوں میں بیٹھتی گئیں اور مرورِ وقت کے باعث ہزارہا گز موٹی تہیں بن گئیں۔ ایک تہ کے اوپر، سطح زمین کے تبدیل احوال کے باعث، دوسرے رنگ، ساخت اور قماش کی تہ بیٹھی۔ تبدیلیٔ موسم، طوفان باد و خاک اور حرکت انہار کے تخریبی اثرات (تعریۂ جوّی)، شبنم اور طبعی میاہ، باران و یخ بستہ کے کیمیاوی اور اِرادی اعمال (تعریۂ مطری)، اور تصادم امواج مدوجزر بحر کی زمینی شکست و ریخت (تعریۂ بحری) نے اِن طبقات کی تدریجی تعمیر میں مستقل حصہ لیا۔ پھر ان کے اوپر کا پانی زلازل زمین یا اور مقامی انقلابات کے باعث رفتہ رفتہ خشک ہو گیا، اور یہ طبقے سطح زمین پر نمودار ہوگئے۔ بعد ازاں اوپر کے طبقوں کے کروڑوں من بوجھ اور زمین کی اندرونی حرارت نے قرنوں کے بعد ان رسوبات کو پتھر کی مانند سخت کر دیا، اور وہ مختلف چٹانیں بن گئیں۔ آج بھی ہر سمندر، جھیل، بلکہ معمولی تالاب کی تہوں میں یہ رسوبی طبقات روز بروز بن رہے ہیں اور ہر صاحب نظر کو ارضی تعمیر و شکست کا سبق دے رہے ہیں!

لیکن جو حیرت انگیز امتیاز ان آبی اور ترسیبی احجار میں نمایاں ہے وہ ان کا حیوانی ہڈیوں اور ڈھانچوں، اُن کے قدموں کے نشانوں، اور نباتی پتوں اور تنوں کے بقیۂ آثار (رکازات) سے معمور ہونا ہے۔ سطح زمین سے کئی کئی ہزار گز، بلکہ بعض اوقات چار چار میل نیچے تک یہ ہڈیاں کیمیاوی طور پر تبدیل شدہ حالت میں ملتی ہیں۔ بلند ترین طبقوں میں مرے ہوئے حیوانوں کے سالم ڈھانچے ترکیبی اجزا کے معمولی رد و بدل کے بعد پائے جاتے ہیں۔ اُن کی شکلیں بالکل محفوظ ہیں لیکن اجزا متحجر یا متحد ہو گئے ہیں۔ بعض کے اجزا چونے سے بدل گئے ہیں، بعض لوہا یا تانبا وغیرہ بن چکے ہیں۔ قرآن حکیم میں عظام کی اسی بدلِ ہیئت کی طرف علیمانہ اشارہ کرکے خدا فراموش انسان کو بعث کا عبرت انگیز سبق دیا گیا ہے؛

یا تخالف پذیر ہونا ہی ان کی صلاحیت یا عدم صلاحیت ہے، اور وہی جنس قوی تر یا صالح تر ٹھیرے گی جسکے وسائلِ دفاع کا توازن (جو فطرت نے اُسکو سپرد کیے ہیں) قدرت کی خارجی اور اٹل طاقتوں کے ساتھ قائم رہے گا۔ مگر مجامع انسانیہ کی حالت جن کے ہر فرد کی ادنےٰ سے ادنےٰ ضرورت بھی تدبیر و عمل کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی، قطعی مختلف ہے۔ ان کے تحفظ و ارتقا کا مسئلہ بیحد مشکل اور بدرجہا پیچیدہ تر ہے

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۸) وَقَالُوٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۝ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ۝ (۱۷ : ۴۹-۵۱)

اور لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم مرنے کے پیچھے گل سڑکر ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ایسی حالت میں ہمکو از سر نو پیدا کرکے اٹھا کھڑا کیا جائے گا۔ اے محمدؐ! ان سے کہدو کہ کم عقلو! تم مرنے کے پیچھے پتھر ہو جاؤ، یا لوہا بن جاؤ، یا کوئی اور شئے جو تمہارے خیال میں اس سے بھی عجیب تر ہو، پھر کہیں گے کہ اچھا بھلا اب کون ہم کو زندہ کر سکے گا۔ انہیں کہہ دو کہ وہی خلّاقِ عظیم جس نے تمہیں پہلے پیدا کیا تھا۔ اسپر یہ لوگ تمہارے سامنے انکار کے طور پر سر ہلانے لگیں گے اور کہیں گے کہ اچھا یہ کب ہوگا۔ انہیں کہہ دو کہ عجب نہیں کہ یہ سب کچھ قریب ہی آن لگا ہو!

ایک مدت تک اِن آثارِ باقیہ کے متعلق لوگ یونہی سر ہلایا کیے؛ انکے وجود کے بارے میں اکثر اغماضی اور تجاہلی شان رہی، لوگ انکو دیکھتے مگر ان کے متعلق بحث کرنے سے محترز رہتے؛ کسی نے اُن کو فطرت کا کھیل کہا؛ کسی نے خدا کی شان کا ایک نمونہ" بتاکر معترض کو چپ کر دیا۔ عیسائی پادریوں نے جو یورپ کی علمی تحقیقات سے خوفزدہ ہوکر اپنی انجیل کی حفاظت میں حواس باختہ تھے، اور پاپائے رومۃ الکبریٰ نے جو محافظ دین ہونے کی حیثیت میں علمائے فطرت کو دار و صلیب پر چڑھانے میں مصروف تھا، ان کو نوح علیہ السلام کے طوفان کا بقیہ قرار دیکر اپنی جان چھڑانی چاہی، مگر حقیقت کے بالمقابل باطل کب تک ٹھیر سکتا تھا۔ جب کئی کئی گز لمبے ڈھانچے اور پورے سر، اور پیر اور دھڑ برآمد ہونے لگے، اور میلوں کی گہرائی تک تمام سطحِ زمین آباد نظر آئی تو پادری دُم دبا کر بھاگے؛ سب یورپ دم بخود ہو گیا؛ علمائے فطرت کی چڑھ بنی۔ اُنھوں نے کامل غور و خوض کے بعد اعلان کر دیا کہ دنیا عہد عتیق کے شمار کے مطابق محض چھ ہزار سال سے ہی آباد نہیں بلکہ تخلیق کا سلسلہ لکھوکھا برس سے جاری ہے! یہ ہڈیاں لامحالہ اُن حیوانوں کی ہیں جو روئے زمین پر انسان سے پہلے بس رہے تھے۔ اُن کے ڈھانچے پانی کے سیلاب، ہوا کے جھکڑ یا اور مختلف اسباب کے ذریعے سے سمندروں میں چلے گئے؛ آبی حیوانوں کے ڈھانچے وہیں تہ میں گرتے رہے، بالآخر جب رفتہ رفتہ رسوبات اور فضلات کی تہ اُن پر جمی، دب گئے۔ فطرت نے ان کو نہایت حفاظت سے یادگار کے طور پر محفوظ رکھا، ان کی شکلیں برقرار رکھیں، اُن کے کیمیاوی اجزا تقطیر حوامض و املاح کے باعث بدل گئے مگر شکل نہ بدل سکی۔ انسان کی نوعی تخلیق ان حیوانات کے مدتوں بعد ہوئی اور بتدریج تمام ہوئی۔ اس بنا پر سطحِ زمین کے لاتعداد رنگا رنگ طبقے فطرت کی عظیم الشان کتاب کے رنگا رنگ "ورق" ہیں، یہ رکازات باقیہ ان اوراق پر خدا کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے "حروف" ہیں؛ انسان کو یہ عالم آرا کتاب" اسلیئے دی گئی ہے کہ اسکو پڑھے اور اُس خلّاقِ عظیم کی عظمت کا اندازہ بچشم خود کرے!

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ۭ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ۝ (۶۷ : ۱۵)

لوگو! وہ وُہ منعم حقیقی ہے جس نے زمین کو تمہارے لیئے میدان کر دیا ہے کہ تم اسکے اطراف و اکناف میں دل کھولکر پھرو، خدا کے

اور جوں جوں اقوامِ عالم ترقی کی تگ و دَو میں ایک دوسرے پر سبقت لیجا رہی ہیں انفرادی معیشت اور اجتماعی حفاظت کا سوال اور بھی لاینحل ہوتا جا رہا ہے۔ آج معاشرت کی اِس حیران کن مسابقت میں تمدن کی لاانتہا ضروریات، اور تہذیب کے اَن گنت لازمات جزوِ زندگی بن گئے ہیں؛ علم کی حیرت انگیز جدت آفرینی اور عقل کی محیر العقول جولانی نے میدانِ حیات ناقابل گذر کر دیا ہے؛ ذرائع کی ناقابل یقین توسیع کے باوجود

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۹) عجیب و غریب اعمال کا بچشم خود مشاہدہ کرو اور اس کا رزق کھاؤ، ترقی اور آسودگی کے بامِ بلند پر چڑھو لیکن اِس بات کو یاد رکھو کہ تم نے ایک نہ ایک دن اُسکے حضور میں کھڑے ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔

کتابِ فطرت کی اِس حیرت انگیز اہمیت کو پیش نظر رکھ کر مغرب کے طبعی حکمانے اجزارِ زمین کے اُس حصۂ عظمیٰ کو جن کی تخلیق سمندر کی وساطت سے ہوئی پانچ بڑے بڑے جلیل القدر اور طویل المدت زمانوں یعنی "القدیمۃ الاولیٰ" ۔ "القدیمۃ الاخریٰ" ۔ "الحیات الوسطیٰ" "الجدیدۃ القصویٰ" ۔ اور "الجدیدۃ الادنیٰ" کے صحور پر منقسم کیا ہے۔ پہلی قسم یعنی القدیمۃ الأولیٰ کے طبقوں میں جنکی گہرائی زمین کے بعض حصوں میں میلوں تک پونہچتی ہے اور جو اور سب طبق کی تہ میں ہیں، کسی ذی حیات مخلوق کا باقی نشان آجتک نہیں ملا، اگرچہ ان کی تہوں کے اندر بعض مشکوک سی لکیریں اور سوراخ پائے جاتے ہیں جنسے شبہ پڑتا ہے کہ وہ کسی بے استخوان حشرات الارض کے نشاناتِ قدم ہیں۔ باقی چار حصے حیرت انگیز ترتیب اور تسلسل کے ساتھ عجیب و غریب حیوانات کے بقیہ آثار (رکازات) سے پُر ہیں، سطح زمین کا کوئی حصہ اُن سے خالی نہیں۔ "القدیمۃ الأخریٰ" کے طبق میں جن کی تقسیم چند بڑے بڑے حصوں میں کیگئی ہے، زندگی کے آثار غیر مشکوک طور پر نمایاں ہیں۔ استخوان کے عام فقدان کے باعث سب مخلوق غیر ذی فقری (یعنی ریڑھ کی ہڈی کے بغیر) ہے۔ پہلے حصے میں (خوردبینی حیوانات سے قطع نظر جنکے نشانات کا باقی رہنا ناممکن ہے) سرطان نما قشری حیوانوں (القشریات) کی ایک تعداد کثیر پائی جاتی ہے جو آج سطح زمین سے قطعاً ناپید ہو چکے ہیں۔ اِسی حصے میں اسفنج، مفصلی اور دو برگی حلزون (گھونگھے) کی ابتدائی نوعیں رونما ہوئی ہیں۔ دوسرا حصہ ان "سرطانی" انواع سے نسبتاً کم آباد ہے۔ مگر مرجان (مونگے) کی فی الحال ناپید انواع، اسفنج، شوکیۃ القشر لوبی (دیپدار) حلزون، اور ناموجود "شمعانی" حشرات سے پُر ہے۔ تیسرے حصے میں قشریات "کشمکشِ حیات" کے باعث نہایت قلیل التعداد اور نحیف ہو چکے ہیں، مگر نجم نما آبی حیتان کی ابتدا ہو رہی ہے۔ دریائی حلزون نمودار ہیں، ریڑھ کی ہڈی والے (ذی فقری) جانوروں کی نشاناول کہیں کہیں نمودار ہے مگر نہایت ابتدائی اعضائی ترکیب کی مچھلیوں کے سوا اور کوئی حیوان اِس جنس کا کہیں نظر نہیں آتا۔ البتہ سرطانی قشریات اعضائی ارتقا کر کے ہزار پائے بن گئے ہیں۔ آبی عقرب، جن کی کوئی قسم آج نہیں ملتی، کہیں کہیں جلوہ گر ہے۔ نمل (چیونٹی) کی ابتدائی انواع، پروار اور بے پر، دونوں پائی جاتی ہیں۔ چوتھا گروہ طبق مچھلیوں کی بے شمار ناپید انواع سے پُر ہے۔ ارضی حیوانات کی اکثر انواع وہی ہیں جو تیسرے حصے میں تھیں۔ مگر اقسام نسبتہً بہت زیادہ ہو گئی ہیں، مرجان کی کثرت ہے۔ "القدیمۃ الاخریٰ" کے طبقات کا پانچواں حصہ یعنے زمین کی انقلابی نشوونما کا وہ یادگار زمانہ ہے جس میں انسان کی آیندہ بہبودی کے عجیب و غریب سامان پیدا ہوئے۔ اِس زمانے میں سطح زمین پر نباتات کا وہ عظیم الشان فقدورہ ہوا جسکی مثال آجتک پھر پیدا نہ ہو سکی۔ بڑے بڑے سرفلک درخت جن کے تنے موجودہ درختوں سے کئی کئی گنا بڑے تھے سطح زمین کے سب بالا و پست میں پھیل گئے۔ ہزارہا اقسام کی نئی نباتات کا ظہور ہوا، بالآخر اِسی سرسبز نباتات کے ہزاروں میل تک پہیلے ہوئے خزانے پایاب جھیلوں اور دلدلوں میں جمع ہو کر صدیوں کے بعد معدنی کوئلہ بن گئے، جسپر آج یورپ کی بے مثال ترقی اور تمکن فی الارض کا اکثر حصہ ہے! قرآن حکیم میں اِسی اہم نعمت خدا کا تذکرہ، اور اِسی بے مثال صناعی کا بیان سورۂ یٰس کے اندر ہے (سورۂ فاطر میں گھنگ کالی (غرابیب سود) چٹانوں کا اشارہ بھی اِسی معدنی کوئلے کی طرف ہے جسکا ذکر آیۂ (۲۷، ۲۸) صفحہ ۲۰ میں ہو چکا ہے)؛

ذاتی آسائش مفقود، اور بین الاقوامی امن ممتنع الحصول ہوگیا ہے، عمران وحفظانِ صحت کے التزامات نے آبادی کی المناک کثرت پیدا کردی ہے، ہلاکت کے شہر شکن سامان اور بربادی کے کوہ پاش وسائل کا مہیا کرنا ہر متمدن قوم کا منتہائے عمل ہوگیا ہے۔ وہ روٹی کا ٹکڑا جو انسان کو نشاءِ اول میں قلیل ہی قلیل سعی اور ادنےٰ سی ادنےٰ تدبیر کے باعث مل رہتا تھا آج انتہائی جدوجہد کے بغیر میسر نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۳۰) قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ ۝ (۳۶: ۷۹–۸۰)

اے محمدؐ! ان منکرین بعث کو جواب دو کہ تمہاری بوسیدہ ہڈیوں کو از سر نو زندہ وہی خلاقِ عظیم کرے گا جس نے اول بار انکو نیست سے ہست کیا تھا، اور وہ اپنی پیدا کی ہوئی ہر چیز کے سب کیف و حال، اور اس کی تمام ممکنات سے بخوبی واقف ہے۔ وہ فعکار سانئ جلیل اور وہ بنائے علیم ہے جس نے تمہارے استعمال کے لیے سرسبز درختوں کے بوسیدہ تنوں سے آگ کے عظیم الشان خزانے پیدا کیے اور آج تم انہی خزانوں کو اپنے مصرف میں لا کر ترقی کے بام بلند پر چڑھ رہے ہو!

آج ان گرانبہا خزانوں کے تہ در تہ طبقے ہزارہا گز گہرے وسطی یورپ اور امریکہ، وسط ایشیا اور شرقی ہند، روم، عرب اور مصر کی سرزمینوں میں دبے ہوئے انسانی سعی و عمل کا انتظار کر رہے ہیں۔ معدنیات زمین کے اِسی حصّۂ کبریٰ میں پر دار مچھلیاں کثرت سے دبی ہیں۔ گویا مچھلیوں کی نسبتاً ادنیٰ مگر استخوان دار مخلوق کے ارتقا سے پرندوں کی مقابلۃً اعلیٰ مخلوق کے ابتدائی اسباب پیدا ہو رہے ہیں۔ انکی اقسام ترقی کرتے کرتے موجودہ مچھلیوں کے لگ بھگ بن چکی ہیں۔ اسفنج اور لولبی حلزون، کیڑے اور کچھوے زیادہ طاقتور اور بہتر اعضائی ترکیب کے بنتے جاتے ہیں۔ لیکن جس خاص جنس کا ظہور اِس عہدِ ارتقا میں اول مرتبہ ہوا وہ پیٹ کے بل چلنے والے دابّہ ہیں۔ ان میں سے ایک نوع کسی منقار دار چھپکلی کی ہے جس کی ایک باقی قسم ابھی تک نیوزیلینڈ کے بعض متعلقہ جزائر میں سسک سسک کر اپنی حیات کے آخری دن گذار رہی ہے!

لیکن طبقات زمین کے اِس تحتانی سے قطع نظر "الحیات الوسطیٰ" کے طبق فی الحقیقت وہ حیران کن طبقے ہیں جن کے اندر اُس خلاقِ عظیم کی کبریائی سب سے زیادہ واضح طور پر آشکارا ہوئی ہے۔ دریائی اور ساحلی کیکڑے قدیم قشری سرطانوں اور عقربوں سے ارتقا کرتے کرتے موجودہ کیکڑوں کے متشابہ بن گئے ہیں، مچھلیاں بہ مدارج بہتر اور صالح تر ہو رہی ہیں، ان کے پھیپھڑے اور سر کا استخوانی ڈھانچہ اور دانت آجکل کی مچھلیوں کے اعضاء سے مشابہ ہو چلے ہیں۔ پیٹ کے بل چلنے والی چھپکلیاں (حرزون) نہایت تیز رفتاری سے ترقی کر رہی ہیں، اُن کی منقاریں رفتہ رفتہ موجودہ حرازین کے دندان دار موہنوں سے بدل گئی ہیں، ایک گروہ اسی جنس کا دریائی مسکن اختیار کر چکا ہے۔ جہاں یہ آجکل کے دریائی دودھ پلانے والے حیوانوں (ذوات الثدی یا مرضعات) کا پیش خیمہ بن رہا ہے۔ "الحیات الوسطیٰ" کے اِسی پہلے حصّۂ طبق میں حرازین کے فوری ارتقا کے باعث رضاعی حیوانوں کے مشکوک یا متشابہ آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ کشف شدہ اعضائی خاصیات اور آلی امتیازات جو اس جنس کے لیے مختص ہیں، بعض اعلیٰ اقسام کے حرازین میں نمودار ہو رہی ہیں۔ دوسرے حصۂ طبق میں حرزونی جنس کے حیوانات کی یہ حیرت انگیز کثرت اور پرورش ہوئی ہے کہ ان کے بقیہ آثار کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بڑے بڑے عظیم الشان پیٹ کے بل چلنے والے جانور جن کے ڈھانچے کئی کئی گز لمبے ہیں اور جنکی رانوں کی قد آدم کے برابر ہڈیاں اور گزوں لمبی دُمیں ان کو اژدہوں کے مماثل کر دیتی ہیں، اِس زمانے میں سطح زمین پر موجود دکھائی دیتے ہیں۔ ان ڈھانچوں میں "سُم قدم"، "چنگال قدم"، اور "پنجہ قدم"، تینوں قسم کے حرزون

مشکلات کے مادّیت کے غلبے نے اقوامِ متمدنہ میں روحانیت سے عام انحراف پیدا کر دیا ہے! جسمی طاقت اور مادّی اقتدار پر ناز، کبریائی کا ادّعا اور بہیمی اخلاق سے تخلق، طبیعت ثانیہ ہوگئی ہے! مکر و دروغ مجامع عالم کا شعار، بلکہ طغرائے امتیاز بن گیا ہے! بین الملی خُلق اور اتحادِ عالم کا نصب العین خواب و خیال ہو چکا ہے! طاقتور اقوام کی سبعیت اور درندگی کی یہ شان ہے کہ ایک دوسرے کی تباہی کے ہولناک سامان روز بروز بڑھ رہے ہیں

(بقیہ حاشیہ تحت المتن صفحہ ۳۱) شامل ہیں گویا پرندوں اور رضاعی حیوانوں کی طرف ارتقا کا میلان ابھی سے ظاہر ہے۔ حرزونی اژدہوں کے اعضا کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیس بیس گز لمبی چھپکلیاں اپنی پچھلی دو ٹانگوں کے بل سطح زمین پر کودتی پھرتی تھیں، یا عظیم الشان تمساحوں (مگرمچھ) کی طرح پایاب ساحلوں اور دریاؤں کے دہانوں پر شکار کی گھات میں پڑی رہتی تھیں۔ امریکہ کے بعض حرزون اپنی جسامت کے لحاظ سے اسقدر عظیم الشان تھے کہ آج سطح زمین کا بڑے سے بڑا جانور اُن کے بالمقابل دیوار کی چھپکلی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا! ایک منقاردار حرزون جسکے پاؤں کی ساخت پرندوں کے پنجوں سے بہت مماثل تھی، اسقدر قدآور تھا کہ الف لیلہ کا سیمرغ بھی اسکے آگے محض ایک کنجشک نظر آتا ہے۔ اسکی تمام محدب کمر پر ریڑھ کی ہڈیوں کے عین اوپر دو دو گز اونچی گھریلو مرغ کی مانند کلغی تھی، اور مخروطی دُم کے اوپر ڈیڑھ ڈیڑھ گز لمبے اور ہاتھی کی ٹانگ کے برابر موٹے کئی کانٹے تھے! اونچائی میں چار انسانوں کے قد کے برابر اور دُم سے لیکر چونچ تک بلا مبالغہ دس گز لمبا تھا!

يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١:٣٥﴾

وہ رب عظیم اپنی مخلوق میں جو مناسب سمجھتا ہے زیادہ کر دیتا ہے۔ لوگو! بگوش ہوش سُن رکھو کہ وہ خدائے بے مثال ہر بات کر دینے پر قادر ہے!

"الحیات الوسطیٰ" کے اسی زمانے میں فرعی ارتقا کے باعث اُڑنے والے اژدہوں کی بھی ایک تعداد کثیر نظر آتی ہے۔ اُن کے تمساح (مگرمچھ) کی مانند لمبے لمبے دندان دار منہ اور خفاش (چمگادڑ) کی شکل جھلی والے پر اس بات کی شہادت ہیں کہ یہ ہولناک "پرندے" درندوں سے بدرجہا خوفناک تھے معمولی اژدہوں کے پروں کا پھیلاؤ بھی آٹھ آٹھ گز تک پہنچتا تھا۔ دُم سے لیکر چونچ تک ہر ایک کی لمبائی کئی کئی گز تک تھی، اور الف لیلہ کے رُخ کی مانند یہ دہشت انگیز درندے جہاں اُڑتے تھے اپنے پروں کے پھیلاؤ سے زمین پر اندھیرا کر دیتے تھے![1]

لیکن فرعی ارتقا کی اِن حیرت انگیز عجائب نمائیوں سے قطع نظر جو اصلی ارتقا اس زمانے میں نمودار ہوا وہ پر والے پرندوں کا ظہور تھا اِن طبقات میں مُرغِ ہوا کی صرف ایک قسم محفوظ رہ گئی ہے جو آجکل کے پرندوں سے کچھ کچھ مماثل ہے۔ رضاعی (ذوات الثدی) حیوانات کے آثار خال خال نظر آتے ہیں۔ لیکن حرزونی اور رضاعی اجناس کے سلسلۂ تکوین کی درمیانی کڑیاں صاف طور پر ظاہر ہیں۔ "انڈے دینے والے رضاعی حیوان" جو مرغ اور چوپائے کے بین بین نظر آتے ہیں کثرت سے ہیں۔ تھیلی والے رضاعی حیوانات کی جو حرزون اور مویشیوں کی درمیانی کڑی ہیں، رونق لگی ہے۔ مقدم الذکر نوع کی دو قسمیں آج بھی آسٹریلیا کے بعض حصوں میں پرانے وقتوں کی یادگار کے طور پر قائم ہیں۔

ارضی، ہوائی اور دریائی تمساحوں اور اژدہوں کا قیام "الحیات الوسطیٰ" کے تیسرے اور آخری حصے میں بھی بدستور رہا لیکن انکی جسامت اس زمانے میں اور بھی حیرت افگن ہوگئی۔ ایک ارضی حرزون جسکے جسم کی نسل موجودہ گوہ بلاؤ سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا پانچ گز کے قریب بلند نظر آتا ہے۔ بعض ہوائی تمساح اُڑتے وقت تین تین گز لمبے خفاشی پر پھیلا سکتے تھے۔ بعض امریکی دریائی انواع کی لمبائی سر سے لیکر دُم تک پچاس پچاس گز ناپی گئی ہے! ایک ارضی تمساح کی ہڈیاں اسی زمانہ قدیم کے طبقوں میں سے ابھی (نومبر ۱۳۴۱ھ ۱۹۲۲ء) چھ ماہ نہیں گذرے

[1] ابن بطوطہ (المتوفی ۷۷۹ھ) مرشد ۱۳۲۳ء اور مارکو پولو (المتوفی ۷۲۴ھ ۱۳۲۳ء) نے اِن ہیبت ناک پرندوں کا ذکر اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔

الغرض عقل کی بے اندازہ کارفرمائیوں اور فوق الضرورۃ چارہ جوئیوں نے آج عقدۂ معاش میں وہ صورت اشکال پیدا کردی ہے جو فی الحقیقت ناقابلِ تحمل ہے!

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝ (۳۳ : ۷۲)

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۳۲) کہ ہند کی سرزمین میں دریائے جہلم کے قریب نکلیں مگر اُس کا ڈھانچا اس قدر وزنی تھا کہ بمشکل اپنی جگہ سے ہل سکتے تھے! الغرض جس حیرت انگیز طریق پر رب زمین و آسمان کی اِن ہولناک اجناس نے انسان کے زمین پر وارد ہونے سے پیشتر زور پکڑا تھا، اُس سے گمان ہو سکتا تھا کہ انسان جیسی بظاہر کمزور، نو وارد اور بے نوا مخلوق اُن کے ہوتے ہوئے کچھ حفظ و قیام حاصل نہ کر سکے گی، مگر شارعِ فطرت کو اِن کا روئے زمین پر دیر تک رکھنا منظور نہ تھا! کارخانۂ طبیعت کے اٹل قوانین اُنکے تمکن فی الارض کی مخالفت میں ڈٹے تھے؛ بقاء معیشت کے پیہم مجادلے میں اُنکی جسامت، اُنکی قوتِ لایموت کی مقدار، اُن کا ممتنع السیر، کاہل الوجود اور بطیٔ النسل ہونا ہی اُنکے بقا کا مانع تھا؛ وہ سب کے سب ایک اقلِ قلیل مدت میں صفحۂ زمین سے محو کر دیئے گئے، اور اعمل اور صالح تر مخلوق کو اُن کا جانشین کر دیا گیا۔ الحیات الوسطیٰ تک کے بلند ترین طبقات جن قدر ان اجناس سے پُر نظر آتے ہیں، اُسیقدر الجدیدۃ القصویٰ کے ابجار کا حد کی اسفل لنے نسبتاً خالی پایا جاتا ہے۔ مقدم الذکر زمانے کے زیریں والا سب طبقات میں اُن کے حیرت انگیز توالد و تناسل کے بعد بلند تر طبق میں اُنکا یک لخت معدوم ہوجانا فطرت کے طالب العلم کے لیئے ازبس عبرت آموز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سعی و عمل اور تگ و دو، صبر و ابتلا کے اس عظیم الشان معمل میں اُنکی سعی کچھ مشکور نہ ہوئی؛ بدیع کائنات کو جو بذاتِ خود شبانہ روز سعی و عمل میں مصروف ہے، اور ہر آن "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَأْنٍ" کا مصداق ہے، اُن کا جمود، اُن کا ناکارہ پن، اُنکی گرانجانی کچھ پسند نہ آئی، اور ایک "یوم" کے اندر اندر اُن کو روئے زمین سے فنا کر دیا گیا۔ قرآن کریم میں سورۂ قصص کے اندر اُسی ربِ علیم کے اسی بے مثال اختیار کی طرف اشارہ ہے جس کے مطالب کی عظمت کو طبقاتِ زمین کی کتابِ عظیم میں بچشمِ خود دیکھ کر ہر صاحبِ نظر کا کپکپا جانا یقینی ہے!

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ (۲۸ : ۶۸)

اور اے محمدؐ! تیرا پروردگار زمین و آسمان کے اِس بیکراں محیط میں جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اور پھر پیدا کرنے کے بعد اُن کی سعی و عمل کا امتحان لیکر جو مخلوق چاہتا ہے پسند کر لیتا ہے، اور جسکو مناسب سمجھتا ہے روئے زمین سے محو کر دیتا ہے (ویختار) اور جو فرضی معبود اور حاکم اعلیٰ انسانوں نے اپنی طرف سے گھڑ لیئے ہیں اُنکو تو یہ عظیم الشان اختیار کچھ بھی نہیں! اے ساکنانِ زمین! وہ خدائے عظیم اُن تمام من گھڑت مُطاعوں اور معبودوں سے بدرجہا بلند تر اور ارفع ہے جن کو لوگ اسکے برابر بنائے رہتے ہیں (تذکرہ کوئن)۔

اور سب پر طرہ یہ کہ اگر اس قیام و ممات، اس رد و قبول، اِس فنا و بقا اور اِس شکست و فلاح کے اختیار کرنے کی کوئی شرط قرآن کریم پیش کرتا ہے تو وہ بھی مغربی ظنیوں کی علمی تحقیقات کی تائید میں "عمل صالح" ہی ہے جو اِس آیۂ کریمہ سے پیشتر کی آیت میں بوضاحت تمام بیان کر دی گئی ہے:

فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ۝ (۲۸ : ۶۷)

پھر جو مخلوق اُسکے قانون کیطرف لوٹ آئی (تاب) اور جنے ایمان کی اٹل قوتیں اپنے اندر قائم رکھیں (آمن) اور جسنے عمل صالح کیے تو قریب ہے کہ جماعت اس زمانے کے سب عمل میں کامیاب ہوگی۔ (توبہ اور ایمان کی تفصیل کے لیئے ابھی بہت دیر ہے مگر یہاں پر ایک عارضی ترجمہ کر دیا گیا ہے)۔

ہم نے فہم و ادراک کی امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے پیش کیا کہ شاید وہ اُسے قبول کریں،
مگر اُنھوں نے بزبانِ حال اس عظیم ذمّہ داری کے حامل ہونے سے انکار کیا، اور اسکی اہمیت کو پاکر خوفزدہ
ہو گئے۔ بالآخر انسان نے اسکو اُٹھانا قبول کیا مگر وہ درحقیقت بڑا ہی ظالم اور بڑا ہی جاہل تھا جو یوں
ناحق اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالا!

عالم الغیب کے حضور میں شاید تمدّن کی اسی رست وخیز، اور عمرانِ حاضرہ کی اسی نفسا نفسی کی قیامت نما

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۳۳) ایک اور موقع پر نسلِ انسانی کو اپنی معنوں میں خدا کا محتاج گردانا گیا ہے، سکنانِ زمین کو قانونِ فطرت اور حکمِ خدا کی کامل متابعت کی ترغیب دی گئی ہے، اور ان سب کو یکسر ہلاک کرکے کسی خلقِ جدید کے تمکن فی الارض کرنے کی دھمکی اس حیرت انگیز جرأت، صحت اور وثوق سے دی ہے کہ اعمالِ خدا کا علم رکھنے والا انسان بے اختیار لرز جاتا ہے۔ لیکن یہ آیات کبھی اپنے اصلی رنگ میں لامحالہ اُسوقت نظر آئیں گی جب کتاب کے متن (غالباً چھٹی مجلد) میں تمام سورہ کا مربوط ترجمہ کردیا جائے گا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ۝ وَمَا
ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ۝ (۳۵: ۱۵-۱۷)

اے سکنانِ زمین! تم سب کے سب کسی حال اور کسی ڈھنگ میں ہو بہر نوع اُس خدائے عظیم کے محتاج ہو، اُس کے لطف و کرم کے محتاج ہو، ہدایت اور رہنمائی کے محتاج ہو، قانون پر چلنے کے محتاج ہو۔ اور اُسکی یہ شان ہے کہ وہ تم سب سے مستغنی اور بے نیاز ہے اور باوجود اِس بے نیازی کے سزاوارِ حمد ہے۔ وہ اسقدر بے پروا خدا ہے کہ اگر تمہارے اعمال کو دیکھکر مناسب سمجھے تو تم سب کو تختۂ زمین سے یکسر اُچک لے، اور کسی نئی مخلوق کو تمہاری جگہ لا بسائے، اور جانتے رہو کہ یہ خدا کے لیئے کچھ بھی دشوار نہیں (وہ تم سے پہلے بارہا اسی طرح کر چکا ہے اور پھر کرنے میں اُسکو کوئی تکلیف نہیں ہوتی)

ایک عجیب و غریب مشاہدہ جو یہاں پر "صلاحیت" کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لیئے نہایت غور طلب ہے، اور جو "الحیات الوسطیٰ" کے ان عظیم الشان اژدہوں کے متعلق کیا گیا ہے یہ ہے کہ وہ آجکل کے بڑے سے بڑے تمساحوں اور سنساروں کے بالمقابل نہایت چھوٹے چھوٹے دماغ رکھتے تھے۔ بعض حالات میں، باقی جسم کے تناسب کو پیش نظر رکھکر کاسۂ سر (کھوپڑی) بھی بے اندازہ مختصر تھا، بعض میں گوشت اور اعصاب کی زیادتی کے باعث بظاہر سر کافی بڑا دکھائی دیتا تھا، مگر مجوّفِ دماغ ناقابلِ یقین طور پر تنگ تھا؛ حتیٰ کہ موجودہ مگرمچھ کا دماغ تناسبِ بدن کے لحاظ سے دس گنا بڑا ہے۔ اِن شاہدات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ دور از کار نہیں کہ کشمکشِ حیات کی اس شکستِ فاش میں جو ان حیوانوں کو نصیب ہوئی دماغی قُویٰ کو بھی بہت بڑا دخل تھا۔ کمزور دماغی طاقتوں والے حیوان مقابلۃً جلد مٹ گئے، جن کی قوتِ مُدرکہ بڑھتی گئی محفوظ رہے۔ آجکل انسان کی نظروں میں بیوقوفی اور کند ذہنی کا مجسمہ گدھا ہے مگر اُس کا انسان کے لیئے مفید ہونا خود اسکی نسل کی حفاظت کر رہا ہے۔ اگر وہ بھی مزاحمتِ حیات کے میدان میں اور حیوانوں کے بالمقابل جم کر کھڑا ہو جاتا اور انسان کے سایۂ عاطفت میں پناہ نہ لیتا تو شاید کبھی کا صفحۂ زمین سے نابود ہو گیا ہوتا!

الجدیدۃ القصویٰ کے ادنیٰ طبقات زیادہ تر اُن دیرینہ حیوانات کے آثار سے پُر ہیں جو "القدیمۃ الاولیٰ" کے زمانے سے رفتہ رفتہ ارتقا کرکے بہتر بن گئے ہیں۔ حلزون اور اسفنج، میتان (مچھلیاں)، ہزار پائے، مرجان، نجم نما مچھلیاں، قبّہ دار حلزون، حشرات الارض، شقایق بحری، خار پشت بحری، وغیرہ وغیرہ نہایت کثرت سے ہیں۔ حرذون (چھپکلیاں)، حرباء (گرگٹ)، ثعبان (اژدہے)، اَفعیٰ (سنگھاڑی اژدہے)، تمساح (مگرمچھ)، خفاش (چمگادڑ) وغیرہ وغیرہ نسبتاً بہت کم ہیں۔ لیکن پرندے غیر مشکوک طور پر نمایاں ہو گئے ہیں۔ اُن کے منقار دندانہ دار

تصویر درپیش تھی جو انسان کو قبولِ امانت کے وقت ظلوم وجہول ٹھیرایا تھا۔ مگر تصویر کے اِس تاریک پہلو سے ایک لمحے کے لیے قطع نظر کر کے جو اہم سوال آج اِس زمانے میں پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ مسئلہ ارتقا کے رو سے وہ کونسی صلاحیت ہے، اور قرآن کریم کی لازوال صداقت کے تتبع میں وہ کیسا ایمان اور کیا اعمال صالحہ ہیں جسنے آج اقوامِ یورپ کو مادی ترقی کے انتہائی منازل پر پونہچا کر "اعلون" بننے، اور

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۴۴) گویا ہوائی منّاجوں سے ارتقا ظاہر ہے۔ رضاعی حیوانات کی بعض ناکمل نشانیاں نچلے حصے کے بعض اعلےٰ طبق میں نمودار ہیں مگر شمیشہ رضاعی حیوان اِن طبقوں میں بھی بہت کم ملتا ہے۔

"الجدیدۃ القصوی" کے اعلیٰ طبق میں بھی قریب قریب یہی حال ہے، مگر اکثر اجناس کا بہتر اور صالح تر ہوجانا بیش باندیش ظاہر ہے۔ لیکن **الجدیدۃ الادنیٰ** کے طبقات وہ سبق آموز اور عبرت انگیز طبقات ہیں جن کی مخلوق کے مطالعے سے سطح زمین کی موجودہ مخلوق کا تدریجی ارتقا اظہر من الشمس ہوجاتا ہے۔ ان حصص زمین میں حیوانات کے آثار باقیہ نہایت صناعت اور حفاظت کے ساتھ ملتے ہیں۔ اولیٰ حیوانات کی ایک شاندار تعداد ارتقا کی ہوئی ملتی ہے۔ حرازین کی قسم کے حیوانات اکثر نابود ہوگئے ہیں مگر رضاعی اجناس کی ایک بہت بڑی تعداد آبی گاؤ، اور بلاؤ اور وہیل مچھلی (حوت) کی صورت میں پیدا ہورہی ہے، مچھلیاں آجکل کی ساحلی مچھلیوں سے ترکیب اعضا میں زیادہ مشابہ ہورہی ہیں، مگر مچھ اور سنسار کہیں کہیں نظر آتے ہیں، عقرب، عنکبوت، ہزار پائے وغیرہ وغیرہ ایک مدت تک قائم ہیں، حشرات الارض کی سب قسمیں کثرت سے ہیں، پتنگے اور تیتریاں پہلی دفعہ جلوہ گر ہیں، پیٹ کے بل چلنے والے جانوروں کی یادگار سینڈکوں میں رہ گئی ہے، پرندوں نے اپنی چونچوں کے اندر دانت رکھنا قطعًا چھوڑدیا ہے لیکن اُن کی جنس کا داخلی ارتقا حیرت انگیز طریقے پر ہوا ہے۔ اسی کے زیر اثر سے اُڑنے کی بجائے دوڑنے والے پرندے (یعنی مرغ میدان) جلوہ گر ہیں، نعامہ (شتر مرغ) اور اسی جنس کی اور انواع جو آج صرف عرب اور افریقہ تک محدود ہوگئی ہیں نصف کرہ شمالی، یورپ اور شمالی امریکہ میں بھی پائی جاتی ہیں۔ گویا خط استوا کی طرف کوچ بعد میں شروع ہوا۔ نیوزیلینڈ میں آج صرف ایک قسم نعامہ کی رہ گئی ہے مگر ابھی دو سو برس نہیں گذرے کہ شتر مرغ سے نسبتًہ بہت بڑے بڑے پرندے جن کی اونچائی بارہ فٹ تک پونہچتی تھی، اُن اقطاع میں آباد تھے جنکو بالآخر اُس سرزمین کے اصلی باشندوں نے نابود کردیا۔ جزیرۂ مڈغاسکر میں کچھ اوپر سات صدیاں گذریں کہ ایک عظیم الشان مرغ رہا کرتا تھا جسکے قد آدم کے برابر انڈے ابھی تک الف لیلہ کے افسانوں میں بطور یادگار کے رہ گئے ہیں مگر اسکا نشان آج صرف ہڈیوں میں ملتا ہے۔

"الجدیدۃ الادنیٰ" یا "الجدیدۃ الحاضرہ" کے اعلیٰ طبق کی مخلوق اور موجودہ مخلوق میں بہت کم فرق نظر آتا ہے۔ عجیب غریب رضاعی حیوانات کی ایک تعداد کثیر سے یہ سب طبقے پُر ہیں۔ اُن کی نو مختلف نوعیں شناخت کی گئی ہیں جن میں وہیل مچھلی کی قسم کے مرضعات، آبی گاؤ، سُم دار مویشی، کُترنے والے موش، گوشت خور گربہ، کرم خور خارپشت، چمگادڑ، بغیر دانت کے رضاعی حیوان، اور بوزنہ وش انواع شامل ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک نوع اِس زمانے میں بھی پائی جاتی ہے۔ رضاعی اقسام میں عجیب غریب حیوانات مرامیس (گینڈے) ہیں، جن کی بعض قسمیں نہایت خوفناک تھیں جو نابود ہوگئیں۔ ہاتھی کی بعض حیرت انگیز قد آور انواع اسی زمانے میں ظاہر ہوئیں۔ ایک بالوں والا یال دار ہاتھی (میمتھ) جو انسان کا ہمعصر تھا، اور موجودہ دو اقسام سے کم از کم دو گنا بڑا تھا، شمالی سائبیریا اور انگلستان میں نہایت کثرت سے ملتا ہے۔ اُسکے دانت سائبیریا میں اِس کثرت سے ملتے ہیں کہ روسی تجارت کی محبوب شے بن گئے ہیں۔ موجودہ فیل کی بقیہ دو اقسام کا بھی انسان کی دستبرد سے مدت تک محفوظ رہنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہاتھی دانت کی تجارت کو موجودہ مقدار میں برقرار رکھنے کے لیے دنیا میں ہر سال ایک لاکھ ہاتھیوں کا

"مستخلف فی الارض" کا مقام حاصل کرنیکا قطعی مستحق قرار دیا ہے، اور مسلمانوں میں وہ کیا ضعفِ ایمان اور کیا غیر صالح اعمال آگئے ہیں جنہوں نے انکی ہزار سالہ عظمت کو محو کرکے انکو تنزل کا مترادف اور جہانبانی کا نااہل کر دیا ہے؟

پیشتر اسکے کہ یہ عظیم الشان سوال، اس کتاب کے طول و عرض میں ٭ ایک مدلل اور ناقابلِ انکار طریقے پر طے کر دیا جائے، اس امر کا فیصلہ ضروری ہے کہ مفسرین نے جن سہل اور محدود معنوں میں آیۂ استخلاف کو لیا ہے بکس حد تک اس کی مشروط اور مطلق لغت کے تابع، اور سیاق کلام کے مطابق ہے: اولاً اس آیت کا

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۳۵) شکار ہوتا ہے۔ اور چونکہ ہتھنی پندرہ سال میں صرف ایک بچہ جنتی ہے، اور موجودہ حیوانوں میں سب سے زیادہ بطئی النسل ہے، اسلیے چند اور صدیوں کے اندر اس نوع کا تباہ ہو جانا بھی یقینی ہے۔ لیکن "الجدیدۃ الحاضرۃ" کے اعلیٰ طبق میں خدا کی جس حیرت انگیز عالم آرا، اور احسن الخلق مخلوق کا ظہور ہوا وہ حضرت انسان ہے۔ ادنیٰ طبقوں میں کچھ مشکوک سی ہڈیاں ملتی ہیں جنکو رضاعی حیوانات اور ابتدائی انسان کی "درمیانی کڑی" کہا جا سکتا ہے، مگر قطعی طور پر کچھ حل نہیں سکا۔ ایک مدت مدید تک حکمائے مغرب اس "درمیانی کڑی" کی تلاش میں سرگردان رہے، اور ابتک ہیں۔ اعلیٰ طبق میں ابتدائی انسان کے ڈھانچے صاف طور پر ادنیٰ حیوانوں سے ارتقا کیے ہوئے نظر آتے ہیں لیکے جسم نسبتاً قوی ہیں مگر دماغ کے حجم سے موجودہ انسان کے بالمقابل بہت چھوٹے ہیں۔ قدیم غاروں میں انکی ہڈیاں نہایت صفائی سے دبی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انکے ساتھ ساتھ اکثر اوقات پتھر اور لوہے کے بیڈھنگے ہتھیار اور برتن بھی دبے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آفرینش کے ابتدائی ایام میں انسان اپنے آپ کو زور آور حیوانوں سے بچانے، اور سردی اور گرمی سے محفوظ رکھنے میں مصروف رہا، اس وجہ سے مدت مدید تک وہ کوئی معاشرتی ترقی نہ کر سکا۔ پہاڑوں کی غاریں اور وادیوں کے اوٹ اُسکے مستقل نشیمن تھے حفظِ نفس اُسکا منتہائے وحید تھا۔ بالآخر جب انفرادی دفاع مفید نظر نہ آیا تو عقل سلیم نے اجتماعی اور معاشرتی حیات اختیار کرنے پر مجبور کیا، اور آج انکی یہ حالت ہے کہ علم و عمل کے بام بلند پر چڑھکر فطرت کی عالم آرا قوتوں کو قابو میں لانے کی سعی کر رہا ہے!

ارتقائے حیات کی متذکرۂ صدر تشریح میں جو بات نہایت قابل لحاظ ہے یہ ہے کہ سلسلۂ تکوین متعدد مستقل منازل طے کرکے انسان تک پہنچا۔ "القدیمۃ اللاخری" کے پہلے حصے میں زندگی صرف غیر ذیفقری اور منفصلی مخلوق تک محدود رہی۔ دوسرے اور تیسرے حصے میں ان بے استخوان اور منفصلی حشرات سے ریڑھ کی ہڈی والے (ذیفقری) بے دست و پا جانور پیدا ہوئے جن کی نشاۃ اول مچھلی سے ہوئی، چوتھے اور پانچویں حصوں میں مچھلیوں کا اعضائی ارتقا اوج کمال کو پہنچا، چھٹے حصے میں پردار مچھلی کے ساتھ ساتھ پیٹ کے بل چلنے والے دابّہ کا ظہور ہوا۔ "الحیات الوسطیٰ" میں بے دست و پا مچھلی اور دابّہ سے پروپا والے پرندوں کا ارتقا ہوا۔ پھر "الجدیدۃ القصویٰ" کے زمانے میں دو پاؤں والے پرندوں اور خزندوں کے ارتقا سے چار ٹانگوں والے ذات الثدی حیوان پیدا ہوئے جو اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ ان انواع شریفہ کا مقدمۃ الجیش "الحیات الوسطیٰ" کے ادنیٰ طبق میں ہی نمودار ہو گیا تھا مگر قسری ارتقا احسن الخلق انسان پر مکمل ہوا۔ طبیعی حکما کا اندازہ ہے کہ یہ تمام نوعی اور جنسی تبدیلیاں لاکھوں بلکہ کروڑوں برس میں جاکر واقع ہوئیں، اور بتدریج تمام ہوئیں، ادنیٰ مخلوق ہی بلند تر طبقوں میں اُسی ایک سلسلۂ توالد و تناسل کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً اعلیٰ مخلوق میں مبتدل ہوتی رہی، کسی نئی نوع یا جنس کا ناگہاں اور بلاواسطہ ظہور مافوق الطبیعی یا خارق عادت اصول پر نہیں ہوا جیسا کہ عوام کا خیال ہے۔ قرآن حکیم نے سورۂ نور میں حیوانات زمین کی اس وحدت اصل و نسل کو، اور جوارح حیوانی کے اس تدریجی اور مسلسل ارتقا اور انقلاب کو ان غیر مشکوک، پر معنی، اور نتیجہ خیز "مبیّنات" میں ادا کیا ہے جن کے حقیقت کشا انکشاف کو صحیفۂ فطرت میں بچشم خود دیکھکر خدا کی طاقت کا ہر شخص کے دل میں مشخص ہو جانا، نہیں بلکہ تخلیق عالم اور سر حیات کی ماہیت کے متعلق صراط مستقیم کا پتہ لگ جانا یقینی ہے!

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ [باقی]

٭ اس سوال کے متعلق قطعی فیصلہ غالباً پانچویں مجلد سے پہلے نہ ہو سکے گا۔ سلسلۂ تخلیق کی تفہیم، ملائکہ کی تنظیم و تنویر اور خلق کا انتظام ظاہر کرتا ہے کہ یہاں ہر اولیک سلسلۂ تناسل ہے صفحہ ۲۰۰-۲۰۱ کا ...

خطاب بلا قید وقت عام مسلمانوں کیطرف ہے، مگر معاہدہ لامحالہ اُنکے ایک گروہ ہی سے باندھا گیا ہے اگرچہ وعدے کی توسیع ایمان اور اعمال صالحہ کی موجودگی میں ہر مسلمان تک ہو سکتی ہے۔ اس بنا پر مسلمانانِ عالم میں سے صرف اُسی گروہ کا استخلاف شرط ہے جو ایمان اور اعمال صالحہ رکھتا ہو؛ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۲۴: ۵۵)۔ ثانیاً استخلاف فی الارض کا میثاق، جزیرۃ العرب پر تسلط یا سیادتِ حرمین کے معنوں میں کسی فردِ واحد، یا اُسکی نسل، یا زیادہ سے زیادہ عرب قوم کے ساتھ ہو سکتا تھا، سب مسلمانانِ عالم سے ضروری نہ تھا ثالثاً كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ، نے معاملہ بالکل صاف کر دیا کیونکہ اسلام سے پہلے حرمین پر

(تتمہ تحت المتن صفحہ ۴۳) يَمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۲۴: ۴۵-۴۶)

اے لوگو! اس خلاقِ عالم کی طاقت کی یہ شان ہے کہ اس نے روئے زمین کے تمام حیوانوں کو ایک ہی نطفے اور ایک ہی سلسلہ تولد و تناسل کے ذریعے سے (مِنْ مَّاۗءٍ) پیدا کیا، اور آج اس وحدت تناسل کا نتیجہ یہ حیرت انگیز ہے (فَ) کہ اُن حیوانوں میں سے بعض وہ ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں، اور بعض ایسے جو صرف دو پاؤں پر چلتے ہیں، اور بعض وہ ہیں جو چار پاؤں پر چلتے ہیں (اور یہ حیرالعقول تباین اور اختلاف اسی ترتیب و تسلسل سے اُس ایک نطفے کی قوت تولید میں ظاہر ہوا ہے) لوگو! خدا جو شے جس ذریعے سے مناسب سمجھتا ہے پیدا کر دیتا ہے، بگوش ہوش سن رکھو کہ وہ ہر بات کے کر دینے پر قادر ہے۔ اے ساکنانِ زمین! ہم نے تم کم علم اور کوتاہ نظر انسانوں پر حقیقت کشا اور جہاں نما آیات اوج آسمان سے اُتاری ہیں تاکہ تم پر تکوین حیات کا راز عیاں ہو جائے اور یاد رکھو کہ خدائے علیم اُسی کو علم کے صراطِ مستقیم پر لے جاتا ہے جسکو مناسب سمجھتا ہے۔

کیا آج سطح زمین کے طول و عرض میں مذاہب عالم کی آسمانی کتابوں کے اندر تکوین حیات کی اس سے بہتر، صحیح تر اور مکمل تر داستان کہیں موجود ہے؟

طبقات زمین کی تعمیر کے یہ پانچوں زمانے جن کا ذکر اوپر ہوا اور جنمیں زمین و آسمان کی پیدائش فی الحقیقت تکمیل کو پہنچی، اور ظہور انسان سے لیکر آجتک کا زمانہ حال جس میں بنی نوع انسان کا ارتقا مکمل ہو رہا ہے، مالک کون و مکاں کی حکیمانہ لغت میں وہ "سِتَّةِ اَيَّامٍ" (آیہ ۷: ۵۴ صفحہ ۱۴) ہیں جنمیں اُسنے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ "یوم" کی تشریح کافی طور پر صفحہ ۱۰ میں گذر چکی ہے، اور لفظ ستہ سے ظاہر ہے کہ قرآن حکیم زمین و آسمان کی تدریجی اور ارتقائی تعمیر کا مؤید ہے پس عہد عتیق کا دعوے کہ دنیا صرف چھ ہزار برس سے قائم ہے ازروئے قرآن محض غلط ہے اگرچہ ستہ ایام کا ذکر اُس الہامی کتاب میں بھی موجود ہے حکمائے مغرب نے زمین کی مدت تعمیر کو چھ زمانوں میں اس بنا پر تقسیم کیا ہے کہ اُنکی مخلوق کے مابین ایک صریح تباین اور قطعی مابہ الامتیاز پیدا ہے جسکے باعث ہر طبقہ اور دوسرے ایک دوسرے سے طبعاً اور خلقاً الگ نظر آتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہی وجہ افتراق اُس ارتقائے کائنات کے ضمن میں ستہ ایام کے الفاظ میں مضمر ہو مگر یہ بحث کسی آیندہ موقع پر بتفصیل کیجائے گی۔

قصیر الجسم ہاتھی جسکا ذکر اصل کتاب (صفحہ ۲۵) میں ہوا، اصل افریقہ کا باشندہ تھا جو کشمکش حیات کے باعث در بدر پھر کر چند صدیاں گذریں نابود ہو گیا۔ اُسکی ہڈیاں آج جزیرۂ مالٹا میں ملتی ہیں۔ ایک قسم کی اونچائی گھٹتے گھٹتے ڈیڑھ گز اور دوسری کی صرف ایک گز رہ گئی تھی۔ نئی دنیا کا ہندوئے احمر جو آجکل بڑے زور سے ناقابل یقین سرعت سے ناپید ہو رہا ہے سولھویں صدی کے احتلال امریکہ کے بعد یورپی اقوام کی جارحانہ دستبرد اور ستم ایجادیوں کا شکار ہوا۔ فرانسیسی مستعمرین نے اس بیخ کنی میں سب سے زیادہ شرمناک حصہ لیا۔ ایک قوم پر مہلک متعدی بیماریوں کے جراثیم سے آلودہ کمبل، رواداری اور فریب پروری کے بہانے سے انہیں تقسیم کر دیئے جس سے اردگرد کی آبادی سال بھر میں آدھی رہ گئی۔ لیکن تمدن کے مہا دلہ کا جو ہندو آج وہ اور دوسری غیر صالح قومیں جس تیزی سے محو ہو رہی ہیں اس داستان سے کہیں زیادہ دردناک ہے!

---

* اگر یہیں تک آیہ زیرنظر کا خطاب ہمیشہ ہو اور تمام امت سے کوئی مستقل تعہد اخذ نہیں ہوتا ہے۔ مطالب کے لئے دیکھو صفحہ، لیکن زیرنظر آیہ کے الفاظ نہایت قابل غور ہیں۔

یا عرب میں استخلاف اِن خاص معنوں میں نہ تھا، اور نہ عرب کے متخاصم قبائل ایمان اور اعمالِ صالحہ کا دعوےٰ کر سکتے تھے۔

درحقیقت اِس آیۂ کریمہ میں، شارع فطرت نے مسلمانانِ عالم کے سامنے وہ عظیم الشان دستور العمل پیش کر دیا ہے جو ہر کیفیت میں، اور ہر موقع پر اُن کی انفرادی اور اجتماعی، اعتقادی اور عملی، روحانی اور مادی زندگی میں کامل طور پر کارآمد ہو سکے۔ اِسی نصاب عمل میں افراد کے اخلاق کی صلاحیت، اعمال کی درستی، اعتقادات کی سلامتی، ہمت کے قیام، قوت کے توازن، دینی بہبودی، اور دنیاوی مرفہ الحالی کا سامان موجود ہے، اور اِسی ضابطے کے اندر اقوام کے سیاسی غلبے، اقتصادی ترقی، اجتماعی اقتدار، علمی ارتقا، اور تسلط فی الارض کے جراثیم مخفی ہیں†۔ "استخلاف فی الارض" جسکا وعدہ خدائے پاک نے بلا قیدِ وقت مسلمانوں سے کیا محض ایک کمزور اور منحنی و برنج ملکی تسلط ہی کا دوسرا نام نہیں جو مسلمانوں کو کچھ دیر ہوئی سرزمین عرب پر حاصل تھا، اور اب بھی زمین کے دو ایک ٹکڑوں پر حاصل ہے، بلکہ وہ تمام روئے زمین یا اُسکے بڑے سے بڑے حصے پر کامل سیاسی اقتدار، اور مکمل اجتماعی اور اقتصادی غلبے کا نام ہے؛ وہ قومی آزادی، عملی بیداری، علمی اور ادبی اِحیا، جمعی عصبیت، اور اخلاقی علوِ مرتبت کا وہ انتہائی معراج ہے جو صحیح معنوں میں مسلمانانِ عالم کو کئی سو سال تک قرونِ اولیٰ و متوسطہ میں حاصل رہا، اور معانی کی خاص حدود کے اندر یورپ کی بعض اقوام کو اِس وقت حاصل ہے؛ وہ مغرب کی سیاسی اصطلاح میں امن کے زمانے میں اپنی بہتری کی خاطر ہر ملی اور بین الملی وسیلے کا اختیار، اور ایامِ جنگ میں اپنے بچاؤ کے لیئے ہر جائز اور مناسب حربے کا استعمال ہے؛ حرمین شریفین کی حفاظت، جزیرۃ العرب کی کامل سیاسی آزادی، اور رسمی خلافت کا قیام و استحکام اُسکے کل کا صرف ایک جزو لاینفک ہے؛ وہ آیۂ استخلاف کے الفاظ میں شارع فطرت کی اپنی بنائی ہوئی شریعت، اپنے پسند کیئے ہوئے نظامِ عمل، اور اپنے اختیار

---

† اِن مہتم بالشان دعاوی کا ثبوت آگے چل کر اِس کتاب میں جا بجا ملے گا۔

کیئے ہوئے مسلک و مذہب کا زمین پر حقیقی تمکن، اور معنوی تسلط ہے؛ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَهُمْ دِینَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (۲۴: ۵۵)؛ وہ مسلمانوں کے دینی اور دنیاوی عروج، قومی اور انفرادی تفوق اور علمی اور ذہنی تقدم کی وہ خوشگوار منزل ہے جہاں ایمان اور عمل صالح کی قوت افزا وساطت سے ہر شکست کا فتح میں، ہر فنا کا بقا میں، اور ہر خوف کا امن میں تبدیل ہو جانا یقینی ہے۔

جس طرح ہر متنفس میں بقائے نسل اور تحفظ ارث کی خواہش ایک طبعی امر ہے اسی طرح پر ابتدائے آفرینش سے آجتک، ہر زندہ قوم کا منتہائے نظر قیام سلطنت اور حفظ نسل رہا ہے۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو لفظ استخلاف سے تعبیر کیا ہے، اور ظاہر کر دیا ہے کہ اسلام سے پہلے بھی اقوام عالم میں یہ فطری جذبہ موجود تھا۔ شارع دین نے بعینہ اسی قطع کے تخلف کا وعدہ، سابقہ اقوام کی مانند مسلمانوں سے بھی کیا، اور اسی قرینے سے اُس نے جابجا 'وراثت زمین' کے نام سے موسوم کیا ہے:۔

قَالَ مُوسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِینُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِینَ ۞ (۷: ۱۲۸)

موسیٰ نے اسپر اپنی قوم سے کہا کہ تم ان مشکلات کی حالت میں اللہ سے مدد مانگو اور مستقل مزاج بنے رہو زمین تو سب اللہ ہی کی ہے' وہی اپنے بندوں میں سے جسکو مناسب سمجھتا ہے وارث بنا دیتا ہے اور بالآخر جیت تو اُنہی کی ہے جو مقام خدا سے ڈرتے رہتے ہیں۔

---

۵۷ اور وہ خدائے عظیم اس دین کو جو اُس نے مسلمانوں کے لیئے پسند فرمایا ہے متمکن کر کے رہے گا، اور اس حالت خوف کو بھی جو آج دشمن سے لاحق ہے، امن سے بدل دے گا۔

---

† گویا اس آیۂ کریمہ کے روسے 'وارث زمین' وہی قوم بنتی ہے جس کے افراد میں صبر اور استقلال بدرجۂ اتم موجود ہو۔ اس بنا پر آیۂ استخلاف کو پیش نظر رکھکر عملوا الصّٰلحٰت کی ایک شق صبر ہے۔ استعانت باللہ سے مراد، درگاہ خدا میں عاجزی کرنیکے علاوہ احکام خدا سے استعانت بھی ہے، لیکن خود صبر کے معانی بھی آج مسخ ہو چکے ہیں 'یشاء' کے محولہ بالا معانی کا ثبوت دیر میں آئے گا۔ 'عاقبۃ' کے معنی یہاں پر قیامت کی آخرت کے نہیں اور نہ اس سے معانی مربوط ہو سکتے ہیں۔ بلکہ اس کا صحیح مفہوم کسی قوم کی سعی و عمل کا اس دنیا میں منتج بخیر یا بشر ہونا ہے۔ انہی معنوں میں 'عاقبۃ' کا لفظ آیۂ 'اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ' (۴۰: ۸۲) میں، یا 'اَفَلَمْ' کی بجائے 'اَوَلَمْ' کے ساتھ (۴۰: ۲۱)، (۳۵: ۴۴)، (۳۰: ۹)' میں استعمال ہوا ہے جسکے معنے یہ ہیں: "تو کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں کہ اُن لوگوں کا کیا بُرا انجام ہوا جو ان سے پہلے ہو گذرے ہیں"۔ 'متقین' کی تشریح میں ابھی دیر ہے، لیکن ترجمے میں مطالب کی تصریح کر دی ہے۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا † (۷ : ۱۳۷)

اور اس مبارک اور زرخیز سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بالآخر ہم نے اُنہی لوگوں کو کیا جو کمزور گنے جاتے تھے۔ اور خدا کا وعدۂ نیک تو بنی اسرائیل کے حق میں ٹھیک پورا ہوا کیونکہ انہوں نے عزم و استقلال سے دشمن کی سختیوں کی برداشت کی تھی۔

اِسی ضمن میں ایک اور جگہ بعینہٖ آیۂ استخلاف کا مضمون ہے:۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ۝‡ (۲۱ : ۱۰۵-۱۰۶)

---

† اِس آیۂ کریمہ میں صبر کا انجام اور بھی واضح طور پر وراثت زمین ہے۔ گویا 'صبر' کے معنی استقلال اور استقامت سے سب مشکلات کا مقابلہ کرتے رہنا ہے، ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نیچے رہنا، اور اپنی بربادی کا تماشہ دیکھنا نہیں۔ یہ آیۂ عظمیٰ مسئلہ ارتقا کی تشریح کے ضمن یعنی صفحہ ۱۹ کے تحت المتن میں آچکی ہے۔ مزید تشریح کے لیئے وہاں دیکھنا چاہیئے۔

‡ اِن آیاتِ الٰہی میں 'وارثین زمین' کی مکمل تشریح 'عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ' کے الفاظ میں کر دی گئی ہے۔ 'اصلاح' کی تعریف از روئے قرآن مجید جامع و مانع ہے۔ علیٰ ہذا القیاس لفظ 'عبادت' کی۔ مگر یہ امر نہایت غور طلب ہے کہ مسئلہ ارتقا کے 'بقائے اصلح' کا مفہوم اس آیۂ کریمہ (۲۱ : ۱۰۵) کے دعوے کے کس قدر عین مطابق ہے۔ 'عبادت' کا لفظ 'عبد' سے مشتق ہے جس کے معنی غلام کے ہیں۔ اور وہی قوم درحقیقت عابد ہے جو خدا کی عملاً غلام ہے، جو اُس کے قانون اور احکام پر عمل کر رہی ہے۔ ورنہ کوئی رسمی نماز گذار اور باقی احکام سے غافل قوم عابد کہلانے کی مستحق نہیں ہوسکتی کیونکہ ملازمت کی شرط اول آقا کے احکام کی تعمیل ہے۔ لیکن 'عبادت' کے متعلق مکمل بحث اصل کتاب میں آگے چل کر جا بجا آئے گی۔

'صلاح' کی ایک اہم شق ہم نے 'صبر' بتلائی۔ لیکن اگر 'صالح' کے معانی کی ایک جھلک کتاب کے اس ابتدائی حصے میں دیکھنی ہو تو اِس آیۂ کریمہ پر غور کرنا ضروری ہے جس میں شارعِ کائنات نے نوزائیدہ بچے کو 'صالح' کہا ہے:

فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَاۤ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (۷ : ۱۸۹-۱۹۰)

پھر جب خداوند کے لطف سے بیوی کا حمل ٹھیر گیا اور وہ رفتہ رفتہ بوجھل ہوتی گئی تو مرد اور عورت دونوں دلسوز دعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! اگر تو ہمکو یہ بچہ صحیح الاعضا (صالح) متناسب البدن (صالح) اچھا چنگا (صالح) خوبصورت (صالح) دیگا تو ہم تیرے بڑے ہی شکرگذار ہونگے۔ پھر جب اِن دونوں کو وہ خدائے عظیم صحیح اور سالم، توانا اور تندرست (صالح) بچہ عطا فرماتا ہے تو اُس منعم حقیقی کے ساتھ اُسی انعام دی ہوئی چیز کو شریک کرنے لگتے ہیں، اِس بچے کی محبت میں اسقدر منہمک ہوجاتے ہیں کہ خدا کے برابر اسکو کر دیتے ہیں، اُسی کو اپنا بُت بنا لیتے ہیں۔ تو لوگو! خدائے عظیم اُس شئے سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے جو یہ لوگ اُس سے شریک کرتے ہیں۔ (دیکھیے حصے کا ثبوت بعد میں آئے گا)

اِن آیات سے واضح ہے کہ بچے کا صالح ہونا اسکا فی الحقیقت بے نقص اور تندرست، صحیح الاعضا اور سالم الجسم ہونا ہی ہے۔ یہی وہ ماں باپ کی حمل ٹھیر نے کے بعد لگا رہتا ہے۔ ورنہ ماں کے پیٹ سے بچے کا نیک پیدا ہونا بے معنی ہے اور نہ یہاں جوان بنکر نیک ہونیکا ذکر ہے۔ اِس نقطۂ نظر سے صالح قوم وہی ہے جسکا ہر عضو درست ہو، متناسب ہو، بڑھا گٹھا ہو، اُسکے ہر حصے میں یکساں بیداری ہو، حیات کا جوہر لطیف اُسکی ہر رگ و پے میں دوڑ رہا ہو وغیرہ وغیرہ۔ جبتک مسلمانانِ عالم اِن معنوں میں صالح رہے وراثت زمین اُنکے پاس رہی۔ جب صلاح کے معنی محدود ہو گئے تو اِس آیت (۲۱ : ۱۰۵) کی تاویلیں بھی ہونے لگیں مگر کلام خدا کے صحیح مفہوم میں ردوبدل قطعاً محال ہے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶ : ۱۱۶) اِسکی شہادت ہے۔

اور ہم زبور میں تمام احکام کی شرح و ذکر کے بعد یہ بات لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث تو ہمارے صالح العمل بندے ہی ہیں۔ بلاشبہ اسمیں اطاعت گذار قوم کے لیئے ایک بڑا پیغام ہے۔

اور سورۂ زمر کے تفسیر میں :۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ۖ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ۞ † (۳۹ : ۷۴)

اور وہ لوگ کہیں گے کہ شکر ہے اُس خدا کا جسنے اپنا یہ وعدہ بھی سچ کر دکھایا، اور اس سے پیشتر زمین کا وارث بھی ہمیں کو بنایا؛ اب ہم بہشت میں جہاں بھی چاہیں رہیں گے ؛ تو دیکھو کام کرنے والوں کا کیا ہی اچھا اجر ہے!

اب یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ آیۂ استخلاف میں فاطر ارض و سما نے خاص مسلمانانِ عالم کے ساتھ ایک ایسے کامل سیاسی غلبے کا حتمی وعدہ کیا ہے جو محض سرزمین عرب پر قبضے کے متعلق، یا اس کمزور اور برائے نام خلافت کے قیام پر ہی مشتمل نہیں جسکو یورپ کی خون آشام طاقتیں آج ایک لمحے کے لیئے چین نہیں لینے دیتیں، بلکہ اُسکا نصب العین دنیا کے عظیم تر حصے پر حقیقی اور قرار واقعی سیاسی اور اجتماعی حکومت ہے۔ اِس نعمت عظمیٰ کے حصول کے بغیر نہ تو خدائے پاک کا دین کسی معنوں میں اکنافِ عالم میں متمکن ہو سکتا ہے، اور نہ وہ خوف جو آج ہر سمت سے مسلمانانِ عالم پر طاری ہے کسی طرح امن سے بدل سکتا ہے۔

---

† یہاں پر لوگوں نے "الْأَرْضَ" کے معنے ارض جنت لے لیئے ہیں۔ مگر اس دل خوش کن تاویل کی کوئی سند نہیں۔ أَوْرَثَنَا کا ماضی کا صیغہ اور نَتَبَوَّأُ کا حال کا صیغہ اِس کا شاہد ہے کہ أَوْرَثَنَا الْأَرْضَ کا واقعہ پیشتر کا واقعہ ہے۔ اور جب الْجَنَّةِ کا ذکر آگے صاف ہے تو خدا کے کلام میں ایک آیت کے اندر یہ بے نتیجہ تکرار پیدا کرنا محض لغو ہے۔

دوسری بات جو غور طلب ہے یہ ہے کہ اِس آیۂ کریمہ میں بھی "فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ"، کہہ کر کسی عمل پر کس قدر زور دیا گیا ہے گویا عمل وہ چیز ہے جسکا نتیجہ وراثت زمین ہے۔ اور وراثت زمین کا نتیجہ ہی الْجَنَّة آخرت میں ہے !!

ایک اور اہم بات جو قابل لحاظ ہے یہ ہے کہ اِن سب آیات (یعنی (۷ : ۱۲۸)، (۷ : ۱۳۷)، (۲۱ : ۱۰۵) اور (۳۹ : ۷۴) میں بھی "الْأَرْضَ" کا لفظ مطلق معنوں میں استعمال ہوا ہے کسی خاص حصۂ زمین کی تخصیص اِن میں نہیں جیسا کہ بعض شارحین نے آیۂ استخلاف میں فرض کر لیا ہے۔

یہ آیت اُسوقت نازل ہوئی تھی جب دینِ الٰہی کے سچے علمبرداروں، اور بے ریا عاملوں کی ایک چھوٹی سی جماعت، کفارِ مکہ کے سلوک سے تنگ آکر مدینے میں پناہ گزین ہوگئی تھی۔ دشمن کے پے در پے حملوں کے باعث خوف وہراس ہر طرف طاری تھا؛ مجبوری اور بے چارگی کا یہ عالم تھا کہ ایک لمحے کے لیئے بھی ہتیار بدن سے جدا نہیں ہوسکتے تھے، مَردوں اور یتیموں کی نیم شبی آہیں، اور عورتوں اور بوڑھوں کی صُبحگاہی دعائیں آسمانوں کو ٹکرا رہی تھیں۔ مایوسی اور اضطراب کی ان گھڑیوں میں، خدائے پاک کی غیرت نے جوش زن ہوکر، مُسلمانوں کو بشارت دی کہ اگر تمہارے ایمان میں یہ استواری، اور اعمال میں یہ صلاحیت ہے تو یقین جانو کہ دنیا کی کوئی طاقت تم کو مقہور و مغلوب نہیں کرسکتی؛ تم خدائے واحد کے پرستاروں کی ایک عاجز اور حقیر جماعت ہو، مگر یاد رکھو کہ قادرِ مطلق کی جناب میں تمہارے کاموں کی حقیقی وقعت، اور تمہارے ایمان کی سچی قدر ہے؛ تمہارے سینوں میں صداقت کے موجزن دریا، اور حقانیت کے اُمڈتے ہوئے طوفان ہیں؛ تمہارے دلوں میں خدا کی محبت کا سچا ولولہ، اور رسول کی اطاعت کا سچا ولولہ ہے؛ تم بے خان وماں ہو، مگر تمہاری نظروں میں آخرت کی لازوال متاع، اور عقبیٰ کی راحت افزا منزل ہے؛ تم بے سروسامان ہو، مگر تمہاری اَنتھک کوششیں اور اتحادِ عمل ہی خدا کی دائمی نصرت کا سامان ہیں؛ تم قلیل التعداد ہو، مگر جہاں جاتے ہو استقلال کے فرشتے تمہارے ہمرکاب، اور حوصلوں کے غیبی لشکر تمہاری تائید پر ہوجاتے ہیں: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا[لہ] (۳۳ : ۹)؛ تم ایک ہو، مگر قوتِ ایمان اور صلاحِ عمل کی برکت سے

لہ اے ایمان والو! خدا کے اس احسان کو یاد کرو جو اسنے تم پر کیا تھا جب کہ تم پر لشکر کے لشکر آچڑھے تھے۔ تب ہم نے اُن پر آندھی بھیجی اور اسکے علاوہ لشکر بھی جو تم کو دکھائی نہ دیتے تھے۔ یہ سب کچھ اس لیئے تھا کہ اللہ تمہارے مردانہ وار اعمال کو بغور دیکھ رہا تھا اور تمہاری تائید و نصرت پر بہمہ وجوہ تُلا ہوا تھا۔

---

† ۵ ہجری میں غزوۂ خندق کے موقع پر اس جلیل القدر آیت کا نزول ہوا۔ آیت کے آخری حصے وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا سے ضمناً یہ ظاہر ہے کہ صدرِ اسلام کے مومنوں کا سعی وعمل ہی نصرتِ خدا کا باعث ہوا تھا، نیز یہ کہ شارعِ کائنات کی توجہ سعی وعمل کی طرف کس قدر ہے اور اسکا انعام کیا ہے۔

دس بنجاتے ہو، تمہارا عزمِ صمیم اور سچا ایثار ہی تمہارے لیئے پیغام بقا ہے۔ دشمن کے ہجوم نے ایک لمحے کے لیئے تم کو مرعوب اور بے بس کر دیا ہے، مگر میرا تم سے وعدہ ہے کہ اگر تم میں یہی خوبیاں رہیں تو تم نہ صرف خانہ کعبہ کے قطعی محافظ، اور سرزمین عرب کے حقیقی وارث بنو گے بلکہ کسریٰ کی دیرینہ عظمت کے اصلی حقدار، اسکندر کی عالم آرا سلطنت کے مسلّم جانشین، بکرماجیت کی بھارت کے سچے سپوت، اور قیصر کے دنیاوی جاہ و اُبہت کے بہترین خلف ٹھیرو گے!

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ† اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۚ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ ذٰلِكَ لِمَنْ‡ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ۝ (۱۴ : ۱۳-۱۴)

اور منکرینِ خدا نے اپنے پیغمبروں سے کہا کہ ہم تم کو اپنی زمین سے نکال باہر کرینگے یا ہار کر تم پھر ہمارے مذہب میں آملو گے۔ اِس پر خدا نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ تم بدستور اپنی سعی میں لگے رہو ہم یقیناً ان ظالموں کو ہلاک کر دینگے اور ان کے پیچھے تم ہی کو اس سرزمین میں بسائیں گے۔ یہ صلہ اس قوم کا ہے جو میرے مقام و منصب سے ڈر کر میرے احکام کی اطاعت کرتی رہی، اور جنے میرے عذاب سے بچنے کی کوشش کی۔

اِس بحث و تمحیص کے بعد یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ آیہ استخلاف مسلمانوں کے ساتھ وراثت زمین کے متعلق ایک مشروط وعدہ ہے، اجتباری اور بلا قید شرط نہیں۔ جب تک مسلمانانِ عالم ایمان اور اعمال صالحہ کے صحیح مفہوم پر کم و بیش قائم رہے زمین کے ایک عظیم ترحصے کی وراثت اُن کے قبضے میں رہی، دین اسلام کا تمکن مستقل ہوتا گیا، اور یکے بعد دیگرے ہر مخالف طاقت کا خوف امن سے بدل گیا۔

---

† اِس موقع پر "اَرْضِنَا" سے مراد منکوبِن خدا کا وطن ہے اور اس لحاظ سے (۱۴ : ۱۴) میں "الارض" کے معنے بلاشبہ اُسی مخصوص سرزمین کے ہیں۔ مگر آیۂ استخلاف یا اور متذکرہ صدر آیات میں جنہیں "الارض" کا لفظ واقع ہے تخصیص اسلیئے نہیں ہوسکتی کہ ان میں کسی خاص وطن کا ذکر نہیں۔

‡ یہاں صاف ظاہر ہے کہ "مَن" کسی فرد واحد کے لیئے نہیں آیا بلکہ تمام قوم کے لیئے استعمال ہوا ہے۔ اجتماعی حرف موصول کی اس قطع کی مثالیں قرآن حکیم میں آگے چل کر جا بجا ملیں گی۔ ایک مثال مسلۂ ارتقاء کے تحت المتن صفحہ ۱۳ آیہ (۷ : ۳۵) میں گذر چکی ہے: فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

قرآن کی اعجاز نما تعلیم نے ایک اقلِ قلیل مدت میں عرب کے رہزنوں اور مردم کُش وحشیوں کو روحانیت اور ایمان کے حلقہ اثر میں لاکر، انکی کایا پلٹ دی۔ ریگستان کے ان بے مُہار حُدی خوانوں کو، جن کی زندگیاں سالہا سال سے ریت کے چٹیل اور خشک میدانوں میں تشنہ اٰمال اور آوارہ و مرادِ گشتی تھیں، خدا کی حبل متین میں جکڑ کر، کامران صلاح اور سبک گامِ عمل کر دیا۔ بداعمالی اور فسق کے یہی آزادہ رَو بندے جن کے ہر فرد کو قتل و غارت پر ناز، اور ہر شخص کو بدکاری کا اِدعا تھا، چشم زدن میں طاعت کی لذت اور عشق خدا کی خلش سے آشنا ہو کر، عبودیت کے رہ نورد بن گئے۔ اخلاق کی درستی کے ساتھ ساتھ دنیاوی اعمال میں صلاحیت آگئی۔ وہی طاقتِ عمل جو داحس اور بسوس* کی خانہ جنگیوں میں قومی تخریب کا باعث ہوا کرتی تھی، قرآن کی حُسن تجویز سے اعلائے حق میں صرف ہوئی؛ وہی جوشِ اعتقادی جو لات و منات، ہبل و عزیٰ کی جاہلانہ پرستش سے قبائل عرب کو نصیب تھی، خدائے واحد کی سرفروشانہ عبادت سے بدل گئی۔ بالآخر ایمان کے اِنہی بے محابا فدائیوں، اور عمل صالح کے اِنہی نامصلحت اندیش والہوں نے باطل کو دنیا سے یک قلم محو کر کے، اسکے ہر گوشے میں صداقت کی گونج اور فدویت کی ہیبت پیدا کر دی؛ کلامِ الٰہی نے منتشر قوتوں کو جمع، کمزور جذبات کو مضبوط، اور نفسانیت کو مغلوب کر دیا۔ وحشیانہ عادات کو مناسب سطح پر لاکر، اقتصاد اور میانہ روی کی ہدایت کی حسیات آلیہ کو متحرک اور وسیع الاثر کر کے عالم گیر اسلامی اخوت کا سبق دیا۔ نیتوں کی راستی اور ارادوں کی درستی کو اعمال کے عواقب پر مقدم کر کے ہیجانِ عمل پیدا کر دیا۔ جائز مراسم اور مفید روایات کو مفید تر پیرائے میں بدل کر پھر رائج کیا۔ الغرض ارادات اور اعتقادات کی

---

* زمانۂ جاہلیت کی دو مشہور خانہ جنگیاں حرب بسوس اور حرب داحس کے نام سے موسوم ہیں۔ اول الذکر لڑائی بنی بکر اور بنی تغلب کے درمیان سنہ ۴۹۴ء میں شروع ہوئی اور چالیس ۴۰ برس تک جاری رہی۔ وجہ یہ ہوئی تھی کہ ایک شخص کا اونٹ کھیت میں چلا گیا۔ کھیت والی نے اونٹ کو مارا بلکہ غصے میں آکر اُس کے تھن کاٹ ڈالے، اس پر فریقین میں لڑائی چھڑ گئی۔ پھر رفتہ رفتہ عرب کے سب قبائل اس لڑائی میں شریک ہو گئے، اور ستر ہزار آدمی اس خانہ جنگی کی بھینٹ چڑھے۔ حرب داحس گھوڑ دوڑ میں کسی شخص کے گھوڑا بدکانے پر سنہ ۵۶۸ء میں شروع ہوئی اور ترسٹھ ۶۳ برس تک جاری رہی؛ اِس لڑائی کا خاتمہ اُس وقت ہوا جب بعض قبیلے حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ مگر قبیلوں کے قبیلے اُس وقت تک کٹ مرے تھے!

کامل صلاحیت کو **ایمان** سے، اور عبادات اور معاملات کی کامل درستی کو **اعمالِ صالحہ** سے تعبیر کرکے شریعت اور سیاست کی بنیاد ایک پتھر پر رکھدی۔ اور چند برسوں کے اندر اندر عرب کے ان سیہ کار اور فاقہ مست گداؤں کو شناسائی خدا کے ساتھ ساتھ بادشاہت زمین کی ہر رمز سے آگاہ کرکے عالم ستانی کے لائق اور جہانبانی کا اہل بنادیا!

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا (۱۷: ۹)

بیشک یہ قرآن اپنے عاملوں کو اُس طرف لیجاتا ہے جو سب سے زیادہ راست اور قیام آفریں ہے اور اُن صاحب ایمان لوگوں کو جو صالح العمل ہیں بشارت دیتا ہے کہ اُنکے لیئے بڑا اجر ہے۔

پس اگر آج تیرہ سو سال کے بعد اسلام کا لہلہاتا ہوا چمن مایوسی اور شکست کی ماتم سرا بن گیا ہے، اگر آج اُسکی ہر روش بربادی کے سپرد، اور اُسکا ہر گوشہ خرابی کا امین بن چکا ہے، اگر اُسکی بدطالعی اور خانہ ویرانی کے افسانے دشمن کے شکر خند اور قہقہے بن رہے ہیں، اگر اسکی بے آبروئی اور فاقہ مستی کا ماجرا شرمندۂ بیان اور رُوکشِ تشہیر نہیں رہا، اگر آج اُسکی ذلت اور مسکنت کی چوٹ جگروں کو فگار اور سینوں کو پاش پاش نہیں کرتی، اگر بے حِسّی کے موت آفریں زہر نے آج اُسکے ہر فرد کو بے پروائے سعی اور بیگانۂ عمل کردیا ہے، اگر افلاس کی غیرت اور بیچارہ مستی کی آن آج اُسکو منت کشِ چارہ گر ہونے نہیں دیتی، اگر اس کی نعشِ جاں سپار پر آج ایک سچا ماتمی اور نوحہ گر موجود نہیں، نہیں نہیں، اگر اسکے عزاداروں کی آسمان رس فغاں اسکے بخت خوابیدہ کو جگا نہیں سکتی، اگر اسکے یتیموں کے دلفگار آنسو، اور بھک منگوں کی جاں گداز آہیں فرشِ زمین میں شگاف اور سقفِ آسمان میں سوراخ نہیں کرتیں، اگر اسکے پسماندوں کی محشر انگیز سینہ کوبیاں اللہ میاں کے عرش کو متزلزل نہیں کرتیں، اگر خدائے پاک کی غیرت اور شانِ عفو، زمیں پاش سجدوں اور فلک شگاف دعاؤں کے باوجود، جوش زن اور متحرک نہیں ہوتی، اگر آج محبوبِ خدا اور حبیبِ ملت نبیؐ کی **شفاعت** بھی اُمت کے حق میں کارگر ہوتی نظر نہیں آتی، نہیں العیاذ باللہ نہیں! اگر خود اُمت اپنی مجرمانہ غفلت اور ظالمانہ طریقِ عمل،

عداوتِ رسولؐ اور عصیانِ خدا کے باعث رحم کی قطعی غیر مستحق، اور شفاعت کی یقیناً نااہل ہوگئی ہے۔ اور آسمانی اور زمینی بلائیں آج ہر طرف سے اُسکے اُجڑے ہوئے جھونپڑوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ویران کر رہی ہیں تو اِسکی وجہ یہی ہے کہ مسلمان قرآن کے مقاصد سے قطعاً ناآشنا ہوگئے ہیں اور **ایمان** اور **اعمالِ صالحہ** کے اصلی مفہوم سے کوسوں دور جا پڑے ہیں!

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ○ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ○ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ○ (۲۵: ۳۰-۳۲)

اسوقت رسولِ پاک اللہ کی جناب میں بصد حسرت عرض کرینگے کہ آہ! اے میرے پروردگار میری اُمت نے تیرے اِس بھیجے ہوئے قرآن کو لغو سمجھکر چھوڑ دیا! اور بعینہٖ اسطرح ہم نے ہر نبی کی مخالفت میں احکامِ خدا سے مجرمانہ تغافل کرنے والوں کی ایک جماعت بنا رکھی ہے، مگر اس مایوس کن حالت میں بھی تمہیں راہ بتانے اور مدد کرنے کو تمہارا پروردگار بس ہے۔ اور آج منکرینِ خدا جو اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن سارے کا سارا ایکدم سے رسول پر کیوں نہیں نازل کیا گیا اور جستہ جستہ کیوں اُترا، فی الحقیقت مناسب یہی تھا کیونکہ ہم اُنکو مطمئن کرنے کی بجائے سب سے پہلے اسکی صداقت اور عظمت کو تمہارے دلنشین کرنا اور تمہارے قلبِ سلیم کو مطمئن کرنا چاہتے تھے۔ اور اسی غایت کو پیشِ نظر رکھکر ہم نے اسکو ٹھیر ٹھیر کر اُتارا کہ اسکی ایک ایک آیت کی اہمیت کو تمہارے دل پر کالنقش فی الحجر کر دیں۔

---

† 'قوم' کا لفظ قرآن کریم میں مختلف جگہ پر خاص اُس اُمت کے لیئے آیا ہے جس کی ہدایت کے لئے کوئی رسول بھیجا گیا ہو۔ مثلاً آیات (۶: ۶۶)، (۱۱: ۳۶)، (۴۳: ۴۴)، (۴۳: ۵۷) میں، اور بالخصوص آیہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ (۱۴: ۴) میں، "اور ہم نے کوئی رسول اپنے ہاں سے نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہ ہمارا پیغام اُسی زبان میں لے جاتا ہے جو اُسکی قوم کی ہے تاکہ اُنپر ہمارے منشا کو غیر مشکوک طور پر واضح کر دے"۔ جس سے ظاہر ہے کہ متذکرہ صدر آیت (۲۵: ۳۰) میں قرآن کو لغو سمجھکر متروک کر دینے کا اشارہ بالخصوص قوم عرب کی طرف ہی۔ اور چونکہ کتاب خدا کے عربی زبان میں ہونے کے باعث، اِس کے مقاصد اور مطالب اہل عرب کو، عجم کے بالمقابل، بدرجہا واضح تر ہونے چاہیئے تھے، اسلیئے آج قرآن کے مطالب کی اکثر ذمہ داری اہل عرب کی گردن پر ہے، نہ باقی دنیائے عجم پر۔ آیندہ اوراق میں چلکر بتایا جائے گا کہ اسلاف صالحین سے قطع نظر جن کے سلیم الذہن طبقے قرآن کے عظیم الشان مطالب سے کماحقہٗ واقف تھے، اور جن کے علم و عمل نے ہی فی الحقیقت اسلام کو تمدن کے فلک الافلاک تک پونہچا دیا تھا، اخلافِ عرب نے کتاب خدا کو تُجر و ہذیان بنانے میں کسقدر مستقل حصہ لیا۔ اسکے مطالب میں کیا کیا آمیزشیں کرکے ایک دنیا کو اِس سے بیزار کر دیا۔ آج اِس زمانے میں بھی مسلمانانِ عالم کے اکثر مذہبی اور معاشری، تمدنی اور اجتماعی معاملات میں اہل عرب کا معنوی اقتدار اِس انتہائی حد تک نمایاں ہے کہ اسلام کی موجودہ حالت کی اکثر ذمہ داری بھی اہلِ عرب پر ہی عاید ہوتی ہے۔ اسلام کی داستان زوال کے ہر مرحلے میں یہ امر اسقدر روشن ہی کہ تاریخ کے ہر وسیع النظر طالب العلم کا اِس تلخ حقیقت سے انکار کرنا قریباً محال ہو گیا ہے۔

آج قرآن کی سچی عظمت دلوں سے محو ہو گئی ہے! اُسکے عالم افروز مطالب اور محیّر العقول معانی کو دلنشین کر دینے والے دس متنفس زندہ نہیں رہے، اُسکے حیرت انگیز ربط اور مکمل لائحہ عمل کو عیاں کرنے والا ایک فرد باقی نہیں رہا! اُسکی بُرہان ساطع اور حکمت لامعہ، رسمی ادب اور سطحی تعظیم کے گرد آلود جُزدانوں اور ریشمین غلافوں کے اندر سربلند طاقوں میں چھپی ہے؛ اسکی حجت قاطعہ، زبان کی عام نافہمی، تراجم کی حسرت آفرین کمی، اور مطالب کی نفرت انگیز تشریحوں کے باعث ہجر و ہزیان بنکر دردناک کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہے۔ طہارت کے سخت عذروں، رموزِ اوقاف اور اسالیبِ قرأت کے فوق الضرورۃ خوف آلود فتواؤں نے اِس عظیم الشان کتاب کو اور بھی متروک و مہجور کر دیا ہے۔ اِسکے کھُلے کھُلے احکام کے مطالب، اور سیدھی سادی آیتوں کے معانی بھی لغت، صرف و نحو، علم الانشا، علم المعانی، علم البیان، علم البدیع، علم رسم الخط وغیرہ وغیرہ کے اُن لامتناہی نکات اور مصنوعی رعایات کی شرح و بسط کے نیچے دب گئے ہیں جو عرب زباں دانوں نے محض اپنی زبان کو جِلا دینے کی خاطر ترتیب دیئے تھے۔ قرآن کا صحیح مطالعہ عرب تو درکنار، دنیائے عجم کے نزدیک بھی آج زیادہ تر انہی غیر متعلق علوم و فنون کا شبانہ روز درس و التزام ہے جو اہلِ عرب نے خود قرآن ہی کو معیارِ فصاحت و بلاغت مان کر اُسی کے تتبع میں قرونٍ؎ بعد اختراع کیے تھے۔ مسلمانوں کا درد انگیز قحطِ عقل، اور اُن کی مضحکہ خیز کم فہمی آج عرب کی کورانہ تقلید میں مغز کو چھوڑ کر پوست کی محبت میں گرفتار ہے، اور قرآن کی نہایت ادنیٰ، وہمی، اور سطحی فضیلت کو اہلِ غرض کی

؎ علم نحو کی ابتدا خلیل ابن احمد (المتوفی سنہ ۱۷۰ھ بمطابق سنہ ۷۸۶ء) سے ہوئی، گو ابو الاسود الدعلی (المتوفی سنہ ۶۹ھ سنہ ۶۸۸ء) نے اس پر چند ابتدائی تصانیف کیں۔ سیبویہ (المتوفی سنہ ۱۸۰ھ سنہ ۷۹۶ء)، اور کسائی (المتوفی سنہ ۱۸۹ھ سنہ ۸۰۵ء) نے بعد ازاں اس فن کو مستقل کیا۔ علم صرف عام طور پر کسائی سے منسوب ہے مگر اسکا اصلی موجد ابو عثمان بکر بن محمد مازنی البصری (المتوفی سنہ ۲۴۹ھ سنہ ۸۶۳ء) ہے۔ علم لغت کی ابتدا ابو عبیدہ (المتوفی سنہ ۲۱۰ھ سنہ ۸۲۵ء) نے کی۔ علم انشا کا ظہور ابو جعفر منصور عباسی (المتوفی سنہ ۱۵۸ھ سنہ ۷۷۵ء) کے عہد میں ہوا۔ علم المعانی و البیان پر پہلی کتاب غالباً عبد القادر جرجانی (المتوفی سنہ ۴۷۱ھ سنہ ۱۰۷۸ء) نے خلیفۃ المقتدی باللہ کے عہد میں لکھی۔ علم بدیع کا موجد ابن المعتز (المتوفی سنہ ۲۹۶ھ سنہ ۹۰۸ء) ہے جو خلیفۃ المعتز کا بیٹا اور المعتمد باللہ کا بھائی تھا۔ درس و تدریس قرآن کے متعلق باقی فنون کی ابتدا بھی نزول قرآن کے قرنوں بعد ہوئی۔ کتاب الٰہی کا مطالعہ صدر اسلام میں ان تمام تکلفات سے بے نیاز ہو کر ہوتا رہا۔ لیکن کیا اِن فنون کی عدم موجودگی میں آج کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کے عہد کے مسلمان قرآن کے مطالب سے بعد کے مسلمانوں کے بالمقابل کم آشنا تھے، یا اُس کی ہوئی تعلیم اور معنوی خوبیوں سے کم واقف تھے؟

اپنی بنائی ہوئی دلیل، اور اپنی پیدا کی ہوئی سند سے ثابت کرنے کی لاطائل سعی کر رہی ہے!

تو سر بادیۂ برشعلہ می تازی زغاکستر
بہ بینی حسن خاکستر چو در روشنگری بینی

آہ! اس المناک تکلف اور مجہولانہ ظاہر پرستی کا خمیازہ مسلمانوں کو آج اٹھانا پڑا ہے جبکہ صدیوں کے اس بے سود اجتہاد، اور تضییع وقت نے انہیں اپنی محبوب کتاب کے مہتم بالشان مقاصد سے اسقدر علیحدہ اور دائمی بہبودی کے حیرت انگیز دستور العمل سے اسقدر دور کر دیا ہے۔ کاش! جس تصنع اور ظاہر نوازی سے خلیل ابن احمد، ابو الاسود الدئلی، سیبویہ، کسائی، قطرب اصمعی وغیرہم نے قرآن کو ادب و بلاغت کی صحیح محک مان کر اسے کئی ایک مستقل علوم ادبیہ کا ماخذ و مصدر قرار دیا تھا اگر رازی، ابن رشد، فارابی، ابن حزم، اشعری وغیرہم علیہم الرحمۃ بھی کتاب الٰہی کے درس کو قانونِ فطرت کا صحیح ضابطہ، اور مشیت خدا کی صحیح تصویر مان کر اسی طریقے پر مستقل اور ناقابل رد علوم الکلام اور علوم الطبیعۃ کی بنیاد ڈالتے، اور قرآن کا تمام ضابطہ عمل عیاں کر دیتے، تو آج اسلام اس اندوہناک مصیبت میں مبتلا نہ ہوتا۔ برخلاف اسکے علم کلام میں مسلمانوں کی تمام تر سعی نہایت نازک اور خارج از بحث، مابعد الطبیعی اور غیر مفید موضوعوں کے غلط استنباط و غلط اجتہاد میں صرف ہوئی۔ معارفِ الٰہی، اوصافِ نبوت، ماہیتِ وحی، حقیقتِ روح، بحث امامت، جبر و قدر، احوالِ قیامت، عذاب قبر، خلقِ قرآن، وغیرہ وغیرہ، ایسے مسئلے تھے جن سے کسی غائر نظر کے بعد بھی کوئی یقینی فائدہ یا قطعی نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا تھا۔ یونان کے ضعیف اور اغلاط، غیر مستند اور خیالی آرا فلسفے نے ان مباحث کو چھیڑ کر مسلمانوں کے اعتقادات میں دردناک تصادم پیدا کر دیا۔ اہل سنت اور شیعہ، خوارج، معتزلہ، قرامطہ وغیرہا کے علاوہ جبریہ، قدریہ، مشبہہ، مرجیہ، باطنی، ناصبی، غالیہ، وغیرہ وغیرہ بیسیوں فرقے اسلام میں پیدا ہو گئے! اجماع امت شک میں تبدیل ہو گیا، قرآن کے مطالب کی تنظیم و تنسیق قطعاً ترک کی گئی، استدلال کا تمام تر رجحان معتقدات اور ظنیات کی طرف ہو گیا، معاملات اور یقینیات کیطرف توجہ نہ رہی

اِن نامراد قضیوں میں پڑکر مسلمان قرآن کی حقیقت سے اور بھی دور ہو گئے۔ جمہور علمائے دین کی اعتقادات میں بالغ نظری اور معاملات کی طرف کم نگہی آج ایک بہت بڑی حد تک اِسی مفسدانہ اور شر انگیز فلسفیانہ اجتہاد کا نتیجہ ہے۔

وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ۝ فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ
زُبُرًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ فَذَرْهُمْ فِي غَمْرَتِهِمْ حَتَّىٰ حِينٍ ۝ (۲۳، ۵۲-۵۴)

اور مسلمانو! یاد رکھنا کہ یہ تمہاری اُمت اپنے اصلی اساس کے اعتبار سے ایک ہی گروہ ہے جو میری سرگروہگی اور سرداری میں قائم ہے۔ اور وہ اصل میں خدا کا خوف ہی تھا جس سے ڈرتے رہو۔ اور میرے خوف کے باعث ایک اُمت بنے رہے ہو۔ آہ! لیکن خدا کا خوف اُن سے زائل ہو گیا، اور لوگوں نے آپس میں پھوٹ پیدا کر کے اپنا اپنا مسلک جُدا کر لیا۔ اب ہر فرقہ اپنی اپنی بات پر خوش ہے۔ پس اِن سب کو غفلت میں پڑا رہنے دو یہاں تک کہ امرِ الٰہی اُنکے اِس گناہِ عظیم کی پاداش میں سب کا فیصلہ کر دے!

علم کی صداقت آزما فضا، اور عمل کے فیصلہ کن میدان میں آج اس **یونانی فلسفے** کی دھجیاں اُڑ چکی ہیں۔ سطحی خوب صورتی، لفظی نزاع، غلط مقدمات، ظنی استدلال، عقیم نتائج، وغیرہ وغیرہ کوئی ایسا مذہبی نہیں جسکے رو سے اسکی اصلیت، حسب نسب، اور نامۂ اعمال کی قلعی نہ کھل گئی ہو۔ خود مسیحی یورپ بھی آج اپنے کمالِ قوت اور عدیم المثال تمکن کے غرور میں کبھی کبھی اِس پرانی، باتونی، اور بے وفا معشوقہ کی داستان دل لگی اور افسوس کے طور پر بیٹھتا ہے جسکی دلفریب باتوں کی بلائے محبت میں وہ مسلمانوں کی شہ پر دو سو برس تک گرفتارِ وصال اور منتظرِ نتائج رہا۔ مگر مسلمان ہیں کہ ایک ہزار سال سے زیادہ اِس راندۂ عالم اور مضعف الیقین، اِس تہیدست اور قلاش محض عجوزہ کے تبسم نما لبوں اور عشوہ سنج نگاہوں کے

٭ حاکمِ وقت کا خوف بشرطیکہ سچا خوف ہو رعیت کے افراد کے مابین سچا اتحاد پیدا کر دیتا ہے۔ اگر کوئی جماعت کسی ایک شخص کے ماتحت رہ کر متحد نہیں ہوتی تو اسکو لامحالہ اُس حاکم کا کچھ خوف نہیں۔ خوف کے ہوتے ہوئے تفرقہ ناممکن ہے۔ اور یہ بات ہر منتظم محکمے اور ادارت میں روز مرہ نظر آتی ہے۔ یہیں تقوے اور اتقا کی ایک اہم قرآنی رمز اتحاد اور وحدتِ اُمت ہے۔ اور یہی قوم دراصل متقی ہے جو خوفِ خدا کے باعث متحد ہو۔ اِس عالم آرا اصول کی تائید آگے چلکر ہو جائے گی۔ یہاں پر اِس سے بحث نہیں۔

گھائل ہیں اور اپنی دینی اور دنیاوی کشائش کی راہ ابتک اِس ناپاک فلسفے کے قدموں تلے دیکھ رہے ہیں! کیا خدائے پاک کا تنبیہی اور تادیبی اشارہ جو آیۂ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ[۵۱] (۵۶ : ۷۹) میں ہے، اور جسکی سعلمی تعمیل اور دور از کار تاویل[+] میں مسلمان اِس جوش و خروش سے استعاذوں، استغفاروں، اور پے در پے طہارتوں کے بغیر قرآن کا

---

[۵۱] اِس قرآن عظیم کو پاک بندوں کے سوا کوئی چھونے نہیں پاتا۔

+ اِس معنی خیز اور حقیقت نما آیت کا غلط استعمال جسقدر مسلمانانِ عالم نے پے در پے کئی قرنوں سے بالالتزام کیا ہے شاید ہی کسی دوسری ایک آیت الٰہی کا کیا ہو۔ کتاب خدا کے قدیم تر نسخوں میں جسقدر اس کا سرورق پر زیب عنوان ہونا کہیں تحقیق نہیں، اسیقدر اسلام کے زمانہ انحطاط سے آجتک یہ آیت نہایت استقلال کے ساتھ قریب قریب ہر مجلد کا سرنامہ بنتی رہی ہے۔ قرآن کریم کا ہر عالم اور جاہل مؤلف بلا امتیاز اسکو سرورق پر کہیں نہ کہیں جگہ دیتا رہا ہے اور اسکی شمولیت کو اپنی تالیف کا جزو لاینفک قرار دیکر اپنے زعم میں دنیا کو خدا کی ایک 'نہی' مہتم کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہے، اور طرفہ تر یہ کہ اُسکے غلط العام مفہوم کے متعلق اپنے دل میں ذرا سا شک بھی نہیں رکھتا۔ مگر ہر قوم کے زوال کی داستان دراصل اُسکی حسیات کے زوال کی داستان ہے، جب سعی و عمل کا اصلی ہیجان افراد کے قلوب سے رفتہ رفتہ فرو ہوتا ہے اور طبیعتیں آرام پسند بن جاتی ہیں تو انسان اپنے دل کی تسکین کے لیۓ چند ایسی باتیں اعتقاد کے طور پر لے لیتا ہے جن کے کرنے میں کم سے کم تکلیف ہوتی ہے اور اُن کے کر لینے سے ایک ڈھارس سی بندھی رہتی ہے۔ جبتک مسلمانانِ عالم، کتاب خدا کو کسی جلیل القدر حاکم کا فرمان خسروی سمجھ کر اسکے ایک ایک حرف پر عمل کرنا ناگزیر سمجھتے رہے، اسکی اہمیت اور عالی نسبتی سے خوفزدہ رہ کر لرزتے رہے، اور اسکی تعمیل میں اپنے تن بدن کو تحلیف میں ڈالتے رہے، قرآن کی تعظیم کا صحیح مفہوم عمل اور صرف عمل ہی رہا۔ لیکن جب سعی و عمل سے گریز کرنا آرام دہ نظر آیا تو لوگوں نے قولِ خدا کی لفظی اور زبانی تعظیم کو اپنے اعتقاد کا جزو کبیر بنا کر اپنے نفس کو دھوکا دیا، اِسی کو حاکم اعلیٰ کا صحیح منشا سمجھنے لگے، اسی کو حکم حاکم کی مرگ مفاجات فرض کر لیا، اِسی میں اپنا تمامتر اعتنا و انہماک صرف کر دیا۔ پھر نفس فریب کار کی اِس خوشنما بہانہ سازی نے قرآن کی تعظیم ریشمین جزدانوں میں بند رکھنے یا کبھی کبھی تبرک کے طور پر تلاوت کر لینے پر محدود کر دی، اور جب اس مکروہ کو نباہنا بھی طبیعت پر گراں گذرنے لگا تو اُسکو ہر وقت بالائے طاق رکھنے کا شیوہ اختیار کرکے گویا خدا کو بالائے طاق رکھدیا! آج یہی ابلیس کی بنائی ہوئی متقیانہ دلیل ہر فرد متنفس کے دل میں موجزن ہے، اور باوجودیکہ انسانی تعلق اور تعبد کا انداز ہمیشہ سے یہ ہے کہ کسی شاہ ہو دہ حاکم کے مکتوب کو دیکھکر کئی کئی راتوں تک نیند حرام ہو جاتی ہے، اور دن تیاری اور تعمیل میں صرف ہوتے ہیں، اور فہم مطلب کے اضطراب میں اُس منشور خسروی کو اُٹھا اُٹھا کر پڑھا اور پڑھ پڑھ کر رکھدیا جاتا ہے اور عمل کے سوا کسی دوسری تعظیم کا خیال تک نہیں گذرتا، تاہم مسلمانوں کے نزدیک آجکل تعظیم احکم الحاکمین اور تکریم قول و عمل کی بہترین تجویز یہی ہے کہ اُسکے مکتوب کو طاق نسیاں پر رکھکر پھر اُس کی خبر نہ لی جائے اور ہر دم باوضو نہ ہونے کا یا اور شیطانی عذر رکھکر اسکو ٹال دیا جائے۔ آہ! لیکن جسوقت کسی قوم کی نیتیں بگڑ جاتی ہیں، جب تکلیف کی بجائے آرام اُن کا شیوۂ عمل بن جاتا ہے تو کوئی منطق، کوئی دلیل، کوئی حس مشترک اُنکو بہتر بنانے کے لیۓ کارگر نہیں ہوتی، ورنہ خوف خدا کے اُس لشکر انگیز اور کشورکشا زمانے میں جب کہ قرآن کے یہی الفاظ سرورِ اُمت اور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلب پر براہ راست آسمان سے وحی ہو رہے تھے، آپ کی چہیتی اور اندازدان بیوی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ کلامِ خدا کو چمڑوں، اور کھجور کی شاخوں اور ہڈیوں پر لکھکر اُسی طرح علی الحساب ایک صندوق میں ڈال دیا جاتا تھا اور وہ صندوق رسولِ خدا کی چارپائی کے سرھانے پڑا رہتا تھا!

لیکن اِس استدلال سے قطع نظر جن معانی میں آیہ مُطَهَّرُونَ (۵۶ : ۷۹) قرآن کریم کے اندر استعمال ہوئی ہے۔ اُن کا مسلمانوں کی اِس خود ساختہ تاویل سے ذرا کوئی تعلق نہیں۔ سورۂ واقعہ کے ربط کو ظاہر کرنے کا یہ موقع نہیں مگر چند پہلی اور پچھلی آیتوں کے سیاق سے ظاہر ہے کہ

درس تو درکنار، اُسکے اوراق پر اُنگلی بھی نہیں رکھنے دیتے، یہی معنی رکھتا تھا کہ تم اِس پاکیزہ کتاب کے خدائی معقولات اور انمول جواہرات کو یونانی فلسفے کے ناپاک سنگِ امتحان پر گڑر گڑر کر، اپنی ہی ناقص عیاری اور نااہلی کا ثبوت دو، اور دنیا کو ابدالآباد تک محوِ حیرت اور شرمسار کر دینے والی صداقتوں کے مابین الدفتین خزانوں کو

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۵۰) اِس آیت میں کسی بات سے منع کیا گیا ہے اور نہ اِنما مقصود ہے بلکہ معترضین کو کتابِ خدا کے مفیدِ عام ہونے، اسکے علم کے سب انسانی علم و خبر سے بالاتر ہونے، اور اسکی تعلیم کے مصدرِ عزت و امن ہونے کا دعوے حیرت انگیز الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۝ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۝ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝ (۵۶ : ۷۵ - ۸۵)

تو اے راہ گم کردہ غفلت زدو! اور اے احکامِ خدا کو مکر سے ٹالنے والے بہانہ سازو! (الفاظ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ (۵۶ : ۵۱) کا ترجمہ، جو اِس سے پیشتر آ چکے ہیں، اور جہاں سے برابر مُکَذِّبِیْن قرآن اور ضَآلِّیْن کی طرف خطاب ہو رہا ہے۔ حتّٰی کہ (۵۶ : ۹۲) میں بھی انہی الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ کی طرف عود کیا گیا ہے،) میں تم کو آسمان کی اِس پہنائے بیکراں میں کروڑوں میل بلند ستاروں کے مقامات عالیہ کو گواہ ٹھیرا کر کہتا ہوں (فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ) اور گو ٹال مٹول کر کے سن لو کہ اگر تم کو علم ہوتا تو سمجھ لیتے کہ ان آسمانی عصائی ہوں کی شہادت ایک بہت ہی بڑی اور قطعی شہادت ہے، کہ یہ قرآن عظیم ایک بڑی ہی بلند پایہ (کَرِیْمٌ)، بڑی ہی قابلِ قدر و عزت (کَرِیْمٌ)، بے مثال غور و خوض (کَرِیْمٌ)، اور قابلِ غور و استنباط اور انہماک (کَرِیْمٌ) کتاب ہے۔ ہمارے نزدیک اِس کے احکام کی عزت، اِسکے مضامین کی قدر و منزلت، اُن کی اہمیت، ضرورت اور نافعیت، فی الجملہ مقصد ہے کہ گویا کہ ڈبوں میں رکھے ہوئے (مَّكْنُوْنٍ) انمول موتیوں کی طرح بین الدفتین لپٹی پڑی ہے جسکو بوجہ اسکے نایاب اور بے بہا ہونے کے پاک صاف اور اہل لوگوں کے سوا کوئی چھونے نہیں پاتا (لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ)۔ کم فہمو! قدر شناس انسانوں کے دلوں میں اِس کتابِ عزیز کے احکام کی یہ وقعت کیوں نہ ہو، یہ تو ایزدِ بے مثال کا اُتارا ہوا کلام ہے جو مخلوقِ زمین و آسمان کا پالنے والا ہے اور سب کو امن و راحت دینا جسکا اولین پیشِ نظر ہے (رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ)۔ تو کیا تم ایسے قابلِ قدر ایسے منفعت بخش اور اسقدر نایاب کلام سے مداہنت اور مسامحت روا رکھو گے (اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ)؟ کیا اِن بے بہا احکام کی تعمیل سے گریز کرنا، اُن کو جھوٹ سمجھ کر اُن سے بے اعتنائی برتنا اپنا روزینہ اور ذریعۂ معاش بناؤ گے (وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ)! تو خیر کچھ پروا نہیں شوق سے کرو لیکن اے اہل نظرو! اِس فرمانِ خسروی کو اُس دن کیوں نہ جھٹلاؤ جب کہ اجتماعی شکستِ ریخت کے قیامت انگیز صدمے میں تم میں ایک ایک فرد کی جان بدن سے کھچ کر حلق میں آ پہنچے گی، اور تم اُس وقت ٹکر ٹکر پڑے دیکھتے رہو گے اور ہرگز کچھ نہ کر سکو گے! پھر اُس دن ہم تم سے بھی زیادہ تمہارے حلق سے قریب تر (اَقْرَبُ اِلَيْهِ) کھڑے تمہارا گلا گھونٹ رہے ہونگے، اور تم کو خبر تک نہ ہو گی (وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ)!!

اِس مربوط ترجمے سے جس میں ہر آیت کے مطالب کو بعد کی آیت سے سلسلہ وار پیوست کر دیا گیا ہے، یہ ظاہر ہے کہ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کے الفاظ احکامِ الٰہی کی قدر و منزلت کو ساکنانِ زمین کی نگاہ میں عیاں کر دینے کے لیے بطور استعارہ استعمال کیے گئے ہیں۔ کتابِ خدا کو آیہ (۵۶ : ۷۷) میں کریم کا خطاب دیا ہے اور آیہ (۵۶ : ۷۸) میں اسکے تکرّم کی توکید مزید لفظ مَكْنُوْنٍ سے کر دی ہے۔ گویا یہ کتاب وہ قیمتی شہوار اور وہ گوہرِ نایاب ہو کر موتیوں کی طرح ڈبوں میں لپٹی پڑی ہے۔ یہ کسی شے کو لپیٹے رکھنا ہی انسان کے نزدیک انتہائی تعزز کا معیار رہا ہے، اور بعینہٖ یہی تشبیہ رب جل و علیٰ نے حورانِ بہشتی کے متعلق آیۂ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ (۵۶ : ۲۳) میں فرمائی ہے کہ گویا وہ حوریں ڈبوں میں رکھے ہوئے موتیوں کی مانند ہیں۔ حوروں کا فی الواقع لپٹی ہوئی ہونا نہ یہاں مراد ہے اور نہ قرآن کا عرشِ معلّٰی پر آیت زیرِ بحث (۵۶ : ۷۸) میں، بلکہ مقصود احکامِ خدا یا انعامِ خدا کی قدر و قیمت

چھوڑ کر، کاسۂ گدائی ہاتھ میں لیئے ہوئے، یُونان کی مسخ شدہ حکمت کے دریوزہ گر بنو!

آفتاب اندرون خانۂ ما | دربدر میسرویم ذرّہ مثال
گنج در آستین و میگردیم | گرد ہر کوئے بہر یک مثقال

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۵۱) کا جتلانا ہے۔ اِسی قدر و قیمت کی مزید تائید لَّا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَہَّرُوْنَ (۵۶ : ۷۹) کے الفاظ سے کردی ہے، یعنی وہ لپٹے ہوئے موتی اسقدر قیمتی اور آبدار ہیں کہ میلے ہاتھوں کا اُن کو چھونا بھی منع ہے۔ یہی تخصیص سورۃ الرحمٰن میں حوروں کے متعلق کی ہے: لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ (۵۵ : ۵۶ و ۷۴) یعنی "کسی جن و انس نے ان کو اس سے پہلے چھوا تک نہ ہوگا"۔

اب رہا یہ سوال کہ کتاب خدا کی قدر و منزلت آیا اسی سطحی تعظیم میں ہے جو کم ہمت مسلمان آج کر رہے ہیں، یا اُسکے مشمولہ احکام کی تعمیل کرنا ہی قرآن کریم کی صحیح قدر شناسی اور عزت ہے۔ اِس کا جواب آیۂ مُّدْهِنُوْنَ (۵۶ : ۸۱) اور آیۂ تُكَذِّبُوْنَ (۵۶ : ۸۲) میں ہے۔ اِن دونوں آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کریم سے "مداہنت" یہی ہے کہ مکر اور چرب زبانی سے کام لیکر اسکے احکام کی آرام دہ تاویلیں کر دیجائیں، ان کی تعمیل سے گریز کیا جائے، اور نری سطحی تکو بھگت کر کے العیاذ باللہ خدا کو دھوکا دیا جائے۔ یہی کفر کے صحیح معنی ہیں اور یہی تکذیبِ آیاتِ الٰہی ہے۔ جیساکہ دوسری مجلد میں واضح کر دیا جائے گا۔ خدا کی نظروں میں "مکذب" وہی شخص ہے جو اُسکے کہے پر عمل نہیں کرتا خواہ وہ اُسکے قول و کلام کا مُنہ سے رسمی اقرار کرے یا انکار۔ اِنہی معنوں میں رسول خدا صلعم کے زمانے میں اکثر اہل عرب مکذب تھے۔ مُنہ سے مقر ہو جانا اور عملاً تکذیب کرنا خدا بلکہ فی الحقیقت ہر اولو الامر کے نزدیک وہ فعل عبث ہے جس کی کچھ اُجرت نہیں۔

تعجب ہے کہ احکام الٰہی کو عملاً ماننے کی اس حیرت انگیز تحریص و ترغیب کے باوجود آیۂ مُطَہَّرُوْنَ کے معانی یہ لیئے جاتے ہیں کہ خدا نے اِس کتاب کو ہاتھ مُنہ دھوئے بغیر چھونے سے منع فرمایا ہے، اور صرف رسمی تعظیم مقصود ہے۔ ایک سلیم الذہن شخص کے نزدیک یہ تشریح نہایت لغو اور مضحکہ انگیز ہے۔ یہ خدا کی شان سے قطعاً بعید ہے کہ اپنے فرمانِ خسروی کی ایسی ناقص اور بے معنی تعظیم کرنے کا حکم دے جو آج کسی معمولی سے معمولی حاکم کو بھی قطعاً گوارا نہیں، اور جبکہ اُس نے خود اسکی تبلیغ و اشاعت کو بیحد محدود اور نامسلمان ملکوں میں قطعاً مسدود کر دیا ہو۔ مگر اس تمام استدلال سے قطع نظر، کیا آج غیور مسلمانوں اور بالخصوص سات کروڑ ہندی مُسلموں کے لیئے یہ ڈوب مرنے کا مقام نہیں کہ آیۂ مُطَہَّرُوْنَ کی اِس تاویل کو بالاتفاق تسلیم کرتے ہوئے بھی اُن کی فاقہ مستی اور بے نوائی، اُنکی بے حسی اور لا اُبالیت اِس حد تک پہونچ چکی ہے کہ قرآن کریم کی اکثر اشاعت اور طباعت کافر ناپاک ہندؤوں کی وساطت سے ہو رہی ہے۔ اُن کا اِس کتاب کو چھونا تو درکنار، عین بسر صدق پر آیۂ مُطَہَّرُوْنَ کے ساتھ ساتھ اُنکے نام نامی لکھے جاتے ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ کیا اندھیر ہو رہا ہے!

میرا مقصود اِس تمام بحث و تمحیص سے حتماً یہ نہیں کہ کلامِ الٰہی کی ظاہری تعظیم نہ کی جائے یا کم کر دیجائے، بلکہ یہ کہ صحیح قدر شناسی صرف اُس کے احکام کی تعمیل میں ہے اور بس۔ جو شخص قولِ خدا پر عمل کرنے کی نیت سے اپنے آپ کو تکلیف میں ڈال رہا ہے وہی اُسکے قول کی تعظیم کر رہا ہے، وہی اسکو مان رہا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ اکثر اوقات یقین و عمل کے ساتھ ساتھ ایک ظاہری ادب بھی خود بخود پیدا ہو جاتا ہے مگر ایسا اعتباری لحاظ کسی وجہ سے قابل اعتراض نہیں۔ جس بات پر معترض ہے یہ ہے کہ کتاب خدا کے بارے میں مسلمانوں کے دلوں میں ریا و مکر کی تعظیم نہ ہو، جھوٹ و فریب کی عزت نہ ہو، آرام دہ تکلف نہ ہو، تسکین دہ بناوٹ نہ ہو، دل سے انکار اور مُنہ سے اقرار نہ ہو، نفس کو دھوکہ نہ ہو، شیطان کی ساتھ نہ ہو، خدا سے گریز نہ ہو۔ اگر یہ ہے اور ساتھ ہی جنت کی تو بھی لگی ہے تو مسلمان وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ[1] (۳ : ۵۴) کے مضمون کو یاد رکھیں اور سمجھ لیں کہ اِس خوش اعتقادی کا کیا انجام ہو سکتا ہے! (باقی بر صفحہ آئندہ)

---

[1] اور اِدھر اُن لوگوں نے مکر کیا تو اُدھر خدا اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ مکاروں کے بالمقابل بہترین چال چلنے والا ہے۔

مغربی حکمت کے اِن شیدائیوں نے آہ! اِس تیرہ سو برس کے اندر قرآن کی مقدس مجلدات کو دِس کے ہر موقع پر آنکھوں سے لگاتے اور بار بار پڑھتے وقت ایک مرتبہ بھی اُسکے اُن دعاوی پر غور نہیں کیا جنکو وہ ہر نئے موضوع کے عنوان میں، ہر تحقیق بحث کے ضمن میں، اور ہر تازہ انکشاف کے ضمیمے میں پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ آہ! قرآن حقیقت کے اِن گمراہ متلاشیوں کو سوفسطائی فلسفے سے ہٹا کر حقیقی کے راہ راست پر ہی لا رہا تھا جب اُس نے کہا تھا کہ اسکی آیات حکمت کے کامل اُستاد، اصحاب البرہان خدا کے اپنے ہاں سے اُتری ہیں: تَنْزِيلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿۳۹: ۱﴾[1]؛ اُس بے مثال ہستی کا روئے سخن حکمت کے اِنہی نامراد ہرجائیوں کی طرف تھا جب اُس نے قرآن کو حکمت کی سب بے بدل اور جامع و مانع کتاب قرار دے کر اُسکی قسم کھائی تھی: یٰسٓ ۔ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيمِ ۔ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۔ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ[2] ﴿۳۶: ۱-۴﴾؛ وہ رب عزیز و حکیم، فی الحقیقت، انسان کو اُسکی اپنی ایجاد کی ہوئی ہر حجت اور حکمت سے عملاً بے نیاز کر رہا تھا، جب اُس نے اپنی بھیجی ہوئی بُرہان، اور اپنے بنائے ہوئے قانون کو "کتابِ حکیم" کا جامع اصلاحی لقب دیا تھا: تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ[3] ﴿۱۰: ۱﴾؛ شارعِ زمین و آسمان کی مرادِ حکمت کے اِنہی نادان اور کم علم فلسفیوں کو "صراطِ مستقیم" پر لانے کی تھی جب اُس نے جتلا دیا تھا کہ تمہارا اُمّی نبیؐ تو قرآن کے مہتم بالشان حقائق

[1] سورۂ زمر کے علاوہ جس کا حوالہ متن میں دیا گیا، یہی آیت دو اور جگہ زیبِ عنوان ہے جن کا حوالہ یہاں دیا جاتا ہے: تَنْزِيلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿۴۵: ۲﴾، تَنْزِيلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿۴۶: ۲﴾، سورۂ مومنون میں "العزیز العلیم" ہے: تَنْزِيلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿۴۰: ۲﴾، ترجمہ ان کا یوں ہے: یہ تحریری پیغام (الکتٰب) بارگاہ جل و علیٰ کی طرف سے تمام عالم کے نام ہے جو بڑا غالب القوت (عزیز) صاحب علم (۴۰: ۲) اور بڑا صاحب حکمت ہے۔

[2] قرآن حکیم اِس بات کا شاہد ہے کہ بیشک تم خدائے عظیم کے پیغامبروں میں سے ہو اور اسی صراطِ مستقیم پر چل رہے ہو جو مقصود خدا ہے۔

[3] یہی آیت سورۂ لقمان کے زیبِ عنوان بھی ہے: تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ﴿۳۱: ۲﴾، مفہوم ترجمہ یوں ہے: یہ احکام الٰہی (آیٰت) اُس قانونِ جلیل سے ماخوذ ہیں جو ایک مجسمہ حکمت کتاب ہے۔

(تتمہ تحت المتن صفحہ ۵۲) "مواقع النجوم" کی قسم کا صحیح مفہوم، اسکی عظمت کی تشریح، اور حلقوم تک پہنچنے والی موت کی صحیح کیفیت کا ذکر کسی موقع پر کر دیا جائے گا۔ مولٰنا بالا ترجمے میں مطالب بہت کچھ عیاں کر دیئے ہیں کا اور ظاہر ہے کہ مواقع النجوم کی شہادت لامحالہ اُس افقِ اعلیٰ کی شہادت ہے جو انسان کو کمالِ علم کے باعث حاصل ہو جاتی ہے اور جو عرب کے پیغمبرِ اعظم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہو گئی تھی۔ اِس کیفِ نبوت کا ذکر مسئلہ ارتقاء کے تحت المتن صفحہ ۲۱ میں ہو چکا ہے۔

حکیم و علیم خدا کے ہاں سے براہِ راست سیکھ کر آتا ہے: وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ[1] (۲۷ : ۶) اور اُسکی آیات پڑھکر دنیا کو حکمت اور طہارتِ نفس سکھلاتا ہے: لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ[2] (۳ : ۱۶۳)؛ ادب آموزِ ازل[3]

---

[1] اے محمد! اس میں شک نہیں کہ تم قرآن کی عظیم الشان حکمتوں کو حکیم و علیم خدا کے پاس سے سیکھ کر آتے ہو۔

[2] لوگو! اس خدائے عظیم نے ایمان والوں پر بڑا ہی احسان کیا کہ اِن بے علم اور اُجڈ اَن پڑھ اور انجان اہلِ عرب میں (فِیْهِمْ، دیکھو (۲:۶۲)) اُن ہی میں کا، اور حسب پسند ایک رسول بھیجا جو آج فرستادہ خدا ہونے کے باعث اس قدر صاحب علم ہو گیا ہے کہ اُن پر خدا کے عالم آرا احکام واضح کر رہا ہے (یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ)، ان کو آلائش گناہ سے پاک صاف کر رہا ہے، اُن کو قانون الٰہی (الْکِتٰب) کا علم دے رہا ہے، خدائے علیم و حکیم کی حکمت سکھلا رہا ہے، ورنہ اِس سے پہلے تو یہ جاہل لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

قریب قریب یہی مضمون (فِیْهِمْ، اور یُعَلِّمُهُمْ) کی ذرا زیادہ وضاحت کے ساتھ چار اور موقعوں پر آیا ہے۔ سورۂ جمعہ میں ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ (۶۲ : ۲)

لوگو! وہ خدا ہی تو ہے جس نے عرب کے اَن پڑھ اور اُجڈ لوگوں کی ہدایت کیلئے اُن ہی میں کا ایک اُمّی اور پہلے آسمانی صحیفوں سے ناآشنا شخص اپنا قاصد بنا کر بھیجا۔ وہ شخص آج فرستادہ خدا ہونے کے باعث ہی اسقدر صاحب علم ہو گیا ہے کہ اہل عرب پر خدائے علیم کے عالم آرا احکام واضح کر رہا ہے، اُنکے دلوں کو اپنی زندگی کے پاکیزہ نمونے اور نیک عمل سے آلائش عصیان جہود سے پاک کر رہا ہے (یُزَکِّیْهِمْ)، اُنکو قانون الٰہی کا علم دے رہا ہے، خدائے حکیم کی حکمت سکھلا رہا ہے، ورنہ اِس سے پہلے تو یہ جاہل لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

سورۂ بقرہ میں ہے:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۚ (۲ : ۱۵۱)

اے ساکنانِ عرب! یہ احسانات جو اوپر شمار ہوئے اُسی قطع کے ہیں جیسا وہ عظیم الشان احسان کہ ہم نے تم کو راہِ راست پر لانے کیلئے تم ہی میں کا ایک رسول بھیجا جو ہمارے احکام تم پر واضح کرتا ہے، تمہارے نفس کو گناہ کی آلائش سے پاک کرتا ہے، تمکو قانون الٰہی کا علم دے رہا ہے، عزیز و حکیم خدا کی حکمت سکھلا رہا ہے، اور مختصر یہ کہ تمکو اُن عظیم الشان حقائق فطرت کا علم دے رہا ہے جن کا اس سے پہلے تمہیں کچھ علم نہ تھا۔

ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا بھی یہی انداز تھا:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۲ : ۱۲۹)

اے ہمارے پروردگار! تو اِن بے علم اور انجان اہل عرب میں اُن ہی میں کا ایک رسول بھیج جو تیرے احکام اِن پر اچھی طرح واضح کر دے، اُنکو تیرے قانون جلیل کا علم دے، تیری جلیل القدر حکمت کا درس دے، اور اُنکی اصلاح کرے (یُزَکِّیْهِمْ)۔ اِس میں شک نہیں کہ تو ہی غالب البرہان اور صاحب حکمت خدا ہے۔

سورۂ نساء میں ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (۴ : ۱۱۳)

اور اے محمد! اس خدائے ذوالجلال کا تم پر بڑا ہی فضل ہوا جو اُس نے اپنی کمال عاطفت سے یہ کتاب عظیم تم پر اُتاری بلکہ یہ کتاب کیا ہے، اور اصل مجسمۂ حکمت ہے، جسکے ذریعے سے خدائے علیم و حکیم نے تم کو وہ حقائق عالیہ سکھلائے ہیں جن کا تم کو اس سے پیشتر علم نہ تھا۔

نے یونانی فلسفے کے اِن خوشہ چینوں کو قرآن ہی کیطرف بلایا تھا جب اسکی سچی اور بے عیب حکمت کو بشریت کے ہر نقص سے بری، اور انسانی صناعت کے ہر سُقم سے پاک ٹھیرایا تھا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ؕ سکہ (۱:۱۸)، اور صاف فرمادیا تھا کہ ساکنانِ عالم کو محیطِ ظلمت سے پہنائے نور میں نکالنے والی یہی کتاب ہے: کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۙ۬ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ؕ (۱:۱۴)؛ آہ! مغروبِ منطق کے اِن ذلّہ برداروں نے قرآن میں یونانی فلسفے کے ذریعے سے اجتہاد کرتے وقت نہ سمجھا کہ قرآن کی قطعیّت اور کفایت کی یہی دلیل بس ہے کہ وہ ایک کامل باعلم اور کامل باخبر ذات کی طرف سے ہے: کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ۙ (۱:۱۱)، اور اس بنا پر اسکے معارف و حقائق میں کسی ناقص، غیر قائم اور عارضی شئے کو دخیل کرنا خدا اور حکمتِ خدا کو العیاذ باللہ ناقص سمجھنا ہے!

---

۵۱ تمام تعریف اور شکر خدا ہی کو سزاوار ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن اُتارا اور اسمیں کسی قسم کی کمی نہ رکھی۔
قرآن حکیم کی حکمت میں کمی نہ ہونے اور اسکی صداقتوں کے ازلی اور ابدی ہونے کے متعلق دو اور اشارے ہیں جو اس جگہ لکھ دیئے جاتے ہیں۔ سورۂ زمر کی آیت (۳۹: ۲۷) سے قرآن کی جامعیت اور مانعیت کا دعوےٰ بھی نکلتا ہے:

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ ۚ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ۝ (۳۹: ۲۷-۲۸)

اور لوگو! ہم نے تمہارے سمجھانے اور تمہیں صحیح طرزِ عمل بتلانے کیلئے اس قرآن کے اندر ہر ممکن مثال دیکر سارا دستور العمل واضح کر دیا ہے تاکہ لوگ اس سے نتائج اخذ کریں، اور بعد ازاں اُنپر عمل کریں۔ یہ قرآن عربی زبان میں ہے، اِسکی حکمت عالیہ میں کسی قسم کی کمی نہیں رکھی اور اسکا منتہائے نظر یہ ہے کہ تمام عالم کے لوگ اس بیمثال حکمت پر عمل کرکے عذابِ الٰہی سے بچیں۔

لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ (۴۱: ۴۲)
باطل کو اس کتابِ عظیم سے مقابلہ کرنے کی تاب نہیں، نہ اسکو پیچھے سے وار کرنے کی جرأت ہے۔ جھوٹ نہ اسکے سامنے سے آسکتا ہے (مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ)، نہ پیچھے سے (مِنْ خَلْفِهٖ)۔ نہ آج اِسکو کوئی انسانی حکمت جھٹلا سکتی ہے، نہ آج کے بعد اِسکو کہیں سے گزند پہنچ سکتا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت عظمیٰ اس حکیم اجل، اُس استادِ ازل کی اُتاری ہوئی ہے جس کی حمد و ثنا میں ایک عالم رطب اللساں ہے!

۵۲ یہ قرآن ایک بڑے پائے کی کتاب ہے۔ اس کو ہم نے تم پر اس غرض سے اُتارا کہ تم لوگوں کو حکمِ خدا کی اطاعت پر آمادہ کرکے جہل کے اندھیرے سے علم کی روشنی میں لاؤ اور انکو عزیز و حمید خدا کی طرف لے جاؤ۔

۵۳ یہ قرآن وہ بے بدل کتاب ہے کہ اسکے احکام دلائل و براہین سے بخوبی ثابت اور مستحکم کیئے گئے ہیں اور پھر حکیم و خبیر خدا کے اپنے ہاں سے اُن کی مکمل شرح و بسط کی گئی ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (۱۶ : ۸۹)

اور اے پیغمبر! ہم نے تم پر کتاب اس پائے کی نازل کی ہے کہ اس میں ہر ممکن شئے کے متعلق (جسکا واسطہ انسان سے پڑتا ہے) تفصیلی بیان موجود ہے، اور تسلیم کرنے والی قوم کے لیئے یہ کتاب تو سرتاسر ہدایت ہی، رحمت ہے، اور اسکی سلامتی اور حفظ امن کی بشارت ہے!

ان حیرت انگیز دعاوی کے بعد مسلمانوں اور قرآن کو "تسلیم کرنے والوں" کا فرض تھا کہ وہ اپنی دینی اور دنیاوی دونوں زندگیوں کے اصولی قواعد اور بنیادی ضوابط کی تلاش میں انسانی حکمت کے ہر مسلک خیال، اور قیاس ورائے کے ہر نظری مذہب سے قطعاً بے نیاز ہوجاتے۔ وہ اللہ کا حاوی علم، اور خدا کا محیط فلسفہ موجود ہوتے ہوئے کسی افلاطون یا ارسطو کی حکمت کے محتاج نہ بنتے، وہ انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کو خوش سلوبی سے سلجھانے کیلئے تمامتر رجوع اسی کتاب کی طرف کرتے، وہ دین اور دنیا کے ہر مسئلے اور ہر طرزِ عمل کے متعلق سب بشارت اور رحمت، سب نور اور ہدایت، سب علم اور خبر اسی کتاب سے لیتے، وہ قرآن ہی کو اعتقادی اور عملی مناظرات کی حقیقی سنام، اور کلام الٰہی کو ہی روحانی اور مادی مجاہدات کی مضبوط اساس مانتے! وہ کتابِ خدا کو نہ صرف ذاتی فلاح کا بے مثال ذریعہ اور روحانی تقرب کا واحد وسیلہ سمجھتے، بلکہ معاشری عمران کا سنگِ بنیاد، اجتماعی استحکام کا مرکزِ ثقل، اور قومی تقدم کا محورِ عمل یقین کرتے؛ وہ اقوام کی ترقی کے اسباب، انحطاط کے وجوہات، بادشاہت اور تسلط فی الارض کے طریقے، حصول قوت کے مآخذ، علوم و فنون کے مصادر، فطرت کے قوانین✝، الغرض ان سب نکات کے کھوج جن پر انسانی زندگی کا تمام حصر ہے، اسی قرآن سے لیتے اور انپر عمل پیدا کرتے۔ منانِ لم یزل اور منعمِ حقیقی نے قرآن ہی کو مسلمانانِ عالم کا کامل ضابطۂ عمل اور مکمل آئینِ مذہب قرار دے کر کہا تھا کہ آج میں نے اسلام کو تمہارے لیے پسند فرماکر دین و دنیا کی تمام نعمتیں تم کو بخش دی ہیں!

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا✽ (۵ : ۳)

آج ہم تمہارے دین کے تمام دستورِ عمل کو تمہارے لیے مکمل کرچکے، ہم نے اپنی تمام نعمت تم پر پوری کردی اور

✝ سلسلہ ربانی کے تحت البیان (صفحہ ۱۱-۲۰) میں اس عظیم الشان حقیقت کو واضح کرنے کی ایک حد تک سعی کی گئی ہے۔ ✽ نبوت کے سال الخیر ۱۰ ہجری میں حجۃ الوداع کے خطبے کے موقع پر یہ آیۂ جلیلہ نازل ہوئی

اسلام کو تمہارے لیے بطور آئین عمل پسند فرمایا۔

کلامِ الٰہی کی اس مہتم بالشان اور معرکۃ الآرا حیثیت کو پہچاننے کے لیئے نہایت سیدھے سادے اجتہاد کی ضرورت تھی۔ شارعِ اسلام نے قرآن کو ایک روشن اور بیّن حقیقت قرار دیا تھا: تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝[۵۱] (۲:۲۶)، مگر ساتھ ہی سورۂ قمر میں یہ امر بار بار یاد دلا دیا تھا کہ اسکے اوامر و نواہی، مواعظ و حِکَم، طریقِ توجیہ اور طرزِ استدلال سے پورے طور پر مستفید ہونیکے لیئے ذکر و فکر، صحیح استنباطِ نتائج، اور عمل کی قطعی ضرورت ہے: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝[۵۲] (۱۷:۵۴)۔ صاحبِ قرآن اور فاطرِ زمین و آسمان نے قرآن کو ہدایت کا سرچشمہ، رحمتِ الٰہی کا مبدء، اور بشارت کا مصدر قرار دیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اُسکے حقائقِ عالیہ کو پورے طور پر سمجھنے کے لیئے کامل یقین، کامل ایمان، انتہائے استقلال، اور کمالِ بصیرت کی ضرورت ہے: قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝[۵۳] (۷:۲۰۳)

---

۵۱ "یہ آیات اس کتابِ جلیل کا ایک حصہ ہیں جو واضح ہے، اور جسکے مقاصد صاف صاف بیان کر دیئے گئے ہیں"۔ یہی آیت سورۂ شعراء کے علاوہ سورۂ یوسف اور سورۂ قصص کے زیبِ عنوان بھی ہے: تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ (۱۲:۱)، (۲۸:۲)۔ سورۂ حجر کے شروع میں "قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ" کے الفاظ ہیں: تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۱۵:۱)، "یہ آیاتِ الٰہی اس الکتٰب کی ہیں جو قانونِ خدا ہے، اور اس قرآن کی جو ہر طرح پر واضح اور روشن ہے"۔ سورۂ نمل میں "كِتَابٍ مُّبِيْنٍ" کے الفاظ ہیں: تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۲۷:۱) "یہ آیاتِ الٰہی قرآن کریم کی ہیں اور اس کتاب کی جو واضح اور روشن ہے"۔ سورۂ زخرف (۴۳:۲) اور سورۂ دخان، (۴۴:۲) میں صرف وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ ہے جس کا ترجمہ یہ ہو سکتا ہے "قرآن کریم جو ایک روشن اور مشرح فی البیان کتاب ہے اِس بات کا شاہد ہے"۔

اِن آیات کا صحیح مفہوم ترجمے میں ادا کرنا از بس مشکل ہے یہاں پر ایک عام ترجمہ کر دیا گیا ہے جس سے مقصود قرآن کو واضح کتاب ثابت کرنا ہے۔ لیکن یہ امر کہ "كِتَابٍ مُّبِيْنٍ" اور "الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ"، "الکتٰب" اور "کِتَاب" کے الفاظ کا صحیح مقصود کیا ہے علٰحدہ بحث ہی جو دوسری صحبت میں کی جائے گی۔ "الکتٰب" اور "کتاب" کے الفاظ اس سے پیشتر بھی چند آیتوں میں آچکے ہیں، اور اس موضوع کی مستقل اور فیصلہ کن بحث سے پیشتر بھی آئینگے لیکن اِن کے اصلی مفہوم کو اُسی بحث پر چھوڑ دینا چاہیئے۔

۵۲ اور فی الحقیقت ہم نے قرآن کو تو لوگوں کے حصولِ نصیحت کی خاطر آسان طور پر بیان کر دیا ہے۔ پس کوئی ہے جو اس سے سچی نصحت پکڑ کر اس کے احکام پر عمل کرے!

سورۂ دخان کے اخیر میں ہے: فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (۴۴:۵۸) "ہم نے اس قرآن عظیم کو تمہاری زبان میں محض اسلیئے آسان کر دیا ہے کہ تمہاری قوم کے لوگ اس سے نصیحت اخذ کریں"۔ "يَسَّرْنٰهُ" کا اشارہ ایک اور جگہ بھی آیا ہے: (۱۹:۹۷) مگر وہ آیت آگے چلکر متن کتاب میں آئے گی۔ آیۂ مُّدَّكِرٍ قرآن کریم میں سورۂ قمر میں تین جگہ آئی ہے یعنی (۵۴:۱۷)، (۵۴:۲۲)، (۵۴:۴۰) میں۔

۵۳ تم ان لوگوں سے کہدو کہ میں تو اسی پر عمل کرتا ہوں جو میرے پروردگار نے مجھپر وحی کی ہے۔ یہ قرآن تو فی الحقیقت بڑی سوچ سمجھ کی باتیں ہیں جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ ان میں اگر ہدایت اور رحمت ہے تو اس قوم کے لیئے جو اس کی حقیقت پر کامل ایمان رکھتے ہوئے اس میں تدبر کرے (لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ)۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ٥ (۴۵: ۲۰)[۵۱] استادِ لم یزل اور حلّالِ مشکلات نے قرآن کو آسان اور
مبین، کہنے کے باوجود مجسمۂ بصائر اور پیکرِ حکمت فرمایا تھا مگر ساتھ ہی یہ معنی خیز تشریح کر دی تھی کہ اس کی
آیات کی صحیح اور مکمل تفصیل صاحبِ علم قوم کے سوا کسی کو ودیعت نہیں: كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ
يَّعْلَمُوْنَ ٥ (۴۱: ۳)[۵۲] وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ٥ (۷: ۵۲)[۵۳] ہادیٔ دین اور ماحیٔ
اختلاف خدا نے قرآن کو تضاد کے بدنما اور بشری عیب سے قطعاً بلند تر ٹھیرایا تھا مگر اس بات کو بوجہ احسن واضح
کر دیا تھا کہ اگر انسان کو اسکی آیات بیّنات میں کسی جگہ اختلاف کا شائبہ نظر آتا ہے، یا نقص و ضد کا
گمان گذرتا ہے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کے ظاہر اور باطن، سیاقِ بحث اور سباقِ کلام یا محلِ وقوع اور
شانِ نزول پر غائر نظر نہیں ڈالی گئی، جسقدر اسکے مطالب میں تدبّر اور صحیح استدلال کیا جائے گا اُسکا
اختلاف مٹتا جائے گا۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ٥ (۴: ۸۲)

تو کیا یہ لوگ قرآن کے مقاصد و مطالب پر غور نہیں کرتے اور نہیں دیکھتے کہ وہ سب آپس میں متحد اور متفق ہیں
کیا ان کو اتنا بھی شعور نہیں کہ سمجھیں کہ اگر یہ کسی غیر خدا کا بنایا ہوا قانون ہوتا تو لامحالہ اسمیں بیحد اختلاف پاتے۔

---

۵۱ یہ قرآن تو تمام عالم کے لئے بصیرت اور تدبر کی باتیں ہیں۔ ہدایت اور رحمت اُسی قوم کو حاصل ہو جو اسکی سچائی اور منجانب اللہ ہونے پر بلا استقلال یقین رکھکر اسمیں تدبر کرے (لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ)۔

۵۲ یہ قرآن عظیم ایک کتاب ہے جس کی آیات جلیلہ کے عظیم الشان مطالب کو ایک عربی متن کی صورت میں (قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا) اس قوم کے لئے مشرح اور مفصل کر دیا گیا ہے جو 'علم' رکھتی ہو (لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ)۔

۵۳ اور حقیقت حال یہ ہے کہ ہم ان نادان اور اجڈ اہل عرب کے پاس وہ بے بدل کتاب لائے ہیں جس کی شرح و تفصیل ہم نے 'علم' سے کر دی ہے جو صاحب علم قوم اس قانون جلیل کے حقائق عالیہ کی صحت پر بالالتزام ایمان رکھکر اس میں تدبر کرتی ہے۔ اُس کے لئے تو یہ کتاب سراسر ہدایت اور رحمت ہے (لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ)۔

---

* 'علم' کی صحیح اور ناقابل انکار تعریف 'عمل' کے عنوان کے تحت تیسری مجلد میں آئے گی۔ وہاں پر بصراحت تمام واضح کر دیا جائے گا کہ کتاب خدا کی مراد 'علم' سے بعینہ کیا ہے اور اس کے موجودہ مفہوم میں کس قدر حیرت انگیز تحریف ہوئی ہے۔ اس آیۂ کریمہ (۴۱: ۳) سے بہر نوع یہ ظاہر ہے کہ قرآن صرف صاحب 'علم' قوم کے لئے اُترا ہے اور اس بنا پر اسکے حقائق عالیہ کو وہی قوم کماحقہٗ سمجھ سکتی ہے جو 'علم' رکھتی ہو۔ مسئلہ ارتقا کے تحت المتن میں اس 'علم' کی ایک جھلک دکھلا دی گئی ہے اور ایک دو اور مباحث آگے چلکر اسی مجلد میں آئیں گے۔ مگر 'علم' کی تعریف تسلیم کئے بغیر کتاب خدا کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانا از بس مشکل ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○ (۱۶ : ۴۴)

اور اے محمدؐ! ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب نصیحت اسلیئے اتاری ہے کہ تم لوگوں پر اچھی طرح عیاں کر دو کہ اُن کیلئے کیا احکام اُترے ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ خود سوچیں اور تدبّر کر کے نئے مطالب دریافت کریں، اور تطابق پیدا کریں۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○ ✝ (۳۸ : ۲۹)

اے پیغمبر! یہ قرآن عظیم بڑی برکت اور رونق پیدا کرنے والی کتاب ہے۔ اسکو ہم نے تیری طرف محض اسلیئے اُتارا ہے کہ لوگ اسکی آیات پر کامل تدبّر کریں، اور صاحب عقل و فراست لوگ اس سے صحیح نتائج اخذ کر کے عبرت حاصل کریں۔

یہی خالص تدبّر، ذکر و فکر، ایمان و یقین، علم و بصیرت، صحیح استدلال اور تطابق ایسے آئینی اُصول تھے جن کی بنا پر کلامِ الٰہی کے حجۃ بالغہ ہونے پر ایک سچا اور ناقابلِ رد اجتہاد قائم ہو سکتا تھا۔ قرآن کے حیرت انگیز سربستہ رازوں، اور سر بمہر حکمتوں کے لیئے کسی خارجی فلسفے کی ضرورت نہ

✝ 'اُولُوا الْاَلْبَاب' کی قرآنی تعریف 'بنی عمل' کے عنوان میں آئے گی۔ لیکن ان تینوں (۱۴ : ۸۲) (۱۴ : ۴۴) (۳۸ : ۲۹) اور قبل کی 'بصائر' والی (۷ : ۲۰۳)' (۴۵ : ۲۰) آیات کو پیشِ نظر رکھکر اُس مہلک تخیل کا یکسر قلع قمع ہو جاتا ہے جسکے رو سے مسلمانانِ عالم کی ایک کثیر تعداد نے قرآن میں تدبّر کر کے اس کے مطالب کو دریافت کرنا گناہ سمجھ لیا ہے۔ آج اِس عام انحطاط کے زمانے میں غالب رائے یہی ہے کہ قرآن کسی تدبّر کا متحمل نہیں، اس کے حقائقِ عالیہ کا ذہن سے کچھ تعلق نہیں، اس کے مطالب میں فہم کو دخیل کرنا گناہ ہے، اسکی تشریح میں عقل کو کام میں لانا بدعت ہے' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جو لوگ "علم اسرار الدین" کے منشا و وجود سے واقف ہیں جس کی رسمی بنیاد قرنِ اوّل میں حضرت عمرؓ نے رکھی، اور جنہوں نے اُس تنقیح و استقصا کا مزا چکھا ہے جو خود رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحبت میں اور اصحابِ صُفّہ کے مابین سالہا سال تک ہوتی رہی، اور جس کو بلا استثناء سب صحابہ کرام نے ایمان و یقین کی خشتِ اوّل قرار دے کر قرآن حکیم کی ایک ایک آیت کے مطالب کی تعبیر میں مہینوں اور برسوں تک تدبّر کرنا عین ایمان سمجھا تھا، اُن کے نزدیک اِس زہر آلود تخیل کی کچھ وقعت نہیں۔ مگر مالکِ زمین و آسمان اور بخشایندۂ فہم و ادراک کا کلام انسان کی بڑی سے بڑی تنقید، ہر ممکن سے ممکن آزمائش، اور سخت سے سخت معیار کا متحمل نہیں تو وہ ذی شعور انسان کے لیئے وجوباً قابلِ قبول نہیں۔ کتاب کے اِس ابتدائی حصے میں بھی صاحبِ نظر کے لیئے کئی مثالیں پیش ہو چکی ہیں لیکن آگے چلکر ہر صفحہ اِس امر کا آشکارا ثبوت ہو گا کہ قرآن حکیم کی آیات کس قدر محکم، کس قدر صحیح، کس قدر مطابق، اور کس قدر عمیق و بلیغ ہیں۔ کوتاہ نظر انسان کا علم اُن کے علم کے بالمقابل کس قدر ہیچ ہے۔ خدائے بیمثال کی طرف سے انسان کو صلائے عام ہے کہ اُن کو بغور تمام پرکھے، الٹ پلٹ کر دیکھے، بار بار دیکھے، مگر اُنکے ایک حرف کے متعلق کوئی کمی، کوئی کم علمی، کسی نادانی کا دریافت کرنا قاطبۃً محال ہے۔ اِس کتاب میں کلامِ الٰہی کے تمام مطالب اِسی تطابق کے اصل اصول کو پیشِ نظر رکھکر واضح کیئے گئے ہیں، اور جو یگانگت اور وحدت اِس کتاب کے مطالب میں قائم ہوئی ہے ہر صاحبِ نظر کے سامنے ہے۔ خود انہی 'آیاتِ الٰہی' یعنی 'آیۂ مبین' (۲۶ : ۲) و 'آیۂ مُدّکر' (۵۴ : ۱۷) اور 'آیات بصائر' (۷ : ۲۰۳) (۴۵ : ۲۰) کے مطالب میں بظاہر کچھ اختلاف سا نظر آتا تھا مگر ادنیٰ سے تامل نے اسکو 'آیۂ یعلمون' (۴۱ : ۳) کی وساطت سے رفع کر دیا ہے۔

 (دیکھو صفحہ ۱۰۰)

تھی۔ ربّ علیم و حکیم نے اہلِ اسلام کی رہنمائی اور سرخروئی کے لیئے، قرآن کے بیمثال عجائب خانے کے اندر سعی و عمل کے ہزاروں کرشمے، خوشحالی اور امن کے صدہا طلسم، قوت و اقتدار کے لاانتہا دفینے، اور علم و حکمت کے بیسیوں اساسی اصول اسکے مختلف طاقچوں اور گوشوں، دیواروں اور محرابوں کے سپرد کر دیئے تھے مگر آہ! اُن کی ظاہری شکلیں بھی آج اعتقاداتِ باطلہ، غلط مطالب، اور غلط اجتہاد کے خس و خاشاک کی تہ میں محو ہو چکی ہیں! مسلمانوں کا موجودہ فلسفہ آج اس معجز العقل عجائب خانے کے انمول موتیوں کو سپردِ خاک کر کے، عمارت کی چوکھٹوں اور دہلیزوں، طاقوں اور محرابوں، روشندانوں اور کھڑکیوں، چھتوں اور نالیوں کی ثناخوانی میں مصروف ہے، اور کم فہمی اور بدذوقی کی غیظ آفرین بے توجہی سے ان پاکیزہ جواہرات پر فصاحت کا جاروب پھیر کر، شاعرانہ واہ واہ یا جزدانی تعظیم کے جمادِ چند سے ہی اُن کی قدر و قیمت کا فیصلہ کرنا چاہتا ہے! آج قرآن کی کُل کائنات میں مسلمانوں کا مبلغ اجتہاد اور اُنکی اہم داستانِ حکمت، قیامت کے بے سند قصّوں، قبر کے مظنون عذابوں، روح کی مفروض قسموں، اخلاقی امراض کی آفتوں، کفر کے بے دلیل اور مضحکہ انگیز فتواؤں، نشست و برخاست کے موضوعی آداب، توبہ و استغفار کے بناوٹی اسالیب، اور طہارت و استنجا کے وضعی طریقوں کی ندامت انگیز تشریح ہے! کیا یونانی فلسفے کی المناک خیال آفرینی، اور مسلمانوں کے دردانگیز فقدانِ علم و فکر کا یہ نتیجہ نہیں ہوا کہ آج ظن و وہم کے ان ہوائی قلعوں کی تعمیر میں اسلام وہ سب کچھ کھو بیٹھا ہے جو صرف چند برس تک مسلمانوں کو قرآن کے ادنیٰ اور ابتدائی عمل کے انعام میں ملا تھا۔

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۞ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۞ اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ۞ (۴۳: ۲-۵)

* "الکتٰبِ المبین" کے معانی کے متعلق، جیسا کہ صفحہ ۵۰ کے تحت المتن میں ظاہر کیا گیا ہے، ابھی کچھ بحث کرنا پیش از وقت ہے لیکن ان آیات یعنی (۴۳: ۲-۳) اور (۱۲: ۱-۲) سے کم از کم یہ ظاہر ہوتا ہے کہ (۴۳: ۲) میں کسی روشن اور بیّن کتاب کی شہادت پیش کی گئی ہے اور جعلنٰہ (۴۳: ۳)

لوگو! کتاب مبین اس امر کی شاہد ہے کہ ہم نے کتاب خدا کو عربی زبان میں محض اسلئے کردیا ہے کہ تم اُسکے دستور العمل کو بآسانی سمجھ لو۔ اور یہی قرآن جسکو تمہارے سمجھنے کی خاطر عربی لباس پہنایا گیا ہے اُس اُمّ الکتٰب کا ایک حصہ ہے جو ہمارے ذہن میں ہے اور جو ایک مقتدر اور مخزن حکمت کتاب ہے۔ تو کیا اس وجہ سے کہ تم لوگ اس کتاب کے حقیقی مقاصد نہ سمجھنے میں حد سے بڑھے جاتے ہو اور ہمارے مطلب کو نہیں پاتے ہم اس کتاب کے مطالب کو تم سے سرتاسر اِسطرح اُچک لیں کہ تم خاک بھی نہ سمجھ سکو؟

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝ (۱۲: ۱-۲)

اے ساکنانِ زمین! یہ آیات الٰہی اس جلیل القدر کتاب سے ماخوذ ہیں جو روشن اور واضح ہے۔ اور اسمیں شک نہیں کہ ہم نے اِس کتاب مبین کو اپنے ہاں سے عربی زبان کا لباس پہنا کر عربی اللسان قرآن اس لئے بنایا ہے کہ تم لوگ اس کے اسرار عالیہ کو سمجھکر عقلمند بن جاؤ۔

قرآن کے مقاصد اور اسلامی فلسفۂ اخلاق پر یونانی حکمت کے اِس مُہلک اثر کے علاوہ اور بھی فساد آفرین اثرات پڑے جن کا تعلق خود اہلِ عرب کی جبلّت اور طینت سے تھا۔ عرب ظہور اسلام سے پہلے یونانیوں

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۶۰) اور اَنْزَلْنٰهُ (۱۲: ۲) کی ضمیر ہُ کا مرجع بھی اسی "کتٰب مبین" کی طرف ہے۔ گویا خدائے بیمثال نے کسی کتاب مبین کو شاہد بنا کر یہ کہا ہے کہ ہم نے اُس کتاب مبین کو عربی زبان کا لباس پہنا کر عربی قرآن اسلئے بنادیا ہے کہ تم عقلمند بن جاؤ۔ ان آیاتِ الٰہی کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیئے بیحد غور و خوض درکار ہے لیکن صفحہ ۹ کے تحت المتن سے جو علم طبقات الارض کے متعلق ہے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ "الکتاب المبین" دراصل صحیفۂ فطرت ہی ہے۔ اور اسکو مبین اسلیئے کہا گیا ہے کہ ہر شخص کے پیش نظر ہے۔ اگر اِس مفہوم کو تسلیم کرلیا جائے تو آیات (۴۳: ۲-۳) کے معانی صاف ہوجاتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

> "لوگو! صحیفۂ کائنات جو تمہاری نظروں کے سامنے روشن اور عیاں ہے اس امر کی گواہی دے رہا ہے (وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ) کہ ہم نے اِس کارگاہ اکبر کے تمام پوشیدہ قانون کا ترجمہ سہل الفہم اور عربی اللسان قرآن میں اسلئے کردیا ہے (جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا) کہ تم اسکے رازوں کو سمجھکر ہوشمند بن جاؤ (لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ)۔ (گویا اسلام دین فطرت ہے اور قرآن کریم صحیفۂ فطرت کے قانون کا لُب لباب ہے۔)

حکمائے مغرب نے بھی جریدۂ فطرت کو کتاب سے تشبیہ دی ہے اور اسکا شمار ایک کتاب کے معرفت خدا کے نکات اور معلومات عالیہ سے پُر ہونا تسلیم کیا ہے۔ اور دراصل یہی وہ عظیم الشان کتاب ہے جو خدائے عظیم نے خود اپنے ہاتھوں سے مرتب کی ہے۔ اعمال خدا کے اسرار و حقائق کے متعلق اِس سے روشن تر کتاب کا ملنا قطعاً غیر ممکن ہے بشرطیکہ اسکا صحیح مطالعہ ہوسکے۔ لیکن اِسکا صحیح مطالعہ کرنا آسان کام نہیں۔

آگے چلکر "الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ" کے اِن معانی کی حیرت انگیز شہادت قرآن کریم کی مختلف آیات سے ملیگی۔ یہاں صرف مطالب کو قابل فہم بنانے کی غرض سے پیش از وقت متنبہ کردیا گیا ہے۔ رہا اِس بات کو پایۂ ثبوت تک پونہچانا کہ قرآن کا قانونِ عمل کسقدر صحیفۂ فطرت کے قانون کا ہُو بہو عکس ہے، اور کیونکر فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۳۰: ۳۰ صفحہ ۴) کا مصداق ہے اِسکی شہادت اصل کتاب میں جابجا ملے گی۔ البتہ نفس مطلب کی تائید اُن تمام آیات سے جو صفحہ ۵ پر "تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ" کے تحت المتن میں بیان ہوئیں بصراحت تمام ہوتی ہے جہاں "الکتٰب" اور "قرآن"

کی طرح اوہام پرستی اور خیال آرائی میں ماہر تھے۔ اُن کے مذاہب اور ادیان میں، اُنکی عبادات اور معاملات میں، اُنکی رسموں اور رواجوں میں تخیّل اور توہّم کا عظیم تر حصہ شامل تھا۔ اُن میں غیب دانی اور کہانت کا بکثرت رواج تھا۔ زود اعتقادی کی یہ حد تھی کہ عورتیں† بھی نبوت کا دعوےٰ کر کے قبائل سے بیعت کرالیا کرتی تھیں۔ قیافہ شناسی، تفاؤل و تشاؤم، تنجیم و تسخیر، امیسر و ازلام، سیمیا، وغیرہ وغیرہ ایسے اعتقادات واہیہ تھے جن پر صدیوں سے نہایت ایماندارانہ عمل چلا آتا تھا۔ ظن و قیاس سے واقعات کی

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۶۱) مُّبِيْنٍ (۵:۱۵) اور الْقُرْاٰنِ اور كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۲۷:۱) کے درمیان ظاہری شناخت قائم کر کے کتاب فطرت اور کتاب خدا کو ایک سمجھنے کا پر معنی اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن اسی مطلب کی ایک اور آیت بھی غور طلب ہے جس میں خود قرآن ہی کو کتاب مبین کا لقب دیا گیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے: قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (۵:۱۵)۔ "لوگو! تمہارے پاس خدا کی طرف سے یہ قرآن کیا آیا، گویا نور اترا ہے اور کتاب مبین اُتری ہے"۔ گویا قرآن اور کتاب مبین (یعنی صحیفۂ فطرت) ایک ہی شئے ہیں۔ لیکن ان معانی کی مزید شہادت اصل کتاب میں اپنے موقع پر ملے گی۔

اُلْكِتٰبُ الْمُبِيْنُ کے اِن معانی کے بعد دوسرا سوال یہ ہے کہ "اُمُّ الْكِتٰبِ" کیا شئے ہے۔ لیکن ادنیٰ سے تامل کے بعد یہ فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ اگر "الکتاب المبین" صحیفۂ فطرت کا وہ حصہ ہے جہاں تک انسان کے حواس ظاہری پہنچ سکتے ہیں تو "اُمُّ الْكِتٰبِ" لامحالہ تمام کائنات ہی جس کا ایک عظیم تر حصہ انسان کے دست قدرت اور علم سے قطعاً باہر ہے اور جس کا کامل علم لامحالہ اُس ذات باری کو ہے جس نے اسکو اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ اسی لیئے اسکو 'لَدَيْنَا' کہا گیا ہے اور چونکہ صحیفۂ کائنات ہی تمام علم و حکمت کا مخزن ہے اسلیئے اسکو "لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ" کا خطاب دیا گیا ہے۔ عوام کی زبان میں "اُمُّ الْكِتٰبِ" کو مفسرین نے "لوح محفوظ" کہا ہے لیکن اگر نظر عمیق دیکھا جائے تو یہ صحیفۂ کائنات ہی وہ عظیم الشان کتاب ہے جو لاکھوں اور کروڑوں برس سے محفوظ ہے۔ اسی کے اندر خدا کا علم، اسکا قانون، اسکی حکمت چھپی پڑی ہے۔ وہ اس کے علاوہ کوئی بڑی لمبی چوڑی مجلد نہیں جو ملا کی زبان میں ساتویں آسمان پر عرش خدا کے کنارے پر رکھی ہے اور جس کی لمبائی چوڑائی آسمان و زمین کے برابر ہے"۔ اس نکتے کو پیش نظر رکھکر آیہ (۴۳:۴) کے مطالب صاف ہو جاتے ہیں: "اور یہ قرآن عظیم اس صحیفۂ کائنات کے عالم آرا قانون کا ایک جزء ہے (وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ) جو ہمارے پاس رہتا ہے (لَدَيْنَا) اور جو ایک بڑے پائے کا قانون (لَعَلِيٌّ) ہے اور حکمت سے پر ہے (حَكِيْمٌ)"۔ جب دین اسلام کے نزدیک خدائے عزوجل کے وجود کو انسان کی شکل و صورت سے قطعاً کوئی مماثلت نہیں تو خدا کی بنائی ہوئی اُم الکتب بھی کاغذ کی بنی ہوئی انسانی کتابوں سے اصلاً مختلف ہونی چاہیئے۔

† زمانۂ جاہلیۃ کے اہل عرب کے نزدیک کہانت اور نبوت میں بہت کم فرق تھا۔ سب وہ لوگ جو آئندہ یا گذشتہ واقعات پر اطلاع رکھنے کا دعوےٰ کرتے تھے کاہن کہلاتے تھے۔ جو اس کے علاوہ شعبدہ بازی اور عجائبات دکھلانے کا ادعا کرتے نبی کہے جاتے تھے۔ چنانچہ ان شرائط کو بزعم خود پورا کرنے والے افراد ہر قبیلے اور قریے میں موجود تھے۔ انمی، جذیمہ ابرش، اسود عنسی، ابن ابی سرح، مسیلمہ، وغیرہ وغیرہ چند مشہور کاہنوں اور نبیوں کے نام ہیں۔ ایک مشہور عورت سجاح بنت حارث نے جو قبیلۂ تمیم کی شاخ بنی یربوع سے تھی رسول خدا کے زمانے میں نبوت کا دعوےٰ کیا مگر مسیلمہ کے بالمقابل ایک مدت تک اسکا زور نہ چل سکا۔ رسول خدا کی وفات کے بعد پھر اسی عورت نے جزیرۂ بنی تغلب میں نبوت کا دعوےٰ کیا اور بنی تمیم کو اپنا حامی بنا کر اسلام کے لیئے ایک مستقل خطرے کی صورت پیدا کر دی۔ اسلام سے پہلے بھی ایسی کاہنہ عورتیں عرب میں ظاہر ہوئیں اور خلق خدا کو اپنے تابع کر لینے میں چند لمحوں تک کامیاب ہوتی رہیں۔ تفاؤل اور تشاؤم کا رواج بھی اہل عرب میں اسلام سے پہلے انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا۔ عرب کے اِن اعتقادات واہیہ کا بقیہ ابھی تک عالم اسلام کے اندر استخارے اور پیشگوئیوں کے شرعی تقدس میں رونما ہے۔

پیش بینی، اور غیر متعلق واقعات کو ذات پر محمول کر لینا اُنکے خمیر میں داخل ہو گیا تھا۔ من گھڑت روایات اور آبائی مزخرفات کا ایک عظیم الشان طومار اُن کا علم ادب بلکہ اخلاقی ضابطہ بن گیا تھا۔ فصاحت اور شعر گوئی کا یہ عشق و ولولہ تھا کہ عین میدان جنگ میں، سفر و حضر میں، خطابات اور مناظرات بلکہ عالم خواب† میں، رجز و سجع بے تأمل کہہ دیتے۔ ظہور اسلام سے پیشتر بیسیوں برس تک، فصاحت کے یہ جنونی امرأ القیس، زہیر، لبید بن ربیعہ وغیرہم کے مُعلقات السبع کے سامنے فی الحقیقت ماتھا رگڑتے رہے، اور مُجمہرات اور منتقیات السبع‡ کے مصنفوں کو اپنے تخیل اور فصاحت حتیٰ کہ اعمال و اعتقادات کا سچا رہنما مانتے رہے۔ صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان تمام مراسم شنیعہ کو جہنم کا شعلہ اور غضب الٰہی کی آگ دکھا کر یک قلم معدوم کر دیا۔ تمام مذاہب و ادیان ملیامیٹ ہو گئے؛ توہم پرستی قطعاً جڑ سے اُکھڑ گئی۔ کہانت اور نبوت کے متعلق سب فوق الفطرۃ عقائد اور دعاوی قرآن کے ایک ادنیٰ اشارے سے باطل ہوتے گئے: اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ[۱] (۷: ۱۸۴)؛ نجوم پرستی اور سحر کے تمام شعبدے بیکار ہو گئے؛ قرآن کی روشن اور نمایاں حقیقت کے سامنے کذب و دروغ سب فنا ہو گیا؛ وَقُلْ جَاۗءَ الْحَقُّ

---

۱ کیا ان لوگوں نے اس بات پر کبھی غور نہیں کیا کہ اُنکے پیشوا (یعنی رسولِ خدا) کے اندر کوئی جن تو ہے نہیں۔ وہ کوئی پاگل تو ہیں نہیں کہ اُن کی بیہودہ اور اَن ہونی فرمائشیں قبول کرتے پھریں۔ وہ تو صرف کھلم کھلا اور صاف طور پر عذاب خدا سے ڈرانے والے ہیں۔ المبین۔

---

† عالم خواب میں شعر کہنے کے متعلق اہل عرب کی بعض روایتیں مشہور ہیں جن کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں۔

‡ مُعلقات کے سات قصائد مشہور ہیں۔ ان کے مصنف امرأ القیس، زہیر ابن ابی سلمیٰ، حارث بن حلزہ، لبید بن ربیعہ، عمرو بن کلثوم، طرفۃ بن العبد، اور عنترۃ بن شداد ہیں۔ "مجمہرات" بھی سات قصیدے تھے جو نسبتاً کم مشہور ہیں۔ نابغہ ذبیانی، عبید بن الابرص، عدی بن زید، بشر بن کازم، امیۃ بن ابی الصلت، خداش بن زہیر، نمر بن تولب العکلی، ان قصائد کے مالک تھے۔ "منتقیات" تیسرے طبقے کے قصائد ہیں۔ جن کے مصنف مسیب بن علس، مرقش بن جریر، مرقش الاصغر، عروۃ بن الورد، صید بن صخر، مہلہل بن ربیعہ، اور عثمان بن سوید تھے۔ یہ سب شعراء اکثر زمانۂ جاہلیت ہی کے تھے۔ معلقات کے سات قصائد خانۂ کعبہ کی دیواروں پر لٹکتے رہتے تھے۔ لوگ ان کو آکر دیکھتے اور ان کے سامنے سجدہ کرتے۔ [illegible] فی طبقات الامم میں معلقات پرستی کی مدت ڈیڑھ سو برس لکھی ہے۔ مگر امرأ القیس کے عہد حیات (۵۳۰ء) اور ابتدائے اسلام کے زمانے (۶۲۱ء) کو پیش نظر رکھ کر اس مدت جاہلیت میں بہت کچھ مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ علماء میں بعض جدید محققین نے ان قصائد کے دیوار کعبہ پر آویزاں ہونے سے بھی یکسر انکار کیا ہے۔ اور معلقات کے تسمیہ کو حماد الراویہ سے منسوب کیا ہے۔ بہر نوع واقعات کچھ ہی ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان قصائد کی عرب میں خاص عزت تھی اور کوئی نظم ان کے بالمقابل قدر و قیمت میں ٹھہر نہ سکتی تھی۔

وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا[۱] ○ (۱۷: ۸۱)۔ فصاحت کے طاقتور اور فساد انگیز طلسم کو توڑنے کے لیے کلامِ الٰہی نے اپنے بے ارادہ زورِ کلام سے ہی خاموش مگر ترکی بہ ترکی جواب دیکر عرب کو ہمیشہ کے لیے دم بخود کردیا۔ معلقات کی پرستش از خود ماند پڑگئی۔ عرب کی طاقت گویائی گویا اچک لی گئی۔ مگر ساتھ ہی عرب کے اس مالیخولیائی وصف کی علانیہ تکذیب و توہین کے ارادہ سے، اور کتاب الٰہی کی حیثیت کو شعر و فصاحت سے بے انتہا بلند تر جتلانے کیلئے، شارع اسلام نے شاعروں کو اللہ کے رستے سے بھٹکے ہوئے، وہم و گمان کی وادیوں میں سرگردان، جھوٹے اور سفتری قرار دیا۔

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ○ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ○ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ○ (۲۶: ۲۲۴-۲۲۶)

اور جیسا کہ عرب خیال کرتے ہیں رسولِ خدا شاعر بھی نہیں۔ شاعر تو خود گمراہ ہوتے ہیں اور گمراہ لوگ ہی اُنکے پیچھے لگتے ہیں۔ کیا تو نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ وہ عالم وہم و خیال کے ہر میدان میں پڑے بھٹکتے ہیں اور اکثر اپنے بارے میں فخر کے طور پر وہ کچھ کہتے ہیں جو کبھی کرتے نہیں۔

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ[†] وَمَا يَنْبَغِي لَهُ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُبِينٌ ○ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ ○ (۳۶: ۶۹-۷۰)

اور ہم نے رسولِ خدا کو کچھ شاعری تو نہیں سکھائی اور نہ شاعری اُنکی شان ہی کے لائق ہے۔ یہ قرآن تو نری نصیحت ہی نصیحت ہے، ہاں البتہ واضح کتاب ہے۔ اور اسکے مُبین ہونے سے مقصود یہ ہے کہ باحس اور بیدار لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرائے اور ساتھ ہی منکروں پر ہمارے عذاب کی دھمکیاں برحق ثابت ہوں۔

---

[۱] اور کہدو کہ اب حق آگیا اور باطل نیست و نابود ہوگیا۔ اور فی الحقیقت اُس نے تو ایک نہ ایک دن مٹنا ہی تھا۔

[†] اس آیت میں اور ایسی کئی موقعوں پر جن کی تفصیل آگے آئے گی مخالفین نے قرآن کو شعر کہا ہے۔ حالانکہ قرآن موجودہ معانی میں شعر نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ موزوں نہیں، بلکہ تمام کا تمام مقفّیٰ بھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب ہر اُس شئے کو جس میں لطافت بیان ہو، ایجاز و اختصار ہو یا جسکی عبارت مقفّیٰ ہو، بلالحاظ وزن شعر کہا کرتے تھے۔ فصاحت کا معیار بھی اُن کے نزدیک یہ تھا کہ خوبیٔ مضمون کے ساتھ ساتھ الفاظ خوش اسلوبی سے پیوست کیئے گئے ہوں، ان میں ترنم ہو، مطالب سادہ اور دلچسپ ہوں، ان میں غیر ضروری ثقل نہ ہو، لیکن وزن کا ہونا یا نہ ہونا ضروری نہ تھا۔ اسی بنا پر اہل عرب سجع، رجز، خطبات، مناظرات اور قصائد سب کو شعر میں داخل سمجھتے تھے۔ اور چونکہ ایں قطع کے شعر کا جزو اعظم ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ انسان کے سفلی اور سطحی جذبات یا صرف سامعی محسوسات کو برانگیخت کرتا ہے، اور باطنی تربیت اسمیں مدّ نظر نہیں ہوتی، اس لیئے قرآن کو اپنے متعلق ایسی فصاحت کے معترف بننے میں چڑ تھی۔ اسی نقطۂ نظر سے قرآن نے جابجا شعر ہونے سے انکار کیا ہے اور اسی لحاظ سے وہ فصیح

اِن اعتقادی خرابیوں سے قطع نظر، عرب کا سب سے نمایاں اور مہلک عیب اُن کا باہمی انتشار اور **نفاق** بھی تھا۔ سب قبیلے ایک دوسرے کے خلاف آمادۂ جدال رہا کرتے تھے، بغض وحسد اُن میں کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا، سب کی سب کچھ رسم وراہ نہ رہی تھی، اُن کی ذاتی اور پشتینی عداوتیں تھیں، حریفانہ کاوشیں اور خاندانی رنجشیں تھیں، حسب ونسب کے فخریہ جھگڑے، اور بداعمالی کے اِدعائی

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۶۴) نہیں۔ تعجب ہے کہ باوجود اس صریح اور پے در پے انکار کے آج مسلمانان عالم قرآن کو انہی معنوں میں فصیح مانتے ہیں جن سے اُسکو عمداً احتراز ہے۔ قرآن کے تمام طول وعرض میں اسکی فصاحت کے متعلق ایک حرف کہیں موجود نہیں،[۵۱] نہیں بلکہ فصاحت کا لفظ بھی سوا قولِ موسیٰ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا (۲۸: ۳۴) کے جو حضرت ہارونؑ کے متعلق استعمال ہوا ہے کہیں نظر نہیں آتا! آیندہ اوراق میں اِس امر کے متعلق توضیح کر دی جائے گی، لیکن قرآن کے فصیح فی البیان ہونے کا مہلک اور شرمناک تخیل مسلمانوں کی ہر رگ وپے میں اسقدر سرایت کر چکا ہے کہ اب اِس کتاب عظیم کی اور کوئی خوبی اُن کے وہم وگمان میں بھی نہیں آتی۔ اگر فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ[۵۲] (۲: ۲۳) کی صلائے عام جو خدا نے قرآن حکیم کے متعلق جا بجا دی ہے، فی الحقیقت اسکی فصاحت، اسکی شاعریت، اسکے صنائع اور بدائع کی خوبیوں کے متعلق ہے، اور اس کتاب جلیل کی عالم آرا حکمت، اُسکے ناپیدا کنار علم، اسکی حیرت انگیز **صداقت** اور بے نظیر ہدایت سے اِس دعوے کو چنداں واسطہ نہیں، تو آج ابو القاسم حریری کے مقامات کا ایک ایک ورق، یا امرأ القیس ابن حجر کے قصائد کا ایک ایک بیت ان انسانی کمزوریوں اور تکلفات، اِن خود ساختہ تُرّہات اور لغویات سے اسقدر پُر ہے کہ قرآن کی عبارت اُن کے بالمقابل حتماً نہیں ٹھیر سکتی۔ اگر فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ[۵۳] (۱۱: ۱۳) سے صاحب القرآن کی مراد فی الحقیقت یہی تھی کہ برجستہ الفاظ اور چست بندشوں، یا قوافی اور استعاروں کی مناسبت میں اِسکا اَدَبی مقابلہ کیا جائے، اور دین اسلام کو کسی اہل زبان اُمّت کے لغو شاعروں کا اکھاڑہ بنا کر خدائے زمین وآسمان کے دقیق سلیم کی داد (العیاذ باللہ) دلوائی جائے، تو آج مسیلمہ کذاب کا افترا کیا ہوا "قرآن" بھی جس کی چند پریشان آیتیں کہیں کہیں ملتی ہیں، محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لائے ہوئے قرآن سے کسی اسلوب میں کم نظر نہیں آتا، کیونکہ اُس مفتری علی اللہ کی سحر بیانی نے بھی آخر انہی عرب قبائل کی ایک تعداد کثیر کو عین صدر اسلام میں برسوں تک گم سجود کر رکھا تھا جو خوش اعتقاد مسلمانوں کے قول کے مطابق اِس سے پیشتر قرآن کی اَدبی خوبیوں پر مرمٹے تھے! فرق اگر آج زمین کے طول وعرض میں پھیل کر سا کنان عالم کے لیے مشعل نور ہدایت بن گیا ہے، اور مسیلمہ کا تمام قافلہ لُٹ کر پیوند زمین بن چکا ہے، تو اسکی وجہ یہ نہیں کہ قرآن کی زبان علمائے ادب کے اُن رسمی قواعد کے رو سے بہتر ہے جن کو خود انسان ہی نے وضع کیا، نہ اس لیے کہ مالک زمین وآسمان اور بادشاہ ارض وسما نے بادشاہ ہو کر بھی پیمبرِ انسان کے اسالیب بیان کا بہترین تتبّع کیا ہے، بلکہ اِس لیے کہ یہ تصنیف جلیل **کلام ملوک** میں وہ **ملک الکلام** ہے جس کی حکمت اور حقیقت جس کا علم وفضل، نور وہدایت سب انسانی تصانیف سے حتماً بالاتر ہے! یہ ناپیدا کنار علم کا مخزن تھا ہی وہ مات کن فضیلت تھی جسکے آگے مغرور سے مغرور گردنیں جُھک گئی تھیں، جس کے سامنے بادشاہوں نے گردن خم کر دی تھی، عرب اور عجم سب دم بخود ہو گئے تھے، عمرؓ (رضی اللہ عنہ) سا اَنموڑ اور سخت گیر دشمن مُڑ گیا تھا، **ابو سُفیان** نے بالآخر توبہ کر لی تھی، اور آج بھی اگر قرآن عظیم سے دل میں باغی اور منہ سے مُنقر مسلمان اسکے آگے از سرِ نو گردن اطاعت خم کر سکیں گے تو اسکی شاعرانہ حیثیت کو دیکھ کر نہیں، بلکہ لامحالہ اسکے علم ہی کے قائل ہو کر کرینگے! سورۂ ہود میں ہے (باقی)

---

۵۱ وہ یعنی ہارونؑ مجھ سے زیادہ اپنے کلام میں فصیح ہے۔ ۵۲ تو اس قرآن جیسی ایک سورۃ تو کہیں سے لے آؤ۔ ۵۳ تو اسی طرح کی من گھڑت دس سورتیں تم بھی بنا لاؤ۔

اعلان تھے، ذاتیات پر بے اندازہ فخر و طعن تھا۔ اس بنا پر اُن کے درمیان ادنیٰ سی بات پر نارِ حرب مشتعل ہو جاتی تھی۔ پھر ان خانہ زاد لڑائیوں میں قبیلوں کے قبیلے اپنی بسالت اور تہور، اپنے شرف اور تفاخر، اپنے نعرہ عمل کے جوہر دکھانے کے لیے شوقیہ مل جاتے تھے۔ پھر خود نمائی اور نفس پسندی کی آن اکثر اوقات اس حد تک نمایاں ہو جاتی تھی کہ برسوں کے مقاتلے اور انتہائی کشت و خون کے باوجود مصالحت کا نام زبان پر لانا بے غیرتی میں داخل تھا۔ ہادیٔ اسلام نے اس ہلاکت انگیز معاشرت کو حکومت خدا اور

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۶۵) أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ (۱۱: ۱۳-۱۴)

کیا قرآن کے منکر کہتے ہیں کہ محمدؐ اسکو اپنی طرف سے گھڑ لایا ہے۔ انہیں کہدو کہ ہاں تم بھی ایسی ہی گھڑی ہوئی دس سورتیں لے آؤ، اور اگر تم اس الزام دہی میں سچے ہو تو خدا کو چھوڑ کر تمام دنیا جہان کے لوگوں کو، جہاں تک تمہاری طاقت ہو، مدد کے لیے بلاؤ کہ تمہاری بنائی ہوئی سورتیں مقابلے میں پوری اُتر سکیں۔ پھر اگر لوگ اس پر بھی تمہاری اس دعوت کو قبول نہ کریں تو جانے رہو کہ یہ قرآن عظیم اس خدا نے زمین و آسمان کے علم کو اپنے ساتھ لیکر اُترا ہے (أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ) اس شارع کائنات کی ناپیدا کنار حکمت کا امین ہے اور وہ علیم بے مثال ہے جسکے مثل کوئی دوسرا خدا نہیں (وَأَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ) تو کیا تم اس ناممکن الحصول فضیلت کو پیش نظر رکھکر اسکو کتاب خدا تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو!

خدائے زمین و آسمان معاذ اللہ کوئی شاعر نہ تھا کہ لوگوں کو ادبی مقابلے کے لیے بلاتا، اس کی بڑی اور کارگر دلیل یہی ہے کہ انسان کا علم اسکے بالمقابل محض ہیچ ہے، یہی وہ شے ہے جو شاگرد کو اُستاد کے سامنے، محکوم کو حاکم کے حضور میں، جاہل کو عالم کے روبرو، مستفیض کو منعم کے آگے حتّٰی چپ کرا دیتی ہے: اسی کے ہوتے ہوئے کسی کو دم مارنے کا یارا نہیں ہوتا! اگرچہ بعثت رسولؐ کے زمانے میں تمام کا تمام عرب فصاحت کا شیدا تھا، اگرچہ عرب کو اپنی شاعری کے بالمقابل تمام دنیا گونگی نظر آتی تھی، تو بھی خدا پر اسکا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اور نہ اس موقع کو غنیمت جانکر (العیاذ باللہ) خدا اپنی فصاحت کو ظاہر کرنے کا اشتیاق رکھتا تھا۔ اُس پاک ذات نے اگر قرآن کو عربی زبان میں اتارا تھا تو محض اسلیے کہ عرب کی گمراہ قوم قانونِ خدا کو سمجھ جائے: إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ (۱۲: ۲) اسکے منشا کو اخذ کرے: إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ (۴۳: ۳) ان کا کوئی عذر باقی نہ رہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (۱۴: ۴) اُن کی بہانہ سازیاں معدوم ہو جائیں، انکو اس تشریح و تبیین کے بعد کسی اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے، اُن کے لیے باعث تذکیر و اعتبار ہو: فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝ (۴۴: ۵۸) مصدر امن و بشارت ہو: فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ۝ (۱۹: ۹۷) اس سے زیادہ قطعاً اور قطعیۃً کچھ نہیں۔ اگر مسلمانانِ عالم اسپر بھی کسی مضحکہ انگیز وہم میں گرفتار ہیں اور قرآن کو کسی عربی غزل گو یا ہندی تک بند کا مجموعہ نکات سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں اس کلام الٰہی کی عظمت و صداقت میں ذرہ کوئی فرق نہیں آتا۔

اس میں شک نہیں کہ ہر وہ کتاب جس کا منشا علم و یقین کی طرف رہنمائی کرنا ہو، جو صدق نیت اور خلوص دل سے لکھی گئی ہو، جو سراپا راستی

---

۵۱ مطالب کے لیے دیکھو متن صفحہ ۶۰-۶۱ ۔ ۵۲ دیکھو متن صفحہ ۶۱ ۔ ۵۳ دیکھو تحت المتن صفحہ ۴۶ ۔ ۵۴ دیکھو تحت المتن صفحہ ۵۰ ۔ ۵۵ اے پیغمبر! ہم نے قرآن کو تمہاری زبان کا لباس پہنا کر محض اس لیے آسان کر دیا ہے کہ تم اس کے ذریعے سے خدا سے ڈرنے والی قوم کو خوشحالی کی خبر دو، اور عرب کی جھگڑالو اور نفاق پرور قوم کو عذاب خدا سے ڈراؤ۔

خوفِ احکم الحاکمین کے حلقۂ اثر میں لاکر کالعدم کر دیا۔ سب فرقہ بندیاں اور نفاق آرائیاں جڑ سے اکھاڑ دیں، صدیوں کے دشمن دوست کر دیئے، سینوں کی کدورتیں نکال پھینک دیں، دلوں سے کینے یکسر اُچک لیئے، اور اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹-۱۰) کا لشکر انگیز فرمان بارگاہِ خداوندی کے ہاں سے دکھلا کر چند برسوں کے اندر اندر محکوم اور شکست زدہ اہلِ عرب کو فرماں فرمائے عالمیان اور بادشاہِ وقت بنا دیا!

یہ سب کچھ اسلام اور قرآن کا ناقابلِ انکار معجزہ تھا مگر عرب کی جبلت اور طینت کو کون بدل سکتا تھا؟ وہ عادتیں اور خاصیتیں جو اُن کی فطرت میں ہزار در ہزار برس پہلے سے چلی آتی تھیں کس طرح چشم زدن میں اُنسے رخصت ہو کر اپنا نقش پا نہ چھوڑتیں؟ وہ ملّی اوصاف جو قرنوں اور صدیوں پہلے اُنکی مٹی میں خمیر ہو چکے تھے، اُن کے طبعی میلانِ کار کو کیسے بے اثر چھوڑ دیتے؟ قرآن کی قاطع الظن اور متحد الاعمال تعلیم کی فدایانہ تعمیل میں عرب اپنی ظاہری عبادات اور رسومات کو بدل سکتے تھے، اپنی آبائی روایات اور اعتقادات کو بادی النظر میں چھوڑ سکتے تھے، اپنے داخلی مناقشات اور قبائلی تنازعات کو علی رؤس الاشہاد محو کر سکتے تھے، بلاغت اور فصاحت کے ذاتی اِدعا کو بھی طوعاً و کرہاً خیرباد کہہ سکتے تھے، مگر طبائع کے باطنی رُجحان اور اصلی طریقِ تخیل کو ہرگز نہ بدل سکتے تھے اُنکا مسلک وہم و خیال یونان کی قدیم وہمی روایات سے ہزارہا سال قدیم تر تھا۔ اُنکی قبائلی زندگی کی بُنیاد روزِ آفرینش سے اِسی انداز پر چلی آتی تھی۔ وہ اِسی وہمی اور اعتقادی ماحول کے بگڑے ہوئے طفلک، اور اِسی فرقہ آرائی اور انتشار کے کُہنہ مشق استاد تھے۔ اِس بنا پر اُن میں کسی حقیقت کشا علمی صداقت یا عافیت انگیز

لہ ایمان والے تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

(تتمہ تحت المتن صفحہ ۶۶) اور حقیقت پر مبنی ہو، جیسی واقع الامر کی تائید اور صراطِ مستقیم کی تاکید ہو، جس کا منتہائے نظر انسان کو امن کا راہ راست دکھانا اور اجتماعی ہلاکت سے حتی الوسع بچانا ہو، ہر ایسی کتاب خود بخود اپنے زورِ بیان کے باعث، اپنی صداقت اور عُمقِ نظر کی وجہ سے بلیغ بلکہ بسا اوقات فصیح بھی بن جاتی ہے، لیکن اِس بلاغت اور فصاحت کا شاعرانہ تکلف اور آورد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اِنہی معنوں میں قرآن حکیم بھی بلیغ ہے جیسا کہ آگے چلکر جا بجا واضح ہوگا۔

بہر نوع محولہ بالا آیات سے ظاہر ہے کہ قرآن حکیم کے متعلق شاعرانہ فصاحت کا دعوےٰ سراپا اہلِ عرب یا مسلمانانِ عالم ہی کی ایجاد ہے۔ صاحب القرآنؐ کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

معاشرتی آئین کا معناً اور اصالۃً رائج ہو جانا ازبس متعذر تھا۔ اِسی قطع کی ایک متفرق اور اوہام پسند نوحؑ کی قوم، اِن سے صدہا برس پیشتر، اپنے ضعف ایمان اور طغیان کے باعث غضب الٰہی کے تنور میں دردانگیز طور پر غرق ہو چکی تھی؛ (سورۂ ہود ۱۱: ۲۵-۴۹)؛ اِسی جزیرۃ العرب کے ایک حصّے میں عادؔ و ثمودؔ کی احکامِ الٰہی سے متذبذب اور آیاتِ خدا کی مکذب قومیں بالآخر اللہ کے عذاب غلیظ اور صیحہ سے دوچار ہوئی تھیں (سورۂ ہود ۱۱: ۵۰-۶۰)؛ اسی دیار کے بسنے والے اصحاب مدین، صدیوں پیشتر کم وزنی اور شرک کرتے کرتے غضب الٰہی کی چیخ کے شکار ہو گئے تھے (سورۂ ہود ۱۱: ۸۴-۹۵)؛ اور وہ دراصل اسی مٹی میں رہنے والے وہم زدہ لوگ، اور قریب قریب اِسی آب وہوا میں پلے ہوئے فرقہ بند آدمی تھے جنہوں نے وادیٔ سینا میں موسیٰ علیہ السلام کی شریعت بیضا کو ہاتھ میں لیکر، اُسکی غیبت میں، اپنی پُرانی عادت کے مطابق اللہ سے انکار، اور بچھڑے کی پرستش شروع کر دی تھی (سورۂ اعراف ۷: ۱۴۸-۱۵۴) نہیں بلکہ وہ انہی عرب کے ہم اصل (سامی) اور قریب النسل (عبرانی)، ہم مشرب اور ہمسائگت میں رہنے والے بھائی بند تھے جنہوں نے حکومت، فارغ البالی، زرخیز زمینوں، معتدل آب وہوا، چشموں اور نہروں اور انواع واقسام کے طیبات رزق کی بے قدری کر کے بالآخر ذلّ و مسکنت کی وہی پُرانی طرز معیشت کو پسند کر لیا تھا؛

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّاۗىِٕهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۭ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ۭ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّـبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ (۲: ۶۱)

اور اے بنی اسرائیل! کیا تمہیں وہ وقت یاد ہے جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ اے موسیٰ! اب تو ہم ایک ہی قسم کے ان اچھے اچھے کھانوں لو اس سرزمین کے شکار وغیرہ سے تنگ آ گئے ہیں تو آپ ہمارے لیئے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ شیرینی درخت ملخ اور بٹیر (من و سلویٰ) کی بجائے ہمارے لیئے زمین سے جو چیزیں اُگتی ہیں، یعنی ترکاری اور ککڑی، گیہوں اور مسور اور پیاز، پیدا کرے۔ موسیٰ نے کہا کیا تم فضیلت اور خوبی کے اِس مقام نصیب کو چھوڑ کر محکومیت اور افلاس کی ادنیٰ معاشرت کو پسند کرتے ہو۔ اچھا تو یہاں سے کسی متمدن شہر کو چل پڑو جہاں کی حاکم قوم تم کو

> فلاحت اور زراعت میں لگادے گی، اور تم کو وہی کچھ مل رہے گا جو مانگتے ہو۔ پھر ان پر ذلت اور محتاجی لیس دی گئی اور وہ خدا کے قاہر کے غضب میں آگئے؛ یہ سب اِس لیئے کہ اُنھوں نے خدا کے مستعد کرنے والے احکام سے غفلت برتنی شروع کردی تھی، اور رُسل کو ناحق قتل کیا تھا، اور نیز اِس لیئے کہ اپنے امیر جماعت کی نافرمانی کی تھی اور کاہلی، کام چوری، اور نا قدر شناسی میں حد سے زیادہ تجاوز کیا تھا۔

صدرِ اسلام کے اہل عرب نے بلاشبہ صاحبِ شریعت کی زندگی میں ہی کلام الٰہی کے آگے سربسجود ہوکر اپنا سارا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا؛ وہ سارے کے سارے ایک اقل قلیل مُدت میں ماسوی اللہ کے قطعی منکر، اور خدا اور رسول کے قطعی مطیع ہوگئے تھے؛ قرآن اُن کا واحد منتہائے عمل، اور کتاب خدا اُنکی ایک جا لا نگاہ نظر بن گئی تھی؛ اُسکے محض ابتدائی اصول پر بے دھڑک اور بلا تامل عمل کرنیکے شکرانے میں منعم لم یزل نے دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت، اور زمین کی وسیع ترواثت اُن کو سپرد کردی تھی؛ وہی نہروں والے جنات جنکا وعدہ، بادی النظر میں خدا نے آخرت میں کیا تھا، قرآن کے مبادیات اور ایمان کے حرف اول پر بیچا با عمل کے عوض میں اُن کو اس دنیا میں ہی مل گئے تھے؛ اُن کے مشعلستانِ ایمان دل، اور محشرستانِ عمل جگر، اُن کو چند برسوں† میں ہی سمندروں کے پار، عراق عرب کے میدانوں، افریقہ کی تپتی ہوئی ریتوں، اور اُندلس کی خوشگوار چوٹیوں پر لے گئے! یہ سب کچھ اہل عرب کی بےنظیر خوبیوں کا ایک منظر تھا مگر جب زمین کی بادشاہت مل گئی، اور امن کے لانات حاصل ہوگئے تو سلطنت کے تمکن و استقرار کیلئے قرآن میں استدلال اور اجتہاد ناگزیر ہوگیا، عرب کی مختصر سیاسیات میں توسیع اٹل نظر آئی؛ تب اسلام کے یہ جاں باز

† ایک مورخ نے تخمینہ لگایا ہے کہ رسولِ خدا کی وفات (سنہ ۱۱ھ سنہ ۶۳۲ء) کے بعد بارہ برس کی مدت میں (گویا فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت کے اختتام (سنہ ۲۳ھ سنہ ۶۴۴ء) تک) مسلمانوں نے چھتیس ہزار شہر اور قلعے اپنے قبضے میں کر لیئے تھے۔ چار ہزار بتخانوں اور ہیکلوں کو اپنے تصرف میں لاکر مسجدوں میں تبدیل کیا۔ گویا اسلامی افواج کی اوسط رفتارِ تقدم مسلسل بارہ برس تک یہی کہ ایک دن میں نو شہر یا قلعے سر کرلیتے تھے، جو آج کسی قاہر سے قاہر یورپی فوج کے لیئے ازبس متعذر ہے۔ خود المانیہ، اپنی ناپیدا مثال جُندیت کے باوجود، حال (یعنی سنہ ۱۳۳۲ھ سنہ ۱۹۱۴ء) کے محاربہ عظمیٰ میں اس تقام کے عُشرِ عشیر تک بھی نہ پہنچ سکی۔ اور یوں تو دول یورپ کے برخلاف جارحانہ تقدم چند مہینوں تک قائم رکھنا بھی اسکے لیئے بالآخر پیام موت بنکر رہا۔ حضرت عمرؓ کے مقبوضہ ممالک کا رقبہ بائیس لاکھ مربع میل تھا۔ ہجرت کے ایک سو برس بعد تک مسلمان پرانی دنیا کے تینوں بر اعظموں میں پھیل گئے، ایشیا میں وسطِ ایشیا تک کی حدود اُنکے ایک طرف، اور یورپ میں فرانس کے جنوبی اور وسطی میدان دوسری طرف تھے، افریقہ کا تمام شمالی علاقہ بھی اُنھی کے دست قدرت میں تھا، گویا ماسوا روم الکبریٰ کی سلطنت کے قریب قریب سب مہذب دنیا پر ان کا تسلط ایک صدی کے اندر اندر ہوگیا تھا۔

فدائی جو اپنے تمدن کی تمام اگلی روایات اور کلیات کو خدا کی راہ میں متروک کر چکے تھے، اسکے دقیق مطالب کی طرف متوجہ ہونے لگے، کچھ عرصہ قرآن کی جمع و ترتیب میں صرف ہو چکا تھا، کچھ اور تصریف کتابت میں خرچ ہوا، نقاط اور حرکات ایجاد کی گئیں[1]، مگر اعراب کے استعمال سے معانی کی نوعیت کے متعلق ایک علیحدہ اور انوکھا اجتہاد قائم ہونا شروع ہوا، عرب اپنی وہبی عنقا آرا، اور مجادلانہ طبیعت سے مجبور ہو کر اس جد و جہد میں ہمہ تن مصروف ہو گئے، تلفظ کی زیروں اور زبروں اور اختلاف معانی پر تراکیب الفاظ اور تغیرات عوامل پر مستقل مناظرات ہونے لگے، کوفے اور بصرے میں نحویوں کے دو مقتدر اور متخالف گروہ قائم ہو گئے۔ اِن فساد آفرین مجادلوں میں، تلاش سند کے بہانے سے، عرب قبائل کی مختلف لغات اور جاہلیہ کا سارا علم ادب مدون ہو گیا، راویوں کی مختلف جماعتیں جاہلی اور مخضرمی شعرا کے رطب و یابس سب ابیات اور قبائل کی جھوٹی سچی سب روایتیں پیش کرنے لگیں۔ لکو عرب کی ارباب ذوق، نازک اور ظنی طبیعتیں قرأت کے سطحی اختلافات کی بھی متحمل نہ ہو سکیں، علما کا ایک پُر مغز گروہ اختلاف قرأت، رموز او قاف، اور ترتیل قرآن کی طرف لگ گیا۔ فصاحت و بلاغت کی ان مُہلک یا دہانیوں میں عرب جو اپنا بیشتر اعتقاد قرآن کی بے مثال فصاحت ہی پر رکھتے تھے، اور جو اپنی قادر الکلامی اور سخن شناسی سے کبھی منکر نہ ہوئے تھے، اِسی ناگوار اجتہاد کو اسلام کی بہترین خدمت سمجھنے لگے۔ شعر و سخن کی اِن دلدادہ طبائع، اور وہم و وسوسہ کی اِن مجبور فطرتوں میں کلام خدا کی محبت نے استدلال کی،

---

[1] قرآن کی مختلف سورتوں کی آیتوں کی داخلی ترتیب خود صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی زندگی میں کر دی تھی، مگر ایک مدت تک یہ سورتیں علی الحساب اہل عرب کے سینوں کے اندر محفوظ رہیں اور کتابت قرآن کا سوال پیدا نہ ہو سکا؛ غزوہ یمامہ کے بعد جب حضرت عمرؓ نے خلیفۂ اول کو توجہ جمع قرآن کی طرف دلائی تو صدیق اکبرؓ نے زید بن ثابتؓ کی وساطت سے قرآن کو جمع کیا۔ لیکن اس وقت سورتوں کی باہمی ترتیب کا خیال غالباً نہیں کیا گیا۔ خلیفۂ ثالثؓ (المتوفی ۳۵ھ ۶۵۶ء) کے عہد میں سورتوں کی مستقل ترتیب عمل میں آئی جو آج تک قائم ہے۔ پہلے پہل قرآن کی کتابت شاید حمیری خط میں تھی۔ پھر اس کے بعد کچھ تصرف کرکے کوفی خط کو لے لیا۔ بعد ازاں زیر، زبر، پیش، جزم، وغیرہ وغیرہ حرکات اور نقاط ایجاد کیے گئے۔ اور اس خط کو اور بھی ترقی ہوئی۔ پھر دوسری صدی ہجری کے اوائل میں جب مسلمانوں نے اندلس اور افریقہ کو فتح کر لیا اور ابو جعفر منصور نے ۱۴۵ھ ۷۶۲ء میں بغداد پر قبضہ کرکے اس کو علوم عربیہ کا مرکز بنایا تو خط بغدادی کی ابتدا ہوئی جو آج بعض اہم تبدیلیوں کے بعد ہر جگہ جاری ہے۔

بجائے الفاظ بینی اور ظاہر نوازی، اور اجتہاد کی جگہ خیال آرائی اور بلند پروازی از خود پیدا کردی؛ فصاحت پرستی صحیح معنوں میں از سرِ نو شروع ہوگئی؛ قرآن ہی سے ثابت کرنے کی ناروا کوشش کی گئی کہ انسانوں اور جنوں کا متفق گروہ بھی اُسکی ایک سورت جیسی فصیح و بلیغ "تصنیف" پیدا کرنے سے متعذر ہے[†]: ذمّا

---

† سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ (۱۷: ۸۸)

اے محمدؐ! تم علی الاعلان کہہ دو کہ اگر اس پہنائے عالم کے سب جنّ و انس بھی اس بات پر مجتمع ہو جائیں کہ اس قرآنِ عظیم کی مانند ایک دوسرا قرآن بنا لیں تو ہرگز اس جیسا نہ لا سکیں گے خواہ وہ ایک دوسرے کی مدد پر تُلے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں۔ (جن کی تشریح اپنے موقع پر آئے گی یہاں اس سے بحث نہیں)

یہاں ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی فصاحت یا عبارت آرائی کے متعلق ایک حرف نہیں کہا گیا۔ کیونکہ اگر مقابلہ فصاحت ہی میں تھا تو تمام دنیا کے جنّ و انس کو دعوت دینے کی کیا ضرورت تھی، صرف قادر الکلام اہلِ عرب ہی کو بلایا ہوتا جن کا مقابلہ کچھ معنی بھی رکھ سکتا تھا پس جب دعوت عام ہے تو موازنہ بھی لامحالہ کسی ایسی خوبی کا ہے جسکے متعلق ہر شخص حتی المقدور کچھ نہ کچھ غور کر سکتا ہے اور وہ خوبی علم حکمت یا ہدایت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔ اس امر کا تصفیہ کہ محوّلہ بالا آیت (۱۷: ۸۸) میں بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ کے الفاظ سے بعینہٖ کن معنوں میں مثیلِ قرآن کے ممکن نہ ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے، سورۂ انفال کی ایک اور آیت سے بھی ہوتا ہے جو اس لحاظ سے از بس معنی خیز ہے:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَاۤ ۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۸: ۳۱)

اور ان نابکار اہلِ عرب کے انکار کی یہ شان ہے کہ جب ہماری آیتیں انکو پڑھ کر سُنائی جاتی ہیں تو مقابل اُٹھتے ہیں کہ ہاں ہاں ہم نے محمدؐ کے قرآن اور اُسکے دعوئے پیمبری کی حقیقت کو خوب سمجھا (قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا) اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسی ہی بے سروپا اور بے فائدہ باتیں بنا لیں (لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا) اِن میں رکھا ہی کیا ہے، یہ تو وہی ڈھکوسلے ہیں جو اگلے لوگ ہم کو ہمیشہ سے سُناتے چلے آئے ہیں۔

یہاں ظاہر ہے کہ مِثْلَ هٰذَا کا اشارہ قرآن حکیم کے نفسِ موضوع اور مشمولہ حکمت اور ہدایت ہی کی طرف ہے جس کی منکرین عرب نے اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کہہ کر تخفیف کرنی چاہی ہے۔ اگر عربی اور لفظی خوبیوں کی طرف اشارہ ہوتا تو اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کے الفاظ بے موقع اور بے معنی تھے کیونکہ اساطیر کے لفظ سے غیر فصاحت کے معنی قطعاً نہیں نکلتے اور نہ اوّلین سے مراد پرانے اُدَباء اور فُصحاء کی جماعت ہے۔ انہی معنوں میں مِثْل کا لفظ سورۂ طور کے اندر واقع ہوا ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝ (۵۲: ۳۳-۳۴)

(کیا لوگ کہتے ہیں کہ محمدؐ اس قرآن کو اپنی طرف سے بنا لایا ہے۔ یہ تو ان کا محض ضد کے لئے ضد اور کٹ حجتیاں ہیں، اصل بات یہ ہے (بَلْ) کہ وہ سرے سے ایمان لانے کی نیت ہی نہیں رکھتے (لَا يُؤْمِنُوْنَ)۔ (کیونکہ ایمان لانے کے ساتھ ہی قرآن پر عمل کرنا اُن پر واجب ہو جاتا ہے) اور یہ اگر وہ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو اس جیسی ایک بات بھی تو لے آویں۔

یہاں بھی صاف طور پر قرآن کا مثیل شعر و فصاحت میں طلب نہیں کیا گیا بلکہ مقصود اسکے مضامین کو قدر و قیمت میں برتر ثابت کرنا ہے۔ اسکے شعر ہونے سے انکار تو آیتیں پہلے اسی سورۃ میں ہو چکا ہے: اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝ (۵۲: ۳۰) یعنی کیا لوگ رسولِ خدا کی نسبت کہتے ہیں کہ وہ تو محض ایک شاعر ہے (جس نے اپنے زورِ تخیل کے باعث چند خوشامدی پیدا کر لیے ہیں۔ اسکی واہ واہ تبھی تک ہے جب تک وہ زندہ ہے) اور ہم تو اس امر کے منتظر ہیں کہ موت کا حادثہ اُسکو آ دبوچے اور اسکی سب لن ترانیاں خاک میں مل جائیں۔"

هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۶۹: ۴۱-۴۳)

متن و عبارت کی خوبیاں، اور نطق کی گہرائیاں پیش نظر ہوتی گئیں؛ فصاحت کے عاشقوں کی ایک جماعت بلاغت کو مستقل فن بنانے میں مصروف ہوگئی؛ قرأت اور ترتیل کے موضوعہ اُصول کی بنا پر ادنیٰ سی دماندگی کے عوض میں، عرب و عجم سب کے لیئے، اللہ کی سرکار سے دردناک سزائیں مقرر ہوئیں۔ آہ! لیکن ان مجاز پرستانِ دین کو اس اعتنا و اہتمام کے باوجود یہ کہنے کی توفیق ہرگز عطا نہ ہوئی کہ قرآن کو ٹھیر ٹھیر کر پڑھنے کی حقیقی غایت خدا کے نزدیک صرف اس قدر ہے کہ اُسکی ایک ایک آیت کے مطالب عوام کے دلوں پر کالنقش فی الحجر ہو جاویں۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً ۚ كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ ۖ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ۝ (۲۵: ۳۲)

اور منکرینِ دین جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن سارے کا سارا ایک دم سے کیوں نازل نہیں ہوا تو نہیں کہہ دو کہ فی الحقیقت یہی مناسب تھا۔ کیونکہ ہم اس کے مطالب تمہارے قلب پر دل نشین کر کے تمہیں مطمئن کرنا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے ہم نے اسکو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُتارا۔

وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنزِيلًا ۝ (۱۷: ۱۰۶)

اور قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اس لیئے اُتارا کہ تم وقتاً فوقتاً مہلت کے ساتھ اُسے لوگوں کو پڑھکر سناؤ اور اسکے مطالب دلنشین کردو، اور اسی مصلحت سے ہم نے اُسے رفتہ رفتہ اتارا۔

---

۱ اور یہ قرآن کسی شاعر کا کلام تو ہے نہیں، افسوس کہ تم اسکی حقانیت پر بہت کم ایمان رکھتے ہو جو اسے قول شاعر قرار دیتے ہو۔ نہ یہ کسی کاہن کے ڈھکوسلے ہیں۔ افسوس تم اس سے بہت کم نصیحت پکڑتے ہو جو اسے ایسا سمجھتے ہو۔ یہ تو پروردگار عالم کی طرف سے اُترا ہوا کلام ہے۔

یہ تیسرا موقع ہے کہ قرآن کے شعر ہونے سے بصراحت تمام انکار کیا گیا ہے۔ ایک موقع ابھی ابھی صفحہ ۱۰۲ پر اور ایک صفحہ ۶۲ پر گذر چکا ہے۔

یہ آیہ جلیلہ صفحہ ۲۹ پر پہلے بھی آچکی ہے مگر اس جگہ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ کے مطالب کی تشریح نہیں کی گئی تھی۔ سورۂ ہود کے اخیر میں ہے:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ (۱۱: ۱۲۰)

اور یہ سب جو کچھ ہم تمکو اپنے گذشتہ پیغامبروں کے حال بیان کرتے ہیں، (اُنکی کامیابیوں اور دشمن کی ناکامیوں کی اطلاع دیتے ہیں) اس غرض و مطلب سے ہی کہ ہم تمہارے دل کو مضبوط کردیں، تمہارے عزم کو مصمم کردیں (مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ) قانونِ خدا کی ہیبت کو واضح کر کے تمہارے دل کو اُسکی صداقت کے بارے میں مطمئن کردیں (مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ) اور اس میں شک نہیں کہ تمہیں اس موضوع کے اندر ایک عظیم الشان حقیقت (الحق) منکشف کردی گئی ہو (جو تمہارے آیندہ طرزِ عمل کیلئے مفید ہوگی) اور علاوہ ازیں ایمان والوں کے لیئے بھی اس سورت میں نصیحت اور عبرت ہو!

حقیقت کی ماہیت سے یہاں بحث نہیں مگر یہ امر ظاہر ہے کہ نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ کے معنی دل کو مطمئن کرنے کے ہیں۔

............وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ (۷۳:۴)

اور قرآن کو خوب سوچ سمجھ کر پڑھا کرو۔

ظاہر پرستی کے ان لا انتہا اور شبانہ روز مشاغل کے باعث قرآن کے مطالب میں حقیقی تدبر محال تھا۔ اسلام کی دماغی قوت کا بہترین حصہ اس دردناک طور پر ضائع اور منتشر ہوتا گیا۔ قرآن کی درس و تدریس تمام عالم اسلام میں انہی اصول پر ہونے لگی۔ اس اثنا میں جمع و تدوین احادیث کے نئے نظریئے نے اجتہاد کا رُخ ایک اور ہی طرف بدل دیا۔ سینکڑوں محافظین دین تسلسل اور تواتر کے ناممکن اور غیر یقینی اجتہاد میں مصروف ہو گئے۔ راویانِ احادیث کے حسب نسب اور نامہ ہائے اعمال کی ایک نہایت وضعی مگر پُر از کار تحقیق شروع ہو گئی۔ احادیث کی صحت کا معیار اہل عرب نے پھر اُسی عقیدتمندی اور غلبۂ وہم کی بنا پر، کتاب الٰہی سے تطبیق یا کم از کم عدم تضاد کی بجائے رُواۃ کے ذاتی اعتبار کو قرار دیا۔ دینی اور خدائی معاملات میں ابن نا روا ارادت کا اظہار، اور نسیان کار انسان سے یہ عقیدتمندانہ سلوک عرب کی ظاہر پرستی اور ناحقیقت شناسی کی ایک اور دلیل تھی جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ قسم قسم کی احادیث، موقع اور مطلب کے نا بننے کے لیے معتبرین کے نام پر موضوع ہونے لگیں حتیٰ کہ اُن کی چھان بین محال ہو گئی، اور بے حد قیمتی وقت صرف ہوا۔ کلام الٰہی کے مطالب میں براہ راست اجتہاد اُسی قدر کم ہوتا گیا، اور ضمناً مسلمان ایک حسرت انگیز طریقے پر، قرآن کے ناقص اور غیر مکمل، مغلق اور غیر مشرح ہونے کے خاموش قائل ہو گئے![1]

درحقیقت اس تمام سطحی جدوجہد کے بروئے کار نہ آنے کی اصلی وجہ اہلِ عرب کا طریق تخیل تھا۔ عرب کی گذشتہ ہزارہا سالہ تاریخ میں اُن کا واسطہ تخیل کی دو ہی شقوں سے پڑتا رہا۔ شاعرانہ شق کی بنا پر انہوں نے قرآن کے ظاہری محاسن کو دیکھنا شروع کیا اور بالآخر اسکو کمال پر پہنچا دیا؛ عجیب و غریب رسمی علوم ایجاد کر کے اسکے صنائع اور بدائع کی مکمل تدوین کی، نفس قرآن کو ایک زیر و زبر کے اختلاف سے پاک کر کے

---

[1] احادیث کے معیارِ صحت کی حقیقت اور متعلقہ معاملات کے بارے میں ایک مبسوط بحث عنقریب تیسری جلد میں آئے گی۔

ابدالآباد تک انسانی تصرف سے محفوظ کر دیا۔ اور اسی شق کی بنا پر عرب نے قرآن کے باطن میں بھی استدلال شروع کر دیا تھا مگر چونکہ طبائع میں غیب کی باتوں سے الفت تھی، اور کہانت، وسواس، ظن، اور فرضیت کے عناصر غالب تھے اِس لیئے کتاب الٰہی کو کھولتے ہی اُن کا خیال ماہیت خدا، حقیقت نبوت، کیفیت وحی، ملائک، جنات، موت، مابعد الموت، بہشت و دوزخ وغیرہ وغیرہ، کی طرف مُعاً منتقل ہو گیا۔ یہ سب موضوعات لامحالہ اس نمط کے تھے کہ اُن کے متعلق تخیل کی بلند پروازی بدرجہ اتم ہو سکتی تھی ظن و تخمین کے اِن معاملات پر عرب اور عجم نے دل کھول کر بحثیں کیں، جاہلیہ عقائد کے اکثر لازمات کو اسلامی لباس پہنا کر اِن اتھاہ مضامین میں خلط مبحث کر دیا۔ مگر چونکہ ازمنہ جاہلیہ کے عقائد، یونانیوں کے علم الاصنام کی غیر مانند، مدوّن بھی نہ ہوئے تھے، خود قبائل میں پہلے سے ہی اِن ظنیات کے متعلق بے انتہا تفرقہ موجود تھا، اور اُن کی صحت کی تائید یا تردید بھی قرآن سے نہ ہو سکتی تھی، اسلیئے اِس نوع خیال کا لازمی نتیجہ **فرقہ بندی** ہوئی، عرب نے اِس حادثہ عظمیٰ سے بہت پہلے مسئلہ امامت کے متعلق ایک غیر اسلامی اور جاہلی عقیدے کی بنا پر تفرقہ ڈال کر، اسلام کو دو ناقابل وصال گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا، مگر اب ظنی اجتہاد سے اِلٰہیات کی سطحی موشگافیاں کرکے، ایک خدا، ایک رسول، اور ایک قرآن کے بارے میں بھی عقائد و آرا کا دردناک اشتات پیدا کر دیا؛ كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ[†] ۝ فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۵: ۹۰-۹۳)[ل] جامع المتفرقین خدا نے، جو مسلمانوں کی ایمانی اور عملی دونوں

ل یہ قرآن تو گویا ہم نے کسی اور قوم پر نہیں اتارا کہ وہ سارے کو بعینہٖ مانکر اسکے مطالب میں تطابق قائم کریں، بلکہ دراصل اس تفرقہ آرا قوم کی طرف اتارا جو حسب خاطر اسکے ٹکڑے ٹکڑے کرکے آپس میں بانٹ لینے والے ہیں۔ اپنے اپنے حصے کو علیحدہ کرکے تفریق پیدا کرتے ہیں۔ پس تیرے پروردگار کی قسم کہ ہم اِن سے اُن کے اِن بداعمال کی ضرور باز پرس کرینگے!

---

† قرآن کو "عضین" (ٹکڑے ٹکڑے) کرنیکے معانی یہی ہیں کہ اُسکے کسی ایک حصے کو لیکر اپنے مطلب کے معنی پیدا کر لینا، اسی پر اپنی کاوش، توجہ صرف کرنا، اور باقی حصوں کو نظر انداز کرکے فرقہ بند بننا جیساکہ آج ہر اسلامی فرقے کا شیوہ عمل بن گیا ہے گویا فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۲۳: ۵۳) کا مصداق بننا، جسکی تشریح صفحہ ۹۴ پر گذر چکی ہے۔ یہ طریق تخیل ظاہر ہے کہ کسقدر مُہلک ہے۔ جبتک کسی تصنیف کا تمام ایجۂ عمل پیش نظر نہو، اُسکے کسی ایک حصے کے عملی معانی ہرگز نہیں ہو سکتا ہے مسلمانان عالم نے کتاب اللہ کو اکثر اسی نقطۂ نظر سے لیکر اپنے اپنے فرقے بنا لیے ہیں۔ اسی لیے آج انہیں دردناک پرسش درپیش ہے: فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۵: ۹۲-۹۳) ضمناً ان آیات الٰہی سے یہی مترشح ہے کہ قرآن حکیم فی نفسہٖ تمام کا تمام مربوط ہے۔ اور یہ نقصان ہی ہے جو آیات کے حسب مطلب معانی بیان کرکے اُسکو بے ربط کر رہا ہے، لیکن یہ حقیقت اُس وقت اظہر من الشمس ہوگی جب رفتہ رفتہ ہر ایک سمت کو اس کتاب میں مربوط المعانی ثابت کر دیا جائے گا۔

زندگیوں کو چٹان کی طرح مضبوط دیکھنا چاہتا تھا، لامحالہ ظن کے اِنہی ناہموار نتائج کو پیش نظر رکھکر، اسکی بعض قسموں کو قطعی طور پر گناہ قرار دیا تھا، مگر قرآن کریم کے اِن عظیم الشان مقاصد تک پہنچنے کے لیئے تابعین عرب کو اسکی آیات میں حقیقی تامل اور تدبر کی ضرورت تھی!

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ (۴۹: ۱۲)

اے ایمان والو! اکثر قسم کے ظن سے بچتے رہا کرو کیونکہ بعض ظن داخل گناہ ہیں۔

اسلام کی ارضی سلطنت کے استحکام و تمکن کے لیئے یہ فساد آفرین مباحث کس طرح مفید ہو سکتے تھے قرآن کے متعلق ان لفظی تنازعات اور سطحی کج بحثیوں میں ہی مسلمانوں کی زندگی کے کم و بیش دو سو برس صرف ہو گئے۔ اِس اثنا میں حفاظت قرآن کے مفید اور بے مثال عمل کے ماسوا عرب تخیل کا ایک دیگر یہی نتیجہ ہوا کہ کلام الٰہی کی درس و تدریس کے ضمن میں عوام کے سامنے جاہلیۃ کا سارا علم ادب، اُن کی طرز معاشرت، اُن کی روایاتِ واہیہ، اُن کے اوہامِ باطلہ، اور اُن کا دیرینہ اخلاق معنون ہو کر التزام کے ساتھ پیش نظر ہو گیا۔ اِن بے سود تصریحات اور ناگوار انکشافات کے سم آلود اثر کے باعث، اسلام کی تسلیمِ اعتقاد میں صدہا غیر متعلق اور مفروضہ باتیں از خود دخیل ہو گئیں۔ قرآن کا سب سے بڑا معجزہ اسکی جید عبارت اور حسن بیان میں منتقل ہو گیا! اسکی تلاوت عرب سخن فہمی اور زباں نوازی کی بہترین داستان بن گئی۔ پھر فصاحت اور نغز گوئی ہر خاص و عام کا مستقل بلکہ مستند شغل ہو گیا۔ عرب اور عجم قیل و قال میں، تحریر و تقریر میں، زباندانی کا اہتمام ذوق و شوق سے کرنے لگے۔ اُدھر قرآن کی فرضی تائید پر جنات اور ملائکہ کے متعلق عقائد کی تدوین ہونے لگی۔ بہشت اور دوزخ کے مختلف مقامات اور مدارج وضع کیئے گئے۔ عذابِ قبر کی تشریحوں کے متعلق کلام الٰہی سے دور از کار استناد کیا گیا۔ ماہیتِ خدا، حقیقت نبوت، کیفیت وحی وغیرہ کے مختلف نظریوں کے باعث، قرآن، رسول، بلکہ خدا کے متعلق بھی طرح طرح کے توہمات و شکوک عوام میں پھیل گئے۔ قرآن کی اکثر آیات میں عجیب و غریب تاویلیں ہونے لگیں۔ بدعت کا عام اجرا ہو گیا۔

پھر قیاس کے ان بے نتیجہ مجادلات، آرا کی اس عام کشاکش، اور الفاظ وحی کے جاذبی اثر کے باعث عوام کے غیر مطمئن اور تشنہ نتائج دل کہانت کے جاہلی عقائد کی طرف از خود مائل ہو گئے۔ قرآن کا مطالعہ محض رسم و تبرک کے طور پر رواج پاتا گیا، کلام آلہی کے الفاظ میں غیبی برکت اور طبی تاثیر مانی جانے لگی، تمائم پرستی اور زیارت قبور کی جاہلی علامات نمایاں ہونے لگیں، فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ[ل] (۹:۷۰، ۹:۷۰)۔ پھر آیندہ احوال اور خانگی معاملات، حتّٰی کہ ملّی اور بین الملّی مناقشات کی پیش بینی کی غرض سے کلام خدا سے تفاؤل کیا جانے لگا! احادیث نبویؐ اور حروف مقطعات قرآنیہ سے زوال و بقائے قوم، مدّتِ قیام عالم، اور بقائے اسلام کی تشریحیں نکالی گئیں، سحر و طلسمات کا وجود قرآن سے غلط مستنبط کر کے، اور حلول جنّات وغیرہ وغیرہ جاہلی عقیدوں کا منفی ثبوت✝ غیر متعلق اور دور از کار آیات سے از سر نو نکالکر عجیب و غریب فریب سے اُن کی قرآنی تحریم و تردید کی نوعیت بدل دی! انہی مراسم جاہلیہ اور عقائد واہیہ کی تجدید کے سلسلے میں مُسلمانوں کو نجوم کے مفروضہ اعمال سے بھی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ اثر کواکب کے جاہلیہ عقائد کی تائید، ایک نہایت شرم انگیز طریقے سے کلام خدا کی وساطت سے کی جانے لگی۔ بعض فرقِ صوفیا نے بھی تنجیم کے ان متعدی اور ہلاکت انگیز اثرات میں پا بگِل ہو کر، طبائع کوکبی اور اَرواح فلکی کو مظاہر اسمائے آلہی فرض کیا، اور مکر و دروغ کے خجالت آفرین ڈھکوسلے 'اسرار الحروف' کے نام سے وضع کیے! تیسری صدی کے اخیر میں زیدیہ اور رافضیہ فرقوں نے امام جعفر صادق علیہ الرحمۃ کی تقلید کے بہانے سے کلامِ آلہی کو قطعًا ناقابلِ فہم قرار دے کر، اسکے اسرار و رموز کا حل جفر اور رمل سے منا سب

ل تو اللہ ان پر ظلم نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ تو اپنی جانوں پر آپ ظلم کر رہے تھے۔

✝ اس منفی ثبوت کی ایک مثال صفحہ ۲۲ آیۃ (۷ : ۱۴۴) میں گذر چکی ہے۔ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ سے بعض خوش اعتقادوں نے یہ مستنبط کیا ہے کہ اگرچہ رسولِ خدا میں (معاذ اللہ) جن نہیں گھسا تھا مگر عام لوگوں کے بدنوں میں جنّات کے گھس جانے کی قرآن تائید کرتا ہے! جن کی حقیقت کے متعلق مکمل بحث غالبًا چوتھی مجلد سے پہلے نہ ہو سکے گی۔ مگر جستہ جستہ اشارات درمیانی مجلدات میں بھی آئیں گے۔

جانا! اِن اوہام کی گرفت بالآخر اسقدر وسیع ہو گئی کہ عین اُسوقت جبکہ اسلامی عظمت و جبروت کا آفتاب نصف النہار پر ٹھیرا ہوا تھا، اور اللہ کی بخششوں کے خزانے مسلمانوں کو ہر طرف سے مالا مال کر رہے تھے اسلام کا مقتدر امیر المؤمنین، خلیفۃ المسلمین، ہارون الرشید، قرآن اور اسلام کو بالائے طاق رکھکر فلکیات کے مطالعے میں بذات خود اس نیت سے مستغرق تھا کہ آثار نجوم سے اطلاع پا کر بقائے سلطنت کی بشارت اور نزولِ حوادث کے حالات معلوم کرے!

إِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ† ۝ (۴۳:۳-۵)

ہم نے کتاب خدا کو عربی زبان میں اسلئے کر دیا تھا کہ تم اسکے عظیم الشان مطالب کو پا کر عقلمند بن جاؤ، اور یہی قرآن ہمارے ہاں ام الکتٰب میں موجود ہے جو ایک بڑی بلند نظر اور پُر از حکمت کتاب ہے۔ تو کیا اس وجہ سے کہ تم اس کتاب عظیم کی اصلی غرض و غایت سے دور ہوتے جاتے ہو ہم اس کو تم سے یکسر کیوں نہ اچک لیں؟

کیا اِن اعمال کے بعد انسان کی گذشتہ ہزارہا سالہ تاریخ میں، کفر اور ضلالت، جہل اور ابلہی، مکر اور سیہ کاری کی اِس سے بہتر اور روشن تر مثال پیدا ہو سکتی ہے جیسی کہ سلف راشدین علیہم الرحمۃ کے ان ناخلف عرب و عجم نے ظہور اسلام کے پانچ سو سال بعد تک، قرآن کے مطالب پر غور کرنے، اور اللہ کی عطا بخشی ہوئی سلطنت کو محفوظ و مستحکم کرنیکے بہانے سے دنیا کے سامنے پیش کی ہے؟ کیا خود ابلیس، اپنی شبانہ روز مصروف کاری، شیطانی اغوا، اور طاغوتی مکر و حیل کے باوجود، اپنے سارے نامۂ اعمال میں، اللہ کی پیدا کی ہوئی مخلوق کے دلوں پر ایک ہی وقت میں اُس کامل حکومت کی کوئی مثال پیش کر سکتا ہے جو ہم نے

---

† یہ آیات صفحہ ۶۰ پر گذر چکی ہیں مگر متشابہات کی تشریح اُس موقع پر ملتوی کر دی گئی تھی۔ "مسئلہ حقیقت" کے عنوان میں اس قرآنی اصطلاح اور کئی ایسے الفاظ کی مکمل تشریح آنے کی۔ لہٰذا ظاہر کر دیا جائے گا کہ یہ اصطلاح قرآن حکیم میں کن کثرت اور مختلف معانی میں استعمال ہوئی ہے۔ یہاں پر ہر صاحب نظر بطور خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہی معنی جو ہم نے اصل کتاب میں کئے ہیں، مطالب کو مربوط کر سکتے ہیں۔ اِن کا بعد کی آیتوں سے ربط بھی ظاہر ہے: "الذِّکْرَ" کا لفظ قرآن کے معنوں میں جا بجا مستعمل ہوا ہے۔ مثلاً آیہ (۱۶: ۴۴) میں جو صفحہ ۹۵ پر آئی ہے۔ اِن آیات میں خطاب تمام تر اہل عرب کی طرف ہے۔

ہلاکت انگیز عفریت، اور جہل کے موت افزا دیو نے عرب کی بے علم و ہنر قوم کو کامل طور پر مسحور کر کے قائم کی؟ یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ۙ (۲: ۲۶)؟ کیا اسلام کی ازلی صداقت اور قرآن حکیم کی ابدی حقانیت کی آڑ میں، مکروہ و موغ کا یہ علانیہ جواز، ماسوی اللہ کی یہ آشکار اعبادت، اوثان جاہلیہ کی یہ فاش عبودیت، فی الحقیقت بنی اسرائیل کی پرستش عجل سے بہت بڑھکر جہالت، خودکشی، اور ظلم نہ تھا جس سے اہل عرب نے آج اس خسیر درم تک توبہ نہیں کی؟ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (۲: ۵۴) کیا قرآنی آیات کو بازو پر باندھ کر شفا کی امیدیں رکھنا، اسکے اوراق سے فالیں نکالکر نتائج کا چشم براہ رہنا، کلام الٰہی کے حروف کو طلسماتی فسون سمجھکر فوری اثر کا منتظر رہنا، حادثات زمانہ کو اللہ کے آسمانی گرزوں پر محمول کر کے غیب جاننے کی سعی کرنا، اور اس طرح پر خدا کے وجود کا بالجہر امتحان لینا، دراصل بنی اسرائیل کی خدا کے آشکارا دیدار کی خواہش، اور ان کے مشروط ایمان کے مترادف نہ تھا جسکی سزا میں بالآخر اُن پر بجلی گری تھی؟ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ (۲: ۵۵)، نہیں کیا پھر انہی عرب پر شدید العقاب خدا نے بنی اسرائیل کی مانند، اُنکے مفتریانہ اعمال اور فسق و ظلم کی پاداش میں جلد تر صین اُن کی سلطنت کے قلب میں ہلاکو کی بجلی نہ گرائی، اور اُن کی شش صد سالہ عظمت کو تاتاریوں کے طوفان جراد سے چند دنوں کے اندر خرد برد نہ کیا؟ کیا یہی عرب آٹھ سو سال تک اُندلس کے سرح پرور

۵۱ بہتوں کو اسی سے گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت کرتا ہے۔ لیکن گمراہ انہی کو کرتا ہے جو درحقیقت فاسق ہیں۔ اور ہلاکت کے اہل دیکھو صفحہ سطر (۱)

۵۲ اور اگر! کیا انہیں وہ وقت یاد ہے جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے بھائیو! درحقیقت تم نے بچھڑے کی پرستش اختیار کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے پس اپنے خدا کی طرف پھر آؤ، اسکی جناب میں توبہ کرو، یا اگر یہ نہیں کرتے تو اپنے آپ کو ہلاک کرو، غرق ہو جاؤ، اور مر جاؤ (فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ کا مخالف اَنْفُسَكُمْ) خدا کی نگاہ میں تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ یا توبہ کرو یا مر جاؤ۔ پھر اُن لوگوں نے توبہ کی تو خدا نے بھی اُن کی توبہ قبول کر لی۔ اور ان پر حالات ہوتی نعمتیں بحال رکھیں، اُن سے کچھ مواخذہ نہ کیا، اور وہ خدائے عظیم باز آجانے والوں کے حق میں بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا، اور بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔

۵۳ اور وہ وقت بھی یاد کرو جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ! ہم تمہیں ہرگز فرستادۂ خدا یقین نہ کریں گے جب تک ہم خدا کو آشکارا نہ دیکھ لیں۔ پھر تم کو بجلی نے آدبوچا اور تم دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

* گویا فَتُوْبُوْٓا اور فَاقْتُلُوْٓا باہم ملا دئے مقصود اختیار جتلاتا ہے۔ فَتُوْبُوْٓا کے بعد اور فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ سے پہلے وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا کے الفاظ مقدر ہیں۔

چشموں، سایہ دار بادلوں، دلفریب گھاٹیوں، پُرفضا وادیوں، اور حیات افزا جنتوں میں رہ کر اللہ کی نافرمانی کے عوض میں، عبادت طاغوت کی سزا میں، 'ممنوعہ درخت' کے پاس نہ جانے کے بدلے میں، غیب پر سے نقاب اُلٹنے کی جزا میں، اللہ کے آشکارا دیدار کی خواہش کی سرزنش میں، بالآخر اُسکے زبردست ہاتھ سے بیک بینی و دو گوش اس بے آبروئی اور درگت سے نہیں نکالے گئے کہ آج اس داستان کو دُہراتے ہوئے پسینہ آجاتا ہے؟ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ (۲: ۵۷)[1] کیا آج آٹھ سو برس کی بے مثال حکومت اور جاہ و جلال کے بعد، اُس سرزمین میں، اُن کا ایک متنفس اور ایک نوحہ گر بھی باقی رہا ہے جو اُنکی خاموش مزاروں پر سرنگوں ہو کر چار آنسو ہی بہا دیا کرے!

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ[2] وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ۝ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُم مِّنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ۝ (۱۹: ۹۷-۹۸)

---

[1] اور ہم نے تمہیں ایسے قطعات زمین پر آباد کیا جہاں ابر تم پر سایہ کئے رہتا تھا۔ اور تم کو شیرینی درخت ملاح اور عمدہ اقسام کے بٹیر کھانے کو دیئے، اور اجازت دی کہ جو کچھ عمدہ رزق ہم نے تم کو دیا ہے شوق سے کھاؤ۔ لیکن تم نے ان نعمتوں کی بیقدری کی تو ان لوگوں نے ہم پر کچھ ظلم نہیں کیا، وہ تو اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے رہے۔

---

[*] یہ لغو تشریح ہے جو جہلاء نے بنالی ہے کہ بنی اسرائیل جہاں جاتے بادل کا چھتر اُنکے سر پر رہتا تھا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ جزیرہ نما سینا کے جنوب مشرقی حصص میں بنی اسرائیل فتح کنعان سے پیشتر رہے وہ پہاڑی علاقہ تھا۔ عین قادیش کا تمام گرد و نواح جہاں چند لاکھ بنی اسرائیل کے خروج کے بعد موسیٰ علیہ السلام چالیس برس تک ڈیرہ ڈالے رہے ایک نہایت خوشگوار ملک تھا، آب و ہوا میدانی علاقوں سے نسبتاً اب بھی خنک ہے، موسمی نہریں، چشمے اور دریا جا بجا نظر آتے ہیں۔ درخت ملاح جس کی شیرینی کو قرآن اور تورات نے مَنّ سے تعبیر کیا ہے بکثرت ملتا ہے۔ پرندوں کی بھی بہتات ہے۔ مصر اور سینا کے تپتے ہوئے بیابانوں سے نکلکر بنی اسرائیل کا ان علاقوں میں آباد ہونا انکے لیے نعمت غیر مترقبہ تھا۔ قرآن نے اسی حقیقت کو "ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ" کے خوبصورت الفاظ میں ادا کیا ہے اور اگر قرآن فصیح و بلیغ ہے تو درحقیقت انہی معنوں میں کہ اسکا تمام اسلوب بیان نہایت مختصر اور موثر ہے، اور اس سے بہتر انداز وہم و گمان میں نہیں آسکتا۔

بنی اسرائیل کی تاریخ بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ یہ موضوع تاریخ القرآن کا ہے جو اس کتاب کا آخری حصہ ہے۔ اسی لیے انکے حالات کی تشریح کو اس موقعے کیلئے چھوڑ دیا گیا ہے۔

[2] تُبَشِّرَ کے بالمقابل تُنذِرَ اور مُتَّقِينَ کے بالمقابل قَوْمًا لُّدًّا کے الفاظ آئے ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ خدا کی نظروں میں مُتَّقی قوم صالح ہے جو آپس میں جھگڑے پیدا نہ کرے اور متحد ہو کر رہے۔ قوموں کی ان معانی کا ثبوت جا بجا آگے چلکر آئیگا۔ تقویٰ کے رائج الوقت تشریح یعنی پرہیزگاری نہایت سطحی اور بے نسبت ہے اور قرآن حکیم میں اسکی کوئی سند موجود نہیں۔ اقوام کے بارے میں اسکا اطلاق اور بھی بے معنی ہے۔ اصل کتاب میں ہم نے فی الحال تقویٰ کے معنی کر دیئے ہیں۔ لیکن تقویٰ کے ان معانی کی ایک جھلک سورۃ ۲۳ کی آیۃ (۲۳: ۵۲) میں صاف نظر آتی ہے جہاں مقام خدا کا اس بات پر منتج کر دیا گیا ہے کہ انسان اُمت واحدہ بنکر رہے: وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ۝ (۲۳: ۵۲)۔ کسی آقا (رب) کا سچا ڈر یہی ہے کہ اُسکے غلام آپس میں نہ لڑیں اور نہ کوئی غیور حاکم باہمی جدال کو گوارا کر سکتا ہے۔

> اے پیغمبر! ہم نے قرآن کو تمہاری زبان کا لباس پہنا کر محض اس لیے آسان کر دیا ہے کہ تم اس کے ذریعے سے خدا سے ڈرنے والوں کو خوش حالی کی خبر دو، اور عرب کی جھگڑالو اور اکھڑ قوم کو عذابِ خدا سے ڈراؤ۔ اور ہم ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں۔ کیا اب تم اُن میں سے کسی کو بھی دیکھ رہے ہو؟ یا اُن کی بھنک تک بھی سنتے ہو!

آج یہی اللہ سے نڈر اور جھگڑالو قوم جس نے دین کی ہر جزوی بات میں پھوٹ، اور ہر فرع و اصل میں تفرقہ ڈال کر خدائے پاک کے محبوب مذہب کو نہایت بیدردی سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا جس کے شدید کفر و نفاق کی روئداد، رسولِ خدا کے عینِ حیات میں ہی قرآن کے قریب قریب ہر ورق پر روشن کی طرح ثبت ہے: اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ[1] (۹: ۹۷) جس کے مکر و فریب، جھوٹی قسموں، لنگ عذروں اور منافقانہ دوستیوں سے تنگ آ کر علیم و حکیم خدا نے اُن کے عظیم ترحصے کو قرآنی ہدایت، اور حدودِ خدا پہچاننے کا قطعی نااہل قرار دیا تھا جس کی کج بحثیوں، بیہودہ سوالوں، اور لغو فرمائشوں کا جواب دیتے دیتے اللہ کا محبوب نبیؐ اپنی جان کو ہلاک کر رہا تھا: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ[2] ۝ (۲۶: ۳-۴) جس کے باہمی جنگ و جدل کی سرگذشت، اور آپس کے فتنہ و فساد کی داستان بعثتِ نبیؐ کے بعد بھی، تاریخِ عالم کا سرخ تر اور خونیں ترورق ہے! آہ یہی قوم کسریٰ، اور دارا کے سر بفلک ایوانوں میں شکار کھیل کر، بابل اور نینوا، مصر اور کارتھیج کے مٹے ہوئے نشانوں پر گھوڑے دوڑا کر، نمرود اور فرعون کی مغرور کھوپریوں کو لگد کوب کر کے، بالآخر اپنے ظلم کی سزا میں، ذلّ و مسکنت کے انہی خراب آباد صحراؤں میں، ندامت انگیز قناعت کے ساتھ اپنی زندگی کے آخری دن بسر کر رہی ہے جو اس کے

---

[1] دیہاتی اور بادیہ نشین لوگ اندرونے کفر و نفاق بہت سخت ہیں اور حقیقت اس لائق ہیں کہ کتاب خدا کے احکام کی حدود نہ جانیں، اور خدا تو ان کے حالات سے اچھی طرح واقف ہے اور بڑا صاحبِ حکمت ہے جو انہی کے ذریعے سے اسلام کا بول بالا کر رہا ہے!

[2] اے پیغمبر! تم تو ان کے پیچھے اپنی جان ہی ہلاک کر دو گے کہ یہ کیوں ایمان نہیں لاتے۔ اگر ہم مناسب سمجھیں تو اسی وقت ان لوگوں پر آسمان سے دردناک عذاب بھیجیں حتیٰ کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک کر رہ جائیں۔

اصلی ساکن تھے، مگر اللہ کا المناک انتقام افسوس! آج بھی کم ہوتا نظر نہیں آتا، اور یورپ کی حرص سلطنت، جوع الارض، اور حریت کش اقتدار سے انہیں اور بھی ذلیل و پامال کرنا چاہتا ہے!

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۝ (۲۸:۵۹)

اور اے پیغمبر! یہ تمہارے خدا کا دستور نہیں کہ وہ کسی بستی کو ہلاک کرے جبتک اُسکے اہم اور مرجع خلق حصے میں اپنا پیغامبر نہ بھیج لے جو واضح طور پر ہمارے احکام لوگوں کو سنادے، اور اسیطرح ہم بستیوں کو تباہ نہیں کرتے جبتک اُن کے رہنے والے مقررہ حدود سے تجاوز کرکے ہماری اصطلاح میں ظالم نہ ٹھہریں۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۶:۴۷-۴۸)

اے پیغمبر! ان سے کہدو کہ کیا تم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ اگر عذاب خدا تم پر ناگہاں یا آشکارا آئے تو سوائے ظالم قوم کے کوئی اور بھی ہلاک ہوگا۔ اور پیغمبروں کو تو ہم اسی لیے بھیجتے ہیں کہ خوش حالی اور عذاب کی دونوں صورتیں پیش کردیں۔ پھر اسکے بعد جو قوم ایمان لے آئی، اور جنھوں نے اپنی حالت کی اصلاح کرلی، اُن کی زندگی بے خوف و خطر ہے!

بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝† (۴۶:۳۵)

---

† ظلم اور فسق کی قرآنی اصطلاحیں منجملہ اُن جامع و مانع مصطلحات کے ہیں جن کی تشریح میں ابھی بہت دیر ہے۔ اسی قسم کے چند اور الفاظ (مثلاً ایمان، صلاح، شرک، کفر، اتقا وغیرہ) ہم سے پیشتر گذر چکے ہیں، مگر ان کا صحیح مفہوم بھی معرض التوا میں ڈالدیا تھا۔ بہرصورت جو مقصود ان آیات کے پیش کردینے سے ہے یہ ہے کہ قرآن کے رو سے جو قوم صفحۂ عالم سے نابود ہورہی ہے، اجکا سیاسی اور اجتماعی اقتدار گھٹ رہا ہے، جو ہلاکت کے قعر عمیق کیطرف بڑھ رہی ہے، وہ شارع کائنات کی نظروں میں بلالحاظ مذہب و ملت ظالم اور فاسق ہے۔ اجتماعی ہلاکت کا متعارف مفہوم یہی ہے کہ اُس قوم کا سیاسی اقتدار سطح زمین سے محو ہوجائے۔ ورنہ کسی قوم کے تمام افراد کا لغوی معنوں میں ہلاک ہوجانا شرط نہیں اور نہ تاریخ اسکی کوئی مثال پیش کرسکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اجتماعی ہلاکت کا لازمی نتیجہ اکثر اوقات یہی ہوا ہے کہ اُس اُمت کے افراد بھی روئے زمین سے محو ہوگئے ہیں حتیٰ کہ اُن کا ایک متنفس بھی باقی نہیں رہا، جیسا کہ صفحہ ۰۰ کی آیہ (۱۹:۹۸) سے ظاہر ہے مگر یہ ایک تدریجی عمل ہے جو سلب حکومت کے صدیوں یا قرنوں بعد تک ہوتا رہتا ہے۔ مسئلہ بقائے اصلح کو پیش نظر رکھکر آیہ (۶:۴۸) میں "فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" کے الفاظ نہایت قابل غور ہیں۔ انہی دو آیات یعنی (۶:۴۷-۴۸) سے ضمناً یہ بھی ظاہر ہے کہ پیغمبران خدا کی بشارت اور تخویف کی نوعیت کسی قوم کی اجتماعی سلامتی یا اجتماعی ہلاکت ہی ہے۔ اُن کی رسالت کا مدعا بھی ہوتا ہے کہ اقوام کو حفظ و بقا کے رستے پر لیجائیں یا نافرمانبرداری کی صورت میں ہلاکت کا اٹل انجام سنائیں یہ نکتہ نہایت قابل لحاظ ہے کیونکہ اسکی طرف اشارہ جابجا اصل کتاب میں آئیگا۔ بعینہٖ یہی بات آیات (۱۹:۹۷-۹۸) سے ظاہر ہے جو صفحہ ۰ کے متن میں آچکی ہیں۔

اے لوگو! یہ ایک اہم پیغام تھا جو ہم نے تم کو پہنچا دیا! تو کیا اسکے بعد، فاسق قوم کے سوا اس دنیا میں کوئی اور قوم بھی ہلاک ہو سکتی ہے ؟ (یعنی وہی ہلاک ہوتی ہے جو ہماری اصطلاح میں "فاسق" ہو)۔

عرب تخیل اور اسلامی فلسفے کی اس مختصر حکایت کے بعد کیا کوئی صاحب نظر ایک لمحے کے لیے بھی اس طرز عمل کا ممنون، اور اس فلسفۂ خیال کا شرمندۂ احسان ہو سکتا ہے؟ کیا جنوں کے حالات کرید کرید کر بیان کرنا، ان کے حسب نسب، ذریت حتیٰ کہ حکمت اور علم و ادب† کی تشریحیں کرنا، ملائکہ کو فرضی گروہوں میں تقسیم کر کے ان کے بے سند اور عجیب و غریب فرائض مقرر کرنا، آسمان و زمین کے آر پار سڑکیں اور پل باندھنا، بہشت کی نہروں درختوں اور مقاموں، دوزخ کے طبقوں، پلوں، ایندھنوں حتیٰ کہ کلید برداروں اور محافظوں کے نام وضع کر کے، خلق خدا میں تذبذب یقین پیدا کرنا ہی عرب کے نزدیک وہ حیرت انگیز علم لدنی تھا جسے احمد مرسل (علیہ الصلوٰۃ والسلام) حکیم و خبیر خدا کے ہاں سے لایا تھا؟ إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ الْهُدَىٰ[۱] (۵۳ : ۲۳)۔ کیا رعد، صراط، صاعقہ، سدرۃ المنتہیٰ، کوثر، تسنیم، طوبیٰ، علیون، وغیرہ وغیرہ، سیدھے سادے اور ممثل الفاظ‡ کی تشریح میں عرب مفسرین کا آسمانوں اور بادلوں، ہواؤں اور عرش معلےٰ، خلد بریں اور مساکن ارواح کی سیریں کرانا اور دین متین کو یکسر افسانہ بنا دینا ہی قرآن کے مطالب میں وہ حقیقی تدبر و تفکر تھا جس کی خدائے پاک نے

---

[۱] یہ تو نرے نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آبا و اجداد نے اپنی طرف سے رکھ لیے ہیں، خدا نے تو ان ناموں کی کوئی سند اتاری نہیں۔ یہ لوگ تو محض ظن پر چلتے ہیں یا جو کچھ دل چاہتا ہے گھڑ لیتے ہیں، حالانکہ ان کو اپنے پروردگار کے ہاں سے ہدایت مل چکی ہے۔

---

† ابوالسری سہل بن ابی غالب خزرجی جو خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں مقبول شاعر تھا اس بات کا مدعی تھا کہ اسکو ایک جنیہ نے دودھ پلا کر پالا تھا۔ اس نے اپنے دعوے کی تصدیق میں ایک کتاب جنوں کی نسب اور حکمت اور اشعار وغیرہ کے بیان میں لکھی اور خلیفۂ وقت کو خوش کرنے کیلئے یہ اعلان کیا کہ اسنے جنوں کی مخلوق سے امین بن ہارون الرشید کے حق میں بیعت لی ہے۔ یہ کتاب ایک مدت تک مقبول عوام رہی چند اشعار آج بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔

‡ ان الفاظ کی تشریح حتی الوسع اپنے اپنے موقع پر آئے گی۔ اہل عرب نے انکے متعلق بے سروپا افسانے بنا لیے ہیں جن کی کوئی سند نہیں دین اسلام اغیار کی نظروں میں آج انہی توجیہوں کے باعث تمسخر کا سامان بن رہا ہے "صاعقہ" کا تمثیلی مفہوم ہم نے صفحہ ۔۔ پر ظاہر کرنے کی سعی کی ہے عرب نے "صاعقہ" کو شہاب ثاقب سے گرے ہوئے لوہے کی تلوار یا گرز سمجھ لیا ہے جسکو "رعد" کا فرشتہ اپنے ہاتھ میں لیکر مارتا ہے۔

تاکید کی تھی؟ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ (۱۷: ۳۶)۔

ل۵ اور جس بات کا تم کو یقینی علم نہیں اُسکے پیچھے نہ ہو لیا کرو۔ کیونکہ کان، آنکھ اور قلب سلیم سب سے اِس امر کی پُرسش ہوگی کہ اُس کی بات کا تتبع کیوں کیا گیا۔ (علم وہی ہے جو سمع و بصر اور قلب سلیم (عقل) سے براہِ راست حاصل ہو!)

---

† اِس عظیم الشان آیت میں 'علم' کی ایک نہایت حکیمانہ تعریف کر دی گئی ہے، اور فیصلہ کر دیا ہے کہ شارعِ کائنات کی نظروں میں 'علم' وہ شئے ہے جو براہِ راست سمع اور بصر اور فؤاد کے ذریعے سے حاصل ہو گویا جس شئے کی تصدیق کان، آنکھ، اور ذہن سلیم کریں وہ علم ہے؛ جو اس کے ماسوا ہے وہ 'ظن' ہے، اور علم کے یقینی مرتبے تک نہیں پہنچ سکتا۔ 'فؤاد' کا عام مفہوم عربی زبان میں 'قلب' ہے۔ مگر عرب کے نزدیک 'قلب' ایک وسیع اصطلاح ہے جسکا اطلاق انسان کے اُن اعضائے شریفہ پر ہوتا ہے جو اُس کی فہم و ادراک کے متعلق ہیں۔ اس قول کی تصدیق میں دو شالیں صفحہ ۲، کی آیت (۲۵: ۴۴) اور اسی صفحہ کے تحت المتن کی آیت (۱۱: ۱۲۰) میں گذر چکی ہیں اور باقی تصریحات اپنے اپنے موقع پر آئینگی لیکن سورۂ حج کی اِس آیت سے قلب کا مفہوم قطعاً عیاں ہے؛ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ۝ (۲۲: ۴۶)۔ یعنی کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں تاکہ اُن کے 'دل' ہوتے جن سے تعقل کر سکتے، یا کان ہوتے کہ بگوش ہوش سُن سکتے۔ اور عذاب کی دردناک سزاؤں سے عبرت پکڑتے۔ کیونکہ دراصل آنکھیں تو اندھی نہیں ہوتیں لیکن 'دل' جو سینوں کے اندر ہوتے ہیں اندھے ہو جایا کرتے ہیں۔ گویا عرب کی اصطلاح میں 'دل' ہی فہم و ادراک کا نشیمن ہے اور اسی کے ذریعے سے سب تعقل ہوتا ہے۔ اِس نقطۂ نظر سے 'فؤاد' کا زیادہ صحیح ترجمہ 'قلب سلیم' ہے جس میں لامحالہ ذہن بھی داخل ہے۔ اور چونکہ جبتک کسی شئے کو ذہن تسلیم نہ کرلے، دل کے لئے اسکا تسلیم کرنا غیر ممکن ہے اسلئے ذہن سلیم ہی 'فؤاد' کا صحیح مفہوم ہو سکتا ہے۔ اسی 'فؤاد' میں باقی حواس ثلثہ (یعنی لامسہ، ذائقہ اور شامہ) بھی شامل ہیں کیونکہ اِن محسوسات کی اطلاع بھی، سامعہ اور باصرہ کی مانند، ذہن ہی کو ملتی ہے۔ علم کی یہ حیرت انگیز تعریف اِس قدر جامع اور مانع ہے کہ آج مغرب کی تمام حکمت اور عمل کی بنیاد، بلکہ اُن کی تمام تلاش و تفحص کا معیارِ تصدیق یہی سمع و بصر اور قلب سلیم کی شہادت ہے۔ علم کے عظیم الشان قصر کی تعمیر اُنکے ہاتھوں آج اِنہی ارکان ثلاثہ کے زور پر ہو رہی ہے۔ اُن کی نظروں میں کوئی بات واقع الامر نہیں، کوئی شئے حقیقت کہلائے جانے کی اہل نہیں جبتک کان نے بار بار اسکے واقع الامر ہونے کی گواہی نہ دی ہو، آنکھ نے ہر مرتبہ اُسکو اچھی طرح دیکھ بھال نہ لیا ہو، دل نے بالعموم اسکی معقولیت کو نہ مانا ہو۔ یہی اُن کے نزدیک 'علم' ہے۔ اور جو اسکے سوا ہے 'ظن' ہے اور اسلئے قابل التفات نہیں۔ اِسی سچے معیار کو بطور نہاد بنا کر انہوں نے اُن تمام انسانی مکتشفات کو 'علم' کے نام سے موسوم کیا ہے جن کی بنیاد براہِ راست تجربے اور مشاہدے پر ہے۔ علم طبعیات، علم ہیئت، علم جرثقیل، علم حرارت، علم تشریح الابدان، علم جغرافیہ، علم طب وغیرہ وغیرہ اُنکے نزدیک صحیح معنوں میں علم ہیں۔ فلسفہ، قانون، ادب، صرف، نحو، بلاغت، عروض وغیرہ وغیرہ جن کی اساس قیاس، رائے، یا وضعی طرح پر ہے، 'علم' کے بلند مقام تک نہیں پہونچ سکے، اور نہ سمع و بصر اور قلب سلیم کو ان سے کچھ تعلق ہے۔ بیکن (المتوفی ۱۰۳۵ھ مطابق ۱۶۲۶ء) کے مشہور اور عالم انگیز مسئلہ استقرا (۱۰۲۹ھ مطابق ۱۶۲۰ء) کی تمام بنیاد علم کی اِسی جامع اور مانع تعریف پر ہے۔ اور یہی وہ مسئلہ تھا جس نے مغرب کو ازمنۂ مظلمہ کی جہالت سے نکالکر ایک اقل قلیل مدت میں 'نشأة الثانیہ' کی حیرت انگیز علمی ترقیوں کیطرف رہنمائی کی تھی!

علم کے صحیح اور ناقابل انکار قرآنی مفہوم کے متعلق اصل کتاب میں ایک طول طویل بحث بعد میں آئے گی، مگر کتاب کے اِس ابتدائی حصے میں سورۂ بنی اسرائیل کی اِس جلیل القدر آیت کے متعلق یہ سرسری توضیح اسلئے بھی ضروری ہے کہ قرآن حکیم میں اِس نہی مُتَم یعنی آیہ وَلَا تَقْفُ ..... (۱۷: ۳۶) کو باقی حکمت کا ایک مستقل جُز قرار دیا گیا ہے، جو بعد کی آیہ؛ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ (۱۷: ۳۹)، یعنی یہ احکام ہیں جو تمہارے پروردگار نے اپنی حکمت کاملہ سے اخذ کر کے تم پر وحی کر دئے ہیں، سے ظاہر ہے۔ اِس حکمت عقلی کے متعلق ایک پُر معنی بحث عنقریب تیسری جلد میں آئے گی لیکن ہر صاحب نظر قرآن حکیم کی اِس آیہ کبریٰ یعنی (۱۷: ۳۶) کے صحیح مطالب کو پا کر بطور خود سمجھ سکتا ہے کہ آج جن اقوام عالم نے 'علم' اور صحیح علم کو اپنا رہنما

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۸۳) بنایا ہے، جنہوں نے قرآن کے اس اہم حکم کی تعمیل میں اپنے آپ کو لغو اور بے سند، اٹکل پچو اور بے تکی باتوں کا شکار بنا کر قوم کی ذہنی اور عملی قوتوں کو تباہ نہیں کیا، وہ آج ترقی کے فلک الافلاک پر کس طرح چڑھ رہے ہیں، اور وہ دوسری قوموں کے بالمقابل کس قدر طاقتور بن چکے ہیں!

لیکن اور آفتوں سے قطع نظر، خاص مسلمانانِ عالم نے جس حیرت انگیز خوش اعتقادی سے پچھلی چند صدیوں سے عالمِ عقبیٰ کی جسمانی تصویر اپنے ذہنوں میں جمانے کی بے طرح سعی کی ہے، جو بے سند قصے بہشت اور دوزخ کی مکانیت کے متعلق اپنے شاعرانہ تخیل کے باعث گھڑ لیے ہیں، جو عجیب و غریب خیالی سماں اُن کی فرضی کیفیت کے بارے میں بلا شہادت باندھ لیا ہے (مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۵۳ : ۲۳) (صفحہ ۸۲) بجائے خود اُن کے ضعفِ یقین کی دلیل ہے۔ دنیائے آخرت کی صحیح ماہیت کے متعلق بحث کرنے کا یہ موقع نہیں، مگر باوجود اُس تمثیلی کیفیت کے جو قرآن نے انسانوں ہی کی زبان میں اُس سانحۂ عظمیٰ کے بارے میں جابجا بیان کی ہے جس کا وقوع ہونا اٹل ہے، اور باوجود اس مثالی کیفیتِ حال کے جو بہشت کی بے مثال آسائش اور دوزخ کی بے مثال تکلیف کے متعلق بار بار ظاہر کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو سرورِ کائنات کے اس مشہور قول کی بھی کچھ وقعت پیشِ نظر نہیں جس میں بہشت اور دوزخ کی بابت فیصلہ کر دیا ہے کہ "لا عینٌ رأت ولا اُذنٌ سمعت ولا خطر علیٰ قلب البشر" یعنی اسکو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، کسی کان نے نہیں سُنا، اور نہ اسکا خیال ہی کسی بشر کے قلب پر گذرا ہے۔ جب حال یہ ہے کہ سمع اور بصر اور فؤاد ان کی صحیح کیفیت تک نہیں پہنچ سکتے، اور اُن کا علم حاصل کرنا اُن کے واقع ہونے سے پیشتر محال ہے تو حیرت ہو کہ مسلمان "وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ" کے محاکمے کے باوجود کیوں ان کے پیچھے پڑے ہیں اور فرضی قصے بنا بنا کر اپنے دین کو غیروں کی نظر میں مضحکہ انگیز بنا رہے ہیں۔ عالمِ عقبیٰ کے بارے میں جو تعلیم اسلام نے دی ہے فقط یہ ہے کہ وہ ہے، اُسکا واقع ہونا یقینی ہے اور بس؛

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۘ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۙ (۵۶ : ۱-۳)

اے لوگو! ذرا غور کرو کہ جب وہ کپکپا دینے والا سانحہ واقع ہوگا، اور قیامت جس کے ہونے میں ذرا شک و شبہ بھی نہیں تمہارے سامنے آموجود ہوگی تو تمہارا کیا ہی خستہ حال ہوگا۔ اُس دن تمہارے اعمال کی حقیقت صاف کھل جائیگی، بہتیروں کو ابد الآباد تک ذلیل کر دے گی اور بہتیروں کے درجے ہمیشہ کے لیے بلند کر جائے گی۔

اس حادثۂ کبریٰ کے واقع ہونے کا ناقابلِ انکار ثبوت کتاب کے متن میں اپنے موقع پر آئیگا۔ رہی یہ بات کہ وہ کب ہوگا، کہاں اور کیونکر ہوگا، جزا کیا ہوگی سزا کس طرح ہوگی، کیا کیفیتِ حال ہوگا، کیا منظر پیش ہوگا، یہ سب امور انسان کے احاطۂ علم سے باہر ہیں کیونکہ سمع و بصر اور فؤاد کے حیطۂ درک میں آنیکا امکان نہیں رکھتے۔ اسی بنا پر اُنکے بارے میں بحث کرنا بھی عبث ہے۔ اور نہ قرونِ اولیٰ میں ان کی کسی ایک شق کے متعلق بحث کرنے کی اجازت تھی۔ سورۂ اعراف میں ہے؛

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ (۷ : ۱۸۷)

اے پیغمبر! لوگ تمہیں قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ آخر اس سانحۂ عظمیٰ کا ٹھیک ٹھیک پتہ بھی کہیں ہے، کوئی شناخت کرنے کی علامت یا نشان بھی ہے۔ ان کو کہہ دو کہ اُسکا علم تو صرف میرے خدا ہی کے پاس ہے۔

جو بات نتیجہ خیز ہے یہ ہے کہ اُس "السَّاعَة" کے واقع ہونے پر کامل اور علمی یقین ہو، اسکی ہیبت اور صداقت کو پا کر بدن میں کپکپیاں پیدا ہوں۔ دار الجزا کی امید میں سعی و عمل دہ چند ہوتا جائے، شوق کا حس بڑھے، خوف کا تکلیف ظاہر ہو۔ نہ یہ کہ نادیدہ انعام کے فرضی قصے گھڑ لیے جائیں کہ انکو دُہرا دُہرا کر بے اثر اور آگے عمل کو کالعدم کر دیا جائے۔ انعام میں قوتِ تشویق اور سزا میں طاقتِ تخویف تبھی تک ہے جبتک اُنکی صحیح کیفیت معلوم نہیں، اور ساتھ ہی انکے بہترین یا بدترین ہونے میں کلام نہیں۔ یہی انداز اس موضوع کے متعلق تمام قرآنِ عظیم کا ہے مگر افسوس کہ آجکل کے مسلمانوں نے اس راز کو کبھی نہیں سمجھا۔

ٹوہ لگانا، اور اس مکر و حیل سے آیاتِ خدا کو کوڑیوں کے مول بیچنا ہی قرآن حکیم کی وہ محیر العقول حکمت آموزی تھی جس کا دعوےٰ حکیم حقیقی نے بار بار کیا تھا؟ کیا صرف و نحو، علومِ لغت† اور فنونِ بلاغت کو اسلامی دینیات کا جزلاینفک قرار دے کر سبع اسابیع‡، حماستین اور مقاماتِ حریری کے صنائع اور بدائع کا مطالعہ کرنا ہی فی الحقیقت "قَوْمٌ يُؤْمِنُونَ" و "قَوْمٌ يُوقِنُونَ" کے لیے وہ "هُدًى وَبُشْرَىٰ" اور "هُدًى وَرَحْمَةً"‡ تھی جس کا قرآن میں ملنے کا وعدہ کیا گیا تھا؟ فَذَكِّرْ فَمَا أَنتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهِ رَيْبَ الْمَنُونِ قُلْ تَرَبَّصُوا فَإِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُتَرَبِّصِينَ[1] (۵۲: ۲۹-۳۱) کیا قرآن کے پُرحکمت اور پُرمغز قصوں، تشبیہوں اور مثلوں، سورتوں اور آیتوں کی فرضی اور بے سند تاویلیں بنا کر، اللہ کی پاک اور بے عیب کتاب کو سحر اور تکہن، خوارق اور عجائبات کا جامع قرار دینا، انبیاء کو عجیب و غریب کرامات کا عامل قرار دے کر ان کو تماشہ گر اور حقہ باز سمجھنا ہی اس تذکیر و اعتبار، اس تفکر و تدبر کے مترادف تھا جس کی تلقین کلام الٰہی نے کی تھی؟ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ[2] (۷: ۱۷۶)،

---

[1] تو اے پیغمبر! تم اپنی نصیحت کیے جاؤ کیونکہ تم اپنے پروردگار کے فضل و کرم سے نہ تو بازیگر (کاہن) ہو اور نہ سودائی (مجنون)۔ کیا لوگوں نے تمہاری نسبت یہ مشہور کر رکھا ہے کہ محمد تو محض ایک شاعر ہے جس نے اپنے زورِ تخیل اور شعر و سخن سے ہی چند افراد کو اپنا گرویدہ کر لیا ہے۔ اس کی پیروی اور اس کی دھمکیاں تبھی تک ہیں جب تک وہ زندہ ہے۔ اور ہم تو اس امر کے منتظر ہیں کہ موت کا حادثہ اسکو آ دبوچے اور اس کی سب لن ترانیوں کو ختم کر دے۔ تم ان سے کہدو کہ بہت اچھا تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں پھر معلوم ہو جائے گا کہ کس کی دھمکیاں محض باد ہوائی باتیں نہیں، اور کس کی ہدایت صرف نقش بر آب تھی۔

[2] پس تم ان کو یہ باتیں بیان کر دو تاکہ ان پر غور کر کے مستقل نصیحت اخذ کریں۔

---

† صفحہ ۳۳-۳۴ کے تحت المتن سے ظاہر ہوگا کہ علم لغت اتنی اصطلاح میں در حقیقت علم نہیں علیٰ ہذا القیاس صرف و نحو یا بلاغت کے فنون۔ اسی لحاظ سے علوم کو دو اوین میں لکھا گیا ہے۔

‡ متاخرین عرب نے اپنے علم ادب میں سے طبقہ شعراء کے سات اعلیٰ پائے کے قصیدوں کو معلقات کے انداز پر منتخب کر کے سات حصوں میں منقسم کیا ہے اور اس مجموعے کا نام سبع اسابیع رکھا ہے۔ ان سات حصوں کے نام یہ ہیں: معلقات، مجمہرات، منتقیات، مذہبات، مراثی، مشوبات، ملحمات۔ پہلے تین مجموعوں کی تفصیل صفحہ ۲۳ کے تحت المتن میں گذر چکی ہے۔ باقی شعراء کے نام یہ ہیں: مذہبات (حسان بن ثابت، عبداللہ بن رواحہ، مالک بن عجلان، قیس بن خطیم، احیحہ بن جلاح، قیس بن اسلت، عمرو بن امرالقیس)، مراثی (ابو ذویب ہذلی، محمد بن کعب، اعشیٰ باہلی، علقمۃ المطوس، ابو زبید طائی، مالک بن ریب نہشلی، متمم بن نویرہ) مشوبات (کعب بن زہیر، نابغہ جعدہ، قطامی، حطیئہ، تمیم بن مقبل، شماخ، عمرو بن احمر) ملحمات (فرزدق، جریر، اخطل، عبید راعی، ذوالرمہ، کمیت بن زید، طرماح)۔

‡ صفحہ ۵۵-۵۶ کے متن کی آیات (۱۴: ۲-۳) اور (۷: ۲۰۳) اور (۴۵: ۲۰) کی طرف اشارہ ہے یا (۱۲: ۱۱۱) کی طرف جو آگے آرہی ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ؐ (۱۲ : ۱۱۱)۔ اگر صاحب القرآن عزّ اسمہٗ کی حقیقی غرض و غایت اِسی فلسفے اور اسی حکمت سے تھی، اگر کتابِ خدا میں بصیرت اور تدبّر کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا، اگر غور و فکر اسی نمط پر اسکے حقائق کو بیّن کر سکتا تھا، وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ؐ (۱۶ : ۴۴)، اگر یہ عالم افروز اور مبین کتاب دنیائے اسلام کو اسی طور پر ظلمت سے نور میں نکال سکتی تھی، نہیں، اگر آیۂ استخلاف کے وعدے کے مطابق یہی ایمان اور یہی **اعمال صالحہ** ہونے چاہیئے تھے جو عرب اور عجم نے صدیوں اور قرنوں تک عمل کیئے تو آج کیوں قرآن حکیم کے یہی سچے مترجم، کیوں کتاب مبین کے یہی اصلی مفسّر، یہی پکّے مومن اور صالح العمل **اہل عرب**‡، ایک قلیل سے قلیل زمانے میں، شدید العقاب خدا کے عذاب مہین کے اِس دردناک طریقے پر شکار ہو چکے ہیں کہ خدا کی گز بھر زمین بھی صحیح معنوں میں ان کی وراثت میں نہیں رہی؟

ؐ بلاشبہ دانا آدمیوں کیلئے اِن لوگوں کے حالات میں بڑی عبرت ہے اور یہ قرآن کوئی بنائی ہوئی یا جھوٹ بات تو ہے نہیں بلکہ جو کچھ اُسکے سامنے ہے اسکی تصدیق ہے اور فی الحقیقت یہ تو تمام آئین جہان کی تفصیل ہے اور اُس قوم کیلئے جو ایمان داری سے اسکے احکام پر عمل پیرا ہے ہدایت اور رحمت ہے۔ ؐ ہم نے یہ کتاب نصیحت تم پر اسلیئے اتاری ہے کہ تم اسکے حقائق عالیہ کو اُن پر اچھی طرح عیاں کر دو، اور ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ بطور خود اسمیں تفکر کریں اور نئے حقائق دریافت کریں۔

---

۹ اِس آیت کے صحیح مفہوم، اور بالخصوص تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ کے معانی کے متعلق ایک مستقل باب باندھا گیا ہے جو غالباً پانچویں جلد میں آئیگا، ایک اور مستقل بحث اسی ضمن میں عنقریب آنیوالی ہے اسلیئے یہاں پر اِس آیۂ کریمہ کے متعلق کچھ کدّ و کاوش کی ضرورت نہیں ہم نے الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ کا ایک لفظی ترجمہ کر کے مطالب کو نظرانداز کر دیا ہے۔

‡ اِس جگہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ مقاصد قرآن کی غلط اشاعت کا مجرم خاصتہً اہل عرب کو کیوں قرار دیا ہے حالانکہ عباسیہ سلطنت میں علما، ادبا، متکلمین اور مفسّرین اکثر عجمی الاصل تھے اور قرآنی مطالب کی نشر و تبلیغ بھی عجمیوں کی وساطت سے ہوئی۔ چنانچہ ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں اِس موضوع پر ایک مستقل باب باندھا ہے۔ یہ اعتراض بظاہر وزن دار معلوم ہوتا ہے مگر ادنیٰ تامل کے بعد اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عجمی حکما و فضلا نے قرون ماضیہ میں منشائے قرآن اور باقی علوم و فنون کی تبلیغ جو کچھ کی سب کی سب عرب روایات اور عرب تخیل اور عرب اثر، عرب حکومت کے ماتحت رہ کر کی۔ دینیات کے متعلق تمام علوم کا منبع و منشا قرآن تھا اور وہ عربی میں تھا، احادیث کی روایت عربی زبان میں تھی، بحث مباحثے، اسناد اور حوالہ جات سب عربی میں تھے، تصانیف کی زبان عربی تھی، انکے اکثر موضوع بھی تاریخ، خصوصیات اور اخلاق عرب، اعتقادات اور روایات پر یکسر مبنی تھے۔ نہیں بلکہ عجم مصنفین فرط خیال کے اعتبار سے آپکو عرب میں مدغم کرنیکی سعی اس شدّ و مد کی تھی کہ صرف تصنیف کو دیکھ کر مصنف کی اصل نسل کا پتہ لگانا آج بھی بہت مشکل ہے۔ اس عالم میں یہ کہنا کہ مقاصد قرآن کی غلط اشاعت کی ذمہ داری عرب پر ہے، حقیقت کے اعتبار سے غلط نہیں۔ آج ہند کی سرزمین میں انگلستان کی شہنشہی، تمدنی اور اخلاقی روایات کی اکثر نشر و تبلیغ ہندیوں کے ہاتھ سے ہو رہی ہے، مگر بحیثیت مجموعی انگریز جو اس اشاعت میں حصّہ لیتے ہیں تعداد میں صفر ہیں۔ لیکن با ایں ہمہ یہ کہنا کس قدر نادرست ہے کہ ہندوستان کے اخلاقی افلاس اور ساتھ ہی انحطاط کے مجرم ہندوستانی ہیں، انگریز نہیں۔ حاکم قوم کی حکومت ہی ہر بات کی روشن دلیل ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے انکے ایما بلکہ انہی کے کیئے سے ہو رہا ہے، آلۂ کار خواہ کوئی بھی ہو۔ اِس نقطۂ خیال سے دین متین کو بازیچۂ طفلاں بنا دینے کے مجرم اہل عرب ہی ہیں اور اسی لیئے سزا بھی انہی کو جلد تر ملی۔ لیکن اِس موضوع پر ایک ابتدائی بحث صفحہ ۶ ۴ کے تحت المتن میں بھی ہو چکی ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ○
إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ ○ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ○ (۲۱: ۱۰۵-۱۰۷)

اور ہم زبور میں تمام ضروری تفصیل کے بعد یہ بات قطعی طور پر واضح کر چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے صالح العمل بندے ہی ہیں۔ درحقیقت اس میں اطاعت گذار قوم کے لیے ایک اہم پیغام ہے۔ اور اے محمدؐ! ہم نے بلاشبہ تم کو سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے تاکہ انہیں قیام و بقا کے نشیب و فراز سے مطلع کرو۔† (۱۷: ۸۹)

وَمَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۖ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ○
فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّىٰ عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ○ ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُم
مِّنَ الْعِلْمِ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدَىٰ ○
وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِينَ
أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى† ○ (۵۳: ۲۸-۳۱)

---

† صفحہ ۱۸ کی آیات (۶: ۴۷-۴۸) کے تحت المتن میں پیغمبرانِ خدا کی بشیر و نذیر کی نوعیت واضح کر دی تھی (۶: ۴۸) میں ہے وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۖ فَمَنْ آمَنَ... علی ہذا القیاس یہاں پر وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ہے۔ اس نقطہ نظر سے پیغمبر خدا کے رحمۃ للعالمین ہونے کی کیفیت بھی واضح ہے یعنی یہ کہ دنیا کو اجتماعی ہلاکت کی راہ سے ہٹا کر حفظ و بقا کی راہ پر چلانا ہی وہ پیام رحمت اور بشارت تھی جو وہ لائے تھے۔ اس بنا پر ہم نے یہ توجیہ ترجمے میں داخل کر دی ہے۔ پیغام رسول کو رحمۃ للعالمین ثابت کرنے میں ابھی دیر ہے۔ یہ تمام کتاب اسکی شہادت میں ہے۔

† ان آیاتِ الٰہی کے مطالب اور 'علم' و 'ظن' کے صحیح مفہوم کے متعلق صفحہ ۴۸۔۵۰ کا تحت المتن پیش نظر رکھنا چاہیے۔ یہاں پر دو ایک اہم باتوں کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اولاً یہ کہ 'علم' کے بالمقابل 'ظن' اس دنیا میں کچھ بکارآمد نہیں ہو سکتا۔ (وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا) یہ حقیقت اسقدر جلیل القدر ہے کہ مسلمانانِ عالم نے چند صدیوں سے اس پر کافی غور نہیں کیا، اور ظنیات میں پڑ کر قوم کی عملی قوتوں کو بیکار کر رہے ہیں۔ ثانیاً یہ کہ 'علم' کا تتبع کرنا، یا بعبارت اخریٰ اپنی تمام معلومات کی بنا تجربے اور مشاہدے پر قائم کرنا درحقیقت سبیل خدا پر چلنا ہے۔ اور یہی ہدایت کی ایک اہم شق ہے۔ (ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُم مِّنَ الْعِلْمِ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدَىٰ)۔ ثالثاً یہ کہ تمام انسانی مساعی میں یقینیات کو پیش نظر رکھنا اور 'علم' کو رہنما بنانا گویا 'حسن عمل' کرنا ہے۔ اسی 'حسن عمل' کا نتیجہ زمین و آسمان کے بہترین انعام ہیں جو مسلمانوں کو کئی قرنوں تک بالالتزام ملتے رہے۔ اور جو آج غنیٌّ عن العالمین خدا نے ان سے چھین کر ان اقوام کے سپرد کر دیے ہیں جن کا سعی و عمل ان کو 'علم' کے راہ راست پر لیجا رہا ہے۔

ضمناً ان آیاتِ الٰہی میں 'اصلاحِ عمل' کی ایک اہم شق صاف ہو گئی جس کو آج اس چودھویں صدی کے مسلمان قطعاً بھول گئے ہیں۔ ✱ وجاہت دنیا کی صحیح تعریف 'عمل' کے عنوان میں آئے گی۔ یہاں ہم نے ایک لگتے ہوئے معنے کر دیئے ہیں مگر اس کی قرآنی سند سورۂ آل عمران کی اس آیت سے ظاہر ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ
وَالْحَرْثِ ۗ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ (۳: ۱۴)

یعنی دنیا کے اس دار الامتحان میں انسان کی نفسانی خواہشوں کو مثلاً بیبیوں اور اولاد سے محبت کرنا، سونے چاندی کے بڑے بڑے ڈھیروں کو جمع کرنا، اور عمدہ عمدہ گھوڑوں اور مویشیوں اور سبزوں سے دل بستگی رکھنا، بھلا کر کے دکھلا دیا گیا ہے۔ لیکن یہی چیزیں متاع دنیا کی متاع ہیں جس کا قیام چند روزہ ہے اور خدا کے نزدیک انسان کی بہترین جائے بازگشت ترین اشیا کی بے اندازہ محبت سے الگ تھلگ ہو کر اس کے احکام کی طرف رجوع ہونا ہی ہے۔ (وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ)۔

ان کو اس کے متعلق کچھ علم تو ہے نہیں۔ وہ تو نرے ظن اور اٹکل پر چلتے ہیں، اور ظن یقین کے بالمقابل کچھ بکارآمد نہیں ہو سکتا۔ پس اے پیغمبر! جو شخص ہمارے حقیقت نما قرآن (ذکرِ ہمارا) سے روگردانی کرے، اور دنیاوی شغل و اشغال میں مگن رہنے کے سوا اسکو کسی اور بات سے غرض مطلب نہ ہو، تم اُس سے علٰحدہ ہو جاؤ۔ ان کا مبلغ علم ہی کچھ ہے جو وہ ظاہر کر رہے ہیں۔ خدا ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو اس کے دکھائے ہوئے راہِ راست سے بھٹک گئے ہیں، اور وہ ان کو بھی اچھی طرح سمجھتا ہے جو راہ ہدایت پر قائم ہیں۔ اور جو کچھ آسمان و زمین میں ہے وہ تو اللہ ہی کا ہے تاکہ اس میں سے بہترین شے حسنِ عمل کرنے والوں کو، اور بدترین عذاب بُرے عمل کرنے والوں کو دے ۔ ۱؎ یہاں ذکرِنا سے مراد خدا کی یاد قطعاً نہیں بلکہ کتابِ خدا ہے

۱؎ واقعاً مطالب مربوط نہیں ہوتے کیونکہ پہلے اور بعد کی آیتوں میں "علم" کا ذکر ہے اور قرآن کا مجسمہ علم ہونا ثابت ہے (دیکھو صفحہ ۶۴-۶۷) ذکر بمعنی قرآن کئی جگہ آیا ہے۔ (دیکھو (۴۴:۱۷) و (۱۵:۹) صفحہ ۸۹ و ۹۲ میں)

کیا کلام الٰہی کے یہ ظاہر پرست اور وہم زدہ شارحین اسکی آیات میں استدلال کرتے وقت اس حقیقت کو بھول گئے تھے کہ اسلام کی دنیا میں آنے کی تنہا غرض ساکنانِ عالم کو خدا کی عبودیت اور قانون احکم الحاکمین کی اطاعت کی طرف منتقل کرنا ہے، اور اس بنا پر اسکی تشریحوں میں زمانہ جاہلیت کے ان خناسی وساوس اور ظنی واہیات کو پھر دخیل کر دینا اسلامی تعلیم کے سراسر منافی، اور کتابِ خدا کی صریح توہین ہے؟: قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ۙ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ۝ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝ ۵۱؎ (۲۳: ۶۶-۷۰) کیا قرآن حکیم کو اہلِ عرب کی سخن فہمی، ظاہر آرائی، اور باطل طرازی کی شرم انگیز داستان بناتے وقت انہوں نے یہ خیال نہ کیا کہ جب خود قرآن شعر و فصاحت کا مدعی ہی نہیں بلکہ منکر ہے: بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ† فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝ ۵۲؎ (۲۱: ۵)، اور اور اہلِ کتاب بھی اپنی آسمانی

۵۱؎ میری آیتیں تم پر واضح کیجاتی تھیں مگر تم انہیں غرور قرآن کو قصے کہانیاں اور شعر سمجھ کر اپنے گذشتہ اعتقادات کی طرف رجعت قہقری کر جاتے تھے۔ تو کیا ان لوگوں نے اس قولِ عظیم پر غور ہی نہیں کیا، یا کیا انکے پاس کوئی طرفہ شے آئی تھی جو ان کے باپ دادا کے پاس نہیں آئی تھی؟ کیا یہ لوگ اپنے رسول کی راستبازی، حق پسندی و یقین گوئی سے واقف نہ تھے کہ اب اسکی ان خصائص سے منکر ہیں؟ کیا اب آیات خدا کو یوں ٹھکرا کر اور قصے کہانیاں سمجھ کر گویا یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ مجنون ہے! وہ تو دنیا کے پاس جو کچھ لایا ہے، حق لایا ہے۔ لیکن افسوس کہ ان میں سے اکثر حق بات ہی سے متنفر ہیں!

۵۲؎ ان عربوں نے تو قرآن کو سمجھ کر کہنے پر ہی بس کیا بلکہ کہنے لگے کہ یہ تو پریشان خیالات ہیں جو سوانح ادھر اُدھر سے اکٹھے کر لیے ہیں، بلکہ انہوں نے یہ جھوٹی جھوٹی باتیں اپنے دل سے بنالی ہیں، بلکہ درحقیقت وہ تو ایک شاعر ہے جو قافیہ بندی اور خیال آرائی میں ماہر ہے! اگر وہ فرستادہ خدا ہے تو ہمارے پاس اگلے نبیوں کی سی کوئی نشانی لاوے۔

† یہ جو تمام قصہ ہے کہ قرآن نے بصراحت شعر ہونے سے اعراض کیا ہے پہلے موقعے صفحہ ۶۴، ۷۱، ۷۲ پر گذر چکے ہیں۔

کتابوں کے بارے میں جو اُسی خدائے وحدہٗ کی طرف سے ہیں، اور لامحالہ اُسیکا کلام ہیں، فصاحت کا اِدّعا حتماً پیش نہیں کرتے، جب خود اہلِ اسلام خدا کے تورات کو "مُستبین" کہنے کے باوجود، اُسکے فصیح ہونے کا گمان تک نہیں کرتے: وَآتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ ۝[1] (۳۷: ۱۱۷)، جب خود خدائے عظیم کا آسمانی کتابوں کے بارے میں دعوے اُن کی بے مثال ہدایت میں ہے: قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا† أَتَّبِعْهُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝[2] (۲۸: ۴۹)، تو قرآن کے سطحی محاسن کو اس اعتنا و اہتمام سے دیکھنا اور باطن کو یکسر نظر انداز کر دینا، اُس کی

---

[1] اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو مشرح اور بلیغ فی البیان کتاب دی۔

[2] اے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر قرآن اور تورات دونوں کتابیں جھوٹی ہیں اور تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو تم بھی خدا کے ہاں سے کوئی اور کتاب لے آؤ جو ان دونوں سے ہدایت میں بہتر ہو۔ پھر میں بھی اسکی پیروی کرنے کو تیار ہوں۔

---

† تورات کے متعلق جو دعاوی قرآن کریم نے کیے ہیں مفصلہ ذیل حوالوں سے ظاہر ہیں:-

سورۂ مائدہ میں ہے: إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ (۵: ۴۴)۔ "ہم ہی نے تورات کو اتارا، اُسمیں ہدایت اور نور ہے"۔ سورۂ انعام میں ہے: قُلْ مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ نُورًا وَهُدًى لِلنَّاسِ (۶: ۹۱) "ان سے پوچھو کہ وہ کتاب کس نے اتاری تھی جسکو موسیٰ لایا تھا اور جو سکانِ عالم کے لیے نور اور ہدایت تھی"۔ اِسی سورۃ میں تورات کے متعلق ہے: تَمَامًا عَلَى الَّذِي أَحْسَنَ وَتَفْصِيلًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً (۶: ۱۵۴)۔ "تمام خوبیوں پر مشتمل ہو اور تمام اشیاء کی تفصیل ہے اور ہدایت اور رحمت ہو"۔ اگر ان خوبیوں میں ادبی بلاغت اور شاعرانہ فصاحت بھی شامل ہے تو مسلمان کیوں آج اسکو فصیح و بلیغ نہیں کہتے۔ سورۂ اعراف میں الواحِ موسیٰ کے بارے میں ہے: وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةٌ لِلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ۝ (۷: ۱۵۴)۔ "اور ان الواح کے متن میں ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں ہدایت اور رحمت تھی"۔ سورۂ بنی اسرائیل میں علیٰ ہذا القیاس، وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِبَنِي إِسْرَائِيلَ (۱۷: ۲)، "یعنی ہم نے کتاب موسیٰ کو بنی اسرائیل کیلئے ہدایت بنا دیا ہو"۔ سورۂ قصص میں اسی تورات کے بارے میں بصائر لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝ (۲۸: ۴۳) آیا ہے: "یعنی تمام عالم کے لیے بصیرت اور تدبر کی باتیں ہیں اور ہدایت اور رحمت ہو تاکہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں"۔ سورۂ سجدہ میں پھر وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِبَنِي إِسْرَائِيلَ ۝ (۳۲: ۲۳) آیا ہے۔ سورۂ مومن میں هُدًى وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (۴۰: ۵۴) فرمایا ہے، "یعنی دانا اور صاحبِ عقل لوگوں کے لیے ہدایت اور عبرت ہو"۔ سورۂ احقاف میں امام کا عزیز القدر لقب بھی اسی کتاب کے بارے میں آیا ہے وَمِنْ قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً (۴۶: ۱۲)۔ سورۂ انبیاء میں ضِيَاءً وَذِكْرًا لِلْمُتَّقِينَ ۝ (۲۱: ۴۸) "یعنی پرہیزگاروں کیلئے نور اور عبرت ہو"۔

انجیل کا تعارف ربِ زمین و آسمان نے اِن الفاظ میں کرایا ہے:-

سورۂ آلِ عمران میں ہے: وَأَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِلنَّاسِ (۳: ۳)۔ "یعنی اُسی نے تورات اور انجیل کی الہامی کتابیں بھیجیں جو قرآن سے پیشتر سکانِ زمین کے لیے ہدایت تھیں"۔ سورۂ مائدہ میں ہے: وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ (۵: ۴۶)، "یعنی اس میں نور اور ہدایت ہو"۔ اور اسی آیت میں وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ۝ (۵: ۴۶) کے الفاظ ہیں یعنی خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہو۔

قرآن کے متعلق بعض دعاوی اس سے پیشتر اصل کتاب میں آچکے ہیں مگر تقابل کے خیال سے تمام آیات کو یہاں پر جمع کر دیا جاتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے: هَٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ۝ (۳: ۱۳۸)۔ "یعنی یہ قرآن سکانِ زمین کے لیے ان کے دستور العمل کی تشریح ہے اور خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ہدایت اور عبرت ہو"۔ سورۂ انعام میں ہے: أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا (۶: ۱۱۴)۔ "یعنی اسی خدائے پاک نے تمہاری طرف مفصل کتاب اتاری جسکے بعد کسی تشریح کی گنجائش نہیں رہی"۔ اِسی سورۃ میں کچھ آگے چل کر ہے: وَهَٰذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ (۶: ۱۵۵)

قدر وقیمت کو بے انتہا کم کرنا اور اسکی حقانیت سے انکار کرنا ہے؟ کیا قرآن میں فلسفیانہ اور فقیہانہ، لغوی

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۸۹)، یعنی "اور یہ بھی ایک کتاب ہے جسکو ہم ہی نے اُتارا۔ یہ بھی بڑی برکت پیدا کرنے والی شے ہے بس اسکے قدم بقدم چلو"۔ اسی آیت سے ذرا آگے ہے: فَقَدْ جَآءَكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ (۶: ۱۵۷)۔ یعنی "تو جان لو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس واضح دلیل آچکی ہے جو تمہارے لیے ہدایت اور رحمت ہے"۔ سورۂ اعراف میں ہے: وَلَقَدْ جِئْنَاهُم بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (۷: ۵۲)۔ "اور ہم اُن کے پاس ایک ایسی کتاب لائے ہیں جسکی تفصیل ہم نے اپنے علم سے کر دی ہے۔ جو قوم اس پر عمل پیرا ہو اس کے حق میں ہدایت اور رحمت ہے"۔ سورۂ یونس میں اسی کتاب کو ھُدًی اور رَحْمَۃٌ کے سوا مَوْعِظَۃٌ اور شِفَآءٌ کہا گیا ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ (۱۰: ۵۷)۔ یعنی "اے ساکنانِ زمین! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کیطرف سے آخری دستور العمل (مَوْعِظَۃٌ) پہونچ چکا ہے، وہ دراصل تمہاری بد باطنیوں اور نفسانی امراض کی شفا ہے، اور جو قوم اسکی صداقت پر ایمان لا کر اسکے احکام پر عمل پیرا ہے اُسکے لیے ہدایت اور رحمت ہے"۔ سورۂ ہود میں کتابِ خدا کی صداقت، موعظت اور عبرت پر زور دیا گیا ہے: وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ (۱۱: ۱۲۰)، صفحہ ۲۰ کے تحت المتن میں اس کا ترجمہ گذر چکا ہے۔ سورۂ یوسف میں اسی قرآن عظیم کو تَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (۱۲: ۱۱۱) کہا گیا ہے جسکی تشریح صفحہ ۸۰ کے تحت المتن میں گذر چکی ہے۔ سورۂ رعد میں اسکو قانونِ خدا کی قطعی سند (حُکْم) منشائے احکم الحاکمین کی آخری شہادت (حُکْم)، اور العلم کا خطاب دیا گیا ہے: وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَمَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا وَاقٍ (۱۳: ۳۷) یعنی "اور اسیطرح ہم نے اس قرآن عظیم کو عربی زبان میں منشائے ایزدی کی سند بنا کر اتارا ہے اور اگر اے محمدؐ! تو نے اِس علم کے ہوتے ہوئے لوگوں کی خواہشات کا تتبع کیا تو یاد رکھنا کہ خدا کی دردناک سزا سے بچانے والا تیرا کوئی حامی نہوگا"۔ سورۂ نحل میں پھر وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (۱۶: ۶۴) کے الفاظ آئے ہیں۔ اسی سورۂ شریفہ میں قرآن کو تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ (۱۶: ۸۹) فرمایا ہے جس کے معانی صفحہ ۸۰ کے متن میں گذر چکے ہیں۔ ذرا آگے بڑھکر پھر اسی کے متعلق هُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ (۱۶: ۱۰۲) ہے۔ سورۂ انبیاء میں ہے: وَهَٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ أَنزَلْنَاهُ (۲۱: ۵۰) "یہ بہت برکت پیدا کرنے والی کتاب ہے جسکو ہم نے اُتارا"۔ سورۂ نمل میں دو جگہ بوضاحت تام یہی مضمون ہے: هُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ (۲۷: ۲)، وَإِنَّهُ لَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ (۲۷: ۷۷)۔ سورۂ عنکبوت میں کتابِ خدا کو ایمان والوں کے لیے رحمت اور عبرت فرمایا ہے: إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (۲۹: ۵۱)۔ سورۂ لقمان میں هُدًى وَرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِينَ (۳۱: ۳) ہے، یعنی "حسن عمل کرنے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے"۔ هُدًى وَشِفَاءٌ کے الفاظ سورۂ حٰم السجدہ میں پھر آتے ہیں: قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءٌ (۴۱: ۴۴)، یعنی "اے پیغمبر کہہ دو کہ قرآن عظیم اُن لوگوں کے لیے جو اسکو کتابِ خدا تسلیم کر کے اسپر عمل پیرا ہیں ہدایت اور شفا ہے"۔ اور سورۂ جاثیہ میں تو قرآن کو تمام عالم کے لیے بصیرت اور تدبر کا مجسمہ کہکر عمل پیرا قوم کے لیے ہدایت کا لازوال مصدر، اور رحمت خدا کا بے مثال ذریعہ قرار دیا گیا ہے: هَٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ (۴۵: ۲۰)۔ اور سورۂ احقاف میں اسکو حسن عمل کرنے والی قوموں کے لیے قیام و بقا کی بشارت بتا کر ایک عالم کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے: وَبُشْرَىٰ لِلْمُحْسِنِينَ (۴۶: ۱۲) یعنی "حسن عمل کرنے والی قوم کیلئے قیام و بقا کی بشارت ہے"۔ (اس بشارت کی نوعیت کیلئے دیکھو تحت المتن صفحہ۔)

یہ تمام آیات قرآنی جو قرآن کے طول و عرض میں مختلف مواقع پر آئی ہیں اور جن کے حیرت انگیز تطابق اور توافق کو دیکھکر کتابِ خدا کا طالب العلم اس کے استقلال کا از خود قائل ہو جاتا ہے، اِس امر کی صحیح شہادت ہیں کہ خدا کی نظروں میں تورات، انجیل اور قرآن کی مشترک خوبی اُن کی بے مثال ہدایت میں ہے۔ یہی اُن کا جزو اعظم ہے۔ کسی ادبی یا لغوی، سطحی یا رسمی تفوق کا اِن آیات میں ذکر تک نہیں۔ جس شے پر بجا فخر ہے وہ اُن کے نفس موضوع پر ہے، ہدایت اور نور پر ہے، رحمت اور بشارت پر ہے، عبرت اور موعظت پر ہے، برکت اور شفا پر ہے، علم اور بصیرت پر ہے، حکمت اور امامت، تفصیل اور جامعیت پر ہے، استقلال اور کمال پر ہے۔ اسکے ماسوا کسی دوسری شے پر نہیں۔ اور جب تورات و انجیل کو قریب قریب انہی اوصاف کے ساتھ موصوف

اور منطقی اجتہاد کرتے وقت اُنہوں نے اِس امر پر غور نہیں کیا کہ اسلام ایک کامل مذہب عمل اور کلام الٰہی ایک کامل کتاب شریعت ہے، اور اِس لحاظ سے اِسکے نکات کو حل کرنے یا تکمیل درس کیلئے کسی ناقص فلسفہ، کسی جاہلی نقل و روایت، کسی مصنوعی لغت[†]، حتیٰ کہ کسی یقینی اور غیر یقینی حدیث کی بھی

(تتمہ تحت المتن صفحہ ۹۰) کیا ہے جو قرآن حکیم کے حق میں آئے ہیں اور تمام عالم کو صلائے عام دیدی کہ توراۃ اور قرآن سے بہتر کتاب تو لے آؤ قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا (۲۸: ۴۹)، تو قرآن کی فصاحت کا وہ مخصوص اوعا جو عرب نے صرف اپنی زبان کی برتری جتانے کے لیے اپنے دل سے گھڑ لیا ہے اُس وقت تک محض باطل اور بے معنی ہے جبتک کہ توراۃ کی عجمی زبان (یعنی عبرانی) کو بھی اسیقدر فصیح نہ مان لیا جائے لیکن مغرور عرب کو گنگ عجم کے ساتھ یہ ناقابل برداشت رقابت اور شرکت کب گوارا ہو سکتی ہے۔ اور جب یہ منظور نہیں تو اس مہلک تخیل کی تو خدا قرآن تک نشر و اشاعت کر کے باقی دنیائے اسلام کو کیوں دھوکہ دے رکھا ہو کہ قرآن کی سب سے بڑی فضیلت اسکی شاعرانہ بلاغت ہی ہے، اسی پر ایک دنیا مرمٹی تھی، اسی کے جوش اعتقاد میں عرب سرنگوں ہو گیا تھا، عمر جیسا شاعری سے بیزار انسان دم بخود ہو کر اسلام لے آیا تھا، ایک ایک آیت کی فصاحت پر سب عرب و عجم سر دُھنتے تھے، اندلس کی چوٹیاں فرق جبیں ہو گئی تھیں، کسریٰ کا تخت ہل گیا تھا۔ اگر حال یہی تھا تو قرآن آج بھی موجود ہے۔ اسمیں ایک حرف کے برابر تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ آج اسکی بلاغت کو دیکھکر ان اہل عرب کے کانوں پر جوں تک کیوں نہیں رینگتی۔ آج وہ کیوں اپنی بےحقیقتی کے جوش میں مکے اور مدینے کو، قرآن اور اسلام کو غیر کے ہاتھوں بیچ رہے ہیں اور ٹس سے مس تک نہیں ہوتے!

قرآن کی کل کائنات میں سے لیکر اگر کوئی آیت ہے جس کی بنا پر اسکی شاعرانہ فصاحت کا دعوے چند لمحوں کیلئے کھڑا ہو سکتا ہے تو وہ ذیل کے الفاظ ہیں جنکو توڑ مروڑ کر حسب حال کر لینا نسبتاً آسان ہے: وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ ۗ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ٥ (۱۶: ۱۰۳)، "اور ہم خوب جانتے ہیں کہ کٹ حجتی لوگ افواہیں اڑاتے پھرتے ہیں کہ محمدؐ کو یہ قرآن عظیم ایک چنا پہنا انسان سکھلا جاتا ہو۔ مجھے احمقیت ہو کہ جس شخص کیطرف سکھانے کی نسبت کرتے ہیں اُسکی زبان تو عجمی ہوا اور یہ قرآن شستہ اور سلیس عربی زبان ہو"۔ یہاں زیادہ سے زیادہ نتیجہ جو ایک سلیم العقل شخص نکال سکتا ہی یہ ہے کہ قرآن کی زبان اسقدر صاف اور ستھری ہو کہ کم از کم کوئی عجمی یا غیر عرب شخص اسکی نقل نہیں کر سکتا۔ اس سے زیادہ نتیجہ نکالنا حماقت ہے۔ نہیں بلکہ اس آیت سے صاف اسکا امکان باقی رہتا ہو کہ کوئی عرب اہل زبان قرآن کی عبارت کی نقل اُسی سلاست سے کر سکے۔ اگرچہ عجمی کے حیز امکان سے یہ بات قطعاً خارج ہے جب ایسی سلیس عبارت کا تخیل پیدا کر لینا عجمی کی استطاعت سے باہر ہو تو ہو کہ ایک عربی الاصل شخص کی استطاعت سے بھی باہر سمجھنا بیجا اور غلط ہے۔ اگر یہ بات تھی تو عجمی اور عربی میں تفریق کرنے کی کیا ضرورت تھی صرف کہنا یہ چاہتا کہ وہ تو محض ایک انسان ہے اور یہ قرآن ایسی شستہ زبان ہو کہ ابن آدم سے اسکا مثل پیدا ہونا محال ہے۔ میرے خیال میں یہ آیت بجائے خود اس امر کی روشن دلیل ہے کہ قرآن کی بے مثال فضیلت کم از کم اسکی عبارت آرائی اور لفظی فصاحت نہیں۔

[†] علم لغت پر پہلی کتاب جیسا کہ صفحہ ۴۷ کے تحت المتن میں ظاہر کر دیا گیا ہے تیسری صدی ہجری کے اوائل میں تیار ہوئی۔ یہ خصوصیت صرف عربی زبان تک محدود نہیں بلکہ ہر زبان کا یہی رویہ رہا ہے کہ اسکی لغت صدیوں اور قرنوں بعد میں مدوّن ہوتی رہی ہے۔ جب جب کسی زبان کو روئے زمین پر استقلال حاصل ہوتا گیا، لوگوں نے اُسکے الفاظ کو لیکر رائج الوقت معانی کو مرتب کر دیا۔ اور اُس خاص زمانے کو مدنظر رکھکر ایک لغت تیار کر لی۔ لیکن کسی زبان کے معانی الفاظ کی تاریخ بجائے خود ایک انقلابی داستان ہے اور حیات قومی کے ارتقا، بقاء و فنا سے اُسکا ایک نہایت گہرا تعلق ہے۔ لوگ زمانے کی چال کے مطابق الفاظ کو لیکر اُنکے حسب مطلب معانی وضع کر لیتے ہیں، پھر جوں جوں محسوسات اور اعمال میں تغیر ہوتا جاتا ہے، معانی بدلتے جاتے ہیں۔ اِس مقام نظر سے کسی زمانے کی بنائی ہوئی لغت صرف اُسی زمانے کے مروجہ معانی کی سند ہو سکتی ہے، ماقبل اور مابعد کے مطالب میں اسکو چنداں حکم نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان میں الفاظ کی ایک تعداد کثیر ہر زمانے میں موجود رہتی ہے جن کے مفہوم کی اصلیت بگڑ بگڑ کر زائل ہو چکی ہے، سمجھنا مشکل تر ہو گیا ہے، کچھ غلط رواج سے، کچھ عادت کے ابتدائی اثر سے، کچھ صورت کے معنوی فساد سے الفاظ کا صحیح اور اساسی مفہوم منحرف

ضرورت نہیں؛ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ (۵: ۵۰)؛ کیا وہ اس قانون جلیل کو

لے تو کیا یہ لوگ زمانۂ جاہلیت کا حکم (یعنی سند) چاہتے ہیں لیکن اس قوم کے لیے جسکو قرآن کی حقانیت پر کامل یقین ہو اللہ سے بہتر حکم (سند) کس کا ہے۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۹۱) ہو جاتا ہے حتیٰ کہ بسا اوقات مرورِ وقت کے باعث اسکا اعتراف کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ ہر زبان میں اس قسم کے الفاظ کی صدہا مثالیں موجود ہیں جنکے اعادے کی یہاں پر ضرورت نہیں۔ لیکن خاص قرآن کی لغت کے اندر جو معنوی انقلاب امتدادِ عہد کے باعث وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے مسلمانوں کی حیات کے ہبوط کی بہترین مثال ہے۔ 'ایمان'، 'شرک'، 'عبادت'، 'کفر'، 'صلاح'، 'تقویٰ'، 'ہدایت'، 'ظلم'، 'فسق' وغیرہ وغیرہ بیسیوں الفاظ قرآن میں موجود ہیں جنکے مطالب جزءً یا کلیۃً مسخ ہو چکے ہیں۔ ان کا اصلی تکیف ل ختم ہو گیا ہے۔ ایمان آج کسی رسمی کلموں کو دُہرانے کا نام بنا ہوا ہے، عبادت دو چار رسمی سجدوں تک محدود ہو گئی ہے، اصلاح کے کوئی مستقل معانی نہیں رہے، تقویٰ پرہیزگاری کی بے معنی اصطلاح کے مرادف بن گیا ہے؛ ہدایت کا صحیح مفہوم ذہنوں سے قطعاً نکل چکا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کوئی انسان کی بنائی ہوئی لغت ان الٰہی اصطلاحات کے صحیح مفہوم کو ادا نہیں کر سکتی۔ قرآن حکیم نے اول مرتبہ ان الفاظ کو زبانِ عرب سے لیا اور ہر لفظ کے متعلق ایک مستقل مفہوم مدِ نظر رکھکر اپنی لغت وضع کی، پھر اس مفہوم کی تلقین رسولِ خدا سے تیئیس برس میں براہِ راست کرا کر ایک خاص ماحول پیدا کیا۔ جوں جوں اس ماحول کا اثر ناپید ہوتا گیا معانی بدلتے گئے۔ مگر ان الفاظ کا الٰہی اور نبوی مفہوم اب تک قرآن کے اندر موجود ہے بشرطیکہ انسان اُسکے دریافت کرنے کی سعی گوارا کر سکے۔ انہی معانی میں کتاب خدا تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۶: ۸۹) اور تَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ (۱۲: ۱۱۱)، اور فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ (۷: ۵۲)، اور الْكِتَابَ مُفَصَّلًا† (۶: ۱۱۴) ہے، اور اسی نقطۂ نظر سے وہ سب تغیر پذیر اور موضوعی لغات سے بے نیاز ہے۔ اِس حقیقتِ کبریٰ کا ناقابلِ انکار ثبوت کتاب کی آئندہ مجلدات میں پیش کر دیا جائے گا۔ یہاں پر ہمارا صرف نفسِ دعوے کی تعیین ہے۔ یہ معانی کے لحاظ سے سب انسانی لغات سے بے نیاز ہونا، اور اپنے دائرے کے اندر ایک محکم اور مبسوط، مفصل اور مکمل، مشترح اور نا تغیر پذیر کتاب ہونا ہی قرآن کے انسانی تصرف سے محفوظ ہونے کی دلیل ہے اور اسی لیئے اس کی شان میں کہا ہے؛

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (۱۵: ۹)

لوگو! ہم ہی نے اِس قرآنِ عظیم کو تم پر اتارا اور ہم ہی باوجود تمہاری سب جدت پسندی اور تغیر آرائی کے اِس کے ظاہر و باطن کی حفاظت کرنے والے ہیں، اور اسکے مطالب کو روئے زمین پر سے نابود ہونے سے محفوظ رکھیں گے۔

لوگ قرآن کے متعلق جو تشریح چاہیں بنالیں، اس کی آیات کو توڑ مروڑ کر جو مطلب سمجھیں نکال لیں، تاویل کے انبار کے انبار لگا دیں یا کر کے طومار بکھیر دیں۔ مگر ان کے صحیح اور واحد معانی خود قرآن کے اندر موجود اور محفوظ ہیں، ایک ایک لفظ کی مکمل اور مفصل شرح انہی اوراق کے اندر ہے۔ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی اور ایک جزو دوسرے جزو کی نمایاں تائید اور کامل تفسیر کر رہا ہے۔ نہ اس کو کسی فلسفے کی ضرورت ہے، نہ حکمت کی، نہ لغت اور نہ حدیث کی۔ وقت، حالت، موقع، زمانہ، مصلحت وغیرہ وغیرہ کا اسکے مطالب پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اسکے کلمات صدق اور عدل پر ختم ہو چکے ہیں؛ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ‡ (۶: ۱۱۶)، اب ان کے معانی کو، ان کے الٰہی مقاصد کو کوئی خارجی طاقت بدل نہیں سکتی کیونکہ خدا خود اس کا محافظ ہے۔ اُسی نے اسکو اسقدر مفصل اور مکمل کر دیا ہے کہ اب اس کے الفاظ کے علاوہ مطالب بھی ابد الآباد تک محفوظ ہیں۔ انسان کا یارا نہیں کہ مکر و تاویل سے یا قیاس و رائے سے ان میں تبدیلی پیدا کر کے خدا کو اپنا ہم آہنگ کر سکے!

اللہ اللہ! کتابِ خدا کے جامع اور مکمل ہونے پر ایک وقت وہ کاشف الغطا یقین تھا کہ روئے زمین کا ہادیٔ اعظم اور سالارِ انبیاء وفات سے چار دن پہلے بیہوشی کے عالم میں قلم دوات اور کاغذ طلب فرماتا ہے کہ ایک تحریر لکھ دے جسکے بعد اُمت گمراہ ہونے نہ پائے، لیکن عرب کی اُس بہترین اُمت کا وہ اولو العزم متقی عمرؓ اِس فرمائش کو سنکر ذرا نہیں گھبراتا اور اطمینانِ قلب کے ساتھ کہہ دیتا ہے کہ ختم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مرض کی شدت ہے جس کی وجہ سے بے ربط باتیں کر رہے ہیں ورنہ کتابِ خدا تو ہمارے لیئے ابد الآباد تک کافی ہے، اب اسمیں کچھ نئے بڑھانے کی نہیں رہی!

---

† ان آیات کے مطالب اور سلسلے کیلئے دیکھو بالترتیب صفحہ ۵۶ و صفحہ ۸۶ و صفحہ ۵۸ و صفحہ ۹۳۔ ‡ دیکھو صفحہ ۹۳ آیہ (۶: ۱۱۶)

منجانب اللہ اور مکمل یقین کرتے ہوئے اِس نتیجے پر نہیں پونہچ سکتے تھے کہ اسلام کے حقیقی محافظؐ نے
قرآن کی آیاتِ بیّنات میں مسلمانوں کی حالتِ ضعف کا، اُن کے عہدِ قوت کا، اُن کے وقت جنگ کا،
اُنکے خوف و حُزن کا، ان کے دورِ امن کا، ان کے انفرادی مقام اور اجتماعی حیثیات کا، الغرض ان کی
دائمی بہبودی کا کامل دستور العمل جمع کر دیا ہے؟ کیا امن اور تہذیب، اجتماعی تقدم اور علم، تغلب اور
تمکن، قضا اور قانون کا لائحہ عمل ڈھونڈتے وقت وہ اُن قطعی اور عام احکام کو پیشِ نظر نہیں رکھتے تھے جو
مسلمانوں کو ہر ممکن حالت میں صراطِ مستقیم دکھانے کیلئے کافی تھے، اور جن میں شارعِ اسلامؐ نے صاف
صاف فرما دیا تھا کہ اللہ کا طریقہ معلوم کرنے کے لیئے کلامِ الٰہی کی حکمت اور موعظت یکسر کافی ہے، بلکہ دینی
اور دنیاوی سب معاملات کی بہترین حَکَم خدائے عظیم کی یہی مفصّل اور جامع و مانع کتاب ہے!

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۚ وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ
الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ○ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ
رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○ وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ
فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ○
إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ○† (۶: ۱۱۵-۱۱۸)

---

† ان آیاتِ الٰہی کے مطالب کی تشریح کا ایک حصہ صفحہ ۹۰ کے تحت المتن میں گذر چکا ہے۔ یہاں پر ایک دو باتیں جو نہایت قابلِ غور ہیں بیان کر دی جاتی ہیں۔ اور وہ "یَعْلَمُوْنَ" (۶: ۱۱۵) اور "السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" (۶: ۱۱۶) اور "إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ" (۶: ۱۱۷) اور "أَعْلَمُ مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ" (۶: ۱۱۸) کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہاں پر قرآن حکیم کی فضیلت "علم" بتلائی گئی ہے اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ جو لوگ فی الحقیقت اس کتابِ عظیم کا "علم" رکھتے ہیں اُنکو یقین ہو چکا ہے کہ یہ کتاب اُس "السَّمِيعُ" اور "الْعَلِيمُ" یعنی ہر شے سمع رکھنے والے اور ہر شے علم والے کے ہاں سے اُتری ہے۔ (۶: ۱۱۵) میں قرآن کے مفصّل اور مصدرِ علم ہونے کا دعویٰ ہے تو (۶: ۱۱۶) میں اُسکے مکمل یعنا قابلِ بدل، صادق اور عادل ہونے کا اعلان ہے۔ (۶: ۱۱۷) میں کہا گیا ہے کہ اس کتاب کا بتایا ہوا دستور العمل ہی "سبیلِ خدا" ہے اسلیئے کہ صحیح "علم" پر مبنی ہے اور جو شے اُس علم کے مخالف یا ماسوا ہے "ظن" ہے۔ گمراہی یہی ہے کہ اس لائحہ عمل سے پرے ہٹا جائے اور اس علم کو نظر انداز کر دیا جائے۔ "ہدایت" یہ ہے کہ اس خزینۂ علم کو مستقل دستور العمل بنا لیا جائے۔

اِن نکات کو پیشِ نظر رکھ کر (۶: ۱۱۷) اور (۶: ۱۱۸) کے مطالب کا انطباق صفحہ ۸۰ کے متن کی آیات (۵۳: ۲۸) اور (۵۳: ۳۰) سے ظاہر ہے اور "سبیل" کے معانی عیاں ہو جاتے ہیں۔ گویا "سبیلِ خدا" وہ ہے جو "علم" سے حاصل ہو اور چونکہ "علم" سمع و بصر اور فواد سے حاصل ہوتا ہے اس لیئے جو شے مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہو وہ "سبیلِ خدا" ہے۔ "السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" خدا کا بھیجا ہوا کلام بھی علیٰ ہذا القیاس "علم" ہے۔ اور اسکے پر چلنا بھی سبیلِ خدا پر چلنا ہے۔

تو کیا یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میں (یعنی رسولؐ) ماسوا خدا کے کوئی اور حَکَم تلاش کروں، اور تمہارے معاملات کا قرآن کے ماسوا کسی اور کتاب کے مطابق فیصلہ کیا کروں، حالانکہ اس خدا نے تمہاری طرف مشرح اور مبسوط کتاب بھیجی جسمیں ہر طرح کی تفصیل موجود ہے۔ اور جن لوگوں کے لیئے درحقیقت ہم نے یہ کتاب بھیجی ہے وہ تو خوب جانتے ہیں کہ یہ خدا ہی کی طرف سے ہی، اور حقائق عالیہ سے پُر ہے۔ تو اے پیغمبر! ان کفو عتراضات کو سن کر اس کتاب کے مفصل اور کامل ہونے میں کہیں شک نہ کرنا۔ تمہارے پروردگار کے سب کلمات اس کتاب میں صدق و عدل پر ختم ہو گئے ہیں، اب کچھ بات کہنے کے لائق نہیں رہی، اور نہ اس کے کلمات کے صدق و عدل کو کوئی خارجی طاقت ہی بدل سکتی ہے، اور وہ خدائے علیم انسانی ضروریات کو بڑا سمجھنے والا اور آئندہ احوال کا بڑا علم رکھنے والا ہے۔ اور اے پیغمبر! اگر تو اس کتاب خدا کو چھوڑ کر اکثر ان کی جو زمین میں بستے ہیں، پیروی کرے گا تو وہ تم کو خدا کے راہ راست سے بھٹکا دیں گے۔ یہ لوگ تو محض ظنیات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور نری اٹکلیں دوڑاتے ہیں، علم و یقین کا ان میں نام تک نہیں۔ تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اسکے دکھائے ہوئے رستے سے بھٹک رہا ہے اور کون صراط مستقیم پر ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ○ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ○ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ شَهِيدًا ۖ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ○ † (۲۹: ۵۰-۵۲)

† ان آیات الٰہی میں معترضین کی اس فرمایش کو کہ رسول خدا پر نشانیاں (یعنی معجزے) اُترنے چاہیئے تھے، مسترد کر دیا گیا ہے اور کہا گیا ہی کہ معجزے خدا کے پاس ہیں، اور رسولؐ تو تم کو اجتماعی ہلاکت سے ڈرانے کیلئے آئے ہیں۔ تماشہ دکھلانیکے لیئے نہیں آئے۔ آگے چلکر فرمایا ہے کہ یہ قرآن عظیم بذات خود ایک آیت الٰہی (معجزہ) ہے کیونکہ لوگوں کے پاس جو تعامی بقا اور امن کی بشارت (رَحْمَةً) لیکر آیا ہے اور اسکے ذریعے سے مستقل عبرت (ذِكْرَىٰ) حاصل ہوتی ہے۔ کیا یہ معجزہ کم ہے کہ تمہارے پاس ایک شخص ایسے جلیل القدر صفات کا کلام لائے جو آسمان و زمین کا کامل علم رکھتا ہو (يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ) گویا یہاں پر بھی قرآن کی فضیلت "علم" بتلائی گئی ہے اور اسی لحاظ سے اسکو تمام معجزوں سے برتر قرار دیا گیا ہے۔ جو نادان قرآن کو معجزہ اسلیئے قرار دیتے ہیں کہ اسکی شاعری اور فصاحت بیمثال ہے ان کے لیئے یہ آیات از بس قابل غور ہیں۔ یہ نکتہ اور بھی واضح اسوقت ہو جاتا ہے جب ان آیات سے پیشتر کی آیت یعنی بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ (۲۹: ۴۹) کو پیش نظر رکھا جائے۔ جہاں صاف طور پر فرمایا گیا ہی کہ "یہ قرآن عظیم صاحب علم لوگوں کے سینوں میں روشن اور ناقابل انکار آیات (احکام) کا مجموعہ ہے"۔

ان آیات کا آخری حصہ یعنی وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (۲۹: ۵۲) بھی نہایت قابل غور ہے۔ یہاں پر معجزات پر ایک نہایت خفیف اور حسنی خیز چوٹ کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ معجزات کو دیکھ سنکر کسی کو رسول خدا ماننا فی الحقیقت ایک ناپائدار اور غیر قائم ظنی اور وہمی باتوں پر ایمان لانا ہے۔ اسمیں کلام نہیں کہ بڑے سے بڑے معجزے کا اثر بھی مقامی اور وقتی ہی ہوتا ہے اور کچھ مدت کے بعد زائل اور باطل ہو جاتا ہے۔ یہاں

اور یہ جو عرب لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس شخص پر اپنے پروردگار کیطرف سے عجیب غریب نشانیاں کیوں نہیں اُتریں تو اے پیغمبر ان سے کہدو کہ معجزے تو خدا ہی کے پاس، اور اُسی کے دست قدرت میں ہیں، اور میں تو صرف ایک ایسا خدا سے ڈرانے والا اور احکام کو کھلے طور پر بیان کر دینے والا ہوں۔ کیا ان لوگوں کے لیئے یہ بات کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب اُتاری جو انپر واضح کر دیجاتی ہے، اور یہ اُس قوم کے لیئے جو اسکے حقائق عالیہ پر ایمان رکھتی ہو، رحمت اور نصیحت ہے۔ ان سے کہدو کہ میرے اور تمہارے درمیان خدا گواہ بس ہے۔ وہ آسمانوں اور زمین کی سب باتوں کا علم رکھتا ہے، اور جو لوگ ظنی اور وہمی، باطل اور غیر یقینی باتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں اور خدا کے نافرمان ہیں وہی بالآخر گھاٹے میں رہیں گے۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ† الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ (۱۶: ۱۲۵)

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۹۴) معجزات کی ماہیت سے بحث کرنے کا مقام نہیں اور نہ اُن کے وجود سے انکار کرنا اس کتاب کا منتہائے نظر ہے۔ یہ بحث غالبًا تیسری جلد میں نہایت شرح و بسط سے کیجائے گی اور بتایا جائے گا کہ قرآن عظیم کسقدر کم از کم اپنے عہد نزول میں معجزوں کو غیر ضروری گردانتا ہے اور اپنی صداقت کا تمام تر دارومدار اپنے علم اور حکمت کو قرار دیتا ہے۔ مگر سورت یہ ظاہر ہے کہ خدا کو جو رسول اور عوام کے درمیان گواہ ٹھیرایا گیا ہے؛ (قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا) اس سے مقصود یہی ہے کہ یہ کتاب جو ان کے سامنے ہے مخزن علم ہے اور اُس ذات پاک کی اُتاری ہوئی ہے جو آسمانوں اور زمین کا علم رکھتا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ ہے، قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۵: ۶)، یعنی اے پیغمبر اعلان کر دو کہ اس کتاب کو اس پاک ذات اور عالی تبار خدا نے اُتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید کا علم رکھتا ہے؛ گویا کہا گیا ہے کہ اس کتاب کو بطور خود جانچ تول کر دیکھ لو اگر اس میں وہ علم اور حکمت موجود ہے جو تم کسی خدا کی بنائی ہوئی کتاب میں ہونے کے متوقع ہو تو اسکو مان لو، ورنہ رد کر دو۔ یہی میری صداقت کی دلیل ہے۔ میں معجزوں سے اپنے آپ کو منوانا نہیں چاہتا۔ اور جو لوگ صرف معجزوں کے ذریعے سے کسی کی سچائی کو آزمانا چاہتے ہیں اور نفس پیغام کو نہیں دیکھتے، یا جو سرے سے خدا کے منکر ہیں اُنہی کو نقصان پہنچتا ہے کیونکہ ہر کس و ناکس کچھ نہ کچھ خرق عادت باتیں دکھلا سکتا ہے یا دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ بجلی میری وجہ سے گری، یہ قحط میری بددعا سے پڑا وغیرہ وغیرہ۔

آج چونکہ مسلمانان عالم نے قرآن کو اس نظر سے دیکھنا چھوڑ دیا ہے اور علم و مشاہدے کو چھوڑ کر باطل اور بے حقیقت باتوں پر ایمان لائے ہوئے ہیں اسی وجہ سے وہ گھاٹے میں ہیں (اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ) اور اسوقت تک رہیں گے جبتک حقیقت کو اپنا رہنما نہ بنائینگے۔

† کلام خدا کو بار بار ‹الْحِكْمَةَ› کہا گیا ہے جیسا کہ صفحہ ہذے تحت المتن کی آیات (۲: ۱۶۲)، (۲: ۱۵۱)، (۲: ۱۲۹) اور (۴: ۱۱۳) سے ظاہر ہے قرآن کے لیئے ‹مَوْعِظَةٌ› کا لقب بھی تین بار آیا ہے جیسا کہ صفحہ ۹۰۰۔ ۹ کے تحت المتن کی آیات (۳: ۱۳۸)، (۱۰: ۵۷) اور (۱۱: ۱۲۰) سے ظاہر ہے۔ اس بنا پر آیت کے مطالب صاف ہیں یعنی لوگوں کو اس قرآن ہی کے دستور العمل کی طرف بلاؤ۔ کیونکہ خزینہ علم و حکمت ہونیکے باعث سبیل رب یہی ہے۔ ماقبل کی آیات (۱۱۹۔۱۲۴) سے بھی مطلب کا تطابق بہی ظاہر ہو۔ جن لوگوں نے اس آیہ شریفہ کے یہ معانی سمجھے ہیں کہ عوام کو حکمت (یعنی دانشمندی) سے، اور اچھی اچھی نصیحتیں کر کے اپنے پروردگار کی طرف بلایا کرو، وہ ایک سطحی، لایعنی اور غیر متعین بات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اور اصلیت کو پہنچنے کی سعی نہیں کرتے۔ ان کا مقصود صرف جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ کے الفاظ سے پورا ہو سکتا تھا۔ پھر تکرار کی ضرورت کیا تھی۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن مصدر علم و یقین ہے۔ پس اسی کو بنیاد قرار دیکر سبیل خدا کی طرف لوگوں کو بلاؤ۔ یہ علم و یقین کیطرف رہنمائی کرنا ہی سبیل خدا پر چلانا ہے۔ دیکھو تحت المتن * صفحہ ۹۲ و ۹۳۔

اے پیغمبر! اپنے پروردگار کے راہ راست کی طرف لوگوں کو اس قرآن ہی کے ذریعے سے بلایا کرو، کیونکہ یہی حکمت کاملہ اور موعظہ حسنہ ہے۔ اور اگر ان کے ساتھ اس کے متعلق کوئی بحث چھڑ جائے تو نہایت سنجیدہ طور پر اور نرمی سے کرو۔ پھر اس کے بعد جو اُسکے دکھائے ہوئے راہ راست سے بھٹک گیا، اور جو ہدایت پاگیا اُن سے خدا ہی بہتر واقف ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ† ○ (۵ : ۴۵)

اور جو لوگ ہر اہم معاملے میں کلام اللہ کو حَکَم نہیں ٹھیراتے وہی 'ظالم' ہیں۔ (اور ہلاکت کے مستوجب دیکھو صفحہ ۸۱۔ آیات (۲۸ : ۵۹)' (۶ : ۴۷-۴۸))

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ† ○ (۵ : ۴۷)

اور جو لوگ ہر دور رس معاملے میں قرآن سے اخذ نتائج نہیں کرتے وہی 'فاسق' ہیں۔ (اور ہلاکت کے اہل (۴۶ : ۳۵) دیکھو صفحہ ۸۱۔ اور تحت المتن صفحہ ۸)

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ† ○ (۵ : ۴۴)

اور جو لوگ ہر معاملے کے متعلق کتاب خدا کو حَکَم نہیں ٹھیراتے وہی منکر خدا ہیں۔ اور اجتماعی ہلاکت کے اہل

آج قانونِ اُمم کی یہ مفصل کتاب، یہ سُنّت خدا کا نا ممکن التبدیل مرقع، یہ آئینِ حکمۂ قضا و قدر، یہ علمی معجزات کا سحرستان جلال‡ انسان کی قرنہا قرن کی باطل آرائی، طرفہ اندیشی، اور عجائب نوازی کے بعد

---

† ان تینوں آیتوں میں 'کفر'، 'ظلم'، اور 'فسق' کے الفاظ ایک ہی موضوع کے متعلق استعمال کیے گئے ہیں۔ قرآن کی لُغت میں یہ تینوں اصطلاحیں اسقدر خوفناک اور لرزہ انگیز ہیں کہ کسی قوم پر ان کا خدائی اطلاق اسکو انتہائی سزا کا مستوجب یکسر قرار دیتا ہے۔ صفحہ ۸۱ کے متن میں کتاب خدا کا محاکمہ ظالم اور فاسق اقوام کے بارے میں پیش کر دیا گیا تھا، اور وہ یہ تھا کہ ایسی قوموں کی ہلاکت روئے زمین پر یقینی ہے، دیکھو آیات (۲۸ : ۵۹)' (۶ : ۴۷)' (۴۶ : ۳۵)۔ یہی بات آیات لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ (۱۴ : ۱۳-۱۴) سے بھی ظاہر ہے جو صفحہ ۴۲ کے متن میں آچکی ہیں۔ کافر قوم کے متعلق یہی محاکمہ قرآن میں جابجا موجود ہے۔ سورۂ مومن میں ہے: فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۴۰ : ۲۲)، یعنی پھر انہوں نے کفر کیا تو خدا نے بھی اُن کو دھر پکڑا اور یکسر ہلاک کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ خدا بڑا طاقتور اور شدید العقاب ہے۔" گویا کفر اور اجتماعی ہلاکت آپس میں توام ہیں۔

سورۂ سبا میں سیل عرم کی ہلاکت کے بعد ہے: ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ○ (۳۴ : ۱۷) "یہ تھی سزا جو ہم نے اُن کو کفر کی پاداش میں دی، اور کیا سوائے کافر قوموں کے ہم کسی اور کو بھی ایسا بدلہ دیتے ہیں" یعنی نہیں دیتے، گویا ظاہر ہے کہ کافر قوم کی ہلاکت بھی روئے زمین پر یقینی ہے۔ اس نصّی شہادت کی بنا پر ہم نے متذکرۂ متن آیات کے ترجموں میں "ہلاکت کے اہل" کے الفاظ زیادہ کر دیئے ہیں۔ رہا یہ امر کہ 'ظالم' اور 'فاسق' اور 'کافر' کی کیا تعریف ہے، یہ بحث نہایت طول طویل ہے۔ اور آئندہ مجلدات میں تبدیج اس عظیم الشان راز کو کھول دیا جائے گا۔ کتاب اللہ کو حَکَم ٹھیرانے کے معنی یہی ہیں کہ تمام اعمال میں قانونِ خدا کی عملی متابعت ہو جو آجکل کے نام نہاد مسلمانوں میں قطعاً نہیں ہے۔

‡ وادین کے درمیان گھرے ہوئے ان چاروں الفاظ میں بالترتیب آیہ (۶ : ۱۱۵) صفحہ ۹۳ (مُفَصَّلًا)، آیہ (۶ : ۱۱۵) صفحہ ۹۳ (لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ)، آیات (۵ : ۴۴، ۴۵، ۴۷، ۴۸) صفحہ ۹۶۔ اور آیات (۲۹ : ۵۰-۵۲) صفحہ ۹۴ کی طرف اشارہ ہے۔

طاقِ نسیان ورِیا کا وہ ناقابلِ فہم اور ناکاربر آرد فتر بن چکا ہے کہ اُس کے بارے میں اُمّت حاضرہ کی غلط رَوی کو دیکھکر عقل کانپ اُٹھتی ہے۔ اُسکی تعلیم و تعظیم کے اکثر مدّعی آج کشور کشائی اور جہانبانی، قوّت اور امن، تمکن اور تغلّب کے سب اگلے اور شکر انگیز ارمانوں کو پاؤں سے ٹھکرا کر خوف و مسکنت، ذُلّ و اِمساک، اور عجز و خمول کے عبرت انگیز ماحول میں، حجروں کے اندر بیٹھے، کبر موتیت میں مگن ہیں۔ اُسکی رَواں تلاوت کو دارِ آخرت کی طلسمی کلید سمجھتے ہیں، اُسکو اکثر بجھارت اور چیستاں بنائے بیٹھے ہیں، کہیں اُسکو پُڑیوں میں لپیٹ کر بیچا جا رہا ہے، کہیں اُسکے تعویذ بنکر گلے کا ہار ہو رہے ہیں، کہیں اُسکی خوب خوانی پیٹ کا ایندھن بن رہی ہے، کہیں خوش اعتقاد اسکو گھول گھول کر پی رہے ہیں، کہیں ستم ظریف پھونکیں مار مار کر اُڑا رہے ہیں، کہیں اُسکے اوراق میں کسی اسمِ اعظم کی تلاش ہے، کہیں اسکو رَٹ رَٹ کر بے اثر کیا جا رہا ہے، کہیں اُس سے مُردے کو ثواب پونہچ رہا ہے، کہیں خدا کو دادِ سخن مل رہی ہے، کہیں تحسین ناشناس اور جاہل کی واہ واہ ہے! نہ غرض و مطلب سے بحث ہے نہ مقصود سے سروکار ہے، نہ تعمیل پیشِ نظر ہے۔ اس کتابِ جلیل سے لے دیکر اگر کچھ اخذ ہو رہا ہی تو یہی استخارے اور فالنامے† ہیں، تمائم اور ٹوٹکے ہیں، فسونی اور سحری اعمال ہیں، اور اگر کوئی طبقہ اِن مُہلک اثرات سے

† ایک استخارہ نامہ اسی قطع کا حال ہی میں میری نظر سے گذرا ہے جسکو طابع اور ناشر نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کی غرض سے علامہ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ (المتوفی ۶۳۸ھ ۱۲۴۰ء) اندلس کے مشہور فقیہ اور محدث، اور صاحبِ الفتوحات المکیّۃ کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس طومار نویس متکلم کے بارے میں، جس نے اپنی عمر میں ۲۸۹ کتابیں لکھیں، اور جو ظاہریہ فرقے کا رکن رکین شمار کیا جاتا تھا، وثوق سے معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں تک یہ مختصر رسالہ اُنکے قلم سے نکلا ہی، مگر جرمن مستشرق بروکلمین نے اسکی ایک سو پچاس موجودہ تصانیف کی جو فہرست دی ہے، اُسمیں اسکا کہیں مذکور نہیں۔ تاہم اسکی بعض تصانیف کے مذاق کو پا کر جنمیں سے اکثر جفر اور رمل، اور اعتقاداتِ واہیہ پر ہیں، عجب معلوم نہیں ہوتا کہ یہ استخارہ نامہ بھی اسی عجب ایجاد شخص کے ہاتھ کا لکھا ہُوا ہو۔ لیکن مصنف کی ذات سے قطع نظر، جس مکر و فریب سے طابع صاحب نے اس رسالے کو عوام کی نظروں میں عجیب و غریب ثابت کرنے کی سعی کی ہے جس دیدہ دہنی سے اسکی طلسمی جداول کو قرآن کا زندہ معجزہ بتایا ہے، اور جو ادّعا مصنف کی اسرار دانی خدا اور رسالے کی حقانیت کے بارے میں کیا ہے، اُسکا پول کھول دینا لازمی ہے۔ مصنف نے اس رسالے میں ۲۳ جدولیں تیار کی ہیں۔ ہر ایک جدول میں ۱۰ خانے شرقاً غرباً اور ۱۰ خانے شمالاً جنوباً کھینچے ہیں۔ پھر قرآن کی پانچ حسبِ حال آیتوں کے ٹکڑے لیکر (یعنی وہ ٹکڑے جن سے سائل کے مطلوبہ سوال کے جواب کا ہاں یا نا، سعد یا نحس، مخالف یا موافق ہونے کا اندازہ ہو سکے) ہر جدول کے ۱۰۰ خانے اس انداز سے پُر کر دیئے ہیں کہ ہر ٹکڑے کا ایک ایک حرف علی الترتیب چار متصل خانے چھوڑ کر پانچویں خانے میں سما جائے۔ مثال کے طور پر پہلی آیت کے حرف خانہ نمبر ۱، ۶، ۱۱، ۱۶ وغیرہ میں، دوسری آیت کے حروف خانہ نمبر

نسبتاً محفوظ ہے تو اسمیں مقاصدِ قرآن کے بارے میں ہولناک افتراق ہے۔ ذہنی ویرانیاں اور غوغائے قیامت ہے، سطحی حیص بیص اور لفظی تنازعے ہیں، تفریقِ آرا ہے، انتشارِ نظر ہے، تشتتِ عمل ہے! ایسا تختۂ مشقِ اختلاف قرآن، ایسا مجموعۂ شعر و سخن قرآن، ایسا سحری اور طلسماتی جدول، ایسا کاہنی بُطّا عمل، اُمت کے افراد میں کیا اتصال اور کیا اتحاد کا رپیدا کر سکتا ہے۔ اُنکی نظروں میں یہ اختلاف شکستہ ہی قرآن کی اکثر ہدایت ہے، بشارت اور رحمت ہے، نور و شفا ہے! عرب کی جاہلی عادتوں اور وہمی عقیدوں کا پُرانا خمیر مسلمانوں کی اعتقادی زندگی میں اِس تیزی سے سرایت کر چکا ہے کہ اب اُن کے طرزِ تخیل سے اِس اثر کو دور کرنا گوشت کو ناخن سے جدا کرنا ہے۔ آج دینِ متین کے باقی عَلَم بردار اہلِ عجم بھی عرب کی اِن روایات کے اعلا اور آیاتِ خدا کی تکذیب کے جُرم میں تیرہ سو برس کی خواب آور مُہلت کے جدر فتہ رفتہ اُسی موت و فنا کے گھاٹ اُتر چکے ہیں جس پر اُن کے پیشوا اہلِ عرب کئی سو برس پہلے اُترے تھے!

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَأُمْلِي لَهُمْ ۚ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ۝ (۷: ۱۸۲-۱۸۳)

لوگو! سُن رکھو کہ جس قوم نے ہماری آیات کی تکذیب کی، جسنے اُنکو حقیقت کے بلند مرتبے سے گرا کر جھوٹ بنا دکھایا، ہم اُنکو نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ ہلاکت کیطرف گھسیٹ لیجائینگے اور کچھ مدت تک اُنکو ڈھیل بھی دینگے کہ خوب نیند کر لیں کیونکہ میرا داؤ بیشک بڑا پکا داؤ ہے۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۹۷) ۲، ۷، ۱۲، ۱۷ وغیرہ میں، تیسری آیت خانہ نمبر ۳، ۸، ۱۳، ۱۸ میں علیٰ ہذا القیاس باقی دو آیتیں بھی باقی خانوں میں اسی ترتیب سے بھری گئی ہیں۔ پھر اس جدول کو خوش اعتقاد سائل کے سامنے رکھکر حکم دیا گیا ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے کسی خانے پر انگلی رکھے۔ اور اُس حرف سے شروع کر کے آگے اور پیچھے کے چار خانوں کو علی التواتر چھوڑ کر سب حرف لکھتا جائے یہ سب حروف ظاہر ہے کہ اُن پانچ آیتوں میں سے کسی ایک آیت کے ہونگے۔ اس لایعنی عمل کو دیکھکر بیوقوف شخص حیران رہجاتا ہے کہ یہ کیا کرامت ہے جس حرف پر انگلی رکھتے ہیں ایک قرآنی آیت بنجاتی ہے اور ہمارے سوال کا جواب خود بخود دیدیتی ہے۔ استخارہ نامہ میں کل ۲۳ جدولیں موجود ہیں مگر طالب صاحب کو واضح رہے کہ تئیس کیا ایسی تئیس ہزار طلسمی جدولیں چشم زدن میں تیار ہو سکتی ہیں اور نہ صرف قرآن کی آیتوں سے بلکہ کوک شاستر کے ہر اشلوک سے بھی! رہا مصنف کی اسراردانی اور تقرب کا عقیدہ، سو اسکی نسبت اسیقدر کہدینا کافی ہے کہ جس شخص نے اپنی عمر کے ۷۵ برس میں بالاوسط ہر برس چار کتابیں لکھی ہوں اُسکے زود نویس قلم سے بعض اوقات ایسی لایعنی تصنیف کا نکل جانا کچھ تعجب خیز نہیں۔

✽ یہاں ترجمے میں ہم نے 'تکذیبِ آیات' کے صحیح مفہوم کی ایک ادنیٰ صورت پیش کر دی ہے اور اشارہ کر دیا ہے کہ کسی حقیقت پر جھوٹ کا لباس اوڑھا دینا بھی 'تکذیب' ہی ہے۔ اس تکذیب کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اُس حقیقت کے متعلق تذبذب یقین و ایمان پیدا ہو جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اسکی تعمیل متعذر ہو جاتی ہے۔ یہ فقدانِ عمل ہی صحیح معنوں میں تکذیب ہے جیسا کہ کچھ دیر بعد چل کر ظاہر ہوگا۔

مگر **یونانی فلسفے** اور **عرب تخیل** کے اِن تمام ضعفِ ایمان، اور مخربِ عمل اثرات کے علاوہ دنیائے اسلام کو دائرہ عبودیت اور حلقۂ صلاحیت† سے حقیقی اور معنوی طور پر خارج کرنے، اور آج وراثتِ زمین سے یکسر محروم کردینے کا سب سے بڑا باعث وہ طریق اجتہاد تھا جو صاحب شریعت (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی وفات کے کچھ دیر بعد ہی اسلام میں شروع ہوگیا تھا۔ اِس سمت تخیل نے جس سرد مہری، ناآشنائی اور بے دردی سے اسلام کے آباد آشیان کو بے رونق کیا، جس رعونت اور استغنائے اسکی خانہ براندازی کی، جو نقصان عظیم رفتہ رفتہ اور نامحسوس طور پر مسلمانانِ عالم کی علمی اور تمدنی، ذہنی اور اقتصادی زندگی کو پہنچایا، تاریخ عالم میں تخیل کی حیرت انگیز انقلاب آفرینی کی واحد مثال ہے! مگر اس اہم موضوع کے مطالب دلنشین کرنے کیلئے ایک مستقل اور طول وطویل بحث‡ کی ضرورت ہے جو قرن اولیٰ

---

† صفحہ ۷۰ کی آیات (۲۱: ۱۰۵-۱۰۷) کی طرف اشارہ ہے۔

‡ یہ بحث اسقدر طول وطویل ہے کہ غالباً آیندہ تین یا چار مجلدات سے پیشتر ختم نہ ہوسکے گی۔ اسمیں بتدریج تمام اُس ہلاک اور جمود انگیز تخیل کی تکذیب کردی گئی ہے جسکے باعث اسلام آج محض اعتقادی اور نظری، نقلی اور رسمی شئے کا نام بن گیا ہے، اسی وجہ سے اسکا حتماً کچھ واسطہ نہیں رہا۔ سب اعتقادات اور معاملات عالم قول وخیال میں منتقل ہوگئے ہیں یا اُن کے مقاصد واغراض قطعاً بدل چکے ہیں اور فعل وعمل کے لائق کوئی شئے نہیں رہی۔ یہ معرکۃ الآرا بحث دراصل آیۂ استخلاف (۲۴: ۵۵) صفحہ ۷) کے الفاظ 'اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ' کی تشریح ہی ہے اور اسی ضمن میں کلام الٰہی کے ایک معتدبہ حصے کے مطالب بھی عیاں ہوگئے ہیں صفحہ ۲۳ کے اُس عبرت آموز سوال کا جواب کہ آج تیرہ سو برس کے بعد مسلمانانِ عالم کیوں وراثت زمین سے محروم کردیئے گئے، اور مغرب کی بیدار قومیں کیوں انکی مستخلف بن چکی ہیں، نیز اس اثنا میں نظرانداز نہیں کیا گیا۔ جہاں جہاں موقع ملا ہے جواب کی مختلف شقیں ظاہر ہوتی گئی ہیں حتیٰ کہ عنوان عمل کے اخیر میں (جو غالباً پانچویں مجلد ہوگی) اس جواب کو حتماً طے کردیا ہے۔ اس مجلد میں باقی بحث صرف لفظ 'ایمان' اور اسکے تکیف پر ہے۔ پھر اسکی اہم شرائط کو پیش نظر رکھکر ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام کا واحد منتہائے نظر کیا تھا۔ اسکا تمام دستور العمل کس مستقل نصب العین کے درپے تھا۔ وہ مطمح نظر کیونکر حاصل ہوا تھا اور آج کیوں نظروں سے اوجھل ہوگیا ہے وغیرہ۔ مجلد کا آخری حصہ 'عبادات' کی اساسی حکمت عملی پر مشتمل ہے۔ اسلام کے موجودہ ماحول میں یہی وہ اہم اوامر ہیں جو دین اسلام کے ارکان خیال کیے جاتے ہیں اور انہی پر 'اعمال صالحہ' کے الفاظ کا اکثر اطلاق آجکل ہوتا ہے۔ اِس بنا پر کتاب کے ابتدائی حصوں میں 'عبادات' کے صحیح مفہوم کو واضح کردینا انسب معلوم ہوتا ہے۔

کتاب کا مستقل حصہ دراصل اسی عنوان سے شروع ہوتا ہے جو آیندہ اوراق میں قائم کیا گیا ہے۔ مقدمۂ کتاب میں صرف اُن دعاوی کو پیش کیا گیا تھا جو قرآن حکیم نے اپنے بارے میں کیئے۔ قرآن کی تعلیم یا تجویز وتدبیر سے اُس حصے کو چنداں سروکار نہ تھا۔ آیندہ اوراق میں قریباً پانچ جلدوں کے اندر کتاب الٰہی کی 'تعلیم' پیش کردیجائے گی، اور ثابت ہوجائے گا کہ تاسیس جماعت کے متعلق قرآن کی تجویز وتدبیر کس قدر حکمت کاملہ سے پر ہے اور کس صحت واستقلال سے اُن دعاوی کی تائید کرتی ہے جو اس حیرت انگیز کتاب نے اپنے بارے میں علی الاعلان کیئے۔ اِس مجلد میں بالخصوص 'عبادات' کی حکمت اور تاسیس جماعت کے چند اساسی اصول پر بحث کی جائے گی جیسا کہ گذر چکا ہے۔ باقی اصولوں اور بالخصوص 'معاملات' اور 'عملیات' پر

کی اعتقادی اور سیاسی زندگی، اور قرآن حکیم کے اجتماعی دستور العمل کے متعلق ہے۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۹۹) بحث بعد کی چار جلدوں میں ہوگی۔ انہی مجلدات میں ضمناً 'معتقدات' کی حقیقت کا انکشاف کر دیا جائیگا۔ تین یا چار جلدیں علم القرآن ('معلومات')، تاریخ القرآن ('ماجریات') اور طریق عمل کے متعلق ہونگی جو اِس کتاب کا آخری حصہ ہے۔

'معاملات' کی بحث کے ضمن میں اسلام کی موجود فرقہ آرائیت کا پول کھول دیا جائے گا، اور ثابت کر دیا جائے گا کہ ایک خدا، ایک رسول، اور ایک قرآن کے ہوتے ہوئے صراطِ مستقیم بھی صرف ایک ہی ہے۔ سب فرقہ بندی اور تشیع، رہبانیت اور غلط تخیل زہد، غلو فی الدین اور مُلّائی افراط و تفریط وغیرہ وغیرہ کتاب الٰہی کے منشا کے نقیض اکثر عیاں کر دیجائے گی۔ دین اسلام کے موجود پر سے عارضی اور اکتسابی غلاف اُلٹ کر اسکو صحیح معنوں میں 'فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا' (۳۰ : ۳۰، صفحہ ۴) کا مصداق ثابت کر دیا جائیگا! یہ حقیقت کہ ہے از سرِ نو منکشف کر دیجائے گی کہ اسلام وہ راہِ عمل، وہ مذہب سعی و کار، اور وہ فطرۃ کاملہ ہے جس پر سطحِ زمین کا ہر فرد بشر بلا لحاظ ملک و ملت مجبول بلکہ مجبور ہے[1]۔ اسی پر چلکر سر تا سر امن ہی امن ہے، جزوی اور اجتماعی امن ہے، فردی اور شخصی امن ہے، اخروی اور دائمی امن ہے۔ اُس سے ذرا ہٹ کر ضعف و شکست ہے، قوموں اور اُمتوں کی شکست ہے، قبیلوں اور گھروں کا انتشار ہے۔ الغرض دینِ الٰہی کو اُمتِ مرحومہ کے مختلف گروہوں اور بھیڑوں کے اعتقادی رنگ سے یکسر آزاد کر کے خدائے واحد کی وحدت انگیز یکرنگی میں رنگ دیا جائے گا۔ اِس نازک موضوع کی بحث و تمحیص سے مفید نتائج برآمد کرنیکے لیے اِس امر کا عمداً خیال رکھا گیا ہے کہ کتابِ خدا کے طالب العلم کے اُن ذاتی جذبات کو جو وہ کسی فرقے سے متعلق ہونے کی حیثیت میں کسی عقیدے یا شخص یا طرزِ عمل کے متعلق اِس کتاب کے کامل مطالعے سے پیشتر رکھتا ہو حتی الوسع کم سے کم ٹھیس لگے؛ حقیقت کی طرف بتدریج اور بالدلیل رہنمائی ہو، جو بات کہی جائے اُسکی سند موجود ہو، محض سفلی جذبات کو بھڑکا کر راہِ راست پر لانے کی بے سود سعی نہ کی جائے۔ اِس مدعا کو پیشِ نظر رکھکر کتاب کی طوالت کا باعث ظاہر ہے۔ میرا مقصود ایک فرقے کو سراہنا، یا دوسرے کی توہین کرنا نہیں بلکہ حتی الامکان اسلام کے سب رسمی ماننے والوں کو ایک مشترک اور صحیح راہ کی طرف انگشت نمائی کرنا ہے۔ اگر جو کچھ میں نے کہا ہے حقیقت ہے تو ذہن خود بخود اسطرف مائل ہوگا، اسکے لیے کسی ناروا ترغیب یا غیر ضروری تشویق کی ضرورت نہیں۔

قارئین کتاب سے صرف اسقدر استدعا ہے کہ آئندہ مجلدات کے ربط اور تسلسل کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ کیونکہ ہر دعوے کی بنا پیشتر کے ثابت کیے ہوئے دعوے پر ہے اور کتاب کے سب آئندہ مباحث ایک سلسلے کی مختلف اور مرتب کڑیاں ہیں۔ اور ایک ہی نتیجے کی طرف استقلال سے جا رہی ہیں۔ اگر تمام کتاب کے سب گذشتہ مطالب درس و تدریس کے کسی مرحلے میں پیش نظر نہ رہے تو قرآن حکیم سے کوئی مدلل نتیجہ اخذ کرنا محال ہو جائے گا۔ اس تصنیف کا سب سے اہم حصہ آخری مجلدات ہیں جنمیں قرآن حکیم کی تمام تعلیم سے کامل تفتیش و تلاش کے بعد مستقل نتائج اخذ کیے گئے ہیں پھر اجل زدہ اُمتوں کے تحفظ و بقا کیلئے ایک اٹل طریقِ عمل مستنبط کر کے مسلمانانِ عالم کو اُنکی حیات و موت کا آخری پیغام دیدیا گیا ہے!

---

[1] فطرت لامحالہ وہ شئے ہے جس سے کسی فرد متنفس کو کسی حال میں مفر نہیں۔ اگر دین اسلام فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ہے جیسا کہ صفحہ ۴ پر دعوے کیا گیا ہے تو وہ بھی بلا شبہ وہ شئے ہے جسکی تعمیل پر سطح زمین کا ہر شخص اُسیطرح مجبور ہے جس طرح کہ اپنی کسی اور فطرت پر، اور جسکے برخلاف چلنے کی فوری سزا بھی اُسیطرح ملنی چاہیئے جس طرح کسی اور فطرت سے باغی شخص کو اس دنیا میں ملتی ہے۔ ایک شخص اگر کھانا نہیں کھاتا یا کئی دن مسلسل نہیں سوتا تو اُسکا جلد مرجانا لازمی ہے۔ اس لیے کہ کھانا اور سونا اس کی فطرت میں داخل ہیں، اور فطرت سے باغی ہونے کی انتہائی سزا ہلاکت ہے۔ پس اِس مقام سے نظر سے دین اسلام بھی وہ طریقِ عمل ہے جس پر چل کر اس دنیا میں ہر جا امن مل رہا ہے جیسا کہ آئندہ اوراق میں چلکر واضح ہوگا۔ وہ کسی رسمی کلمہ شہادت کا پڑھ لینا نہیں جیسا کہ اکثر مسلمان سمجھے بیٹھے ہیں!

مقدمہ ختم ہوا

تکیفِ ایمان و منتہائے اسلام

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۳ : ۱۳۸)

اور تم ہی سب سے برتر ہو اگر ایمان والے ہو

متذکرہ صدر صحبت کے اُس حصّے سے جو تبلیغ دین اور اعلان نبوت کے متعلق ہے، یہ امر واضح ہے کہ داعئ اسلام کی بعثت ائتلاف ملل کے حق میں ایک منبطیر رحمت تھی۔ اعلائے کلمۃ الحق نے اعتقادات کے علاوہ، عرب کی ہیئت اجتماعی میں ایک ناقابل یقین انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ نعرۂ توحید نے، اور اللہ کے برگزیدہ رسولؐ کے خُلق عظیم نے اہل عرب کے سینوں کو چاک کرکے، اُنکے دلوں کو چیر چیر کر، عداوتیں اور کینے نکال لیے تھے! پیغمبر برحق کی بے لوث ریا، اور وقفِ عمل زندگی نے بخل و حسد کے تنگ و تاریک قلوب میں ایمان کا نور، اور اعمالِ صالحہ کی وسعت ویدی تھی! خدائے واحد کی ہستی پر محمّد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی ناقابل انکار شہادت نے ہر متنفس کو اللہ کی حمایت میں آمادۂ عمل کر دیا تھا! خدا کی حقیقت، اُسکی رحمتوں کے دریا، اُسکی حکمت اور علم کے سمندر، اُسکی لاانتہا بخششیں، اُسکی قدرت کاملہ ہساتھ ہی اسکے عذاب کے طوفان، اُسکے زلزلے، اسکی تہس نہس کردینے

† صحبت حاضرہ کے مطالب خاص طور پر قابل غور ہیں۔ آئندہ مباحث، بلکہ ایک رو سے کتاب خدا کی حکمت کو کماحقہ سمجھنے کا اکثر دارومدار اسی صحبت پر ہے تیرہ سو برس کے انقلاب تخیل کے بعد ایمان کی حقیقت کو از سر نو پالینا، یا دل پر اس کا صحیح کیف حال پیدا کرکے پیکر ایمان اور شاہد خدا بن جانا آسان کام نہیں۔ مگر اس فقدان حال اور صورت اشکال کے باوجود قرآن حکیم کے اندر ایمان کی صحیح تصویر اور منتہائے اسلام کی ناقابل انکار دلیل موجود ہے۔ اسی بات کو پیش نظر رکھکر جہاں جہاں اس صحبت کے اندر آیات الٰہی میں ایمان کا لفظ آیا ہے الفاظ کو جلی حروف میں لکھا ہے کہ اس نا قابل تشریح اصطلاح کی صحیح ماہیت سمجھنے میں آسانی ہو۔ اسکی اہم قرآنی شرائط اور لوازم واضح ہوں اور رفتہ رفتہ انسان کے ذہن میں اسکا تکیف بیٹھتا جائے سب سے اہم یہ امر کہ کلام خدا کا طالب العلم بطور خود اس حقیقت کبریٰ کا قائل ہو کہ ہر سچی و کامل ایمان کا جزو لاینفک کس انتہائی حد تک ہے۔ منتہائے اسلام کی حقیقت صفحہ ۱۰۸ پر عیاں ہو گی

والی چیخیں، اسکی بجلیاں، آنکھوں کے سامنے صاف نظر آگئی تھیں؛ اُس رب لم یزل کو جسکی عیب شخصیت وہم کے محیط سے باہر، اور امکان کے نقص سے بری ہے، احمدؐ مرسل (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی حیرت انگیز شناسائی نے ہر شخص کے روبرو عیاں کر دیا تھا! مومنوں کے کانوں میں اسکی صدائیں بلا آگئی تہیں؛ انکی آنکھیں، اُنکے دل، اُنکے ہاتھ، اُس لامکان ذات کو اپنے گھروں کے اندر، میدانوں اور حجروں میں، سجدوں اور دعاؤں میں آشکارا محسوس کر رہے تھے! وہی آسمان و زمین، وہی چاند اور ستارے، وہی زرع و نخیل، جو عرب کی ہموار اور غیر دلچسپ سرزمین میں ہر دم اُن کے پیش نظر رہتے تھے، اِس جویائے حق نبیؐ کی دیدۂ عبرت نگاہ کے باعث **معرفتِ خدا** کے بیکران قدرت اور حقانیت کے بے پایان مظاہر بن گئے تھے!

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَنْبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَّا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْبِتُوْا شَجَرَهَا ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝ (۲۷ : ۶)

لوگو! ذرا سمجھ تو غور کرو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے بنایا؟ اور آسمان سے تم لوگوں کے لئے پانی کس نے برسایا؟ پھر اُسی پانی کے ذریعہ سے ہم نے خوشنما باغ لگائے! لوگو! کیا تم میں طاقت ہے کہ اُنکے درختوں کو اُگا سکو؟ اور کیا پھر اس حقیقت کے عیاں ہو جانے کے بعد سوا خدا کے کوئی اَور قابلِ اطاعت اور لائق عبودیت رہجاتا ہے؟ آہ یہ بے سمجھ لوگ ہیں کہ ناحق دوسری طرف جھکے ہوئے ہیں!

پھولوں کی پنکھڑیوں میں، پرندوں کے پروں اور درختوں کے خوشوں میں صناعِ بے مثال قدرت کا ہاتھ کام کرتا ہوا صاف نظر آدیا تھا!

أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا اللّٰهُ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝+ (۱۶ : ۷۹)

کیا لوگوں نے پرندوں کے حال پر نظر نہیں کی جو فضائے آسمانی میں مسخر ہیں، اُن کو اُڑتے وقت کون سنبھال رہا ہے اور کون سنبھلنے کی طاقت دے رہا ہے؟ جن لوگوں میں ایمان موجود ہے اُنکے لئے اس حقیقت میں بھی غور و فکر کی کئی علامتیں ہیں۔

فطرت کے بدیع الخلق ظواہر اور محیر العقول صنائع کی طرف، کلام الٰہی کی انتھک ترغیب و تحریص نے عرب کی طبائع پر گہرا اور ناقابل انحکاک اثر پیدا کر دیا تھا!

+ اس کا حاشیہ اگلے صفحے پر دیکھو۔

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۗ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۝† (۶: ۱۰۰)

وہی قادر مطلق تو ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم ہی نے اس پانی کے ذریعے سے ہر اگنے والی چیز کی بوٹیاں نکالیں، پھر ان بوٹیوں سے ہم ہی نے ہری ہری ٹہنیاں نکالیں۔ ان سے ہم گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں، اور کھجور کے گابھے میں گچھوں کے گچھے خوشے جو مارے بوجھے جھکے پڑتے ہیں۔ اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار۔ ظاہر شکل و شباہت میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، مگر مزے اور تاثیر میں جدا جدا ہیں۔ تم اسکے پھل کی طرف بغور دیکھو جب نکل رہا ہو اور پک رہا ہو بے شک جن میں ایمان ہے اُن کے لیے اس مشاہدے میں عجیب غریب نشانیاں خدا کی قدرت کی موجود ہیں!

صدیوں کے باطل عقیدوں، خوف انگیز وسوسوں، اور مذبذب قلوب واہموں کے بعد حقیقت کے اس دلنشین انکشاف، اور خدا ہونے کے اس قطعی ثبوت نے بالآخر عرب کے دلوں میں ایمان کا آسمان تاب نور، اور یقین کا عالم افروز شعلہ پیدا کر دیا۔ صداقت کا روح پرور اثر اُنکے بدنوں اور طبیعتوں، دلوں اور ذہنوں میں اسقدر جاری و ساری ہو گیا تھا کہ بمجرد اللہ کا ذکر آنے پر اُن کے دل کپکپا جاتے تھے!*

---

† ضمناً ان آیات الٰہی سے ظاہر ہے کہ اعمال خدا کا مشاہدہ، اُسمیں استقصا اور تفکر، خدا کی عطا کی ہوئی بصر کا استعمال (اَلَمْ يَرَوْا (۱۶: ۷۹)، اُنْظُرُوْٓا (۶: ۱۰۰)) اور کارگاہ فطرت سے طلب علم (دیکھو صفحہ ۷۳) ایمان کے اہم لازمات میں سے ہیں، ان کے بغیر ایمان ناقص اور معرفت خدا محال ہے؟ اس بحث کو یہاں پر طول دینا ضروری نہیں مگر مسلمانوں کو غور کرنا چاہیے کہ آج وہ قَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ کے صحیح مصداق ہیں یا مغربی قومیں جنہوں نے فطرت کا پتا پتا دیکھ مارا ہے!

* سورۂ انفال میں ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۸: ۲)

لوگو! ایمان والے تو وہی بندے ہیں کہ جب خدا کی یاد ان کو آجاتی ہے تو انکے دل ہل جاتے ہیں، اور جب اُسکے احکام (اٰيٰتُهٗ) ان پر واضح کر دیے جاتے ہیں تو انکی تعمیل کا یقین (اِيْمَانًا) اور بھی بڑھتا ہے، اور وہ وہ لوگ ہیں جو حتی الوسع سعی و عمل کے بعد نتائج کے بارے میں اپنے خدا پر بھروسہ کرتے ہیں (يَتَوَكَّلُوْنَ) (توکل کے ان معانی کی توضیح آگے چلکر آئے گی)۔

یہ ایمان والوں کی لرزش کوئی مصنوعی لرزش نہیں جو آجکل لوگ رسماً پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں، اور باوجود مشق کے صحیح معنوں میں پیدا نہیں کر سکتے۔ یہ فی الحقیقت خدا کی عظمت، ہیبت، اور طاقت کا ہول انگیز یقین ہے جو اسکے اعمال کے برای العین مشاہدے اور اس کارگاہ فطرت کی براہ راست بصیرت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہ کیفیت قلب ہے جو آج ان قوموں کو حاصل ہے جو قانون خدا سے ہر دم خوفزدہ رہ کر سعی و عمل میں مصروف ہیں، جو حکم حاکم کو مرگ مفاجات کے برابر سمجھ کر طوعاً و کرہاً اُسکی تعمیل میں لگی ہیں، جو قانون فطرت کے ایک ایک حرف کو بغور سمجھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ لرزش ہمہ تن حاکم کے مقتدر ہونے کی لرزش ہے، اُسکے قانون کو اٹل ماننے کی لرزش ہے، اُسکی سزا کے شدید ہونے کی لرزش ہے، حکم کے ازمنت اور حاکم کے بے پروا ہونے کی لرزش ہے۔ اسی لرزش کا اٹل نتیجہ عمل ہے، احساس فرض ہے، تگ و دو ہے، تکلیف و محن ہے، یہ کوئی دوستی کے باہمی ناز و نیاز، یا عشق کی لطف آمیز چشمکیں نہیں جو مسلمانوں نے رسماً او خاطر خدا سے پیدا کر لی ہیں اور جسکا نتیجہ نادانی خدا کے سوا کچھ نہیں۔

دلوں نے اللہ سے وہ سچا لگاؤ پیدا کر لیا تھا کہ اُٹھتے بیٹھتے ایک دُنیاوی حاکم کیطرح اُسکے حضور میں سراپا ادب اُسکی رحمتوں اور بندہ نوازیوں کے چشم براہ، اور اُسکے قہر سے خوف زدہ رہتے۔ حضوریٔ قلب کی حیات افروز نے اور قربِ رسول کے جرأت آموز اثر نے اُن کو اللہ کی رضا میں مصیبت سے قطعی بے خوف، اور جان سے قطعی بے نیاز کر دیا تھا۔ اُن کے فلک شگاف حوصلے اور کوہ فگن جُرأتیں، اُس احکم الحاکمین کی خوشنودی اور حمایت میں ہر وقت پا بہ رکاب رہتیں! وہ ایک اہل الغرض اور مشاہرہ دار نوکر کی طرح، اُس آنکھوں سے اوجھل ورجلیل القدر ذات کی خوشنودی کی خاطر، اُسکے ادنیٰ اشاروں اور حکموں پر چونک اُٹھتے، اور دوڑ دوڑ کرتے! وہ اللہ کے رعب و وقار اور اُسکے جاہ و جلال کے آگے ہر انسانی منزلت کو بیقدر و قیمت، اور دنیاوی رعب داب کو، ہیچ سمجھتے! وہ اپنے سچے مخدومؐ، اور مقتدر منعم کا بول بالا کرنے کے لئے اپنی جانوں کو ہتیلیوں پر رکھکر قیصر و کسریٰ کے دربار میں، اپنے خرقہ پوش اور اُمّی پیغمبر کا تنبیہی پروانہ بے دہڑک لیجاتے! وہ اپنے حقیقی آقا کا آوازہ بلند کرنے کی غرض سے جان، مال، اور تعلقاتِ دُنیوی کے انقطاع[+] سے ایک لمحے کے لئے دریغ نہ کرتے! وہ ایک مزدور خوشدل کی طرح اللہ کے اس نیک بندے کی حمایت میں تلواروں سے کٹ، اور تیروں سے چھن جاتے مگر ہمت نہ ہارتے! وہ اُس کالی کملی والے رسولؐ کی جانفروشانہ اطاعت میں موت کی آرزوئیں، اور قتل کی منتیں مانتے! وہ اللہ کی کبریائی اور جبروت کے بالمقابل ہر سرکش کا غرور توڑنے کے لئے پہاڑ سے لڑ جاتے اور آسمان سے ہاتھا پائی کرتے! اُن کی مؤدبانہ خدمت اور فدایانہ عبودیت خدائے ذوالجلال کے وجود، اُسکی عالم آرا حکومت، اُسکی عالی مقامی

+ سورۂ مجادلہ میں ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (۵۸:۲۲)

اے مخاطب! جو لوگ خدا کے خدا ہونے پر ایمان لاتے ہیں، اور روزِ آخرت کی جزا و سزا پر یقین رکھتے ہیں، اُن کو تو تم ہرگز نہ دیکھو گے کہ خدا اور اسکے رسول کے مخالفوں یعنی نافرمان بدعاروں کے ساتھ میل جول رکھیں گو وہ انکے باپ یا انکے بیٹے یا انکے بھائی بند یا اہلِ خاندان ہی کیوں نہ ہوں یہی وہ لوگ ہیں جنکے دلوں کے اندر خدا نے ایمان کو گھر نقش کر دیا ہے اور جنکو اپنی ناپیدا کنار طاقت اور رحمت کا ایک حصہ عطا فرما کر انکی مدد کی ہے (ترجمان)۔

اُسکی استقامت عہد، اُسکی سطوت وجبروت، اُسکے جبر و قہر کی وہ زندہ اور زبردست **شہادت** تھی جو ہر منکر کو قائل کردیتی! اُن کی سراپا سعی اور رہینِ عمل زندگی اللہ کی غلامی کو بہترین غلامی، اور اُسکی چاکری کو مفید تر چاکری بنانے کی وُہ بانگِ دُہل اور وُہ صیت ناقوس تھی جسنے اقل قلیل مُدت میں ایک بیکار اور بے حس عالم کو اللہ کی عبودیت پر متفق العمل کردیا تھا!

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ (۲: ۱۴۳)

اور اس تسلیم کی خو اور اللہ کے رنگ میں رنگے جانیکے باعث (دیکھو آیہ (۲: ۱۳۸)) ہم نے تم سب کا ایک مرکز (یعنی قبلہ) قرار دیکر تم عرب کو روئے زمین کی امتوں کا مرجع و مرکز بھی بنادیا ہے تاکہ تم اپنے حسنِ عمل سے تمام دنیا کے سامنے خدا کے وجود کی گواہی دو، اور رسولِ خدا تمہیں اللہ کی گواہی دیتے رہیں!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ ھٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَي النَّاسِ ښ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ (۲۲: ۷۷-۷۸)

✤ "کذٰلِکَ" کا ربط پہلے مضمون کے تسلسل سے ظاہر ہوتا ہے جو آیہ (۲: ۱۲۲) سے شروع ہوا ہے۔ اس ربط کو ثابت کرنے کا یہ موقع نہیں مگر سورہ بقرہ کے ربط کا اظہار غالباً پانچویں جلد سے پہلے نہ ہوسکیگا۔

✤ "شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ" ہونے کے یہی معانی ہیں کہ لوگوں کو تمہارے اعلیٰ اعمال سے، تمہاری محنت اور تکلیف برداری سے، تمہاری خدمت گذاری اور ملازمت سے خدا کے خدا اور حاکم اعلیٰ ہونے کی سچی گواہی ملجائے، وہ بچشم خود دیکھ لیں کہ تم کسی ایسی جلیل القدر ہستی کے ملازم اور پابند ہو جو گو نظروں سے اوجھل ہے مگر اسکے ہونے اور مقتدر ہونے میں گمان نہیں۔ یہی سعی و عمل آج کسی دنیاوی حاکم کی ملازمت اور اسکے موجود ہونے کی صریح بلکہ عینی شہادت ہے، خواہ وہ حاکم ہردم لوگوں کی نظروں سے چھپا ہے اور عوام نے اسکو ایک لمحے کے لیے بھی بچشم خود نہ دیکھا ہو۔ جبتک ایک ملازم کسی آقا کے حکموں کی تعمیل میں مصروف ہے، اسکی خاطر اپنی جان کو تکلیف میں ڈال رہا ہے، اور کسی دوسرے کے ہاں سے امیدوار مزد نہیں ہوتا، تب تک اس آقا کے ہونے کی عینی گواہی موجود ہے۔ کیونکہ کوئی متنفس اپنے آپ کو بلا مزد رنج و محن میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ "شہادت" یہ نہیں کہ منہ سے اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہ، یا کوئی اور ایسا کلمہ پڑھ لیا جائے جیسا کہ آجکل کے مسلمان سمجھ بیٹھے ہیں! جبتک ملازمت اور عبادت عملاً نہ ہو گواہی یعنی شہادت جسکا تعلق لامحالہ مشاہدے سے ہے، قائم نہیں ہوسکتی۔ رہی یہ بات کہ عمل کی نوعیت کیا ہو اسکی تشریح آگے چلکر خود کتاب خدا کریگی۔ اس امر کا ثبوت کہ شہادت خدا ہی کی ہے آیہ (۲: ۱۴۰) صفحہ ۲۰۲ کے الفاظ شَھَادَۃً عِنْدَہٗ مِنَ اللہِ سے ملتا ہے۔

✤ "عبادت" کے قرآنی معانی آج صدیوں کے انقلاب و تحلیل کے بعد قطعاً مسخ ہوچکے ہیں۔ عامۃ الناس نے بلا استثنا اسکے معانی نماز پڑھنا

اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! اپنے خدا کے حضور میں عملاً جھکتے رہو، (ارْكَعُوا)، اُس کے سب احکام کے آگے سر تسلیم خم کر دو، (وَاسْجُدُوا) اس کے سچے غلام بنے رہو، (وَاعْبُدُوا)، اور بھلے اور پسندیدۂ خدا کاموں میں لگے رہو تاکہ تم بالآخر کامیاب ہو جاؤ اور اپنی مراد کو پونہچو۔ اور اعلائے خدا میں کوشش کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے۔ اُس نے تم ہی کو اس مطلب کے لیئے دنیا جہان کی امتوں سے انتخاب فرمایا ہے، اور تم ہی وہ لوگ ہو جن پر (تمہارے اپنے زعم میں) خدا نے اعمال و فرائض کے متعلق کچھ ناروا سختی نہیں کی۔ یہی دستور العمل تمہارے باپ ابراہیم کا تھا، اور اس خدا کی عملی غلامی، اور تسلیم کے نصاب عمل کو مدنظر رکھکر ہی اُس نے اس سے پہلے بھی تم جیسے حکمبردار اور کارکن آدمیوں کا نام مسلم رکھا تھا، اور اب بھی تمہیں اُسی نام سے پکارتا ہے۔ اور یہ سب اس لیئے کہ رسول تو خدا کے آقائے نامدار ہونے کی تمہیں گواہی دیتے رہیں، اور تم تمام جہان کے سامنے اپنے اعمال کے ذریعے سے خدا کے وجود کی زندہ شہادت بنو! پس اِن سب باتوں کو مدنظر رکھکر نماز پر قائم رہو، ہماری بارگاہ عالیہ میں پنجوقتہ حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب دو، اور ہمارے وجود کو دنیا پر ثابت کر دینے کی خاطر قربانی مال (الزَّكٰوة) بھی کیا کرو۔ اور اللہ کو مضبوط پکڑے رہو! وہی تمہارا آقا ہے، پر کیا ہی اچھا آقا! اور کیا ہی اچھا مددگار ہے!

قبولیت اثر، اور محسوسات قلب کے تہیج و احیا کا وُہ عہد سعید اور وُہ نکو کار زمانہ تھا جب کہ خدا کو خدا تسلیم کر لینا، اہل عرب کی نگاہوں میں آفتاب کی کرنوں اور مہتاب کی شعاعوں سے بھی عیاں تر

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۰۵) لے لیئے ہیں، اور ہر شخص چند بار ماتھے کو زمین پر رگڑ کر بے عمل و بخش اپنے آپ کو 'عابد' قرار دیتا ہے۔ شاہین، فاطین، علما، فقہا، جُہلا سب کا غالب خیال عبادت سے نماز یا تسبیح گردانی ہی ہے، اور اگر کوئی شخص ذرا زیادہ وسیع النظری سے کام لیتا ہے تو باقی ارکان اسلام کو بھی داخل عبادت کر دیتا ہے یا حد سے حد علی الحساب اور احسانا کہہ دیتا ہے کہ "خدا کے لیئے اُٹھنا اور بیٹھنا بھی شامل عبادت ہے"۔ یہی نہیں بلکہ قریب قریب ہر مذہب کی لغت میں یہ اصطلاح صرف دعا یا نماز تک محدود ہو گئی ہے۔ پُرانی الہامی کتابوں کے متعلق تحقیق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اُن کے الفاظ کے استقلال کی کوئی سند موجود نہیں اور ترجموں میں الہامی الفاظ کی صورت، روح، اور مطالب سب بگڑ چکے ہیں مگر قرآن حکیم کے اندر 'عبادت' کا اصلی اور صحیح مفہوم ابتک موجود ہے، بشرطیکہ اسکی آیات میں صحیح تدبر کیا جائے۔ اِن آیات الٰہی میں جو زیر بحث ہیں، 'ارْكَعُوا' اور 'اسْجُدُوا' اور 'اعْبُدُوا' کے تین الفاظ آتے ہیں اور اگر، جیسا کہ کم از کم مجھے یقین ہو چکا ہے، خدائے زمین و آسمان کا کلام ہر قسم کے حشو و زواید، بے نتیجہ تکرار، یا شاعرانہ فصاحت سے قطعاً مبرا ہے: اور اس کا ایک جملہ، ایک لفظ اور ایک حرف بھی اَدل بدل، پس و پیش، یا حذف نہیں کیا جا سکتا، تو اس نتیجے پر پونہچنا کچھ مشکل نہیں کہ 'ارْكَعُوا' اور 'اسْجُدُوا' اور 'اعْبُدُوا' کے الفاظ کے تین مختلف اور مستقل معانی ہیں جو شارع قرآن کے ذہن میں اسوقت تھے جب یہ آیت وحی کی گئی۔ اُن کو نماز کا رکوع و سجود سمجھکر قریب المطالب یا مترادف المعانی قرار دینا، یا نعوذ بلاغت کا تکرار فرض کر لینا کلام خدا کی توہین ہے۔ کتاب خدا کے اِس ابتدائی حصے میں اس حقیقت کبریٰ پر

واسطۂ عمل بن گیا تھا؛ تعبد کی یہ شانِ اضطراری "وَاعْبُدْ فِیْ اُذُنِکُمْ"[1] اور اعتصام خدا کا یہ الحافی رنگ تھا

---

[1] دیکھو (۲۲: ۷۰) صفحہ ۱۰۵۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۰۶) چنداں زور نہیں دیا جا سکتا کیونکہ کلام الٰہی کے الفاظ کے استقلال مطالب اور وحدت معانی کی مثالیں کثرت سے پیش نہیں ہوئیں، لیکن آگے چلکر جوں جوں اور شہادتیں ملتی جائیں گی یہ نکتہ عیاں ہوتا جائیگا۔ 'مسخ حقیقت' کے عنوان میں اس بات کا کافی ثبوت دے دیا جائےگا کہ نص قرآن کے رو سے 'سجدہ' اور 'عبادت' ایک کیفیت دل کی دو مختلف حالتیں ہیں اور اسی لیئے بالالتزام علیحدہ علیحدہ بیان کی گئی ہیں۔ 'سجود' کے معانی بھی قرآن کریم میں ماتھا رگڑنے یا سر جھکا دینے کے نہیں، بلکہ اس سے مقصود کیف اطاعت اور صرف اطاعت ہی۔ اگرچہ ماتھا رگڑنا اُس کا ایک جزو ہو سکتا ہے۔ مطیع شخص ممکن ہے اپنی اطاعت کے جوش میں ماتھا بھی رگڑے مگر ہر کسی ماتھا رگڑنے والا لازماً مطیع نہیں ہوتا۔ سورۂ الرحمٰن میں ہے: وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ○ (۵۵: ۶)، "اور ستارے اور درخت سجدہ کر رہے ہیں"۔ یعنی احکام خدا کی اطاعت میں مصروف ہیں۔ ظاہری سجدہ مراد نہیں اور نہ ہو رہا ہے۔ سورۂ نحل میں ہے: وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ... (۱۶: ۴۹) "اور جو کچھ آسمان و زمین میں چلنے والی شئے ہے خدا کے آگے سجدہ کر رہی ہے"۔ یعنی اسکے قانون کی مطیع ہے۔ علیٰ ہذا القیاس (۱۳: ۱۵) اور (۲۲: ۱۸) میں یہی مضمون ہے۔ سورۂ آل عمران میں اہل کتاب کے متعلق کہا ہے: يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ○ (۳: ۱۱۳)، "یعنی رات کے اوقات میں احکام خدا کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں"۔ حالانکہ زمین پر ماتھا رگڑنا اُن کا طریق نہ تھا اور آج بھی نہیں۔ سورۂ اعراف کے اخیر میں ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ○ (۷: ۲۰۶)۔ یہاں 'عبادت' اور 'تسبیح' اور 'سجدے' کا وہی لغوی تکرار ہے، اور لفظوں میں تفریق کر دی ہے مگر ظاہر ہے کہ اُنکے یہ معانی نہیں ہو سکتے جو آجکل لوگوں نے ان الفاظ سے لیئے ہیں۔ کیونکہ مذکور اُن کا ہے جو اس روئے زمین پر نہیں ہیں اور عالم ارواح میں بس رہے ہیں۔ سورۂ نجم میں ہے: فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ○ (۵۳: ۶۲)، یہاں بھی 'سجدہ' اور 'عبادت' کو لفظوں میں الگ کر دیا ہے اگرچہ کیف ہی اطاعت ہی کا ہے۔ 'سجدے' کا لفظ کلام الٰہی میں صرف دو جگہ ظاہری ماتھا رگڑنے کے معنوں میں آیا ہے۔ ایک سورۂ نمل میں ملکۂ سبا کے متعلق: وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۲۷: ۲۴)، "یعنی وہ اور اسکی قوم خدا کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کرتے تھے"؛ اور دوسری سورۂ حٰم السجدہ میں: لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ○ (۴۱: ۳۷) مگر ان دونوں موقعوں پر صرف ایک واقعہ کا اظہار ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں یعنی لوگ سورج کے آگے ماتھا رگڑتے تھے یا یہ عبث فعل جو تم کرتے ہو نہ کیا کرو۔ آیۂ (۴۱: ۳۷) سے 'تَسْجُدُوْا' اور 'تَعْبُدُوْنَ' کا الفاظ میں الگ ہونا بھی ظاہر ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ "اگر تم فی الحقیقت خدا ہی کے غلام ہو (اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ) اگر اسی کے احکام کی تعمیل کر رہے ہو (اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ) اگر اسی کے مطیع اور اُسی کے حلقہ بگوش بنے ہو (اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ)، تو اس ظاہری سجدے کو بھی جو شمس و قمر کے آگے کرتے ہو، چھوڑ دو، کہ یہ بھی کیف عبودیت کے منافی ہے۔ یہ رسم بھی خدا ہی کے آگے ادا کرو جس نے ان کو پیدا کیا ہے"۔ گویا خدائے عزوجل کے نزدیک ملازمت ایک آقا کی اختیار کرنا اور سلام سلام دوسرے کو کرنا ایک لایعنی سی بات ہے۔ اگرچہ ایک شخص کے ظاہراً سورج کو سجدہ کرنے اور در پردہ عابدِ خدا ہونے کے استثنائی امکان کو یہاں پیش ہی نہیں کیا گیا بلکہ اسکو اشارۃً تسلیم کیا گیا ہے۔

'رکوع' کا لفظ بھی جسکے معانی اصطلاحاً آج نماز میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھکر جُھکنے کے ہیں، قرآن میں ان معنوں میں نہیں آیا۔ اس کا قرآنی مقصود بھی اطاعت اور تعمیل احکام الٰہی ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے: اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ ○ (۵: ۵۵) یعنی "اے ایمان والو! تمہارا دوست اور مددگار تو خدا ہی ہے (جو تمہیں قوت افزا احکام دے رہا ہے) اور اُسکا رسول (جو تمہیں راہِ راست پر لے جا رہا ہے)، اور باقی ایمان والے (جو عملاً ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں)، اور یہ وہ لوگ ہیں جو نماز پر قائم رہتے ہیں، اور قربانی مال کرتے ہیں، اور قانون خدا کے آگے عملاً سر تسلیم خم کرتے ہیں (وَهُمْ رَاكِعُوْنَ)"۔ یہ آخری الفاظ قافیے کی ضرورت کے لیئے اسماً اشتہ

(وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ)† کہ رب العرش کی مقتدر **حکومت** دلوں کی زمینوں، عزائم کے رہگذروں، اور اعمال کی شاہراہوں پر یکسر قائم ہو گئی تھی! سب عمل اُسی کے لیئے وقف تھے، سب جدّ و جہد اُسی کی خاطر

---

† وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ کے یہی معانی ہیں کہ بیم و امید کا پیدا کیا ہوا سب اعلیٰ تعلق خدا سے قائم کرو۔ یعنی جس طرح کسی دنیاوی آقا سے غرضمندی اعتصام پیدا کر دیتی ہے، اُسی طرح بلکہ اس سے زیادہ اس احکم الحاکمین سے اعتصام پیدا کرو۔ اسی کیف عبودیت کو متن کتاب میں "الحانی رنگ" کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۰۷) نہیں بڑھائے، اور نہ یہ ایک بیہودہ تکرار ہے جو 'الصَّلٰوۃ' کے بعد کر دی ہے اور جس میں رکوع لامحالہ شامل ہے بلکہ 'رَاکِعُوْنَ' کے اصلی معنی بھی اطاعت احکام خدا ہی تھے یا کم از کم کلام الٰہی کی اصطلاح میں یہ تھے۔ 'رکوع' بمعنی رکن نماز بعد میں لوگوں نے وضع کر لیا اور زبان زد عوام اس قدر ہوا کہ اصلی معانی مسخ ہو گئے۔ اب **انسانی لغت اُس حقیقت کو منکشف کرنے سے عاجز ہی** جیسا کہ ہم نے صفحہ ۹۱-۹۲ کے تحت المتن میں دعویٰ کیا ہے یہی بات: وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ٥ (۲: ۴۳) سے ظاہر ہے۔ یعنی 'الصَّلٰوۃ' پر قائم رہو اور 'الزَّکٰوۃ' کو دیا کرو، (اور سب سے اہم یہ امر کہ) قانون خدا کو تسلیم کرنے والوں کے ساتھ تم بھی سرِ تسلیم خم کر دو۔" سورۂ مرسلٰت میں فنا زیادہ وضاحت کے ساتھ ہے: وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ ارْکَعُوْا لَا یَرْکَعُوْنَ ٥ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ ٥ (۷۷: ۴۸-۴۹)۔ "اور یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان کو کہا جاتا ہے کہ قانون خدا کے آگے جھک جاؤ تو اسکی تعمیل کرنے سے کتراتے ہیں۔ تو لوگو! اُس دن ان جھٹلانے والوں کے حال پر افسوس ہے۔" گویا **'رکوع' (تسلیم) نہ کرنا تکذیب پیغامِ رسل ہے۔**

ان تمام آیاتِ الٰہی سے جو قرآن سے جستہ جستہ لے لی گئی ہیں، ثابت ہی کہ قرآن کی لغت میں 'رکوع'، 'سجود'، 'عبادت'، 'تسبیح' وغیرہ وغیرہ اطاعت خدا کے قلبی تکیف کے مختلف مراحل اور مظاہر ہیں جسکا نتیجہ احکام الٰہی کی تعمیل ہی ہے، اس سے کمتر کچھ نہیں، کوئی شخص صرف نماز کی رکعتوں کو رسماً ادا کر کے یا تسبیح کے منکوں کو پھیر کر 'عبدِ خدا' نہیں بن سکتا، اگرچہ جو شخص **فی الحقیقت** اطاعت گذار ہے اُس کے لیئے ان 'عبادات' کو کیفیتِ دل اور رقّتِ قلب کے ساتھ ادا کرنا اسی طرح طبعی ہے جس طرح کہ ایک غلام کا آقا کی شبانہ روز خدمت کے ساتھ ساتھ سلام کرنا، یا احیاناً اُسکی حمد و ستائش کرنا بھی ایک لازمی فعل ہے۔ پس **یہ احکام خدا کی شبانہ روز تعمیل کرنا ہی سچی 'عبادت' ہی، اور اسی نقطۂ نظر سے کسی کی 'عبادت' کرنا فی الحقیقت اُس کی ملازمت اور تعبّد اختیار کرنا ہی ہے۔** اسکے ماسوا کچھ نہیں، 'عبادت' کے یہ معانی کلام الٰہی کے قریب قریب ہر ورق پر ثبت ہیں اور اصل کتاب میں اسکی بیسیوں مثالیں آگے چلکر ملینگی۔ سرِ دست دو تین مثالیں اور پیش کر دی جاتی ہیں جنسے یہ حقیقت اور بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ سورۂ انبیاء میں ہے:

وَجَعَلْنٰھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْھِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءَ الزَّکٰوۃِ وَکَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ ٥ (۲۱: ۷۳)

"اور لوگو! ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو لوگوں کا سردار و پیشوا بنایا، وہ ان کی رہنمائی ہمارے قانون (بِاَمْرِنَا) سے کرتے رہے، اور ہم نے اُن کی طرف نیک اور مفید جماعت کاموں (الْخَیْرٰتِ) کے کرنے کی وحی بھیجی، اُن کو حکم دیا کہ الصَّلٰوۃ پر قائم رہیں، الزَّکٰوۃ کو دیتے رہیں۔ اور وہ لوگ نو نماز گذار یا پابند زکوٰۃ ہی نہ تھے بلکہ بیشک وہ ہمارے اطاعت گذار بندے اور غلام بنے رہے (وَکَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ ٥)۔ (باقی)

ع٥ اکثر شارحین کلام الٰہی نے 'ارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ' کے الفاظ سے باجماعت نماز کا حکم مستنبط کیا ہے اور اس لحاظ سے رکوع کے معنی اسلامی نماز کے متعارف رکوع کے لیئے ہیں۔ نماز کے باجماعت ادا کرنیکے وجوب و لزوم سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا جیسا کہ آگے چلکر صفحہ ۲۰۸، ۲۱۱، ۲۲۵ پر واضح کر دیا جائیگا۔ لیکن ان الفاظ کو باجماعت نماز ادا کرنے کی سند گردانا حتماً نا رواہی کیونکہ 'رکوع' کا لفظ رکن نماز کے معنوں میں قرآن میں کہیں نہیں آیا چنانچہ حضرت مریمؑ کے بارے میں یہ آیت اس امر کا قطعی فیصلہ کر دیتی ہے: یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ٥ (۳: ۴۳)۔ یعنی "اے مریمؑ! تم اپنے پروردگار کی کامل حکمبرداری کرتی رہو، اُسکے احکام کے آگے تسلیم خم کرو (وَاسْجُدِیْ) اور قانون خدا کو تسلیم کرنیوالوں کے ساتھ تم بھی کامل طور پر مطیع بنجاؤ۔" حضرت مریمؑ کو یہاں پر نماز باجماعت ادا کرنیکا حکم نہیں دیا گیا، اور نہ اسلامی رکوع یہودیوں یا عیسائیوں کا جزو نماز کبھی ہوا ہی۔ اسیطرح یہ عورتوں کے لیئے نماز باجماعت ادا کرنا اسلام میں بھی فرض نہیں اگرچہ رسول خدا کی امامت میں مستورات کا مردوں کے پیچھے صف باندھکر نماز ادا کرنا مذکور ہی۔ اس آیۂ شریفہ سے بہر نوع ظاہر ہو کہ 'قنوت' اور 'سجود' اور 'رکوع' سے مراد احکام خدا کی تعمیل اور کیف اطاعت کا پیدا کرنا ہی ہے اسکے ماسوا کچھ نہیں۔

اور اسی کی راہ میں تھی، (وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ)، سب طاعت و تسلیم اُسی کی گواہی کے لئے تھی، (لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ)، داعیِ اسلام کی جاذب القلوب صحبت اور حقیقت کشا شہادت (لِيَكُونَ

سلہ دیکھو (۲۲: ۷۸) صفحہ ۱۰۵۔ سلہ دیکھو (۲: ۱۴۳) صفحہ ۱۰۵۔

بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۰۸) یہاں پر بھی عبادت اور الصّلوٰۃ اور الزّکوٰۃ کا لفظی تفرق ظاہر ہے۔ گویا عبادت وہ شے ہے جو نماز اور زکوٰۃ سے علیحدہ بلکہ بڑھکر ہے۔ اور سیدھی عملی ملازمت، وہ امتثال امر، اور وہ شبانہ روز چاکری ہے جسکے لئے کسی وقت یا عادت کی تعیین نہیں۔ ایک اور جگہ موسیٰ علیہ السلام کے مکالمے میں عبادت اور الصّلوٰۃ کے فرق کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے: إِنَّنِي أَنَا اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي ۞ (۲۰: ۱۴)۔ یعنی اے موسیٰ! اسمیں شک نہیں کہ میں ہی مالک زمین و آسمان ہوں، میرے سوا کوئی حاکم اعلیٰ نہیں، تو تم میری ہی عبادت اور ملازمت اختیار کرو، اور میری یاد، اور غائبانہ خوف دل میں رکھنے کے لئے (لِذِكْرِي) الصّلوٰۃ پر قائم رہو یعنی اچانا میرے حضور میں حاضر بھی ہوا کرو۔ گویا عبادت ایک غائبانہ تعمیل احکام ہے اور الصّلوٰۃ اس غائبانہ خدمت کے جذبے کو متحرک رکھنے کے لئے بالمشافہ سلام اور حاضری ہے۔ لیکن سورۂ مومن میں عبادت کا قرآنی مفہوم ان سے بھی عیاں تر ہے:

ثُمَّ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ وَأَخَاهُ هَارُونَ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ۞ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا عَالِينَ ۞
فَقَالُوا أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ ۞ (۲۳: ۴۵-۴۷)

پھر ہم نے موسیٰ اور ہارون اسکے بھائی کو اپنے احکام (بِآيَاتِنَا) اور انکے منجانب اللہ ہونے کی روشن شہادت (سُلْطَانٍ مُّبِينٍ) اپنی طرف سے دیکر فرعون اور اسکے حاشیہ نشینوں کی طرف بھیجا۔ وہ لوگ انکو دیکھکر اکڑ گئے، اور در حقیقت وہ تھے بھی سرکش اور مغرور لوگ جو شیخی میں آکر کہنے لگے کہ کیا ہم ان اپنے جیسے دو آدمیوں کو اپنا رہنما مان لیں حالانکہ انکی حیثیت یہ ہے کہ انکی قوم ساری کی ساری ہماری غلام ہے (لَنَا عَابِدُونَ)، ہماری چاکری اور خدمتگذاری میں دن رات لگی ہے (لَنَا عَابِدُونَ)، ہمیں ہمارے زیر اثر ہے (لَنَا عَابِدُونَ)، ہماری محتاج اور دست نگر ہے (لَنَا عَابِدُونَ)، ہماری نظروں میں خوار و ذلیل ہے (لَنَا عَابِدُونَ)، ہمارے آگے ہاتھ جوڑتی اور پاؤں پڑتی ہے (لَنَا عَابِدُونَ)، ہمارے دست شفقت کی آرزو مند ہے (لَنَا عَابِدُونَ)، ہماری دی ہوئی روٹیوں پر گذارہ کرتی ہے (لَنَا عَابِدُونَ)، وغیرہ وغیرہ۔

گویا از روئے قرآن عابد وہ شخص ہے جسکی ہیئت کذائی بعینہ وہ ہو جو خروج سے پیشتر بنی اسرائیل کی فرعون کے ماتحت رہ کر تھی یا جو کہ شرقی اقوام کی یورپ کے دست تظلم سے آجکل ہے۔ بنی اسرائیل کے مظلوم فرعون کے محلات کی تعمیر کے ضمن میں ہزاروں من پتھر لدے ہوئے چھکڑوں میں ہانکے جاتے تھے، اُمرا کی تفریحی گاڑیاں میلوں تک ہانپ ہانپ کر کھینچتے تھے، اُن کی بیگمات کو پالکیوں میں اُٹھائے پھرتے تھے، اُن کے سروں پر چھتریاں لگائے دم بخود چلے جاتے تھے، اُن کی سواریوں کے ساتھ ساتھ دوڑتے تھے، پرناروں میں شبانہ روز خشت سازی اور جنگلوں میں بھوسہ جمع کرنا اُن کا آبائی پیشہ تھا، چمڑے کے گندھے ہوئے کوڑے اُن کے بدنوں کو لہولہان کر دیتے تھے، وہ اُن کی ضرب سے سڑکوں اور چوراہوں پر بے ہوش و حواس گر پڑتے، لیکن بادشاہت کے رعب جلال کے آگے اُف تک نہ کرسکتے تھے۔ اُن کے چیتھڑوں سے پیوند کیے ہوئے تہمد اور مسکنت کے سیاہ کیے ہوئے بدن، فرعون کی عبادت اور طاغوت کی غلامی، تحکم شاہ اور تعبد گدا، تعلّی بشر اور قہر خدا کی وہ عبرت انگیز شہادتیں تھیں جو ہر صاحب نظر کو کپکپا دیتی تھیں۔ وہ اس تعبد میں صدیوں کی عادت اور رواج کے باعث اسقدر محو و منہمک رہتے تھے کہ اس مغرور قوم کی خدمت میں دن رات لگے رہنا اُنکی نظروں میں عین سعادت تھا۔ فرعون مصریوں کو بُلا بلا کر کچھ اپنے آگے ماتھا نہیں رگڑواتا تھا، اور نہ مُنہ سے رسماً اپنے آپ کو خدا کہا کرتا تھا بلکہ یہی تعلق اور تعبد وہ جبری عبادت تھی، جو ہزار رسمی سجدوں اور زبانی دعووں سے بڑھکر تھی۔ اسی کے ضمن میں جب موقع ماتھے بھی رگڑے جایا کرتے تھے۔ منتیں اور خوشامدیں بھی ہوا کرتی تھیں، جبینیں فرش زمین بن جاتی تھیں، آرام کی پروا نہ رہتی تھی، جان کو جوکھوں میں ڈالکر آقاؤں کو خوش کیا جاتا تھا۔ یہی طرز عمل بعینہٖ آج ہر شرقی قوم کا

سلہ لَنَا عَابِدُونَ کی جمع متکلم کی ضمیر سے بھی یہی ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل صرف فرعون کے عابد نہ تھے بلکہ تمام مصری قوم کی خدمت میں لگے رہتے تھے سمجھا کر تا مصر یکار نوٹیں۔

الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ ۖ نے عالمِ ارواح کے شاہد لم یزل[۵۱] پرسے نقاب اُلٹ کر، خدا اور بندوں کے درمیان آقائی اور غلامی، حاکمی اور محکومی، حُسن و عشق کے انداز پیدا کردیئے تھے! (هُوَ مَوْلٰكُمْ[۵۲]

---

۵۱ دیکھو (۲۲: ۷۸) صفحہ ۱۰۵۔ ۵۲ ایضاً صفحہ ۱۰۵۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۰۹) شیوہ عبادت ہے، اور جس فرد یا قوم کے طریق عمل میں خدائے زمین و آسمان کے بارے میں یہی شیوہ عبادت اور یہی انداز عشق ظاہر ہو وہ "اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ" (۲۲: ۷۷) صفحہ ۱۰۵) کے الفاظ کا صحیح مصداق ہوسکتی ہے۔ عبادت کے اسی انداز عمل کو پیش نظر رکھکر اصل کتاب کی زیر بحث آیت (یعنی ۲۲: ۷۷) کے بعد "وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ" کے الفاظ آئے ہیں یعنی "اس رب زمین و آسمان کی خدمت اور اعلا میں وہ وہ کوششیں، وہ وہ حکم برداریاں، وہ وہ ایثار اور تکلیفیں اُٹھاؤ جو اتنے بڑے آقا کے شایانِ شان ہوں!" عبادت کا یہی مفہوم آیہ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ (۲۶: ۲۲) میں بھی جوہر صاحب نظر پر عیاں ہے۔

اب سوال صرف یہ رہجاتا ہے کہ اگر عبادت یہ ہے تو رکوع و سجود یعنی اِرْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا (۲۲: ۷۷) کے الفاظ کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اسکی تشریح بھی بنی اسرائیل کی عبادت کی محولہ بالا تفصیل میں ضمناً ہو گئی ہے مگر قدرے زیادہ وضاحت پیش نظر ہے۔ غرضمندی اور احتیاج، شوق انعام اور خوف سزا ہی وہ چیزیں ہیں جو ہر عبادت کی محرک اول ہیں۔ اِنہی کے ہوتے اطاعت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے، پھر اطاعت کے ساتھ ساتھ رکوع و سجود کا پیدا ہونا بھی لازمی امر ہے۔ جبتک کسی منعم کے انعام کی امید لگی ہے یا اسکی سزا کا خوف باقی ہو، اُسکے آگے جھکے رہنا، اُس کے پاؤں پڑنا، اسکی خوشامد اور اطاعت کرنا قطعی ہے۔ یہی رکوع و سجود کا سچا کیف و حال ہے۔ اور اسی نقطہ نظر سے رکوع و سجود اسلامی نماز کا جزو لاینفک بھی ہے۔ بیم و امید کا وجود عبادت یعنی تعلق اور ملازمت از خود پیدا کر دیتا ہے۔ اور اسی عبادت کا ایک ادنٰی جز رکوع و سجود ہے۔ لیکن نماز میں رسماً ہاتھ باندھ لینا یا گھٹنوں کے بل گر پڑنا نہ عبادت ہے نہ رکوع۔ جبتک خوف و رجا کا قلبی تعلق اصالتاً موجود نہ ہو اور گردنیں رسماً نہیں بلکہ عملاً بلکہ جبراً خدا کے آگے جھکیں۔ اسی کیف کو پیش نظر رکھکر سورۂ انبیاء میں ہے، وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝ (۲۱: ۹۰) یعنی "وہ لوگ ہمیں بیم و رجا سے بلایا کرتے تھے اور اسی لیے ہماری درگاہ میں عاجزی سے آتے تھے۔" قرون اُولیٰ کے عرب کی یہی کیفیت دل ہم نے اصل کتاب میں ظاہر کی ہے (دیکھو صفحہ ۱۰۴) اور یہی ایمان کا جزو لاینفک ہے جو يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے خطاب سے ظاہر ہے۔ مکتاب کے عربی دیباچے میں میں نے لفظ عبادت سے جابجا اسکا یہی عملی مفہوم مراد لیا ہے۔

عبادت خدا کے صحیح معانی آج یہانتک مسخ ہو چکے ہیں کہ دنیا کا کوئی ایک مذہب بھی اس کے اصلی یا خدائی مفہوم پر عمل کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ نہیں بلکہ جسقدر کوئی مذہب قدیم تر ہے اسیقدر اسکی عبادت ایک لفظی اور رسمی، بے نتیجہ اور بے معنی شے بن گئی ہے حتی کہ اسکی نماز کے بقیہ آثار بھی مرور مدت کے باعث قطعاً بے حقیقت اور مضحکہ خیز بن گئے ہیں۔ وحشی اقوام میں جنکے مذہبی محسوسات متمدن اقوام کے معتقدات باقیہ سے نسبتہً قدیم تر ہیں، نماز یا عبادت کا کوئی مستقل تخیل حتماً باقی نہیں رہا۔ افریقہ اور آسٹریلیا کی بعض وحشی قومیں بظاہر اس کلیے سے مستثنٰی نظر آتی ہیں مگر ان میں بھی نماز کا تخیل کسی مٹی کے بت کے گرد اگرد ناچنے یا بآواز بلند نام پکارنے تک محدود ہے اگرچہ خدمت جن (عبادت) کے خیال سے قبروں کے اندر آگ جلانا اور پانی، میوے، اور ہتیاروں کے چڑھاوے چڑھانا بھی کہیں کہیں مروج ہے۔ ہندوؤں میں عبادت خدا کسی دیوی کی موتی پر پھول چڑھانے یا خوراک اور مال کی قربانیاں کرنیکے مترادف ہے۔ نماز کا تخیل انکے ہاں بگڑتے بگڑتے صرف اشنان کرنے، قشقہ لگانے، ماتھا ٹیکنے، ہاتھ جوڑنے اور مندروں کے اندر گھنٹے بجانے تک رہ گیا ہے۔ بدھ مذہب جسکی عبادت اور صلوٰۃ کے تخیل میں آج کوئی مابہ الامتیاز قائم نہیں رہا۔ اور جو خود کسی زمانے میں آریہ مت کی اصلاح کے لیے آیا تھا، اسی انقلاب کا شکار ہو چکا ہے۔ اُسکی نماز آج صرف ایک چرخ کے گھمانے پر ختم ہے! جسقدر چکر چرخ کو دیئے جاتے ہیں اسیقدر زیادہ موثر یا بہتر نماز ہو جاتی ہے حتی کہ بڑے بڑے ہیکلوں میں اس چرخ عظیم کو گھمانے کے لیے آبی کلیں اور پن چکیاں استعمال ہوتی ہیں! خود عرب اور مالی تک کا قدیم

دلوں میں ارادت کے اُسی کارکن جوش کی خوش آیند خلش، اور سینوں میں تعلق کے اسی غرضمند شوق کی دل آویز لگن رہا کرتی تھی۔ مومنوں کے توجہ طلب اور رشک آشنا قلوب میں، شاہدِ حسنِ قیوم کی

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۱۰) اہم ایسی مذہب خدائے ذوالجلال کی عملی عبودیت اور اس کے احکام کی سرفروشانہ اطاعت سے ہٹتے ہٹتے اسقدر لغو اور بے معنی شے بن گیا تھا کہ خانہ کعبہ کی نماز صرف سیٹیاں اور تالیاں بجانا ہو گئی تھی۔ سورۂ انفال میں وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ٥ (۸، ۳۵) کا اشارہ اسی لایعنی 'نماز' کی طرف ہے اور بصراحت تمام کہہ دیا ہے کہ نماز کی ایسی کیفیت کو مسخ کر دینا 'کفر' اور ہلاکت کے مترادف تھا۔ یہود و نصاریٰ کے مذہبی حلقوں میں عبادت اور نماز اصلاً اور عملاً ایک ہی شے سمجھی جاتی ہیں، اور زیادہ تر گیت گانے، ارغنون بجانے، یا مدح و وعظ سننے اور تسبیح پھیرنے' یا توراۃ و انجیل کے ترجموں کی زبانی تلاوت کرنے پر مشتمل ہیں۔ اگرچہ عبادت 'یعنی خدمتِ خدا کا اظہار ہیکلوں اور کلیساؤں میں خوشبودار چیزیں جلا جلا کر شمعوں کو قربانگاہ کے گرد اگرد روشن کر کے، یا اسقفوں کی مقرر کردہ رسوم کو بصحت تمام ادا کر کے کر دیا جاتا ہے۔ اسلام کے اندر اگرچہ نماز کی ظاہری شکل و صورت میں اسکے جدید ترین مذہب ہونے کے باعث (فرقہ بند لوگوں کے جزوی اختلاف سے قطع نظر) قابل ذکر تبدیلی پیدا نہیں ہوئی مگر اسکے مقاصد و اغراض اسقدر نسیاً منسیاً ہو چکے ہیں کہ 'الصلوٰۃ' اب صرف ایک رسمی 'اٹھک بیٹھک' کا نام رہ گیا ہے جو ہر نماز گذار نہایت صحت اور التزام سے ادا کر دیتا ہے اور اسیکو 'خدمتِ خدا' کا جزوِ اعظم شمار کرتا ہے۔ گویا جہاں خدمت نفس اور عبادت حکام، تعلق اولاد اور تعبد مال کیلئے دن رات ایک کر دیئے جاتے ہیں وہاں خدمت خدا کے لیئے یہی دو ایک سجدے کر دینا 'کار عظیم' اور 'بار گراں' بن چکا ہے۔ یہ ہم رہا کا کثیف دلوں سے محو ہو کر خدا پر احسانِ امتنان کی صورت پیدا کر گیا ہے۔ ارضی حاکموں اور نفسانی بتوں کی عملی عبادت مکاو خدا میں خشوع کو حتماً بدعمل کر چکی ہے، اور اسی لیئے یہ نچی تُلی بیگار طبعاً بُری معلوم ہو رہی ہے۔ لیکن جب خوف کے مستحق، اور رجا کے سزاوار ارضی خدا بن چکے ہوں تو رب زمین و آسمان سے استعانت کی ضرورت کیوں باقی رہے اور تمام خشوع و خضوع کیونکر پیدا ہو؟ سورۂ بقرہ میں ہے:

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ٥ (۲، ۴۵)

مدد مانگو! اپنی مشکلات اور مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیئے استقلال سے طلب اعانت کیا کرو اور ساتھ ساتھ نماز میں کھڑے ہو کر خدا کے حضور میں بھی گڑگڑاؤ کہ اصل حلال مشکلات اور مسبب الاسباب وہی ہے۔ اور یہ نماز تو ان لوگوں کے سوا جن کا تمام تعلق ہم سے وابستہ ہو چکا ہے (الخاشعین) جن کا سب سے بڑا ہم ہی ہیں ہے (الخاشعین ' دیکھو آیۃ (۱۲، ۹) جو اوپر گذر چکی ہے) جو ہم ہی کو منعم اور ہم ہی کو متول قرار دیتے ہیں اور اسی لیئے جلد سے ہی آگے عاجزیاں کرتے ہیں (الخاشعین)، باقی سب کے نزدیک ایک بیگار ہی بیگار ہے!

اسلامی مذہبی حلقوں میں 'نماز' اب صرف الفاظ کو صحت اور خوش الحانی سے دہرانے کا نام رہ گیا ہے، مطالب سے کوئی غرض یا بحث باقی نہیں رہی، پیش امام کی ساری توجہ اسی میں ہے کہ قرأت درست ہو، صفیں سیدھی ہوں، ارکان صحیح طور پر ادا ہوں، قرآن کا کوئی ٹکڑا حسب حال یا نا حسب حال ہر قرعے میں چلا دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ مقتدی کا اکثر اہتمام بھی انہی سطحی باتوں میں صرف ہوتا ہے۔ اسی لیئے نماز کے ادا کرنے میں ایک تکلف اور آورد پیدا ہو گئی ہے جو اسکی اصلی غایت بلکہ صورت کو بھی آہستہ آہستہ مسخ کر رہی ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ آیندہ ہزار دو ہزار برس بلکہ اس سے بھی کم مدت میں اسلامی نماز اہل چین کے چرخ کی مانند مضحکہ انگیز بنجائے۔ اور جس طرح آج کسی سے قرآن اور درود پڑھوا کر یا بالوساطت رقعہ رکھوا کر ثواب حاصل کرنا رسوم ہو گیا ہے اسی طرح رفتہ رفتہ نماز کو ادا کرنے والے پیشہ ور اصحاب بھی مقرر ہو جائیں جو اجر کے خیال سے اسکو کسی منجنیقی ترکیب سے جلد جلد ادا کرنے کی کوئی آسان سبیل نکال لیں۔ اب بھی موسیقی عنصر اور تطریبی اسلوب نماز میں بقدر نمایاں ہو چکا ہے کہ جہاں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ دنیاوی حاکم کے روبرو جا کر دم خشک ہو جاتا ہے، ملاقات سے پہلے ہونٹوں پر پپڑیاں جم جاتی ہیں، بدن میں کپکپیاں اور چہروں پر زردی چھا جاتی ہے، اور فرط رعب کے مارے منہ سے الفاظ تک نہیں نکلتے، وہاں مالک زمین و آسمان

نگاہوں کی غلط اندازیاں، اور لب جاں بخش کے تبسم کی غیر نوازیاں غلمان عظیم پیدا کر دیتی تھیں!
وہ خدا کی دامن درازی کے بالمقابل اپنے دست نارسا کو دیکھکر اور بھی سعی و عمل کرتے اور انتخابِ خدا کا

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۱۱) اور خالق شمس و قمر کے حضور میں جاکر ترنم پیدا ہو جاتا ہے! پروا تک نہیں رہتی کہ کس کی جناب میں کھڑے ہیں، کیا مانگ رہے ہیں، کیوں مانگ رہے ہیں، کیوں گھٹنوں کے بل گر رہے ہیں، کیوں سجدے کر رہے ہیں، کیوں ٹھوڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ پیش امام کا سارا زور اسمیں صرف ہوتا ہے کہ نماز بلند سے بلند آواز میں ادا ہو، مقتدی سب کے سب اس کے ترنم کو سُن سکیں اور سجدے بے اختیار واہ واہ کرتے نکل جائیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ایک الٰہی ارشاد ہے جو بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ آجکل کی ترنم والی نماز قرون اولیٰ کی نماز نہیں ہے!

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا وَ ابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ۝ (۱۷: ۱۱۰)

ترجمہ: ان مجازپرستوں کو کہہ دو کہ خدا کو "اللہ" کہہ کر گڑگڑاؤ یا "رحمٰن" کہکر بلبلا اٹھو جس نام سے بھی پکارو گے تو اُسکے سب نام اچھے ہی ہیں (مقصود صرف تکیف دل ہے، باطنی خوف ہے، اسکی جناب میں سچی عاجزی ہے، دل کو ہلا دینے والا خشوع و خضوع ہے، اور پھر اس خشوع و خضوع کے بعد باقی اوقات میں کیف اطاعت ہے) اسکے لیئے نام کی کوئی تخصیص نہیں اور نہ نام لے لے کر پکارنے سے تمہارے حالِ دل کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ ہاں البتہ اپنی نماز میں اتنا ظاہری ادب ضرور ملحوظ رکھو کہ اسکو چلّا چلّا کر مت پڑھو اور بالکل چپکے ہو کر پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں بلکہ ان دونوں کے بیچ بیچ ایک متوسط طریقہ اختیار کرو (جانتے رہو کہ تم کس کے حضور میں کھڑے ہو، اور وہ کتنا بڑا بادشاہ ہے۔ یہ ظاہری ادب بھی کیف دل پیدا کرنے کے لیئے از بس ضروری ہے۔ اگرچہ خدا سب باتوں سے بے نیاز ہے)

نماز کے موجودہ رنگ سے صرف نظر کر کے پھر اگر دوسری مرسوم "عبادات" کی کنہ و ماہیت کیطرف نظر دوڑائی جائے تو لا محالہ کہنا پڑتا ہے کہ انکی غرض و غایت میں بھی مرورِ مدت کے باعث بے انتہا تصرف ہو چکا ہے۔ صوم، زکوٰۃ، حج وغیرہ وغیرہ سب کے سب معنا مہمل ہو چکے ہیں۔ تسبیح کا تخیل مسلمانوں نے قطعًا نصرانیوں اور یہودی راہبوں سے لیا ہے۔ اگرچہ تسبیح ہندوؤں اور بدھ کے معتقدوں میں بھی مدت مدید سے جاری ہے۔ صاحبِ شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی تمام عمر میں تسبیح کا استعمال کا یتہً نہیں کیا۔ اور اگرچہ عبادت خدا کا یہ مضحکہ انگیز ہتھیار آپنے ضرور کہیں نہ کہیں دیکھا ہوگا مگر اسکے استعمال کے متعلق آپکے ارشاد کا ایک حرف کہیں موجود نہیں۔ اُسوۂ حسنہ پر چلنے والے مسلمانوں نے آج زہد و اتقا کا تمام ساز و سامان اسی چار گرہ دھاگے کے اندر دیکھ لیا ہے، اور اس خدائے عظیم کے کپکپا دینے والے اسماء کو دُہرا دُہرا کر بے نتیجہ اور بے اثر کر دینا اس قدر آسان سمجھ لیا ہے کہ ہر کس و ناکس اسکو ہاتھ میں رکھکر مسلمان ہونے کی سند حاصل کر لیتا ہے اگرچہ در پردہ وہ قوم کی بیخ کنی کے منصوبے سوچ سوچ کر اُمت کو تباہی کے کنارے پر لگا رہا ہو۔ مگر یہ نازک موضوع اس قابل نہیں کہ کتاب کے ابتدائی حصے میں اسکے ما لہٗ و ما علیہ پر مدلل بحث کی جاسکے۔

محولہ بالا بحث و تمحیص سے کم از کم یہ ظاہر ہے کہ اسلام میں عبادت کے معانی احکام خدا کی پیہم تعمیل کرنا ہی ہے کوئی انسان کی بنائی ہوئی لغت اسکے صحیح مفہوم کو حتمًا ادا نہیں کر سکتی۔ اور جسطرح کسی آقا کی ملازمت میں وقت کی تخصیص نہیں ہوتی اسیطرح عبادت بھی وقت سے حتمًا بے نیاز ہے۔ "الصّلوٰۃ" صرف ایک پنجوقتہ حاضری اور سلام سلام ہے جو ہر وفادار اور حکمبردار، مُسلم اور مطیع غلام کے لیئے روزانہ خدمت کے بعد ضروری ہے لیکن بجائے خود عبادت نہیں۔ اسی لیئے قرآن میں بارہا "صلوٰۃ" کے لفظ کو عبادت سے علیحدہ کر دکھایا ہے۔ اور اسی تعبد کا اقرار نماز میں ہاتھ باندھکر ہوتا ہے: اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝ (۱: ۴) یعنی "اے خدا! ہم تیرے ہی غلام بنیں گے اور تجھ ہی سے مشکلات میں مدد مانگیں گے" ورنہ "نعبد" کے معانی "ہم تیری ہی نماز پڑھتے ہیں" لے لینا بے معنی ہے کیونکہ نماز تو اسی کی پڑھی جا رہی ہے پھر اسکا اقرار لغو ہے۔ خدا کی "خدمت" صرف یہی ہے کہ اسکے بتائے ہوئے احکام عملًا مانے جائیں۔ اس سے زیادہ یا کم کچھ نہیں۔ آگے چلکر اصل کتاب میں بتایا جائیگا کہ یہ فرماں برداری بھی انسان کے اپنے ہی نفع کے لیئے ہے، خدا اس خدمت سے قطعًا بے نیاز ہے۔ گویا یہ خدمت بھی عجب خدمت ہے جو غلام کی اپنی ہی بہتری کے لیئے ہے۔

(باقی)

حق ادا کرنے میں کچھ کسر اٹھا نہ رکھتے (ھُوَ اجْتَبٰىكُمْ)[1] تسلیم اُن کا واحد شیوۂ عمل، اور اطاعت اُن کا اہم طریق کار تھا (ھُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ)[2]، بڑی سے بڑی مصیبت، اور مشکل سے مشکل خدمت اُن کے چہروں پر ملال اور ماتھوں پر بل نہ آنے دیتی (وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ)[3] منعم بے مثال کے یہ خوشدل مزدور، اور ملتِ ابراہیم کے یہ سچے پیرو، اپنی بہتری اور فلاح کی خاطر پسندیدۂ خدا کاموں کیطرف لپک لپک کر پہنچتے اور ایک عالم کو موجب شرمسار کر دیتے (وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ)[4]، خدائے بے نیاز کی جناب میں اُنکے رکوع و سجود کسی غمزدہ اور بے نوا انسان کی نگاہ عاطفت کی پیہم دعا، اور بے محابا کرم کے سوال بن بن کر ظاہر ہوتے تھے، نشانوں اور دعاؤں میں اُنکے تھمے اور قعدے ہولِ جاہ اور رعب جلال کی مضطربانہ حرکات، اور عجز و بے بسی کے ترحم انگیز اور اضطراری اعمال بن گئے تھے! بارگاہ خدا میں اُنکا دست بستہ

---

[1] دیکھو (۲۲: ۷۸) صفحہ ۱۰۵۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۰۵۔ [3] ایضاً صفحہ ۱۰۵۔ [4] دیکھو (۲۲: ۷۷) صفحہ ۱۰۵۔

(تتمہ حقیقت ایضاً صفحہ ۱۲۱) عبادت کا پہلا نتیجہ خیز مفہوم سنسکرت کے مشہور لفظ سیوا (خدمت)، اور انگریزی کی کلیسائی اصطلاح سروس (ملازمت) سے ظاہر ہے گو آج کوئی شخص انکو ان معانی میں نہیں لیتا۔

مذکورۂ صدر بحث و تمحیص سے بہر نوع یہ ظاہر ہے کہ اِرْكَعُوْا، اور اسْجُدُوْا، اور اعْبُدُوْا، کے الفاظ قرآن حکیم میں اپنے اصلی معانی میں استعمال ہوئے ہیں، ان سے مقصود خدا کی ملازمت بعینہ اُنہی معنوں میں اختیار کرنا ہے جن معنوں میں کسی دنیاوی حاکم کا تعبّد اختیار کیا جاتا ہے، رسمی سلام سلام اور نیم قد نماز اُس ملازمت کا صرف ایک جزو خفیف ہے۔ اس چاکری کا حصہ عظمیٰ عمل ہے، اطاعت احکام خدا ہے، تسلیم و انقیاد ہے، جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ہے۔ اسکے سوا جتنا کچھ نہیں سب سطحی خلاف عبادت کے صحیح مفہوم پر انسان کی سہل پسندی اور کام چوری کے باعث پڑ گیا ہے خود لوگوں نے ڈالا ہے، قرآن کے محفوظ اور ناقابل بدل کلام کو اُس سے کچھ واسطہ نہیں، عبادت کے معانی خود کلام کے اندر موجود مضمون میں کوئی لغت انکو ابد الآباد تک بدل نہیں سکتی، قرآن میں جہاں عبادت کا لفظ واقع ہوا ہو اسکی اصلی غرض و غایت یہی ہے جیسا کہ آئندہ اوراق میں ظاہر ہوگا۔

* اگرچہ شارحین قرآن نے عام طور پر اس فقرے کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ "خدا نے مسلمانوں پر دین کے بارے میں کوئی تنگی روا نہیں رکھی" اور اپنے حسب مطلب معانی پیدا کر کے مسلمانوں کیلئے (اور سب سے پہلے اپنے نفس کیلئے) سعی و عمل سے گریز کرنے کی ایک عمدہ سبیل نکال لی ہے لیکن اگر غور و تامل سے کام لیا جائے تو ان الفاظ کے یہ معانی ہرگز نہیں ہو سکتے۔ خود اچھی آیات (یعنی (۲۲: ۷۷، ۷۸) اور اُنسے جو آگے چلکر پیش کر دی جائینگی) ظاہر ہے کہ ایمان کی شرط خدا کی راہ میں سخت سے سخت مصائب کا سامنا کرنا ہے۔ یہی بات وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (۲۲: ۷۸) سے ظاہر ہے۔ پھر خدا کیونکر کہہ سکتا ہو کہ تمہارے لئے دین اسلام میں ہم نے کوئی ذرا سی تنگی بھی نہیں رکھی حالانکہ ایمان کی شرط وحید یہی ہے کہ اُسکی راہ میں جان تک سے دریغ نہ کرو۔ دراصل تمام خطاب اُن اہل عرب کیطرف ہے جو نبی کے زمانے میں اپنی انتہائی سعی و عمل سے شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ بن چکے تھے، اور انہی کارکن لوگوں کی بابت خدا نے فرمایا کہ تم ہی صحیح معنوں میں مسلم ہو، تم ہی خدا کو درحقیقت خدا تسلیم کرتے ہو، تم ہی ابراہیم کے سچے پیرو ہو، تم ہی میری منتخب اُمت ہو، اور تم ہی خدا کے وہ سچے غلام ہو کہ خدا کا مشکل سے مشکل اور صبر آزما سے صبر آزما حکم تم کو تنگ نہیں کرتا، تم ہی وہ مستقل مزاج اور تکلیف بردار، وہ اولوالعزم اور صابر لوگ ہو کہ خدا کی کوئی خدمت بھی تمہارے ماتھوں پر شکن نہیں پڑنے دیتی، اور ان آیات میں جہاں جہاں لفظ کُمْ ہے ان سب پر ضمیر سے خطاب صرف قرون اولیٰ کے مسلمانوں کیطرف ہے یا اُن کیطرف جو اُن جیسے کارکن ہیں۔ اُنہی کے لئے خدا نِعْمَ الْمَوْلٰى اور نِعْمَ النَّصِيْرُ ہی ہے نہ آجکل کے برائے نام مسلمانوں کا جن کو وہ ذلت کی سزائیں دے رہا ہے!

قیام کسی نیازمند دل کے طبعی اضطراب کی سکوت افزا دھڑک، اور غرضمند انسان کی بےتابیٔ دل کی ادب آموز دبک بن بن کر ظاہر ہوتا تھا (یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا[1])۔ اُن کا ایمان اُنکے اعمال کا صحیح عکس، اور اُن کے سجدے اُنکی **اطاعت** کی صحیح تصویر تھے! خداوندِ عالم کی یہی وہ سچی عبادت اور وہ ناقابلِ انکار شہادت تھی جسنے ایک اقل قلیل مدت میں اہل عرب کو روئے زمین کی اُمتوں کا مرکز بنا دیا تھا! (۲: ۱۴۳[2])۔ عشق و عمل کے اِسی نقطۂ وحید سے خدائے واحد کی محبت کے آتش افشاں فوارے، اور نور ایمان کے آسمان سیر شعلے پھوٹ پھوٹ کر اکناف عالم میں پھیل گئے تھے! یہی وہ برگزیدہ اور منتخب اُمت تھی جسکے دعوئے محبت کو آزمانیکے لیے شاہد امتحان طلب[3] نے قوم کے ہر فرد پر **جہاد بالسیف** فرض کرکے مُدعیٔ ایمان کی جان کو عشقِ خدا کے بیباکانہ جُرم کا خونبہا تجویز کیا تھا، اور پھر وہ اس قہرِ الٰہی والے اور مُنعم لم یزل کی حیرت انگیز حیلہ جوئی اور حکمت آمیز بہانہ طلبی تھی جو اس سرفروشانہ تہوّر کے انعام میں مومنوں کو ہر موقع پر عطا فرماکر چند برسوں کے اندر ہی اندر روئے زمین کے بڑے سے بڑے حصے کی بادشاہت بخش دی تھی! (فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ[4])

بہ تمنائے تو ترکِ دو جہاں کردو ولی

مہربانیِ تو ہم درخورِ آں می بایست

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا[†] لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ ۝ (۸: ۷۴)

---

[1] دیکھو (۲۲: ۷۷) صفحہ ۱۰۵ [2] دیکھو صفحہ ۱۰۵۔ [3] دیکھو (۲۲: ۷۸) صفحہ ۱۰۵۔

[†] لْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا کی شرائط جو اس آیہ شریفہ میں بیان کی گئی ہیں نہایت غور طلب ہیں: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے معاً بعد ہجرت اور جہاد اور نصرت باہمی کی شرائط پیش کرنیکا مطلب یہی ہے کہ ایمان کا مُنہ سے اقرار کرلینا محض کچھ شے نہیں جبتک کہ اُس بانی اقرار کی تصدیق عمل سے نہ ہو۔ چنانچہ سورۂ عنکبوت کے شروع میں یہی تاکید ہے (بلکہ یہی بات آیۂ (۴۹: ۱۵) سے ظاہر ہے جو صفحہ ۱۱۵ کے متن میں ہے)؛

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ

کیا لوگوں نے اپنے دل میں یہ سمجھ رکھا ہے کہ زبان سے صرف اتنا کہنے پر چھوٹ جائینگے کہ ایمان لے آئے اور اُن کا امتحان نہ لیا جائیگا۔ حالانکہ اُنکو اس بات کا خوب علم ہے کہ ہم نے اُن لوگوں کی آزمائش بھی انکے عمل کی تھی جو ان سے پہلے ہوگذرے ہیں۔ تو یاد رکھو کہ خدا ان لوگوں کو ضرور معلوم کرکے رہیگا جو اپنے یقین کی بذریعہ عمل تصدیق کرنےوالے ہیں (الَّذِیْنَ صَدَقُوْا) اور ان کا بھی پول کھول دیگا جو منہ سے بکواس کرتے ہیں اور دل سے جھٹلاتے ہیں (الْکٰذِبِیْنَ)۔ صدقوا کیسے دیکھو ...

اور جن لوگوں نے خدا کو مولا مان کر اسکا آوازہ بلند کرنے کی خاطر ہجرتِ وطن اختیار کی، اور اُس کی راہ میں دشمنوں سے لڑے، اور جنہوں نے ہجرت کرنے والوں کو پناہ دی، اور حصولِ مقصد میں اُن کی حتی الامکان مدد کی، تو یہی لوگ سچے ایمان والے ہیں! ان کے لیے میرے ہاں سے اُنکی تقصیروں اور گذشتہ واماندگیوں پر پردہ پوشی ہے، اور علاوہ ازیں بالآخر عزت و آبرو کی روزی۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ○ (۴۹:۱۵)

سچے ایمان والے تو وہی لوگ ہیں جنہوں نے خدا کو فی الحقیقت اپنا آقا سمجھا (آمَنُوا بِاللَّهِ)، اور رسول کو صدقِ دل سے اُسکا بھیجا ہوا پیغام بر جانا، اور پھر اسکے بعد خدا کی آقائی اور رسول کی صداقت میں کسی طرح کا شک و شبہ نہ کیا۔ اور اس قلبی ایمان کی تائید میں اپنے جان و مال سے خدا کا بول بالا کرنے کی خاطر دشمنوں سے لڑے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے یقین کی بذریعۂ عمل تصدیق کرنے والے، اور اپنے ایمان کو سچ کر دکھانے والے ہیں۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ○ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ† لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُقِيمٌ ○ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ○ (۹: ۲۰-۲۲)

---

† "جنّت" کا ترجمہ ہم نے باغات اور سرسبز زمینیں کر دیا ہے۔ یہاں اس بحث کو طول دینا مناسب نہیں۔ قرآن حکیم میں "جنّت" اور "الجنّة" دو مختلف اصطلاحیں ہیں جنکا مفہوم بھی لامحالہ مختلف ہونا چاہیے۔ "جنّت" اور "الجنّة" میں فرق، اور اوّل الذکر کا قرآنی مفہوم تیسری مجلد میں عیاں کر دیا جائیگا اگرچہ "الجنّة" کی حقیقت پر بحث چھٹی مجلد سے پہلے مکمل نہ ہو سکے گی۔ یہاں صرف اسقدر لکھ دینا کافی ہے کہ قرآن کریم میں "جنّت" کا لفظ کئی جگہوں پر بصراحت تمام زمینی باغات کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ رعد میں ہے: وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ (۱۳:۴)۔ "اور زمین میں پاس پاس کئی قطعے ہوتے ہیں اور انگور کے باغات اور کھیتی اور کھجور کے درخت"۔ سورۂ قٓ میں ہے: وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبَارَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ جَنَّاتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ (۵۰:۹)۔ "اور ہم نے ہی آسمان سے برکت دینے والا مینہ اتارا پھر اُسکے ذریعے سے باغ اگائے اور کھیتی کا اناج"۔ سورۂ مومنون میں پھر اسی بارِ مبارک کے بارے میں ہے: فَأَنْشَأْنَا لَكُمْ بِهِ جَنَّاتٍ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ (۲۳:۱۹) یعنی "ہم نے اس پانی کے ذریعے سے تمہارے لیے کھجور اور انگور کے باغ اُگائے"۔ سورۂ یٰسٓ میں علیٰ ہٰذا القیاس یہی مضمون ہے: وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ وَفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ (۳۶:۳۴)۔ "اور ہم نے اس زمین میں کھجور اور انگور کے باغات پیدا کیے اور اُس میں پانی کے چشمے بہائے"۔ سورۂ انعام میں ہے: وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ جَنَّاتٍ مَعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ (۶:۱۴۲)۔ "اور وہی قادرِ مطلق تو ہے جس نے باغ پیدا کیے۔ جن میں سے بعض کی بیلیں منڈھے چڑھتی ہیں اور بعض سطحِ زمین پر لگی رہتی ہیں اور کھجور کے درخت اور کھیتی"۔ اسی سورۃ میں ہے: وَجَنَّاتٍ مِنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ (۶:۱۰۰)۔ "اور انگور اور زیتون اور انار کے باغات"۔

ان مثالوں کے علاوہ جن سے "جنّت" کا زمینی باغات ہونا اظہر من الشمس ہے قرآن میں ایک اور قطع کی مثالیں موجود ہیں جلیسے "جنّت" کا

جو لوگ خدا کے خدا ہونے پر ایمان لے آئے، اور جنھوں نے اسکی حمایت میں اپنے دیس چھوڑے اور اپنے مال و جان سے اسکی لڑائیاں لڑیں، اُن کا اللہ کے ہاں سب سے بڑا درجہ ہے! اور یہی وہ لوگ ہیں جو اس دنیا میں بھی فائز المرام ہوں گے۔ انکا پروردگار اُنھیں اپنی رحمت اور خوشنودی کی بشارت دیتا ہے اور نیز اُن باغوں (جنّت) اور سرسبز بستیوں کی حکومت کی جن میں اُنکو دائمی نعمتیں اور آسائشیں حاصل ہونگی۔ وہ ہمیں سدا سدا رہیں گے۔ اے لوگو! بیشک ایسے لوگوں کیلئے خدا کے پاس اجرِ عظیم ہے۔[1]

الغرض اِلٰہ العالمین کی نگاہ میں ایمان اور محبت خدا کا صحیح معیار انسان کا اُسکی راہ میں مصائب کا پیہم مقابلہ کرنا، اور دشمن کے بالمقابل جان و مال پر کھیل جانا ہی تھا۔ ترک اقربا، ترک اولاد، ترک خان و مان، ترک وطن، ایثار مال، ایثار نفس، ایثار جان ہی وہ انتہائی پیشکش تھے جو ربّ بے نیاز نے ایمان کی متاع بے بہا کے بدلے بطور قیمت مقرر کردیئے تھے، (اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا)۔ انہی کی موجودگی میں محبت خدا

---

[1] دیکھو (۸: ۷۴)، صفحہ ۱۱۴۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۱۵) مطلب بادشاہت زمین ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً سورۃ الشعراء میں فرعون کو بادشاہت مصر سے محروم کرنیکے متعلق ہے: فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝ كَذٰلِكَ ۭ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۝ (۲۶: ۵۷-۵۹) یعنی پھر ہم نے فرعون کی قوم کو باغوں اور چشموں اور خزانوں اور عزت کی جگہ سے نکال باہر کیا، اُن کی عظمت یوں خاک میں ملادی اور بالآخر بنی اسرائیل کو ان نعمتہائے الٰہی کا وارث بنایا۔ سورۂ دخان میں پھر انہی فرعونیوں کی بابت ہے: كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ ۣ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ (۴۴: ۲۵-۲۸) یعنی ان لوگوں کو کتنے ہی عالیشان باغات اور نہریں اور کھیتیاں اور عمدہ مقامات چھوڑنے پڑے، اور کیسی کیسی آرام دہ نعمتوں کو خیرباد کہنا پڑا جن میں مزے اُڑایا کرتے تھے۔ ہاں اِن نااہلوں کی سزا یہی ہونی تھی۔ اور ہم نے یہ بدلہ لیا کہ اِس تمام سازو سامان کا دوسروں کو وارث بنادیا۔ سورۂ شعرا میں موت و شکست کو دعوت دینے والی قوم ثمود کے بارے میں ہے: اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ۝ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ (۲۶: ۱۴۶-۱۴۷)۔ "تو کیا تم لوگ اس زعم باطل میں ہو کہ ان باغات اور نہروں میں بے روک ٹوک امن و امان سے چھوڑ دیئے جاؤ گے۔" اِسی سورۃ میں قوم عاد کی طرف خطاب ہے: وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۝ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ (۲۶: ۱۳۲-۱۳۴) "اور لوگو! اس احکم الحاکمین کی سزا سے بچو اور اس سے خوف کھاؤ جسنے تمہاری معاونت ان چیزوں سے کی جو تم کو خوب معلوم ہیں۔ تم کو مال مویشی اور اولاد کی کثرت سے مدد دی، باغوں اور نہروں کا تم کو حکمران کیا وغیرہ وغیرہ۔"

تعجب ہے کہ اِن حیرت انگیز شہادتوں کے باوجود شارحین قرآن اور عام مسلمانوں نے جنّت کے معانی آخرت کے جنّت کے لیلئے ہیں اور بادشاہت زمین کے نصب العین کو جو اسلام اِس دنیا پر لایا تھا آنکھوں سے یکسر اوجھل کیا ہے مگر مسلمانوں کی نیت بدل جانیسے کلام حق کے معانی نہیں بدل سکتے، وہ وہی ہیں جو قادر مطلق کے کلام میں اُس وقت تھے جس وقت قرآن حکیم وحی کیا گیا تھا، امت کے اتفاق اور مفسرین کے اجماع کا تفسیر ہذا پر کچھ اثر نہیں اگر یہ بحث جستہ جستہ کتاب کے متن میں آگے چلکر آئیگی۔ آیاتِ زیر بحث (یعنی (۹: ۲۰-۲۲) صفحہ ۱۱۵) میں خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا کے الفاظ بظاہر جنّت کے ان معانی کے مخالف نظر آتے ہیں مگر جب مومن کی دنیا اور دین دونوں درست ہیں (جیسا کہ آگے چلکر واضح ہوگا) اور اخروی انعام دنیاوی نعمتوں کے تسلسل ہی میں ہیں تو خٰلِدِيْنَ اور اَبَدًا کے الفاظ نہ صرف موافق بلکہ نہایت موزوں ہیں اور مطالب کے مبہم ہوجانیکا امکان نہیں۔

کی وہ عملی تثبیت، یقینِ رب کا وہ عملی ثبوت، اور عبودیت کی وہ ناقابلِ انکار تصدیق ہوتی تھی جس سے بڑھکر کم نوا اور فرومایہ انسان کے پاس کوئی تصدیق نہیں، کوئی ثبوت ممکن نہیں، (اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ)۔ یہی وہ قربانیاں تھیں جو اس حاکمِ اعلیٰ کی ملازمت میں کر دینا سچی ارادت، سچے تعبّد اور سچے ایمان کی قطعی دلیل تھا، وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (۲: ۱۶۵) – یہی عبادت کا صحیح مفہوم، بلکہ رکوع و سجود کی صحیح منطق تھی۔ خدا کی بندگی یہی تھی کہ کسی کمتر اور کہتر خواجہ کی غلامی نہ ہو، اُسکی محبت کے بالمقابل کسی شئے کو ترجیح نہ ہو، وطن کا غم نہ ہو، اولاد کی عبادت نہ ہو، مال کی غلامی نہ ہو، نفس کا تعبّد اور جان کی پروا نہ ہو، نماز میں سچی شانِ اطاعت، اور اعمال میں رنگِ سجود کا ظہور ہو۔ یہی شدتِ محبت اور غلبۂ عشق قرنِ اول کا اصل ایمان تھا، اور یہی ہر دنیاوی حاکم کی عبادت کا صحیح پیش نہاد آج بھی ہے۔ اسی سبیلِ خدا، اور ایمان کے صلے میں مغفرت تھی، رزقِ کریم تھا (۸: ۷۴)، رحمت کی نوید امن اور رضائے ربُّ العرش کی بشارت تھی، جنّت تھے، قائم اور دائم نعمتیں تھیں، اجرِ عظیم تھا، فوزِ جلیل تھا، (اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ)۔ خدائے بے نیاز کی خدائی پر سچا ایمان، اور رضائے احکم الحاکمین کا سچا عشق آجکل کے لفظی اور نظری، سطحی اور ناکارہ ایمان کی غیرمانند کسی بے روح و بے حقیقت "اقرار باللسان" یا کسی بے نتیجہ اور غیرمرئی "تصدیق بالقلب" سے ہی کسطرح رُوبرا ہو سکتا تھا، اس سے عہدہ برآ ہونیکے لیے سعی و عمل کی مستقل خلش، رنج و محن کی صبرگسل ابتلا، تکلیف و مصائب کی پیہم برداشت، اور غلال شیوف کی عمل پرور آزمائش لازم تھی! وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِیْنَ

ملہ دیکھو (۹: ۴۹، ۱۵) صفحہ ۱۱۱ ملہ اور جن لوگوں نے خدا کو حاکمِ اعلیٰ مان لیا اُن کی محبت اور ارادت خدا سے بہت شدید ہے۔ اور سب کا سوال یہ تھا کہ گویا ایمان کی شرط یہ ہے کہ سب سے گہرا تعلق خدا سے ہو۔ سب سے زیادہ ملازمت اُسکی ہو، اُسی کے حکموں کی اطاعت ہو، وغیرہ وغیرہ ملہ دیکھو (۹: ۲۰) صفحہ

✝ 'صٰدِقُوْنَ' کا لفظ بالالتزام قرآن کریم میں اُس شخص کے لیے استعمال ہوا ہے جو اپنے قول و ایمان کو فعل و عمل سے سچ کر دکھائے۔ آجکل صادق کے معانی میں کچھ تحریف واقع ہو چکی ہے، اور معمولی سچ بولنے والے کو بھی صادق ہی کہتے ہیں۔ 'صدیق' مبالغے کا صیغہ ہے اور یہ لقب حضرت ابوبکرؓ کو اسی بنا پر ملا تھا کہ وہ اپنے قول کو عمل سے سچ کر دکھاتے تھے۔ 'صدقہ' کی اصطلاح کا قربانی مال کے معنوں میں ہو چکی ہی یہی وجہ ہے کہ مال کا ایثار معنی کے معاون اور مؤید ہونے کی تصدیق ہے۔ 'مصدّق' بمعنی 'صادق' بھی قرآن کریم میں کئی جگہ آیا ہے۔ 'صادق' یا 'مصدّق' کی ضد 'کاذب' یا 'مکذّب' ہے۔ جس کا ذکر صفحہ ۱۰۰ کے تحت المتن میں آیہ (۳: ۱۹۹) کے اندر آچکا ہے اور وقتاً فوقتاً آگے چل کر آئے گا۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ کے معانی صفحہ ۱۱۵ پر ہم نے اسی بنا پر لکھے ہیں۔

مِنکُمْ وَالصّٰبِرِیْنَ† وَنَبْلُوَا اَخْبَارَکُمْ۝ (۴۷: ۳۱) رب زمین و آسمان کی 'عبادت' کا ادّعا کسی رسمی اور دو رکعتی نماز یا پنجوقتہ رکوع و سجود کی مقابلۃً آسان، بے اثر اور بے ضرر مشق کر لینے سے ہی کیونکر قابل تسلیم ہو سکتا تھا اسکی صادقانہ تکمیل کے لیئے ہر آن اور ہر وقت اطاعت کا رنگ لازمی تھا تسلیم کے اعمال، اور تعبّد کی شان چاہیئے تھی؛ ماسوا کا جحود لابدی تھا، نفس پر کامل تحکّم اور غیر پر کامل قدرت ناگزیر تھی۔ گویا سب کا انکار اور ایک کا اقرار، سب سے سرکشی اور ایک کی ماتحتی ضروری تھی! عالم آرائے کون و مکان اور وجہ طراز زمین و آسمان کی عبودیت وہ بے ریا محبت اور وہ بے لاگ خدمت تھی جسمیں غیر سے تعلق اور ماسوا کی اطاعت کو حتماً دخل نہ تھا۔ اسی عالم آرا اصول پر تکوین عالم کی اساس قائم تھی، اسی پر کون و فساد کا سب انحصار تھا، اسی پر چل کر رزق کریم تھا اسی سے ہٹ کر عذاب الیم تھا: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ‡۝ مَآ اُرِیْدُ مِنْھُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ۝ (۵۱: ۵۶ - ۵۷)۔ اس تمام ہنگامۂ کائنات کی وجہ بنا یہی تھی کہ زمین و آسمان کی سب کہ وہ مخلوق؛

ملہ اور اے مسلمانو! ہم تمہارے ایمان کو ضرور آزمایا کریں گے، یہاں تک کہ تم میں سے جو لوگ ہماری حمایت میں دشمنوں سے لڑنے والے اور مصائب کو برداشت کرنے والے ہیں اُن کو ہم اچھی طرح معلوم کر لیں اور تاکہ تمہاری اصلی اور اندرونی حالت کو جانچ لیں۔ ملہ اور اے لوگو! ہم نے اس کائنات فطرت کے جن و انس کو صرف اسی غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ ماسوا سے قطع نظر کر کے ہمارے ہی ہو کر، اور ہمارے ہی محکوم بن کر رہیں۔ ہم اُنسے کچھ رزق کے تو خواہاں نہیں ہیں اور نہ اسکے کہ ہم کو کھلائیں پلائیں۔

---

† یہاں عیاں ہے کہ 'صبر' کے معنی ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھنے کے نہیں جیسا کہ عافیت پسند اُمّت نے لے لیئے ہیں، بلکہ مصائب اور حوادث کا استقلال اور عزم سے مقابلہ کر کے اُنپر فتح پانا ہے۔

‡ یہاں ظاہر ہے کہ 'عبادت' کے معانی وہ نہیں ہو سکتے جو لوگوں نے بنا یئے ہیں۔ خدا نے زمین و آسمان معاذاللہ اس بات کا محتاج نہیں کہ لوگ اسکی نمازیں پڑھتے اور خوشامد کرتے رہیں۔ بلکہ مقصود تعمیل احکام ہی ہے۔ یہی دنیا کا ہر حاکم اپنی رعیت سے چاہتا ہے، اگرچہ زمین و آسمان کا مالک اس صورت احتیاج سے بھی بے نیاز ہے۔ اور جیسا آگے چلکر ثابت ہوگا، انسان سے تعمیل احکام کی آرزو رکھنا کچھ خواہش اختیار کے باعث نہیں بلکہ انسان کی اپنی ہی بہتری کیلئے ہے۔ اس نقطۂ نظر سے آیۂ 'وَمَا خَلَقْتُ' سے مقصود یہی ہے کہ "ہم نے دنیا کے جن و انس کو پیدا ہی نہیں کیا مگر اس جبلت پر کہ وہ ہمارے احکام کی تعمیل میں لگے رہیں"۔ یعنی انکی فطرت اور طینت میں یہ بات پہلے سے رکھدی ہے کہ ہمارے احکام (یعنی قانون فطرت) کی تعمیل کے بدون انکی دین و دنیا میں فلاح نہیں ہو سکتی۔ گویا جب جب وہ اطاعت سے منحرف ہونگے سزا انکو لامحالہ ملکر رہیگی۔ اور تکوین عالم کا اصل اصول ہی ملازمت قانون خدا (یعنی عبادت) ہے۔ یہ اصول ہر صاحب نظر کیلئے اسقدر اظہر من الشمس ہے کہ اسکو اور عیاں کرنیکی ضرورت نہیں۔ ہر جگہ اسی پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔ چھوٹے یا بڑے کسی امر میں جس وقت انسان نے قانون خدا کی متابعت یا مخالفت کی، اُسی وقت یا بدیر، نفع و ضرر اسکو اُسکا نفع یا نقصان ملجاتا ہے۔ حتی کہ ایک رات ضرورت سے کم نیند کرنیکا مزا اسکو اگلے دن ہی درد سر یا اور مرض کی صورت میں مل رہتا ہے۔

اس حقیقت کشا آیت (۵۱: ۵۶) کی مکمل تشریح و تصدیق آیندہ مجلدات میں ہوگی جبکہ قانون خدا اور آئین فطرت کو عیاں کر دیا جائیگا، اور جب ہر ساکن زمین کو اس قانون سے مفر اور اس 'عبادت' سے گریز کرنے کی کوئی سبیل نظر نہ آئے گی۔ یہاں پر مقصود صرف 'عبادت' کے معانی کی توضیح ہے۔

سب جن و انس اُس شارعِ کائنات ہی کے تابعِ فرمان ہو کر رہے، اُسی کے حلقۂ عبودیت میں داخل ہو، اُسی کے سکھلائے یا بتائے ہوئے قانون پر چلے، گویا اُسی کی عبادت میں لگی رہے۔ وہ خدائے عظیم و جلیل انسان کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے فعل کو ہر آن اپنی ہی مرضی، اور اپنے ہی قانون کے مطابق دیکھنا چاہتا تھا۔ اُسکی غیور ذات رحم و مغفرت کی ناپیداکنار وسعت کے باوجود، انسان کی ہر صغیرہ و کبیرہ خطا کو معاف کر سکتی تھی مگر اپنی اطاعت، اپنی محبت، اور اپنی عبادت میں شرکتِ غیر کو قطعاً ناقابلِ عفو جرم قرار دیتی تھی: إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ[۱] ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا[۲] (۴: ۱۱۶) صاحبِ ایمان بشر کے ہاں سے یہ دلبرِ امتحان پسند فرہاد کی سی تمکینِ قلب کا خواہشمند اور

---

[۱] بیشک اللہ اس بات سے چشم پوشی ہرگز نہیں کر سکتا کہ اُسکے مقام و منصب میں کسی دوسرے کو شریکِ طاعت اور شریکِ محبت کیا جائے۔ اسکے ماسوا جو تقصیریں انسان کرے اُنکو اگر مناسب سمجھے تو نظر انداز کر سکتا ہے اور جس شخص نے اپنی محبت میں غیر اللہ کو شریک کیا وہ فی الحقیقت اپنی بہتری کی راہ سے بہت دور بھٹک گیا۔ (ذَٰلِكَ کے معنی ہم نے مناسب سمجھنا کئے ہیں۔ اسکا ثبوت تیسری جلد میں فلسفۂ عمل کے عنوان میں آئے گا)

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۱۸) اس آیۂ شریفہ میں "جن" کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ "جن" کی حقیقت سے یہاں پر بحث نہیں ہو سکتی، اسکے لیے ابھی بہت دیر ہے مگر "خلقت" کے لفظ سے مقصود ثابت ہے کہ "جن" خدا کی پیدا کی ہوئی ایک مخلوق ہے، اور ان سے قانونِ فطرت کی تعمیل کا متوقع ہونا اسیقدر ہے جسقدر انسانوں سے۔ ہم مزید غور کرنیوالے شاید اس نتیجے پر بھی پہنچ سکیں کہ "جن" بھی "انس" کی طرح ایک سرکش خدا مخلوق ہے جس کی بغاوت کو دور کرنے کیلئے خدا نے "عبادت" کا تریاق تجویز کیا ہے۔

[۲] مغفرت کے معانی ہم مفصل پردہ پوشی کر چکے ہیں۔ اسی سے مستفاد یعنی نوع کے ہونگے پہلے جو لوگ بخشش کے لیے ہیں وہ فرض کر لیا ہے کہ یہ تمام بخشش قیامت کے دن ہوگی۔ اس سے پہلے نہیں ہو سکتی۔ اور علی ہذا القیاس سزا بھی شرک کی [illegible] کو قیامت ہی کو ہوگی مگر اس فرضی داستان کی کوئی سند نہیں کیا "یغفر" کا صیغہ حال اور مستقبل دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ [illegible] کوئی وجہ نہیں کہ بخشش اور سزا یا انعام اور عذاب کسی شخص یا قوم کو یوم آخرت سے پہلے نہ مل سکیں۔ بلکہ تعجب ہوتا ہے کہ جب گناہ استثناً ناقابلِ معافی ہے تو سزا میں [illegible] ہر شخص کو خواہ مخواہ شرک کرنے پر جرأت ہو۔ اصل یہ تمام نادرست اسباب سند شرک کے صحیح معانی نہ سمجھنے کی وجہ سے ہیں اور جب تک مسلمانوں کے بنائے ہوئے اصطلاحی مشرکوں کو اس دنیا میں سزا کی بجائے پے در پے انعام مل رہے ہیں تو انکے لیے مشرکین کے متعلق یہ دل خوش کن داستان گھڑ لینا بھی از بس ضروری ہو گیا ہے گویا انکے نزدیک خدا کی حکومت (العیاذ باللہ) اس دنیا پر قائم نہیں رہی۔ اور اگرچہ مشرکین سے بیحد ناراض ہے مگر انکو سزا دینا انکے بس کی بات نہیں ہے۔ اگلی مجلدات میں رفتہ رفتہ ہم اس تخیل کو غلط ثابت کرینگے، اور بتائینگے کہ شرک کی کیونکر سزا اس دنیا میں ہی ملتی ہے۔ وہ خدائے عظیم کسقدر سریع الحساب اور شدید العقاب ہے۔ اور شرک کا بدلہ کس بیدردی، کس بے نیازی، کس شدت اور سرعت سے لیتا ہے۔ اور آخرت کا عذاب تو دنیاوی عذاب سے کہیں بڑھ کر ہے: وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَقُّ[۱۵] (۱۳: ۳۴)۔

"شرک" کی تعریف از روئے قرآن بے حد جامع و مانع ہے جیسا کہ پیشتر کہا گیا ہے۔ یہاں پر اسکی صرف ایک شق کی سرسری تصریح کر دی گئی ہے یعنی یہ کہ کسی شے کو محبت اور اطاعت میں خدا کے ہم پلہ اور برابر نہ کر دیا جائے۔ مسلمانانِ عالم کو غور کرنا چاہیے کہ آیۂ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ[۱۶] (۲: ۱۶۵)

---

[۱۵] اور آخرت کی سزا تو دنیاوی سزا سے سخت تر ہے۔ [۱۶] ترجمہ کے لیے دیکھو صفحہ ۱۱۰۔

بیستون کی جوئے شیر کے سے تاب گسل اور صبر پاش اعمال کا اُمیدوار تھا! اُسکی نظروں میں ایمان و کیفیتِ قلب نمی جسکا اٹل نتیجہ سعی و عمل تھا! وہ ہجرت اور جہاد کی آڑ میں ایمان کے دعویداروں سے نقد جان کا طالب تھا! اور انہی سرفروشانِ حکم اللہ کو عشقِ خدا کے سچے "شہید"، رب العزۃ کی حکومت کے سچے گواہ، اور رزق کریم کے قطعی اہل قرار دیتا تھا۔

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۪ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ (۳ : ۱۳۹-۱۴۲)

اگر تمہیں اس لڑائی میں شکست کا زخم لگا ہی تو اس سے پہلے فریق مخالف کو بھی ایسا ہی زخم لگ چکا ہے اور یہ فتح و شکست کے دن تو ہم بقدر مناسب کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر پھیرتے ہی رہتے ہیں، اور یہ اسواسطے بھی کہ ہم جان لیں کہ خدا پر سچا ایمان رکھنے والا کون ہی، اور نیز اسلئے کہ اللہ تم میں سے اپنے سچے گواہوں کو منتخب کرے ورنہ وہ کچے ایمان والوں کو تو محبت ہی نہیں کرتا۔ اللہ اس طریق عمل سے ایمان والوں کو اپنے متعلق شک شبہ کی میل کچیل سے نکھار دینا چاہتا ہی، اور پھر اپنے اصلی محبت پیدا کر کے منکرین کے زور کو توڑ دینا، اور تمہاری جماعت میں سے شائبۂ شک کفر کو دور کر دینا چاہتا ہے۔ کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہی کہ (صرف زبانی دعوے سے) جنت میں جا داخل ہوگے حالانکہ ابھی تک تو اللہ نے اُن لوگوں کو جانچا ہی نہیں جو تم میں سے اسکی حمایت میں ثابت قدم ہو کر لڑنیوالے، اور مصیبتوں کو برداشت کرنیوالے ہیں۔ اور تم تو موت کے آنیسے پہلے ہی (میری محبت کے جوش میں) مرنے کی آرزوئیں کیا کرتے تھے تو آج تم نے اسکو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، اور پھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے انتظار کر رہے ہو!

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ
بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۲۰) مکرسے استعمال ہوتے ہیں کہ غالباً کوئی دوسرے الفاظ نہ ہوتے ہونگے۔ ہر مسلمان اپنی بے ہمتی، اپنی کاہلی، اپنے نکماپن کو معلم الملکوت کی آستین میں چھپا کر قرآن حکیم کے اس سیاق و سباق سے علیحدہ کیئے ہوئے مکرسے کو جا بے جا استعمال کرتا ہے اور اپنی امراؤں اپنی شکست و ریخت، اپنی سہولت پسندی کا سارا الزام بے دھڑک خدا پر تھوپ دیتا ہے اور اس بیچ افترا کے بعد رب زمین و آسمان کے غیظ و غضب سے قطعاً نہیں ڈرتا۔ حالانکہ ان آیات الٰہی (یعنی ۳: ۱۳۹ - ۱۴۲) کے استدلال سے ظاہر ہے کہ مداولت ایام کا قطعی باعث سعی و عمل کی کمی ہی ہے اور لوگوں کے اپنے ہی کرتوت سے ہے۔ خدائے بے نیاز صرف اقوام کی سعی و عمل کا امتحان لیتا ہے اور بے رُو و رعایت جس کی سعی زیادہ ہو اُسی کو کامیاب کر دیتا ہے۔ قرآن میں جابجا اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۔ (۱۰: ۴۴) کا مضمون اس امر کی تائید میں ہے۔ یعنی خدا سا کنانِ زمین پر کسی حالت میں قطعاً ظلم نہیں کرتا لیکن یہ لوگ ہی ہیں جو اپنی جانوں پر آپ ظلم ڈھا رکھتے ہیں۔

ان آیات الٰہی سے پہلے کی آیت ہے: وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۳: ۱۳۹)۔ جس سے ظاہر ہے کہ ایمان والی وہی قوم ہے جو "اعلون" بنکر رہے۔ جنگ اُحد میں جس کا ذکر ان آیات میں ہو رہا ہے مسلمان پہلے کی خاصی تعداد میں تھے، دشمن کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہ تھی جیسی کہ نسبتاً غزوۂ بدر میں تھی۔ اُس غزوے میں باوجودیکہ ایک مسلمان کے بالمقابل تین اہل مکہ لڑ رہے تھے مگر فتح مسلمانوں ہی کو نصیب ہوئی تھی، لیکن اُحد کے موقع پر بعض مسلمانوں نے ہمت ہار دی۔ ایک جماعت نے جسکو خود رسولِ خدا نے ایک مقام پر متعین کیا تھا کہ اپنی جگہ سے نہ ہلیں، مالِ غنیمت کے لالچ میں آکر اپنا مورچہ چھوڑ دیا۔ اہلِ مکہ اُسی مورچے پر پل پڑے، اور دفعتاً لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ پیغمبرِ خدا چند رفیقوں کے ساتھ تن تنہا رہ گئے اور زخمی ہوئے۔ فرقِ مبارک پر چوٹ آئی، دانت ٹوٹ گیا، ہر طرف مشہور ہو گیا کہ شہید ہو گئے، وغیرہ وغیرہ۔ خدائے عظیم فرماتا ہے کہ وہ تم ہی مٹھی بھر مسلمان تھے جنہوں نے بدر میں ایک جرار لشکر کو شکست فاش دی تھی اور اب یہ بے ہمتی دکھلائی کہ اپنے سپہ سالار کو چھوڑ کر چلتے بنے۔ تم بددل نہ ہو اور غم نہ کھاؤ اگر تم میں ایمان فی الواقع موجود ہے تو فتح خود بخود تمہارے قدم آن کر چومے گی۔ اور ہماری فتح پروری اور بے نیازی تو ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ جو قوم جسقدر سعی و عمل کرتی ہے اُتنا ہی اجر ہم سے لامحالہ لیتی ہے۔ کسی کی بے جا رعایت کرنا ہمارا شیوہ نہیں۔ اور اسی لیئے اگر آج فتح اس قوم کے شاملِ حال ہے تو کل دوسرے کی قدمبوسی کر رہی ہے، (وَتِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ)۔ ہمارا مقصود اس جنگ آمد سے صرف اس بات کا دریافت کرنا (اور دریافت کرنا بھی کیا، صرف تمہیں ہی جتا دینا) تھا کہ تم میں سے حقیقی ایمان والے کون ہیں؟ کن کا ایمان ناقص ہے؟ کون ہمارے وجود کے سچے گواہ ہیں، کون ہمارے حاکمِ اعلیٰ ہونے کی آخری دم تک شہادت دیتے رہے، ہم کو آخری وقت تک قائم کر ہماری خدمت میں لگے رہے، (وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ)۔ اور بھگوڑوں اور کچے ایمان والوں کو تو خدا پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ تھوڑی سی تن آسانی کی خاطر اپنی قوم پر ظلم کر رہے ہیں، اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں (وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ)۔ خدا صرف اتنا چاہتا تھا کہ سچے ایمان والوں کو چھانٹ کر الگ کر دے (وَلِیُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا) اور منکروں اور دل میں خدا کو نہ ماننے والے منافقوں یعنی کافروں کو الگ کر دکھلائے، اُنکو بالآخر نیست و نابود کر دے (وَیَمْحَقَ الْكٰفِرِیْنَ)۔ آگے عبارت بالکل صاف ہے: اَلْجَنَّةَ اتنی آسانی سے نہیں ملنا جتنا تم سمجھ بیٹھے ہو، وہ تو صرف سعی و عمل کرنے والوں (جٰهَدُوْا مِنْكُمْ) اور استقلال والوں (الصّٰبِرِیْنَ) کو ہی ملتا ہے۔ تم تو اس جنگ اُحد سے پہلے موت کی تمنائیں مانگا کرتے تھے، شیخی میں آکر کہا کرتے تھے کہ ہم خدا کی عبادت میں جان تک دینے کیلئے تیار ہیں تو اُحد کے دن کیا موت ٹلی تھی کہ موت تمہارے سامنے تھی اور اُس سے جی چرا کر بھاگے بھاگے پھرتے تھے!

ان آیات الٰہی میں ضمناً **ایمان** کی تشریح ہو گئی کہ اسکا اصل نتیجہ فتح تو ہے۔ **شہداء** کے معنی معلوم ہو گئے۔ **ظالمین** کا پتہ لگ گیا کہ کچے ایمان والے لوگ ظالم ہیں۔۔۔ دراصل لیئے ہلاکت اور شکست کے اہل صفوا مستیات (۳: ۱۴۱ - ۱۴۳) 'کفر' کی ایک حد تک وضاحت ہو گئی کہ میدان جنگ میں

سلہ مطالب کے لیئے دیکھو صفحہ،

عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ وَلَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ‌ۚ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ† ۝ (۳ : ۱۹۴)

پھر پروردگار عالم نے انکی دعا قبول کر لی اور فرمایا کہ ہم تم میں سے کسی کام کرنیوالے کے کام کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔ مرد ہو یا عورت ہماری نظروں میں سب برابر ہیں۔ تم سب ایک دوسرے کی جنس ہو تو جن لوگوں نے ہماری خاطر ہجرت وطن کی، اور ہماری ہی وجہ سے اپنے گھروں سے نکالے گئے، اور ستائے گئے، اور دشمنوں سے لڑے، اور مارے گئے، ہم انکی سب اجتماعی بدحالیوں، خانہ بربادیوں، اور واماندگیوں (سَيِّاٰتِهِمۡ) کو اُنسے دور کر دینگے، اور انکو ایسے عمدہ باغوں میں لیجا داخل کرینگے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہونگی۔ یہ اللہ کے ہاں سے اُنکے اعمال کا بدلہ ہوگا اور اچھا بدلہ تو اللہ ہی کے ہاں ہے۔

آہ! لیکن اس مالک الملک اور پروردگار عالم خدا کو، جسکی طاقت اور حکومت، جسکی عزت اور عظمت صحیفۂ فطرت کے ہر صفحے میں نمایاں ہے، جس کی بے نیازی کی شان صفحۂ عالم پر بقدر روشن کی طرح ثبت ہے، ایک ذلیل، بے حیثیت، اور ہیچمیرز انسان کی مبہم عبادت، سچی محبت اور لاشریک طاعت کی کیا حاجت تھی؟ هُوَ اللّٰهُ الَّذِىۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ۚ اَلۡمَلِكُ الۡقُدُّوۡسُ السَّلٰمُ الۡمُؤۡمِنُ الۡمُهَيۡمِنُ الۡعَزِيۡزُ الۡجَـبَّارُ الۡمُتَكَبِّرُ‌ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الۡخَـالِـقُ الۡبَارِئُ الۡمُصَوِّرُ‌ لَـهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى‌ؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ۚ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝ؑ (۵۹ : ۲۲-۲۴)، وہ جانوں کا خالق، دنیا کے امن و آسایش کا کفیل (الۡمُؤۡمِنُ الۡمُهَيۡمِنُ)، موجد اور مصور خدا جسکی تسبیح و تقدیس میں اُس کے

سلہ وہ اللہ ایسا پاک ذات ہو کہ اُسکے سوا کوئی آقا ہونے کے لائق نہیں۔ بادشاہِ جہان ہے، پاک ہے، تمام عیوب سے مبرا ہے، امن دینے والا نگہبان ہے، زبردست اور بڑا بازو والا ہے، صاحب عظمت ہے۔ جس جس کو یہ لوگ اُس کی عظمت میں شریک کرتے ہیں وہ ان سب سے بالاتر ہے۔ وہی ہر شئے کا خالق، بلکہ موجد اور مصور ہے، اُسکے بڑے بڑے اوصاف ہیں (الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى) جو کچھ زمین و آسمان میں ہے اُسکے احکام کی تعمیل میں سرگرم ہے (يُسَبِّحُ)، اور وہ بڑا غالب اور حکمت والا ہے۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۲۱) خدا کی لڑائیاں آخری دم تک استقلال سے نہ لڑنا کفر اور انکار خدا ہے۔ صَبَرَ کے مطالب صاف ہو گئے کہ وہ صرف استقلال ہی ہے، جِهَاد کی حقیقت کھل گئی کہ وہ صرف قتال بالسیف ہی ہے۔ جو لوگ جہاد کے معنی تسبیحوں پر بغدادینے کے لیتے ہیں ان کیلئے یہ آیات ازبس عبرت انگیز ہیں۔ اور بالآخر یہ کہ تمنائے موت کے معنی سمجھ میں آگئے کہ اس سے مراد لڑائی میں کٹ مرنا ہے کہ یہی سب سے بڑی جانثاری کسی آقائے نامدار کی ہو سکتی ہے۔ یہی ہر بادشاہ اپنے سپاہی سے چاہتا ہے اور اس کے عوض میں تمغے اور انعام، جاگیریں اور منصب تقسیم کرتا ہے۔ تمنائے موت کا ذکر تیسری جلد میں عنقریب آئیگا۔

† اس آیہ کریمہ میں لَاُكَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ وَلَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ کے الفاظ تشریح طلب ہیں۔ لیکن ان کی تشریح صفحہ ۱۳ کے تحت المتن میں مصیبت کے عنوان میں آئے گی۔

اپنے قول کے مطابق آسمان وزمین ہر وقت مصروف رہتے ہیں، اس ذرۂ مقدار انسان سے اپنی محبت کے ولولے میں، تحمل آلام، نقصِ امن، اور خراج مال وجان کا کیوں طالب تھا؟ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝✝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝✝✝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝ (۲: ۱۵۵-۱۵۷)

سلہ اے ایمان والو! اسمیں شک نہیں کہ ہم تمکو ذرا اچھی طرح (بِشَيْءٍ) دشمن کا خوف دلاکر، میدان جنگ میں بھوکوں مار کر، مال اور جانوں میں کمی کرکے پیداوار کا نقصان کرکے (الثَّمَرَاتِ) نتائج کو خلاف امید کرکے (نَقْصٍ مِّنَ..... الثَّمَرَاتِ) آزمائیں گے اور تمہارے ایمان کی قدر وقیمت، اور سعی وعمل کی حد کا اندازہ لگائیں گے، لیکن اگر تم فی الحقیقت صاحب ایمان ہوتے تو تم بھی ان آزمائشوں میں پورے اتر کر رہوگے اور اپنے سعی وعمل کو ہرگز کم نہ ہونے دوگے۔ اور اے محمد! مصائب کا استقلال سے مقابلہ کرنے والوں کو ہماری خوشنودی اور کامیابی کی بشارت دیدو (وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ)؛ اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر کوئی اجتماعی مصیبت آپڑتی ہے تو مقابل ہو کر کہتے ہیں کہ ہم تو فی الحقیقت خدا ہی کے اطاعت گزار ہیں۔ (إِنَّا لِلَّهِ)، اسی کے بتائے ہوئے حکموں پر چلیں گے (وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ)، اُسی کی طرف اپنا تمام تر رجوع کردینگے (وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ)، اور اپنے سعی وعمل سے خدا کو پھر خوش کریں گے (یہ مصیبت جو ہمیں پہنچی ہے لامحالہ ہماری سعی میں کسر کے باعث ہی ہے۔ دیکھو قرآن کریم وَمَا أَصَابَكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ (۴: ۷۹) اور سعی وعمل کو دوبالا کردینا ہی خدا کی طرف رجوع کرنا ہے) یہی وہ لوگ ہیں جن پر اپنے پروردگار کے بیشمار افضال ہیں، تحسین وآفرین کے نعرے (صَلَوَاتٌ) ہیں، رحمت اور عنایت ہے، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کو مصائب کے دور کرنیکے متعلق صحیح راہ عمل مل چکی ہے، (وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ)۔

✝ یہاں الصَّابِرِينَ کا لفظ پھر آیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ صابر وہی لوگ ہیں جو ہر اجتماعی مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں، اسکے دور کرنے کے لیئے ہر آن مستعد رہتے ہیں۔ نہ وہ جو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر اپنی بربادی کا تماشہ کرتے اور ٹس سے مس تک نہیں ہوتے کبھی کبھار آہیں نکالکر یا عورتوں کی طرح آنسو بہاکر اپنے نفس کو دھوکہ دیتے ہیں کہ صابر ہیں!

✝✝ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کے الفاظ مسلمانان جہان جس حیرت انگیز نادانی، جہالت اور ناسمجھی سے نہ معلوم کتنی قرنوں سے کسی عزیز کی موت یا ادنیٰ سی ادنیٰ خانگی اذیت پر استعمال کرتے آئے ہیں، اور اس محض زبانی عبادت کے صلے میں اپنے آپ کو رحمتِ خدا کا مستقل حقدار گنتے ہیں، اُس سے کم از کم یہ مترشح ہوتا ہے کہ کلام الٰہی کا صحیح علم کسقدر جلد رسم ورواج کی لکیر میں پڑکر بے اثر ہو گیا تھا، اور آیات خدا کے مطالب یقینیات کے بلند مرتبے سے گرکر ظن واعتقاد کی ادنےٰ سطح پر کس سرعت سے پہنچ گئے تھے۔ اوپر کی عبارت میں ہم نے ان آیات (یعنی (۲: ۱۵۵-۱۵۷)) کا مربوط اور مسلسل ترجمہ کر دیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ ان میں نہ کسی خانگی مصیبت کا ذکر ہے اور نہ یہ ترغیب دی گئی ہے کہ جب تمہارا کوئی رشتہ دار مرجائے تو إِنَّا لِلَّهِ کے الفاظ مُنہ سے بڑبڑالو، پھر جب کہہ لوگے تو خدا کی طرف سے تم پر "صَلَوَاتٌ" اتریں گی، رحمت رب نازل ہوگی، اور تم ان الفاظ کے دہراتے ہی "مُهْتَدُونَ" یعنی ہدایت پانے والوں میں سے بن جاؤگے (۲: ۱۵۷)۔ یہ سب تشریح نہایت لچر اور شرمناک ہے۔ کوئی ذہن سلیم اسکو ایک لمحے کے لیئے بھی قبول کرنے پر تیار نہیں۔ سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ یہاں پر صرف اجتماعی مصائب کا ذکر ہے۔ جسکی تائید جمع کے صیغے سے ہوتی ہے جو ان آیات میں برابر چلا جارہا ہے۔ مُصِيبَةٌ جس کا ذکر آیۂ (۲: ۱۵۶) میں ہوا ہے لامحالہ وہ خوف کا احول ہے جو ہر شکست زدہ اُمت پر ہر آن حاوی رہتا ہے (بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ)، وہ فقر وافلاس جو محکومیت اور ضعف کی حالت میں غلام قوموں کا پیچھا نہیں چھوڑتا (وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ)، وہ قلت تعداد ہے جو دشمن کی اکثریت، اُبہت، اور ہجوم کے بالمقابل عجز وبیچارگی پیدا کردیتی ہے (وَالْأَنفُسِ)، وہ قہر خدا ہے جس سے

وہ کیوں ہجرت وطن اور قتال بالسیف کو ہی ایمان کا صحیح معیار قرار دے کر مہاجرین و انصار کو
سچے مومنوں کی فہرست میں شمار کرتا تھا: وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّ

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۴۳) اُنھیں قحط اور وبا، فاقوں اور بیماریوں کا شکار ہوجاتی ہیں، جس کے باعث دنیاوی انعام سب اُچک لیے جاتے ہیں (وَالثَّمَرَاتِ)، دشمن ہر وقت تاک میں لگا رہتا ہے، اور کمزور کی کمزوری کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ گویا یہاں پر بعینہٖ اُس قطع کی مصیبت کے تمام ابتلا کا ذکر ہے جو اَعْلَوْنَ نہ رہنے کے باعث قوموں پر طاری ہوجاتی ہے اور جس کا مصداق آج تمام عالم اسلام ہے۔ قرآن حکیم نے اس قلت تعداد اور ضعف قوت، اس خوف عدو اور بیم موت کی تصریح ایک دوسرے موقع پر بھی کی ہے جس میں بوضاحت تمام جتلا دیا ہے کہ کسی قوم کا آزاد ہونا اور دنیوی نعمتوں اور طیبات رزق سے متمتع ہونا ہی نصرت الٰہی ہے:

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ○ (۸: ۲۶)

اور مسلمانو! وہ وقت یاد کرو جب تم دنیا میں تعداد میں تھوڑے سے تھے، کمزور اور بے بس گنے جاتے تھے، اور ہر آن اس خوف کے باعث سہمے رہتے تھے کہ دشمن تمہیں اُچک نہ لیجائیں۔ پھر خدائے ذوالجلال نے (تمہارے اعمال کو پسند فرماکر) تم کو اپنی پناہ میں لے لیا، اپنی مدد سے تم کو قوی بنایا، اور دشمن پر فتح دیکر عمدہ قسم کی دنیاوی نعمتیں بخشیں، اور یہ سب اس لیئے کہ تم قوت اور امن، نعمائے الٰہی اور تائید خدا کی دل سے قدر کرو اور اُسکے قوت انگیز احکام پر بدستور عمل کرتے رہو (لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ)۔ (شکر کے اس معانی کی تصریح کے لیے دیکھو صفحہ ۱۰۳)

یہ آیت مسئلہ ارتقا کی بحث کے ضمن میں صفحہ ۱۲ کے تحت المتن میں گذر چکی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ آیات اِنَّا لِلّٰہِ (یعنی (۲: ۱۵۵–۱۵۷) میں 'خوف' یہی يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ کا خوف ہے، اور 'نَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ' یہی 'قَلِيلٌ' اور 'مُسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ' ہونا ہے، اور یہی وہ مصائب کبریٰ ہیں جن کا ابتلا مقصود ہے۔ کسی عزیز کا مرجانا 'نَقْصٍ مِّنَ... الْأَنفُسِ' نہیں ہوسکتا۔ مزید برآں تعجب ہے کہ جہاں کسی شخص کی طبعی یا ناگہانی موت پر 'اِنَّا لِلّٰہِ' کا غیر متعلق فقرہ نہایت التزام کے ساتھ استعمال ہوتا ہے وہاں خوف اور بھوک اور نقصان مال کے موقع پر دعا تک نہیں بولا جاتا! یہ دلیل بجائے خود اس امر کی شہادت ہے کہ اخلاف مسلمین نے کلمۂ استرجاع کو قطعاً غلط سمجھا ہے اور اسکے خدائی مفہوم سے یکسر الگ ہوگئے ہیں۔

لیکن اس استدلال سے قطع نظر ایک اور صورت نظر بھی ہے جو اس دعوے کی یکسر تغلیط کردیتی ہے کہ کسی مسلمان کی طبعی یا ناگہانی موت وہ 'مُصِيبَةٌ' ہے جس پر 'اِنَّا لِلّٰہِ' کہنے کی ضرورت یا اجازت ازروئے قرآن ثابت ہو۔ 'مُصِيبَةٌ' کا لفظ کلام الٰہی کے اندر بالالتزام اس خدائی انتقام یا اجتماعی سزا کے معنوں میں آیا ہے جو قومیں یا افراد اپنی غفلت یا نافرمانی کے باعث اپنے ہاتھوں مول لے لیتے ہیں۔ انفرادی اموات اس ضمن میں داخل نہیں کیونکہ نیک و بد سبھی ایک نہ ایک دن مرتا ہے اور ہر شخص کا مرنا ازروئے سزا یا انتقام واقع نہیں ہوتا۔ اگرچہ ایک ملک میں عام وبا کا پھیل جانا یا طوفان سے بستیوں کا ہلاک ہوجانا 'مُصِيبَةٌ' میں داخل ہوسکتا ہے۔ یہ نکتہ اس حیرت انگیز صحت اور تطابق کے ساتھ قرآن حکیم میں جا بجا بیان ہوا ہے کہ 'مُصِيبَةٌ' کے الحال مسخ شدہ معانی کی صحیح تصویر پیش کرنے کی غرض سے اس شہادت کا تمام و کمال یہاں پر لکھ دینا ضروری ہے۔

سورۂ آل عمران میں غزوۂ اُحد کے متعلق ہے:

أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ ○ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ (۳: ۱۶۴–۱۶۶)

مسلمانو! تم بھی عجیب لوگ ہو کہ جب تم پر جنگ اُحد میں شکست کی مصیبت آپڑی حالانکہ تم ہی جنگ بدر میں دشمنوں پر اس سے دگنی مصیبت ڈال چکے تھے، تو تمہارے چھکے چھوٹ گئے اور بے دل ہوکر لگے کہنے کہ ہیں! یہ آفت کہاں سے آگئی۔ اے محمدؐ! ان سے کہدو کہ یہ مصیبت آئی تو تمہارے اپنے کیئے سے آئی، اپنی نامردی اور بے دلی سے آئی، اور خدا تو ارشد و باحوصلہ اور بے نیاز ہے کہ اپنے بندوں کے کسی گروہ پر بے جا رعایت نہیں کرتا۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ

ؔ[1] مطالب کے لیے دیکھو صفحہ ۱۱۴–۱۱۵

صَدَقُوْا أُولٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۸: ۷۴)، وہ کیا سمجھکر اور کیا مدنظر رکھکر اپنی راہ میں قتل ہوجانے والوں کو زندہ اور بقید حیات کہا کرتا تھا؛ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ط

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۲۴) شَيْءٍ قَدِيْرٌ) اور وہ اس پر بھی قادر ہے کہ تمہارے اعمال کو دیکھکر تمہیں شکست دے۔ اور یاد رکھو کہ جس دن مقام احد میں دونوں فریق بھڑ گئے اور تم کو شکست کی مصیبت پہنچی تو یہ بھی خدا ہی کے حکم سے تھا اور غرض یہ تھی کہ خدا ایمان والوں کو الگ معلوم کرلے اور ظاہری مسلمان بنے والوں، لیکن دل میں نفاق رکھنے والوں کو الگ پہچان لے۔

یہاں ظاہر ہے کہ قرآنی اصطلاح میں مُصِیْبَۃ وہ شے ہے جو اپنے ہی کرتوت سے آتی ہے اور بطور سزا کے ہو۔ سورۂ نساء میں ہے: فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا (۴: ۶۲)، یعنی تو پھر ان منافقوں کی کیا ہی بری حالت ہوگی جب ان ہی کے اپنے کرتوت کی وجہ سے ان پر کوئی مصیبت نازل ہو تو تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے دوڑے آئیں کہ بخدا ہماری غرض تو یہی تھی کہ میل ملاپ اور اتحاد پیدا ہو۔ اسی سورۃ میں انہی منافقین کے متعلق ہے: وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا (۴: ۷۲)، یعنی مسلمانو! تم میں ضرور ایسے لوگ بھی ہیں جو ارادہ کر بیٹھتے ہیں کہ ہم خود کسی نہ کسی طرح جہاد سے پیچھے ہٹے رہیں گے، پھر اگر لڑائی میں تم پر شکست کی مصیبت آپڑتی ہے تو دل ہی دل میں کہتے ہیں کہ خدا نے مجھ پر بڑا ہی احسان کیا جو میں ان لوگوں کے ساتھ لڑائی میں موجود نہ تھا۔ یہاں پر مصیبت صاف اجتماعی مصیبت ہے۔ سورۂ توبہ میں پھر انہی مسلمان نما منافقوں کے ذکر میں ہے: اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ (۹: ۵۰)، یعنی اے محمد اگر تم کو جنگ میں فائدہ پہنچتا ہے یا غلبہ حاصل ہو رہتا ہے تو ان لوگوں کو برا لگتا ہے، اور اگر تم پر شکست کی مصیبت آنازل ہوتی ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنا کام پہلے ہی سے ٹھیک ٹھاک کر لیا تھا، اور تمہارے پاس سے اٹھکر واپس چلے جاتے ہیں تو ان کی باچھیں کھلی ہوتی ہیں۔ یہاں بھی مصیبت صاف لڑائی میں شکست کھانے کی مصیبت ہے، انفرادی مصیبت سے بحث نہیں۔ سورۂ قصص میں ہر مصیبت کو اپنے اعمال کی سزا کہا گیا ہے: وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (۲۸: ۴۷)، یعنی اور یہ اتمام حجت اس لیے ہے کہ مبادا ان پر انکے اپنے ہی کرتوتوں کے بدلے میں مصیبت نازل ہو......" سورۂ شوریٰ میں 'مصیبت' کے مفہوم کو یہ کہکر قطعاً عیاں کر دیا ہے کہ اقوام عالم پر کوئی مصیبت نہیں آتی مگر یہ کہ انکے اپنے ہی کرتوت ہوں مگر خدا اکثر واماندگیوں پر گرفت نہیں کرتا؛ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (۴۲: ۳۰)۔ سورۂ حدید میں اجتماعی مصیبت کے باعث نزول کو یہ کہکر اور بھی واضح کر دیا ہے کہ دنیا کی سب 'مصیبتیں' نہایت سوچ بچار کے بعد نازل ہوتی ہیں:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۙ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۵۷: ۲۲-۲۳)

اے لوگو! جو جو مصیبتیں روئے زمین پر نازل ہوتی ہیں، یا جو تمہارے اپنے ہاتھوں تم پر آتی ہیں، سب کی سب پیشتر اسکے کہ ہم انکو پیدا کریں ایک مسل میں درج ہوتی ہیں (جو علم الٰہی ہے اور جس کے اندر اس مصیبت کے ماخذ اور حاشیہ پر بھی بحث ہوتی ہے، اسکے سب وجوہ کامل طور پر بیان ہوتے ہیں، واقعات اور حالات سلسلہ وار قلمبند ہوتے ہیں) اور پھر کامل غور و خوض کے بعد اس مصیبت کے اجرا کا فیصلہ کیا جاتا ہے (اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا)، اور لوگو! اس بادشاہ کون و مکان کی حکومت اس قدر منظم، اس قدر قوی، اس قدر خبردار اور عادل ہے کہ یہ سب بظاہر ناممکن باتیں خدا کے لیے بیحد آسان ہیں۔ اور اے ناعاقبت اندیش انسانو! تمہاری جزا و سزا میں یہ عظیم الشان اہتمام اس لیے مدنظر رکھا گیا ہے کہ تم لوگ جو شے تمہارے ہاتھ سے چلی گئی ہے اسکو اپنے ہی بداعمال کا نتیجہ سمجھو، اور ناحق خدائی فیصلوں کو اتفاقیہ حادثہ اور بے اصول سمجھکر اپنی قسمت پر پشیمان نہ ہوتے پھرو (لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ)، یا جو انعام تمکو دیا گیا ہے اسکو بلا سبب اور بے وجہ سمجھکر اکڑتے اکڑتے پھرو اور سعی و عمل سے غافل ہوجاؤ، اور جانے رہو کہ خدا اترانے والے کاہل اور شیخی بگھارنے والے کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ (خدا کے سعی و عمل کے پسند کرنیکے متعلق اب تک اس کتاب میں اتنی شہادتیں مل چکی ہیں کہ ان آیات الٰہی کا اسکے سوا کوئی اور مفہوم ہو نہیں سکتا۔

(باقی)

بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۲: ۱۵۴)، وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ

(۳: ۱۶۸)؛ وہ کس حکمت عملی کی بنا پر انکو مغفرت عامہ کے بے تحاشا انعام، اور جنت کی دلفریب نہروں کے

ط۱ اے لوگو! جو شخص خدا کی راہ میں اور اُسکا اعلا کرتے کرتے قتل ہو گیا، اسکو مرا ہوا نہ کہو، وہ فی الحقیقت زندہ ہے، وہ ابد الآباد تک اپنا نام چھوڑ گیا، اپنے کارنامے چھوڑ گیا، وہ ہر وقت دوسروں کو شجاعت کی ترغیب دے رہا ہے، حوصلے بڑھا رہا ہے۔ لیکن تم نہیں سمجھتے کہ وہ کیونکر زندہ ہے۔

ط۲ اے لوگو! جو شخص راہ خدا میں قتل کیے گئے اُن کو مُردہ شمار نہ کرو، وہ تو فی الحقیقت زندہ ہیں اور خدا کے پاس بیٹھے ہوئے اُسکی نعمتوں اور رحمتوں سے مالا مال ہو رہے ہیں!

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۲۵) ان آیات سے ظاہر ہے کہ مصیبت یہاں پر بھی وہ اجتماعی سزا ہے جو خدا قوموں کو اُن کی مجموعی بداعمالیوں کے باعث نہایت غور و خوض کے بعد دیتا ہے۔ انفرادی اور خانگی مصائب اسمیں شامل نہیں اور نہ کسی عزیز کی موت اس قانون کے ماتحت ہو سکتی ہے۔ قوموں کی پشتینی غلطیاں اور کاہلیاں ایک اقل قلیل مدت کے اندر خدا کے وبال کو دعوت دیتی ہیں، پھر جب انکی بدکاریوں کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو پورے تامل کے بعد خدا کا اٹل حکم نافذ ہو جاتا ہے جیسا کہ سورۂ تغابن میں ہے: مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۶۴: ۱۱) اور جہیں کا قرآن کے اجتماعی عذاب ہی کا ذکر ہوا ہے۔ تمام قرآن کے طول و عرض میں صرف ایک جگہ (یعنی سورۂ مائدہ میں) مصیبت کا لفظ انفرادی معنوں میں استعمال ہوا ہے مگر وہاں پر موت کے لفظ ساتھ کی تصریح کر کے متنازعہ مسئلے کو برقرار رکھا ہے: اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ (۵: ۱۰۶) یعنی اگر سفر میں ہو اور تم پر موت کی مصیبت آپڑے تو وصیت کرتے وقت کوئی دو غیر مسلم گواہ بھی پیدا کر لو تو کچھ مضائقہ نہیں۔

الغرض مُصِيْبَة کی قرآنی اصطلاح کے متعلق اس تمام استدلال سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کی آیات زیر بحث میں خدائے علیم نے اس امر کی تلقین نہیں کی کہ جب تم پر کسی جہان کا خوف طاری ہو، یا غریب اور نادار ہو جاؤ، یا کوئی عزیز مسلمان مر جائے، یا تمہاری تجارت کا جہاز ڈوب جائے تو فوراً اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کا طلسمی منتر دہرا دو بلکہ یہ کہا ہے کہ اے مسلمانو! اسمیں شک نہیں کہ ہم وقتاً فوقتاً تم کو تمہاری مجموعی بداعمالیوں اور غلطیوں کے باعث محکومیت، فقر و افلاس، بیچارگی، اور شکست و ہزیمت کی مصیبتوں میں ڈالتے رہیں گے، لیکن اگر تم سچے معنوں میں مسلمان ہوئے تو تم اپنی آبائی غلطیوں اور ذاتی واماندگیوں کو خیرباد کہکر صبر و استقلال سے ان مصائب کا مقابلہ کرو گے، اور اپنے سے پہلے یہ آسمانی بلائیں ٹال کر رہو گے۔ اور سچے معنوں میں مستقل مزاج اور صابر لوگ تو وہی ہوتے ہیں جو مصیبت کو سر پر سوار دیکھ کر قانون خدا کی طرف از سر نو رجوع کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں (قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ) اور جان لیتے ہیں کہ یہ مصیبت ہمارے اپنے ہی کرتوت کی وجہ سے ہے اور خدا سے منحرف ہونے کا نتیجہ ہے۔ ہر سزا یافتہ مجرم یا عتاب زدہ ملازم اپنے آقا کو خوش کرنیکے لیے آئندہ من بعینہٖ اسی طرح کا رجوع اختیار کرتا ہے، وہ سزا کے بعد پھر اپنے متنازعہ حاکم کے حکموں کی تعمیل شروع کر دیتا ہے، اُسکے قانون کی طرف لوٹ آتا ہے، اپنی بداعمالیوں اور غلطیوں سے تائب ہو کر اُسکی صحیح معنوں میں ملازمت اختیار کر لیتا ہے۔ نہ یہ کہ زبان سے کوئی فسوں دُہرا دیتا ہے، اور آقا اُس کی خوش الحانی پر فریفتہ ہو کر اُس کو معاف کرے بلکہ شاباش بھی دے! قَالَ کا لفظ قرآن حکیم میں ایسے موقعوں پر محض مُنہ سے کہنے کے معنوں میں نہیں آتا بلکہ اپنے قول کو عمل سے ثابت کرنا مراد ہوتا ہے۔ سورۂ حٰم السجدہ میں ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ..... (۴۱: ۳۰)، یعنی جن لوگوں نے خدا کو اپنا رب کہہ دیا، پھر استقامت سے اس قول پر جمے رہے اُن پر فرشتے اُترتے ہیں۔ یہاں محض مُنہ سے کہنا ہرگز مراد نہیں بلکہ جن لوگوں نے اندرونے عمل خدا کو اپنا حاکم اور رازق مان لیا، اُن کا ذکر ہے۔

تشریح سَیِّئَۃ وحَسَنَۃ

مُصِیْبَۃ کی قرآنی اصطلاح کے معانی اب قریب قریب صحیح ہو چکے ہیں اور ظاہر ہے کہ کوئی انسانی لغت اب تک خدائی مفہوم کو ادا نہیں کر سکتی۔ قرآن بذاتِ خود اپنے معانی کا محافظ ہے اور اسی لحاظ سے سب انسانی لغات سے بے نیاز ہے۔ ایک اور قرآنی اصطلاح جو قریب قریب

دائمی وعدے دے دیا کرتا تھا؟ وہ کیوں اپنی سُرمہ گیں آنکھ کی الفت سے بھری ہوئی نظر میں
اُن غازیانِ ملت، اور فدائیانِ دین پر ہی ڈالتا تھا جو اسکی راہ محبت میں دیوارِ آہن کی طرح ثابت قدم

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۲۶) مُصِیبَۃ' یعنی اجتماعی بدحالی کے معنوں میں استعمال ہوئی ہے' سَیِّئَۃٌ ہے اور جس کی ضد حَسَنَۃٌ ہے۔ یہاں اِس تقریب پر اِن اہم اصطلاحات کی توضیح بھی کردی جاتی ہے اگرچہ اسکی ضرورت آگے چل کر واضح ہوگی۔ سالف سورۂ نساء میں ہے: مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (۴: ۷۹)، یعنی اے لوگو: جو بھلائی تم کو اِس دنیا میں پونہچتی ہے وہ تمہارے خدا کے بتائے ہوئے راہ پر چلنے کی وجہ سے ہے، اور جو سزا تم کو اس دنیا میں ملتی ہے وہ تمہارے اپنے کرتوت سے ہے"۔ علی ہٰذا القیاس سورۂ شوریٰ میں ہے: وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (۴۲: ۴۸)، یعنی "اگر ہم انکو انکے اپنے کرتوت سے کوئی بُرائی پونہچے"۔ جس سے مقصود افرادِ امّت کی غفلت کی وجہ سے اجتماعی سزا کا ملنا ہے۔ سورۂ اعراف میں اقوام کو سزا ملنے کے ابتدائی مراحل کے ذکر میں ہے: ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا (۷: ۹۵) "پھر ہم اس قوم کی ظاہری بدحالی کو خوشحالی اور فارغ البالی سے بدل دیتے ہیں یہانتک کہ وہ لوگ اسکے زعم میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں"۔ اسی سورۃ میں آگے چلکر ہے: وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ (۷: ۱۳۰) "اور ہم نے تو فرعون کی قوم کو برسوں کی خشک سالیوں اور کمی پیداوار کی سزا اسی لیئے دی تھی کہ وہ لوگ عبرت پکڑیں اور اپنی بداعمالیوں سے باز آئیں۔ پھر جب اُنپر کوئی اجتماعی راحت نازل ہوتی تھی تو کہتے کہ خدا کی طرف سے خوشنودیٔ مزاج کا یہ پروانہ ہمارے ہی نیک اعمال کیوجہ سے ہے، اور اگر اُنپر کوئی مجموعی آفت آتی تو موسیٰ اور اُسکے ساتھیوں کے بد افعال کا نتیجہ گردان کر اُن کے سر تھوپتے"۔ یہاں نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ کے متذکرۂ صدر معانی (صفحہ ۱۲۴۔ تحت المتن) کی تائید بھی ہوگئی اور سَیِّئَۃٌ کے مطالب بھی صاف ہوگئے۔ سورۂ رعد میں ہے: وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ (۱۳: ۶) "اور اے پیغمبر! یہ لوگ تم سے خوشحالی اور اجتماعی عافیت مانگنے کی بجائے عذاب کی جلدی مچارہے ہیں حالانکہ انکو خوب معلوم ہے کہ اِن سے پہلے ہمارے ہاں سے وہ وہ دردناک عذاب آئے ہیں کہ اُن کی کہاوتیں چلی آتی ہیں"۔ علی ہٰذا القیاس سورۂ نمل میں حضرت صالح کا قول ہے: قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (۲۷: ۴۶) یعنی حضرت نے کہا کہ اے قوم: تم کیوں خوشحالی اور امن (الْحَسَنَۃ) کو چھوڑ کر ذلّ و مسکنت کے عذاب (السَّیِّئَۃ) کے لیئے جلدی مچارہے ہو، تم کیوں خدائے ذوالجلال سے اپنی گذشتہ واماندگیوں پر پردہ پوشی کی درخواست (تَسْتَغْفِرُوْنَ) نہیں کرتے تاکہ تم مستحق انعام و اکرام ہوجاؤ"۔ یہاں بھی سَیِّئَۃٌ سے مراد صاف طور پر وہ اجتماعی بدحالی ہے جو احکام خدا کی عدم تعمیل کے باعث ہر قوم پر دفعتہً یا رفتہ رفتہ نازل ہوجاتی ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے: اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا (۳: ۱۱۹) یعنی "مسلمانو! اگر تم کو کوئی اجتماعی فائدہ پونہچتا ہے تو انکو بُرا لگتا ہے، اور اگر تم پر کوئی قومی آفت نازل ہوتی ہے تو یہ منافق خوش ہوجاتے ہیں"۔ یہاں سَیِّئَۃٌ کی کوئی دوسری تاویل غیر ممکن ہے اور مطالب بالالتزام وہی ہیں جو پہلے بیان ہوئے۔ سورۂ اعراف میں بنی اسرائیل کے بارے میں ہے: وَقَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۡ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ (۷: ۱۶۸) "اور ہم نے بنی اسرائیل کو بالآخر گروہوں میں تقسیم کرکے سطح زمین پر پھیلا دیا، اِن میں سے بعض اُمتیں صالح بنی رہیں (اور مدت مدید تک ہمارے انعاموں سے بہرہ ور ہوتی رہیں) اور بعض بہت جلد غیر صالح' ہوگئیں (اور جلد صفحۂ زمین سے محو کردی گئیں)، اور ہم نے اِن غیر صالح اُمتوں کی آزمائش طرح طرح کی اجتماعی خوشحالیوں (الْحَسَنَات) اور قسم قسم کی جماعتی بدحالیوں (السَّیِّئَات) سے کی کہ شاید وہ انعاموں کے ملنے کی لِم کو سمجھکر اور سزاؤں کے آنے کی حقیقت کو پاکر ہمارے قانون کی طرف لوٹ آئیں (لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ)"۔ گویا یہاں مراد یہ ہے کہ جہاں کچھ مدت کے لیئے راہ راست پر آجاتے تھے تو ہم اپنی نعمتوں کا دروازہ یکسر کھول دیتے تھے تاکہ انکو معلوم ہوجائے کہ انعام یکسر ہماری متابعت کی وجہ سے ملتا ہے، اور جہاں ہمارے قانون سے سرکش ہو بیٹھتے تھے تو اُن کو بدحال کر دیتے تھے کہ سمجھ لیں کہ یہ بدحالی اُنکے اپنے کرتوت ہی سے ہے۔ سورۂ زمر میں سَیِّئَات کا یہی مفہوم ذرا اور بھی واضح طور پر ہے: فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۭ وَالَّذِيْنَ

رہ کر لڑا کرتے تھے: إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ (۶۱: ۴)؛ نہیں! وہ زمین و

آسمان کے خزانوں اور ملاءِ اعلیٰ کے گنجینوں کا مالک خدا، جس کے قبضے میں کائنات عالم کی مفاتیح

لہ بیشک خدا انہی لوگوں کو پیار کرتا ہے جو اسکی حمایت اور محبت میں صف باندھ کر لڑتے ہیں اور ایسے جمے رہتے ہیں کہ گویا ایک دیوار ہیں جسمیں سیسہ پلا دیا گیا ہے۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۲۷) فَالَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ هَٰؤُلَاءِ سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَمَا هُم بِمُعْجِزِينَ ۝ (۳۹: ۵۱)، یعنی تو ان لوگوں کو ان کی بداعمالی کے بُرے نتائج اجتماعی بدحالیوں (السَّيِّئَاتُ) کی صورت میں پہنچے، اور ان اہل مکہ میں سے بھی جو لوگ حدود سے تجاوز کر رہے ہیں (ظَلَمُوا) ان کو بھی ان کے اعمال کے بُرے نتائج قومی زبوں حالی کی صورت میں عنقریب پہنچنے والے ہیں، اور یہ لوگ ایسے طاقتور تو ہیں نہیں کہ ہم کو عاجز کر دیں۔ اس موقع سے ذرا پہلے سیّئات کو پھر اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے: وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ (۳۹: ۴۸)، یعنی "پھر ان لوگوں کو اپنے کرتوت کے بُرے نتیجے اجتماعی شکست و ریخت (سَيِّئَاتُ) کی صورت میں ظاہر ہو گئے، اور جس سزا کو یہ لوگ ہنسی مخول سمجھ رہے تھے ان پر آ نازل ہوئی"۔ یہاں بھی سیّئات سے مراد بصراحت تمام وہ فقر و افلاس، خوف کا ماحول، اور ذلّت و مسکنت ہے جو اقوامِ عالم کو ان کی غفلتوں اور بداعمالیوں کی پاداش میں ملتا ہے۔ اس سے مقصود گناہ نہیں جس کا عملی مفہوم آج شرعی اصطلاح بن کر کچھ بے معنی سا ہو گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ ہود میں سیّئات کا یہ حالی مفہوم اور بھی واضح ہے: وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي (۱۱: ۱۰)، یعنی "اگر انسان کو کسی تکلیف کے پہنچنے کے بعد ہم نعماءِ الٰہی کا تھوڑا سا مزا چکھا دیں تو فوراً اپنے دل میں یقین کر لیتا ہے (لَيَقُولَنَّ) کہ اب (ہمیشہ کے لیے) میری سب خستہ حالیاں مجھ سے دور ہو گئیں"۔

(ب) ان مثالوں سے قطع نظر قرآن حکیم میں 'كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ' اور 'عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ' کے معنی خیز جملے بھی استعمال ہوئے ہیں جن کا صحیح مفہوم قوم کے افراد کا ان مجموعی گناہوں اور بداعمالیوں میں مبتلا ہونا ہے جس کا نتیجہ اجتماعی شکست و ریخت ہو۔ یہاں پر صرف دو مثالیں پیش کر دی جاتی ہیں۔ سورۂ یونس میں ہے: وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۝ (۱۰: ۲۷) یعنی "جس قوم نے بداعمالیاں کمائیں تو یاد رکھو کہ بُرے عمل کا ویسا ہی بُرا نتیجہ ہے، اور وہ نتیجہ یہ ہے کہ اس قوم پر ذلّت چھا رہی ہو گی"۔ گویا اس نے قرآنی 'سیّئات' وہ اجتماعی بداعمالیاں (مثلاً تفرقہ اندازی، بدنظمی، بددیانتی وغیرہ وغیرہ) ہیں جن کا نتیجہ قوم کی بدحالی ہے۔ رہی یہ بات کہ اس آیت میں اس دنیا کی جزا و ذلّت کا ذکر ہے، آخرت کی سزا کا مذکور نہیں، اس کا ثبوت تیسری جلد میں آئے گا جہاں تمام رکوع کا مربوط ترجمہ کر دیا ہے۔ سورۂ قصص کے آخری رکوع میں آخرت کی جزا و سزا کے بارے میں ہے: مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِّنْهَا ۖ وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۲۸: ۸۴)، یعنی "جس شخص نے اپنی جماعت کے حق میں ایک بھلائی کی تو اسکو اس بھلائی سے بہتر اجر دیا جائے گا، اور جس نے اپنی قوم کو کوئی گزند پہنچایا تو بداعمالیاں کرنے والے لوگوں کو تو ان کے اعمال کے مطابق ہی سزا ملیگی"۔ گویا 'كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ' کے قرآنی معانی قومی بدحالی کو اپنے ہاتھوں خریدنا، اور 'عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ' کا صحیح مفہوم اس بدحالی اور ذلّت کے لیے عمل کرنا ہے جیسا کہ آج قریب قریب ہر مسلمان اپنی قوم کے لیے اصالتاً اور معاً کر رہا ہے۔ ایک اسی قطع کی قرآنی اصطلاح 'مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ' ہے جو سورۂ نحل میں واقع ہوئی ہے: أَفَأَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ أَن يَخْسِفَ اللَّهُ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ۝ (۱۶: ۴۵)، یعنی "تو کیا وہ لوگ جنہوں نے اس کارگاہِ سعی و عمل میں بداعمالیوں اور غفلتوں کا جال بچھا رکھا ہے (مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ) فی الحقیقت اس امر سے بے خوف و خطر ہو گئے ہیں کہ خدا کسی دن ان کو زمین میں دھنسا مارے یا ان پر کوئی اور عذاب اُدھر سے آ نازل ہو جدھر سے ان کو سان گمان تک نہ ہو"۔ گویا 'مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ' سے مراد اجتماعی غفلتوں کا پے در پے مجرم بننا، لیکن کمزوریاں سے یہ سمجھنا کہ دراصل کسی جرم کا ارتکاب نہیں ہو رہا جیسا کہ آجکل عالمِ اسلام میں ہر جگہ ہو رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن حکیم میں بعض اوقات 'حَسَنَةٌ' اور 'سَيِّئَةٌ' کے الفاظ بادی النظر میں انفرادی نیکیوں اور ذاتی بُرائیوں کے لیے مستعمل نظر آتے ہیں۔ معاشرتی خصوصیات

اور جمیع مخلوق کا رزق ہے: لَهُ مَقَالِيدُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللّٰهِ أُولٰئِكَ

هُمُ الْخٰسِرُونَ[۱۳] (۳۹: ۶۳)، وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ[۱۴] (۱۵: ۲۱)،

---

۱۳ زمین و آسمان کے خزانوں کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں. جسکو خوش ہوکر جو چاہے اُن میں سے بخش دے. تو جو لوگ احکام خدا سے منکر ہیں اور اُسکے مطابق نہیں چلتے وہی گھاٹے میں ہیں۔

۱۴ اور اِس زمین و آسمان کے اندر کوئی ایسی شئے نہیں جسکے ہمارے ہاں خزانے نہ بھرے پڑے ہوں، اور ہم اُنکو اس دنیا میں بھیجتے بھی ہیں تو ایک مناسب اندازے کے ساتھ جو ہمارے علم میں ہے۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۲۸) سے بظاہر ان کا کچھ تعلق نظر نہیں آتا لیکن اگر بہ امعانِ نظر دیکھا جائے تو سیاق و سباق کلام سے عیاں ہو جائے گا کہ ان کا اصلی مفہوم بھی اجتماعی ہی ہے۔ قرآن حکیم اپنے کسی امر و نہی میں اجتماعیت کے گرانقدر اصل اصول کو نظر انداز نہیں کرتا، اور انہی اعمال کو حسنات یا سیئات قرار دیتا ہے جن کی تہ میں اجتماعی ترقی یا تنزل کے جراثیم مخفی ہوں۔ نہیں! بلکہ ازروئے قرآن 'حَسَنَةٌ' انسان کا وہ انفرادی عمل ہے جو خالصۃً اس ارادے کو پیش نظر رکھکر کیا جائے کہ اُسکے کرنے میں اجتماعی فائدہ ہے، اور علی ہذا القیاس 'سَيِّئَةٌ' وہ فعل ہے جسکا تعلق اور اضرار من حیث الجماعۃ نقصان دہ ہے، اور اسی لیئے اسکے عامل کی نیت اپنی جماعت کے بارے میں درست نہیں۔ **اعمال کا نیات کے ساتھ لازم ملزوم ہونا** اسلامی فلسفۂ عمل کا وہ جزو لاینفک ہے جو ہر صاحب نظر پر ظاہر ہے۔ دنیا کی بیدار اقوام کے سب افراد ہمیشہ سے تمام حسنات اسی مستقل پیش نہاد کو سامنے رکھکر کرتے آئے ہیں، اور یہی مطمح نظر جب رفتہ رفتہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو قوم میں بالتجسس نتائج 'سَيِّئَات' شروع ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ اکثر 'حَسَنَات' بھی 'سَيِّئَات' بن جاتی ہیں جیسا آجکل زکوٰۃ ہے کہ بیہودہ اور منتشر طور پر خرچ کرنیسے مسلمانوں کو قوت دینے کی بجائے ان میں گداگروں کی جماعت پیدا کرکے ضعف پونہچا رہی ہے۔ اس اہم موضوع کے متعلق اسلامی فلسفۂ عمل کے تحت میں مستقل بحث کی گئی ہے جو تیسری مجلد کے شروع میں آئے گی۔ سر دست صرف اسقدر دکھلانا مقصود ہے کہ **'حَسَنَةٌ' کی صحیح تعریف ازروئے قرآن یہ ہے کہ اِس سے کسی مستقل اجتماعی زبون حالی (یعنی السَّيِّئَة) کا دفعیہ ہو۔** مثال کے طور پر اگر ایک قوم کے افراد دیانت داری کے اصول پر اسلیئے عمل پیرا ہیں کہ بددیانتی سے ان کی تجارت کو فروغ نہیں ہو سکتا، اُنکی دنیا میں ساکھ نہیں بیٹھ سکتی، اُن کا کاروبار عالمگیر نہیں ہو سکتا، وغیرہ وغیرہ، تو وہ قوم بلاشبہ ایک 'سَيِّئَة' کا دفعیہ ایک 'حَسَنَة' سے کر رہی ہے، اور اسی لیئے فطرت کے خزانۂ عامرہ سے انعام پا رہی ہے۔ برخلاف اسکے جس قوم کا کوئی مستقل پیش نہاد نہیں رہا، اور اُس کے افراد فرداً فرداً نیک عمل بلا نیت کر رہے ہیں یا سرے سے قوم کے بدانجام سے غافل ہو کر بدیاں کر رہے ہیں تو قرآن کے روسے یہ حالت کچھ داخل حسنات نہیں۔ سورۂ رعد میں ہے:

وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (۱۳: ۲۲)

(اور صاحب علم و نظر تو وہ لوگ ہیں (اُولُوا الْأَلْبَاب' کا ترجمہ جو آیۃ (۱۳: ۱۹) میں ہے) جو اپنے پروردگار کی خوشنودی کی خاطر استقلال کو اپنا دستور العمل بنا لیتے ہیں (صَبَرُوا) جو 'الصَّلٰوة' کو قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انکو دے رکھا ہے اُسمیں سے ایثار مال در پردہ اور علی الاعلان کرتے ہیں اور اپنی اجتماعی بدحالی کا دفعیہ مناسب اعمال کے ذریعے سے کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی دنیا یعنی دنیاوی معاشرت (الدَّار) کا انجام (عُقْبٰى) اچھا ہی اچھا ہے۔

'الصَّلٰوة' کی اجتماعی خوبیوں، اور ایثار مال کے اجتماعی فوائد کے متعلق اصل کتاب میں بحث ہو رہی ہے، اور آیندہ کئی صفحے انہی اہم موضوعوں کے لیئے وقف ہیں، تاہم اِس آیۂ کریمہ سے ظاہر ہے کہ 'صبر'، 'اقامت الصلوٰة'، 'انفاق مال'، 'ادفاع سیئات'، سب کے سب **اجتماعی اعمال ہیں** جنکا اجتماعی حالت کو درست کرنے کی نیت سے کیئے جانا مقصود ہے۔ یہی مضمون قریب قریب سورۂ قصص (۲۸: ۵۴) میں ہے، اور وہاں بھی یہی مجموعی

---

۱۵ أُولٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ (۲۸: ۵۴)۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۲۹) جدّ و جہد مراد ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یہود کے سیاسی مدّ و جزر اور اجتماعی عروج و زوال کی توجیہ کے بارے میں خدائی ارشاد ہے:

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ۝ إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ ۖ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ (۱۷: ۶-۷)

پھر اے بنی اسرائیل کے نافرمانبردار لوگو! ہم نے زبردست حکمرانوں کو تم پر حاکم بنا دینے کی سزا کے بعد (دیکھو آیۂ (۱۷: ۵)) تم کو اُن پر غلبہ دیکر تمہیں باری دی، مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد کی، اور تم کو بڑے جتھے والے بنا دیا۔ اور ہم نے بار دگر تم پر عیاں کر دیا کہ اگر تم نے حُسنِ عمل سے اپنی اجتماعی حالت درست کر لی (اِنْ اَحْسَنْتُمْ)، تو اس کا فائدہ تمہی کو پہنچا (اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ)، اور اگر اس سے پیشتر تم نے بُرے عمل کر کے اپنے آپ کو غیر کا محکوم بنا لیا تھا (اِنْ اَسَاْتُمْ) تو اس کا نقصان بھی تمہی کو ملا تھا (فَلَهَا)۔

یہاں صاف طور پر ربِ زمین و آسمان کی لغت میں حُسنِ عمل '(الحسنات) سے مراد اجتماعی بیداری اور قومی احیار کے وہ متعارف اعمال ہیں جنکا اٹل نتیجہ غلبۂ قوم ہے، اور سُوءِ عمل '(السّیّئات) قومی اخلاق کا وہ انحطاطِ عمیم ہے جس کا نتیجہ محکومیت اور غلامی ہے۔ جن لوگوں نے حسنِ عمل سے مراد نہاں خانوں میں بیٹھکر تسبیحیں چلانا سمجھ رکھا ہو اُن کے لیئے یہ آیات ازبس سبق آموز ہیں! بنی اسرائیل کی قوم نے اپنے ظالم حاکموں (نہیں بلکہ خدا کے سخت گیر اور بارُعب بندوں عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ (دیکھو آیہ (۱۷: ۵)) سے نجات' اعتکاف خانوں کے اندر تسبیحیں پھیر پھیر کر حاصل نہیں کی تھی، وہ لامحالہ تیغ و تفنگ لیکر باہر نکلے ہونگے، ایمان کی اٹل قوتیں اُنکے دلوں میں موجزن ہوئی ہونگی، اتحاد، صبر، ایثار، مال وغیرہ ان کا مذہبِ عمل بن گیا ہوگا، پھر ربِ غفور و رحیم نے انکے اس حُسنِ عمل کو دیکھکر اُن کے گذشتہ گناہ، معاف کر دیئے ہوں گے، اور یہ بادشاہت کا حاصل ہونا ہی خوشنودیٔ خدا کی علامت تھی! مال و اولاد کی کثرت (اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ)، اور اُن کا جمِ غفیر ہو جانا (وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا)، بھی کچھ تسبیحوں کے زور سے نہ تھا، یہ سب افضالِ الٰہی عروسِ سلطنت کی وہ ادنےٰ کنیزکیں ہیں جو ہاتھ باندھے ہوئے اس کے جِلو میں ہر وقت حاضر رہتی ہیں، اور ہر اُس قوم کے گھر کا اُجالا بن جاتی ہیں جسکی میہمانی عروسِ بادشاہت قبول کرے! جو قوم اس کارگاہِ عمل میں اپنی بہتری کے لیئے حتی الامکان ہاتھ پیر مار رہی ہے، جو سعی و عمل کی دوست ہے، آزاد اور زور آور ہے، جو اُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ ہے، وہی اَحْسَنْتُمْ کی مصداق ہے، وہی قانونِ خدا کی پابند ہے، وہی خدا کی عملاً غلام ہے، وہی عبادت' کا حق ادا کر رہی ہے، وہی عِبَادًا لَّنَا ہے! منکوں کو ہاتھ میں پھیر پھیر کر رواں کر دینے سے خدا کی بندگی ہرگز نہیں ہو سکتی! اس کے لیئے ملازم ہونا شرط ہے، کام کرنا شرط ہے، متفق اور متحد ہو کر ہاتھ پیر مارنا شرط ہے! لیکن اس موضوع کو یہاں پر طول دینا بہت کچھ پیش از وقت ہے۔

ج) 'سیّئۃ' اور 'حسنۃ' کے متعلق متذکرۂ صدر بحث سے جو (الف) اور (ب) کے ماتحت ہوئی اسقدر ظاہر ہے کہ جہاں آیاتِ مشمولۂ (الف) میں ان اصطلاحوں سے مقصود اجتماعی بدحالی اور قومی خوشحالی ہے، وہاں آیات مذکورہ (ب) میں ان سے مراد وہ اعمال ہیں جو اجتماعی بدحالی اور خوشحالی کا پیش خیمہ ہوتے ہیں اور جن کا انجام بادشاہت اور تسلطِ فی الارض یا محکومیت اور غلامی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے کلامِ الٰہی میں جہاں جہاں یہ الفاظ آئے ہیں وہاں مراد یہی طاقت اندوز یا شکست انگیز اعمال ہیں اس سے کمتر قطعاً کچھ نہیں۔ سورۂ انعام کے آخری رکوع میں ہے: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (۶: ۱۶۱)، یعنی "جو شخص اس کارگاہِ سعی و عمل سے ایک 'حسنۃ' کما لایا تو اُسکو اُس جیسی دس 'حسنات' انعام میں ملیں گی اور جس نے اپنی جماعت کے حق میں کوئی شکست انگیز عمل کیا تو اسکو صرف اسیقدر ملے گی جسقدر اُس نے شکست و ریخت کی تھی، اور اُن پر زیادتی تو کسی صورت میں نہ ہوگی"۔ یہاں بادی النظر میں محاکمہ عام معلوم ہوتا ہے اور خیال میں آتا ہے کہ کسی خاص نیکی کی تخصیص نہیں کی لیکن اس سے پہلے کی آیت: اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۚ اِنَّمَا

رہا کرتا تھا، اور اِس بروقت مالی امداد کے صلے میں چند سِکوں کے بدلے، جنّت کے نظر فریب

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۳۰) اِنَّمَآ اَمۡرُهُمۡ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ۔ (۶ : ۱۶۰) یعنی اے پیغمبر! جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور کئی فرقے بن گئے، تمہارا اُن سے کچھ تعلق نہیں ہے، اُن کا معاملہ خدا کے حوالے ہے وہ خود ہی انکو دردناک سزائیں دے گا اور اس وقت ان کے بداعمال کا نتیجہ مو بمو بتلادے گا جبکہ شکست و ریخت اُن کے سروں پر چھا رہی ہوگی۔" مثا فیصلہ کر دیتی ہے کہ حَسَنَةٌ اور سَیِّئَةٌ کے الفاظ بالتخصیص اِسی اتحاد اور فرقہ بندی کے متعلق استعمال ہوئے ہیں جو ایک اجتماعی عمل ہے، اور ایسے ہی دور رس اور نتیجہ خیز اجتماعی نیکیوں کے متعلق خدا نے زمین و آسمان سے دس گنا ثواب مقرر کیا ہے۔ نہ یہ کہ اگر کسی راہ چلتے گدیہ گر کو دو پیسے دیدیئے جائیں تو خدا سے بیس پیسوں کا امیدوار انسان ہو جائے علیٰ ہذا القیاس سورۂ نمل کے اخیر میں الحَسَنَة کو اِس قدر جلیل القدر اور لائق الطاف و اکرام عمل قرار دیا گیا ہے کہ قیامت کی نفسا نفسی اور کس مپرسی کے دن اُس ایک الحسنۃ کا عامل سب جزع و فزع سے امن میں ہوگا، اور ایک السیئۃ کا کرنے والا اوندھے مُنہ جہنم میں دھکیل دیا جائے گا:

مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيۡرٌ مِّنۡهَا ۚ وَهُمۡ مِّنۡ فَزَعٍ يَّوۡمَئِذٍ اٰمِنُوۡنَ ۔ وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ فِى النَّارِؕ هَلۡ تُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ۔ (۲۷ : ۸۹ - ۹۰) یعنی جس شخص نے قیامت کے دن الحَسَنَة کو اپنی شفاعت میں پیش کیا تو اسکو اُسکے عمل سے بہتر اجر دیا جائے گا اور ایسے لوگ اُس دن قیامت کی تمام جزع و فزع سے امن میں ہونگے، اور جو السَّیِّئَة کو اپنے ساتھ لایا تو ایسے لوگ اوندھے مُنہ دوزخ میں دھکیل دیے جائینگے اور اُن سے پوچھا جائے گا کہ کیا یہ دردناک سزا تم لوگوں کو ماسوا تمہارے اعمال کے کسی اور جرم کی پاداش میں مل رہی ہے؟" ان آیات الٰہی سے ظاہر ہے کہ الحَسَنَة کا معیار از روئے قرآن کس قدر بلند ہے۔ آج لوگوں نے نیکی کا معیار اِس قدر پست مقرر کر لیا ہے کہ اونیٰ سی اور بے نتیجہ نیکیاں کر کے دس گنا ثواب کے منتظر رہتے ہیں اور اس نا روا زعم میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہتے ہیں۔ قریب قریب یہی بات سورۃ المؤمن (۴۰ : ۴۰) میں ہے مگر اسکے اعادے کی یہاں پر ضرورت نہیں۔ قرآن حکیم کی کل کائنات میں صرف دو یا تین موقعے (۴ : ۷۹، ۴۲ : ۴۸) (۳ : ۱۲۰) میں جہاں بادی النظر میں سَیِّئَة یا حَسَنَة کے الفاظ انفرادی معانی میں استعمال ہوئے ہیں مگر جس وقت اُن آیات الٰہی کا ربط اصل کتاب میں ظاہر کر دیا جائے گا تو عیاں ہو جائے گا کہ اِن موقعوں پر بھی اِن قرآنی مصطلحات کا بلند معیار بدستور قائم ہے۔

اِس تمام طول و طویل بحث و تمحیص سے جو ان اوراق میں سَیِّئَة اور حَسَنَة کے الٰہی مفہوم کے متعلق ہوئی بہر نوع یہ ظاہر ہے کہ سَیِّئَة کے معانی بھی "مُصِیۡبَة" کی قرآنی اصطلاح کی مانند دنیاوی اور اجتماعی بدحالی کے ہیں۔ جو جو سزائیں اقوام عالم کو اس دنیا میں قانون خدا سے منحرف ہونے، اور ذاتی غفلتوں کے تسلسل میں ملتی ہیں، اُن کے لیے قرآن نے لفظ 'سَیِّئَات' تجویز کیا ہے۔ اِسی لحاظ سے جہاں جہاں قرآن میں "نُكَفِّرۡ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ" یا "لَاُكَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ" وغیرہ کے الفاظ ہیں انکا صحیح مفہوم یہ ہے کہ "ہم اُن کی تمام اجتماعی بدحالیوں اور خانہ بربادیوں کو دُور کر دینگے" نہ یہ کہ "ہم اُن کے گناہوں کو معاف کر دینگے" جس کے معنی عملاً غیر محدود ہیں کیونکہ کسی شخص یا قوم کو پتہ نہیں لگ سکتا کہ اسکے 'گناہ' درحقیقت معاف ہوئے ہیں یا نہیں۔ اکثر شارحین قرآن نے اِن الفاظ کا یہ بے معنی اور بے نتیجہ سا ترجمہ کر دیا ہے اور حقیقت سے دور جا پڑے ہیں۔

'سَیِّئَة' کے لفظ پر طول و طویل بحث آیہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ۔ (۲ : ۱۵۶) صفحہ ۱۲۳) کے تحت میں اِس لیئے کی گئی ہے کہ صفحہ ۱۲۲ کے متن کی آیہ (۳ : ۱۹۴) میں لَاُكَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ وَلَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ کے الفاظ آچکے ہیں اور سَیِّئَة کی تشریح نہیں ہو سکتی تھی جبتک کہ 'مُصِیۡبَة' کی تشریح نہ کر دیجاتی۔ بہر نوع ظاہر ہے کہ اس آیت میں مراد یہ ہے کہ جن لوگوں اور قوموں نے میری راہ میں قتال کیا اور قتال کرتے کرتے ترک وطن پر مجبور ہوئے، میں اُن کی اجتماعی بدحالیوں کو دور کروں گا، اور انکو ایسے باغوں اور سرسبز زمینوں (جنّٰت) کا بادشاہ بنا دوں گا جن کے تلے نہریں بہتی ہونگی۔ ضمناً یہاں 'جَنّٰت' کے معانی کی بھی تشریح ہو گئی۔ گو جنّت کے متعلق مکمل بحث تیسری جلد پر چھوڑ دی گئی ہے۔ جو شخص اس قتال میں بچے رہے اُن کے لیئے زمین کے جنّات کی بادشاہت، اور جو مارے گئے اُنکے لیئے آخرت کے

باغات اور نہریں کیوں فروخت کر دیا کرتا تھا، اور پھر ان نعمائے الٰہی کے باوجود اِس

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۴۱) باغ بہشت۔ یہی "ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ" کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ 'مِنْ' کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ ثواب دنیاوی ہے اور سود انقد۔ آخرت کا اُدھار مقصود نہیں جیساکہ شارحین نے بالعموم فرض کر لیا ہے اور اس ناروا فرض کے باعث مسلمانوں کے آگے سے بادشاہت زمین کا وہ اہم نصب العین اور بہترین انعام دور کر دیا ہے جس پر سعی و عمل کا تمام حصر تھا۔

صلوٰت کے مفہوم کی تشریح

آیۂ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۲: ۱۵۶) کے مطالب کی صحیح تعیین کے بعد جو غور طلب بات لائق شرح و بیان رہجاتی ہے یہ ہے کہ آیۂ (۲: ۱۵۷) صفحہ ۱۲۳ کے الفاظ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ میں صلوٰتٌ کا مفہوم بعینہٖ کیا ہے، نہیں بلکہ مروجہ طریق درود خوانی میں اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ کے کیا معانی ہیں۔ اہل اسلام کی شرعی مجالس میں اور دوسرے موقعوں پر نبی کریمؐ کے نام پر درود بھیجنے، کا طریقہ ابتدا سے رائج ہے، اسمیں ہر مسلمان روز اوّل سے نہایت شدومد سے حصہ لیتا چلا آیا ہے؛ اور اس درود کا بار بار پڑھنا 'داخل ثواب' سمجھتا ہے۔ صدر اسلام میں یا اسکے کچھ دیر بعد تک جب کہ نبی آخر الزمانؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا پڑھایا ہوا سبق ابھی تازہ ہی تھا، اور اسلامی اوامر و نواہی کی حکمت بالغہ ہر مسلمان کے ذہن نشین اسقدر ہوگئی تھی کہ اسکی تعمیل کیلئے عند الضرورت ہزاروں میل چلنا بھی اُسکے لیئے ناگوار نہ تھا، ممکن ہے کہ کم و بیش ہر مسلمان 'درود' پڑھتے وقت اُسکے صحیح مفہوم سے واقف ہو، بلکہ اسکو صحیح لہجے اور تکیف دل کے ساتھ ادا کرتا ہو لیکن آج جبکہ مسلمانانِ عالم اسلام کا اکثر درس بھول گئے ہیں، 'درود' کا صحیح مفہوم اور اُسکا سچا کیف و حال ذہنوں سے قاطبۃً نکل چکا ہے، اور باقی ملفوظات شرعی کی طرح یہ عمل بھی محض رسمی اور بے نتیجہ رہ گیا ہے۔ آج جب کسی اوسط مسلمان کو درود کے متعلق سوال کیا جاتا ہو کہ وہ کیا ہے، کیوں اور کس لیئے بھیجا جاتا ہے، اسکی اصلی حکمت کیا تھی، تو وہ آئیں بائیں شائیں کرتا نظر آتا ہے، اور بالآخر جب تہ تک نہیں پونہچ سکتا تو سب ہتیار ڈالکر کہہ دیتا ہے کہ خدا کے احکام میں عقل کو کچھ دخل نہیں! اسمیں کلام نہیں کہ یہ طریق تخیل کسی حق طلب قوم کے لیئے ازبس مہلک ہے، اور فقدان عمل کا راز بھی اسی دم مزن اور لب کشا حالت کے قیام میں ہے۔ آیۂ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کی متذکرہ صدر توضیح کے بعد کم ازکم یہ ظاہر ہے کہ خدا نے اپنی جناب سے اُن لوگوں کو تحسین و آفرین کہنے کا وعدہ کیا ہے جو کسی اجتماعی مصیبت کو دفع کرنے کی غرض سے قانون خدا کی طرف لوٹ آتے ہیں، اور ایسے ہی کارکن لوگوں کے بارے میں اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ کے الفاظ استعمال کیئے ہیں۔ گویا صلوٰتٌ سے مراد وہ شاباش اور تحسین و آفرین ہے جو کسی شخص کو کسی پسندیدہ کام کے سر انجام کرنیکے بعد دیجاتی ہے۔ قرآن حکیم میں سرور کائناتؐ پر 'صلوٰت' اور 'سلام' بھیجنے کا حکم سورۂ احزاب کے ان الفاظ سے ظاہر ہے؛

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ٥ (۳۳: ۵۶)

لوگو! تم کس ناروا زعم میں ہو اور کیوں آئے دن نئے نئے بہتان باندھکر اور خوابیدہ فتنے جگا جگا کر رسول خدا کو تنگ کرتے ہو حالانکہ اس جلیل القدر نبیؐ کی شان و منزلت ہے کہ (وہ زمین و آسمان کا مالک خدا، اور اسکی عالم آرا قوتوں کے علم بردار فرشتے سب کے سب اُسکی حیرت انگیز طاقت عمل، اُسکی صحبت کے دیرپا اثر، اُسکے انقلاب انگیز زہد بروشت، اُسکی مقلب القلوب روحانیت پر تحسین و آفرین کے نعرے لگاتے رہتے ہیں (يُصَلُّوْنَ)؛ اور ہر دم اُسکے خیر القرون اور سید کائنات ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی اپنے اس رہنمائے جلیل پر آفرین کے نعرے لگاؤ (صَلُّوْا عَلَيْهِ)، اور اُسپر تمام اُمت کا سلام بھیجا کرو (سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا) اُسکے احکام کے آگے سر تسلیم خم کردیا کرو (سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا)۔

ملٰٓئکہ کی حقیقت سے یہاں پر بحث نہیں، نہ اسپر کہ رسول خدا کا وہ کیا زور عمل تھا جس نے ایک عالم کو انگشت بدنداں کر دیا تھا، اسکی حقیقت اصل کتاب میں بتدریج عیاں کردیجائے گی۔ لیکن یہاں ظاہر ہے کہ نبیؐ پر درود بھیجنے سے مراد کیف دل کے ساتھ اُسکے جلیل القدر کا رناموں پر تحسیر ہوتا، اُس کا نام بر لب آنے پر تحسین و آفرین کے نعرے لگانا، اسکو زندہ باد (سلام) کہنا وغیرہ وغیرہ ہے جیساکہ آج ہر قوم اپنے رہنماؤں کے دیدار سے مشرف ہوکر کیا کرتی ہے۔ اِس عقیدت کیشی کا نتیجہ اکثر یہی ہوا کرتا ہے کہ دل میں اُن کاموں کی عظمت برقرار رہتی ہے، اور ہر شخص کے دل میں کچھ نہ کچھ ان جیسا بننے کے

قرضِ حسنہ کی چند درچند واپسی کا کیوں اصرار کرتا تھا؟

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۳۲) قدم بقدم چلنے کی اُمنگ پیدا ہوتی ہے۔ یہی مقصود نبی کریمؐ پر 'درود' بھیجنے سے تھا! اور یہی اسکا ثواب، (فائدہ) ہے مگر واحسرتا کہ یہ رسم بھی اب بے اثر ہو چکی ہے!

رہی یہ بات کہ صَلٰوۃ سے مقصود بعینہٖ یہی تھا جو اوپر بیان ہوا، اور صَلٰوۃ کا عمل صرف پیغمبرِ خدا ہی سے مخصوص نہیں بلکہ ہر در خورِ تحسین شخص اِس کا مستحق ہے، اور اُس زمانے میں تھا جب کہ قرآن وحی کیا جا رہا تھا، اس کا ثبوت سورۂ توبہ کی ایک آیت سے ہوتا ہے جس میں منافقین عرب پر درود بھیجنے کا حکم رسولؐ خدا کو دیا گیا ہے!!

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۹:۱۰۳)

اے پیغمبر! ان مشککین اور منافقین عرب سے اُنکے مال میں سے کچھ شئے بطورِ صدقہ لے لیا کرو (کہ یہ صدقہ' بادی النظر میں انکی مزعومہ قلبی کیفیت کی تصدیق کرتا ہے (دیکھو صدقہ' کی تعریف تحت المتن صفحہ ۱۱))، تم یہ طریقہ اختیار کرکے فی الحقیقت اُن کے دلوں کو محبتِ ماسوی سے پاک صاف کر دو گے (تُطَهِّرُهُمْ) اور اُن کے نفسوں کو آلائشِ حُبِّ زر سے مبرا کر دو گے (تُزَكِّيْهِمْ) اور یہی نہیں بلکہ اُن کا شکریہ ادا کرو (صَلِّ عَلَيْهِمْ) انکو اس ایثارِ مال کے عوض میں تحسین و آفرین کہو (صَلِّ عَلَيْهِمْ) انکو دعائے خیر دو (صَلِّ عَلَيْهِمْ) کیونکہ تمہاری شاباش (صَلٰوتَكَ) اُنکے لئے موجبِ اطمینان ہوتی ہے اور انکو ان سے بھی اچھے کاموں کے کرنے پر آمادہ کرتی ہے' اور یوں تو خدا ہر شخص کے ظاہر و باطن کو سمجھنے والا اور دل کی کیفیات کو خوب جاننے والا ہے۔

اِسی رَو میں جہاد سے جی چرانے والے منافقین کے بارے میں: وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (۹:۸۴) یعنی اگر انمیں سے کوئی مرجائے تو انکو ہرگز شاباش کہو اور پھر آگے چلکر اعراب کے [illegible]

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹:۹۹)

اور لوگو! ان بدو اعراب میں سے ایک طبقہ ان لوگوں کا ہے جو خدا کو حاکمِ اعلیٰ مانتے ہیں اور اُسکے حضور میں روزِ قیامت کو جواب دہی کرنے پر یقین کرتے ہیں، اور جو ایثارِ مال وہ کرتے ہیں اُسکو خدا کے تقرب اور رسول کی شاباش (صَلَوٰت) کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اے پیغمبر! ان کے ذہن نشین کر دو کہ یہ مال خرچ کرنا بیشک ان کے لئے باعثِ تقرب ہے؛ اور اگر وہ اسیطرح اپنی اجتماعی بہتری کے لئے مال خرچ کرتے رہے تو عنقریب خدا انکو اپنی رحمت میں لے لیگا۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ کارکن لوگوں کے حق میں گذشتہ واماندگیوں پر بڑا پردہ ڈالنے والا، اور بہت رحم کرنے والا ہے۔

یہاں صاف طور پر 'صَلَوٰت' کا مطلب وہ شاباش اور دعائے خیر ہے جو رسولؐ خدا ایسے مفید کارکنوں کو دیا کرتے تھے اور جو اُن کے لئے باعثِ اطمینان ہوا کرتی تھی۔ سورۂ احزاب میں قرونِ اولیٰ کے کارکن اور شہدائے خدا مومنوں پر خدا اور اُسکے فرشتوں کا درود بھیجکر 'صَلٰوۃ' کی حقیقت کو اور بھی عیاں کر دیا ہے (اِس آیت میں 'الظُّلُمٰت' اور 'النُّوْر' کے صحیح مفہوم پر بحث نہیں! آیندہ ترجمہ میں ان اصطلاحوں کا قرآنی مفہوم لکھ دیا ہے لیکن اسکا ثبوت بعد میں کسی موقع پر آئیگا)

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (۳۳:۴۳)

مسلمانو! اُس ربِ ذو المنن کے احسان و اکرام کی یہ شان ہے کہ وہ اور اسکی عالم آرا قوتوں کے علمبردار ملائکہ تم خستہ حال اور پیچھے رہ گئے ہوئے جہل زدہ اور نابکار اہلِ عرب کو اپنی تمام مستعدی کے ساتھ تحسین و آفرین کہہ کہہ کر اس بات پر آمادہ کر رہے ہیں (يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ) کہ تم کو جہالت، غفلت اور نا انجام شناسی کی ظلمتوں سے (مِنَ الظُّلُمٰتِ) نکال کر علم و عمل اور حقیقت کی روشنی کی طرف (اِلَى النُّوْرِ) نکال لائیں، اور اسمیں شک نہیں کہ وہ بادشاہِ زمین و زمان باایمان لوگوں کے ساتھ بڑا ہی صاحبِ لطف و کرم رہا ہے۔ (مَلٰٓئِكَة کی حقیقت اور انکے 'درود' کی کیفیت سے یہاں پر بحث نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ سے مراد یہاں پر وہ تحسین آفرین ہے جو ایک صاحبِ عزم اور ہوشمند، ایک عادل اور محسن شخص کسی مصیبت زدہ اور غافل شخص کو اِس نیت سے دیتا ہے کہ اسمیں اپنے آپ کو اُس تکلیف سے نجات حاصل کرنے کا حوصلہ اور استعداد پیدا ہو۔ مومنین عرب کے حق میں خدا نے بیمثال سے اسی بے اندازہ کرم کو مدِنظر رکھکر اس سے پیشتر کی آیت میں فرمایا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (۳۳:۴۱-۴۲)

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ؗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (۹ : ۸۸-۸۹)

لیکن رسولؐ اور جو لوگ اسکی تائید میں ایمان لاکر اپنے مال و جان سے جہاد کرتے رہے، یہی ہیں جنکو بہتر سے بہتر چیزیں دیجائیں گی، اور یہی کامیاب لوگ ہیں۔ اللہ نے اُن کیلئے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، وہ اُنمیں ایک مدت مدید تک رہیں گے، اور یہ بڑی ہی کامیابی ہے۔

(تتمہ تحت المتن صفحہ ۱۳۳) یعنی اَے ایمان والو! خدا کا اپنے دلمیں احساس کثرت سے کیا کرو، اور صبح و شام اسکی تسبیح و تقدیس کرتے رہو گویا ایسا محسن، ایسا رحیم، ایسا صاحب لطف و کرم خدا جو تم کو شاباش دے دے کر ظلمت سے نور کی طرف نکالتا ہے اور تمہارے وصلے بڑھا بڑھا کر تم کو حقیقت اور امن، تمکن فی الارض اور بقا کی طرف لاتا ہے اسی کے شایاں ہے کہ ہر دم اس کا کھٹکا اور اسکی یاد دل میں لگی رہے)۔

اِن تمام مثالوں سے ظاہر ہے کہ وہ شرعی ماحول جو لفظ 'صلّ علی' کے گرد اگرد پیدا ہو گیا ہے خود لوگوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ قرآن کو اس سے کچھ سروکار نہیں۔ قرآن حسب موقع عام مومنوں بلکہ منافقوں پر درود بھیجنے سے بھی نہیں جھجکتا! ضمناً یہ بھی ثابت ہو گیا کہ الصلوٰۃ، تمہید و تحسین ربّ العٰلمین ہے اس تمام تصریح کے بعد ضمناً اُس عظیم الشان حکایت کے صحیح مطالب بھی صاف ہو جاتے ہیں جو ہر مسلمان پانچ وقت خدائے جلّ شانہٗ کے حضور میں سلام پھیرنے سے پہلے بیٹھکر کرتا ہے۔ یعنی 'اَلتَّحِیَّاتُ' اور 'اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ' اور 'اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ' کے مطالب۔ آج فیصدی ایک متنفس بھی اِن تینوں قراتوں کے مقاصد کی تہ تک نہیں پونہچتا، اور علی الحساب بڑبڑا کر سلام پھیر دیتا ہے۔ الصلوٰۃ کے صحیح مقاصد کے متعلق مفصل بحث اصل کتاب میں آگے آرہی ہے لیکن ظاہر ہے کہ نماز میں حضوریٔ دل نہ ہونیکا بڑا باعث اُسکے صحیح مطالب کو نہ سمجھنا ہے۔ جب ایک شخص نہیں سمجھتا کہ وہ مخاطب کو کیا کہہ رہا ہے اور کس غرض و مطلب کے لیئے کہہ رہا ہے تو اسکا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ وہ اسکو طوطے کی طرح پڑھکر چھوڑ اسا اُتار دے اور بس 'اَلتَّحِیَّاتُ' خدا کے حضور میں ہر مسلمان عالم و جاہل کا وہ خراج تحسین و آفرین ہے جو وہ نبی کریمؐ کے حیرت انگیز اور جلیل القدر کارناموں کو فی الحقیقت دن میں پانچوقت ادا کرتا ہے، وہ ربّ ذوالجلال کی جناب میں اطمینان سے بیٹھکر سب سے پہلے اس آقائے ذوالمنن کی نعمتوں کا مُعترف ہوتا ہے (اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّیِّبَاتُ)، پھر اس رسول اعظم کے اعمال کو جسنے تیئس برس کی اقل قلیل مدت میں ایک جاہل اور اُجڈ قوم کا باوا آدم بدلکر اُنکو روئے زمین کے اکثر حصے کا بادشاہ بنا دیا تھا، سراہتا ہے، اُسپر رحمت اور برکت بھیجنے کی سفارش کرتا ہے، اُسکو اعظم الناس سمجھتا ہے (اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُہٗ)، پھر اپنے آپ کو اُسی جلیل القدر ہستی کا ایک پیرو، اور اُمت وسطیٰ کا ایک کارکن شمار کرکے اُس شہداء علی الناس اُمّت[1] اور اسکے صالح العمل ارکان پر سلام بھیجتا ہے (اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِیْنَ)، بعد ازاں خود اپنے دن بھر کے کارناموں اور اعمال کو نہایت عاجزی سے خدائے زمین و آسمان کے حضور میں پیشکش کرکے اپنے آپکے شاہد خدا ہونے اور اُس رسول کے اُمتی ہونے کا مُعترف ہوتا ہے (اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ) اسکے بعد اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ اور بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ ہے۔ پھر خدا کے ساتھ کئی لمحوں کی حضوریٔ دل، اور خلق خدا سے قطع تعلق کے بعد باشندگانِ زمین کو اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰهِ کا نعرہ دائیں بائیں ہے، اور نہایت ادب سے اُسکے حضور سے اُٹھ جاتا ہے۔ یہ نماز سب اگر اسی کیفیت دل کیساتھ ادا ہو تو کچھ معنی رکھتی ہے، نتیجہ خیز ہے ورنہ ایک بے اثر اور بے ثواب رسم ہے جسکو لاکھ بار کرنے سے کچھ نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا۔ انسان جو چاہے فرض کرلے مگر اس کارخانۂ قدرت کے اندر وہی شئے نتیجہ خیز ہے جو واقع الامر ہے۔ مفروض اور ظن کو اسکے اندر کچھ دخل نہیں!

۲ 'الحسنات' کی تشریح صفحہ ۱۲۶ کے تحت المتن میں حسنۃ اور سیئات کی شرح و بسط کے ضمن میں ہو چکی ہے اور وہاں پر ثابت کر دیا ہے کہ 'حسنات' کا اصلی مفہوم وہ اجتماعی برکتیں اور خوشحالیاں ہیں جو اُمتوں کو اُن کے حُسن عمل کے انعام میں ملا کرتی ہیں، نیز یہ کہ بعض موقعوں پر حسنۃ سے

---

[1] دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۰۵۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللّٰهَ
قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۚ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ ۖ وَ

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۳۴) مقصود بذات خود وہ اجتماعی اعمال ہیں جن کا نتیجہ قوم کی خوشحالی ہوا کرتا ہے۔ اس آیۂ شریفہ میں "الخیرات" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ یہاں پر بھی مومن، اور مجاہد بالمال والانفس قوم کو اجتماعی خوشحالی کی بشارت دی گئی ہے "اُولٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ"۔ شارحین نے "خیرات" سے مراد نیکیاں، اور فلاح کا مطلب "اُخروی نجات" لے لیا ہے۔ یہ بے معنی ہے، کیونکہ نیک عمل (یعنی جہاد مال و جان) کے بدلے نیک عمل، ملنا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اور فلاح بھی دنیوی اور اخروی دونوں مقصود ہے صرف اُخروی نہیں جو نظر سے تاحال نہاں ہے اور اس قدر محرک سعی و عمل نہیں ہو سکتی جس قدر کہ فوری اجر۔ نہیں بلکہ اجتماعی فلاح کا حاصل ہو جانا، یا اس کی جستجو میں اپنی جان اور مال کو قربان کر دینا ہی کسی متنفس کی اخروی نجات کا پیش خیمہ ہے، اور یہی اس آئندہ یعنی ابدی نجات کے حاصل کرنے کا صحیح معیار ہے۔ اس موضوع پر مدلل بحث اصل کتاب میں کچھ دیر بعد آئے گی، سردست لفظ "خیرات" سے سروکار ہے جس کے معنی ہم نے دنیا کی بہترین اشیاء اور نعمتہائے الٰہی سمجھے ہیں۔ اس مفہوم کی تائید قرآن حکیم میں کئی موقعوں پر بالصراحت موجود ہے۔ سورۂ مومنون میں فرقہ بند، مشرک، اور منتشر الاعمال قوموں کے بارے میں ہے: أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهِ مِنْ مَالٍ وَبَنِينَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ ۚ بَلْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ (۲۳: ۵۵-۵۶) "کیا یہ لوگ اس زعم میں ہیں کہ ہم جو انہیں مال اور اولاد کی کثرت سے ان کی مدد کر رہے ہیں، اس سے یہ مترتب ہوتا ہے کہ ہم ان کو اچھی اچھی اشیاء (الخیرات) اور نعمتہائے الٰہی (الخیرات) کے عطا کرنے میں جلد بازی کر رہے ہیں۔ نہیں بلکہ یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ہم ان کو کچھ اپنے پاس سے دے نہیں رہے، بلکہ ملے دیئے ہوئے انعام بھی رفتہ رفتہ چھین رہے ہیں۔" آگے چل کر ایمان والی قوم کے بارے میں ہے: أُولٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ ۝ (۲۳: ۶۱) "یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقی انعامات خدا (الخیرات) کے حاصل کرنے میں جلدی کر رہے ہیں (نہ وہ لوگ جن کا ذکر اوپر ہوا (۲۳: ۵۵-۵۶)، اور یہی ان کو لپک لپک کر پکڑ رہے ہیں۔" ان دونوں موقعوں پر "الخیرات" کے کوئی دوسرے معانی ہو نہیں سکتے، اور مراد صاف طور پر اجتماعی انعام ہیں، انفرادی نہیں۔ سورۂ مائدہ میں اہل کتاب کے باہمی اختلاف کی برائیوں کے ضمن میں ہے:

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلٰكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ إِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ (۵: ۴۸)

"اے ساکنان زمین! اگر خدا اپنی مرضی کرتا (لو شاء اللہ) تو وہ تم انسانوں کو ایک اُمت بنا دیتا۔ لیکن یہ صورت اختلاف جو تم نے اپنی خود رائی اور خدا سے برگشتگی کے باعث پیدا کر لی ہے اس سے شارع کائنات کی غرض یہ ہے کہ وہ تم مختلف شدہ امتوں کا امتحان ان الہیتوں اور نعمتوں کے بارے میں لے جو اس نے تم کو دیں (لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ)۔ تو اے انسانی امتو! تم اپنے آپ کو اس آزمائش میں کامیاب ثابت کرنے کے لیے خداوند عالم کے بہترین اجتماعی انعامات کی طرف لپکو (فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ)۔ جانے رہو کہ تم سب نے ایک نہ ایک دن خدا کی طرف لوٹنا، اور اس کے حضور میں اپنے سعی و عمل کی جواب دہی کرنی ہے۔ پھر اس دن وہ بنی نوع انسان کا خالق خدا تم کو اس حقیقت حال سے مطلع کرے گا جس کے بارے میں تم آپس میں اختلاف پیدا کر کے ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہو گئے تھے۔

اِس آیۂ شریفہ کے مطالب کے متعلق مکمل بحث صفحہ ۳۰۰ کے تحت المتن میں آئے گی۔ وہاں پر "لو شاء اللہ" کا متذکرۂ صدر مفہوم ثابت کر دیا جائے گا، لیکن ادنیٰ تامل کے بعد صاف ظاہر ہے کہ "الخیرات" سے مراد یہاں پر وہ اجتماعی انعامات ہی ہیں جو اقوام عالم کو ان کے سعی و عمل کے بدلے میں خدا کی جانب سے ملتے ہیں، اور انہی انعامات پر قبضہ کرنے کے لیے "استبقوا" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ "نیکیوں کی طرف لپکنا"، جیسا کہ اکثر شارحین نے سمجھ لیا ہے، محض بے نتیجہ سا جملہ ہے کیونکہ سعی و عمل کے متعلق تمام ترغیب و تحریص کسی مستقل انعام کو پیش نظر رکھ کر ہو سکتی ہے، سعی بے حاصل کو فی نفسہ مآل سعی سمجھنا محض ایک شاعرانہ تخیل ہے، جس کی حقیقت اندر سے کچھ بھی نہیں۔ یہی مفہوم "الخیرات" کا سورۂ فاطر کی اس معنی خیز آیت میں ہے: ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ

إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (۲: ۲۴۴-۲۴۵)

اور خدا کا بول بالا کرنے کے ضمن میں اگر دشمن سے لڑائی کی نوبت بھی آ پہنچے تو قتال کرو، اور خوب جان لو کہ خدا تمہارے ارادوں کو بڑا سمجھنے والا، اور تمہارے اعمال کو بڑا جاننے والا ہے۔ کون ہے جو اللہ کو خوش دلی کے ساتھ قرض دے، اور پھر خدا اُس قرض کو اسی کے لیے کئی گنا بڑھا دے۔ تنگدست کرنا یا کشائش دینا بالآخر خدا ہی کے اختیار میں ہے، اور اُسی کی طرف تم بالآخر رجوع کرتے ہو۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۳۵) الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ۝ۭ (۳۵: ۳۲)، یعنی "اے لوگو! پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے جس قوم کو اہل سمجھا (یعنی مسلمانانِ قرونِ اولیٰ) اُسکو قانونِ خدا (الْكِتٰبَ) کا وارث ٹھیرایا، تو اُن (کی آیندہ نسلوں) میں سے کوئی اُمّت ایسی ناخلف ہوگی کہ بداعمالیوں سے اپنے آپ کو ہلاک کرے گی (ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ) اور کوئی ایسی بھی ہوگی کہ اپنے اوسط درجے کے سعی و عمل سے ہلاکت اور عروج کے بین بین رہے گی (مُقْتَصِدٌ) اور کوئی ایسی بھی ہوگی جو اپنے انتہائی جہد و عمل سے خدائے عظیم کے عطا کردہ انعاموں کی طرف لپک لپک کے پہنچے گی (سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ)، اور یہ آخری حالت کا قائم ہو جانا انتہائی فضل و کرم ہے"۔ یہاں 'سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ' کے ساتھ 'بِاِذْنِ اللّٰهِ' کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ وہ اجتماعی انعام خدا کے حکم سے ملیں گے، خدا کے حکم سے نیکیوں کی طرف لپکنا کچھ بے معنی سا ہے، اور یہاں استعارہ بظاہر اُس حالت کو پیش نظر رکھکر دیا گیا ہے جب منعم کسی انعام کی بخشش کے لیے اذن دیتا ہے اور منعم علیہ اسکے لینے آگے کو لپکتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ صاحب القرآن تعالیٰ کے بہشت کی حوروں کو لفظ "خَيْرٰتٌ" سے یاد فرمانے کی وجہ بھی انکی یہی انعامی حیثیت ہو جو اوپر بیان ہوئی۔ سورۃ الرحمٰن میں ہے: فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ۝ (۵۵: ۷۰) یعنی "اُن باغات کے اندر یہ عزیز القدر انعامات الٰہی یعنی خوبصورت بیبیاں ہونگی"!

'خَيْرٰتٌ' کے اِس مفہوم سے قطع نظر قرآن حکیم میں چند مواقع ایسے ہیں جہاں پر اس اصطلاح سے مراد (حَسَنٰت کے مفہوم کی طرح) وہ اعمال ہیں جنکا نتیجہ افضال و اکرام ہے۔ ایک آیت (۲۱: ۷۳)، صفحہ ۱۰۸ کے تحت المتن میں گذر چکی ہے، مگر یہاں پر اُسکا اعادہ کیا جاتا ہے:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝ (۲۱: ۷۳)

اور لوگو! ہم نے اسحٰق اور یعقوب علیہما السلام کو بھی اُن کے باپ ابراہیم علیہ السلام کی طرح اُن کی قوم کا پیشوا بنایا، وہ اپنی قوم کی رہنمائی ہمارے قانون کے ذریعے سے کرتے رہے، اور ہم نے ان کی طرف مفید جماعت اور مصلح قوم کاموں (الْخَيْرٰتِ) کے کرنے کی وحی بھیجی، اُنکو حکم دیا کہ الصَّلٰوة کو قائم کریں، الزَّكٰوة کو دیتے رہیں، اور وہ لوگ تو نمازگذار اور پابند زکوٰۃ ہی نہ تھے بلکہ فی الحقیقت ہمارے بندے اور غلام بنکر رہتے تھے۔

الصَّلٰوة اور الزَّكٰوة کی اجتماعی حیثیت کے متعلق مکمل بحث اصل کتاب میں آنے والی ہے تاہم سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ یہاں پر اُن قومی اور اجتماعی اعمال کا ذکر ہو رہا ہے جن کا نتیجہ فلاح قوم ہے اور جو ائمۂ اقوام کا پیش نہاد ہمیشہ سے رہا ہے۔ گوشہ نشین بن کر رام رام جپنے کا یہاں مذکور نہیں، عامۃ الناس نے نیک بننے (یعنی فِعْلَ الْخَيْرٰتِ) کو اکثر یہی سمجھ لیا ہے۔ بعینہ اسی قطع کے اعمال کا ذکر اسی سورۃ میں زکریا و یحییٰ علیہما السلام کے بارے میں ہے: اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝ (۲۱: ۹۰) یعنی "ہم نے اُن پر احسان بدیں وجہ کیے کہ اسمیں شک نہیں یہ لوگ مفید قوم اور مصلح اُمّت اعمال کی طرف لپک لپک کر پہنچتے تھے، اور ہم کو اجتماعی انعام کی رغبت، اور اجتماعی سزا کے خوف سے پکارا کرتے تھے، اور اسی بیم و رجا کے باعث ہماری جناب میں سچا خضوع و خشوع کیا کرتے تھے"۔ رغب و رہب اور خوف و اُمید کا کیف دل میں تبھی پیدا ہو سکتا ہے جب انعام دنیاوی ہو، اور یہی خشوع کا سچا باعث اکثر ہوتا ہے۔ اِس نقطۂ نظر سے ادنیٰ تامل بھی اِس نتیجے پر پہنچا دیتا ہے کہ یہاں بھی الْخَيْرٰتِ سے مراد خدمت عباد ہے، تسبیح گردانی قطعاً نہیں۔ سورۂ آل عمران میں جو خدائی محاکمہ بعض صالح اہل اہل کتاب کے بارے میں ہے اِس مفہوم کا صریح طور مؤید ہے: يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ ۝ (۵۷ : ۱۱)

کون ہے جو اپنے مال کا بہترین حصہ خدا کا نام بلند کرنے کی خاطر صرف کرے، اور پھر خدا بھی اسکے واسطے اسکو چند در چند کر دے، اور ساتھ ہی اسکو اسکی خدمت کا باعزت اجر دے۔

إِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ ۝ (۶۴ : ۱۷)

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۳۶) مِنَ الصّٰلِحِينَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ۝ (۳ : ۱۱۳-۱۱۵)۔ یعنی "یہ یہود خدائے استقصا ایمان لوگ ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دعوت میں مصروف رہتے ہیں، اور مفید جماعت اعمال کی طرف لپک لپک کر پہنچتے ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جو در اصل صالح کہلائے جانیکے مستحق ہیں۔ اور یہ لوگ کوئی بھی مصلح قوم عمل (من خیر) کریں ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ ان کے اس عمل کی قدر نہ کی جائے گی، اور خدا تو اپنے قانون سے ڈرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔" یہاں امر بالمعروف، اور نہی عن المنکر، صالحین متقین، وغیرہ اصطلاحات قرآنی کے صحیح مفہوم سے بحث نہیں لیکن ظاہر ہے کہ "الخیرات" سے مراد اجتماعی جدوجہد ہی ہے انفرادی عمل نہیں کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دعوت خانہ نشین رہ کر نہیں ہو سکتی، اور یسارعون فی الخیرات کا عمل بھی اسی ضمن میں ہے۔ سورۂ بقرہ میں تحویل شدہ قبلہ کو مرکز امت گرداننے کی بحث کے بعد الٰہی ارشاد ہے: وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيعًا إِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲ : ۱۴۸) "اور مسلمانو! تمہیں یاد ہے کہ اس کارگاہ اتحاد و اتفاق میں ہر قوم اور ہر امت اپنے لیے کوئی نہ کوئی سمت اتحاد تلاش کرتی ہے (وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ) اور پھر جب وہ لوگ کسی ایک مرکز کو مقرر کر لیتے ہیں تو سب کے سب طبعاً اسکی طرف رجوع ہو جاتے ہیں (هُوَ مُوَلِّيهَا)، تو اے مسلمانو! تم بھی اس کلیے کو پیش نظر رکھکر قوت افزا اور طاقت اندوز اعمال کی طرف لپک لپک کر پہنچو (فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ) اور تقرر قبلہ کے متعلق جو بات سب سے اہم اور نتیجہ خیز ہے یہ ہے کہ تم روئے زمین کے کسی گوشے میں ہو، اور کسی طرح پر بکھرے ہوئے ہو خدا تم کو اسکی بدولت مجتمع کر دیا کریگا، اور دوسری قوموں کے بالمقابل تمہارے مجموعی رعب و وقار کو برقرار رکھیگا، جانے رہو کہ خدا ہر شے پر قادر ہے۔" "الخیرات" کا مفہوم یہاں پر اسقدر اظہر من الشمس ہے کہ اسکے لیے کسی مزید بحث کی ضرورت نہیں۔

الغرض ان تمام آیات الٰہی کے غائر مطالعے کے بعد یہ مستنبط ہو جاتا ہے کہ "خیرات" کی جامع و مانع اصطلاح کا الٰہی مفہوم بھی حسنات کی طرح وہ اجتماعی انعامات ہیں جو منعم حقیقی اقوام عالم کو انکے حسن عمل کے صلے میں عطا فرماتا ہے جو اعمال ان انعامات ملنے کا پیش خیمہ ہیں وہ بھی از روئے قرآن الخیر میں داخل ہیں خواہ انکی جزا اجتماعی انعام کی صورت میں عامل کی عین حیات میں ملے یا نہ ملے۔ اسلام کے رو سے سب سے بڑا عمل جماعت کی بہتری اور تقویت کے لیے ہی ہے۔ جو عمل اس دنیا میں اصلاح پر نتیجہ خیز نہیں وہ داخل خیرات و حسنات نہیں، جو بہبودی قوم کی نیت سے کیا نہیں گیا وہ داخل سعی و عمل ہرگز نہیں۔ انفرادی جدوجہد اور اجتماعی حسن عمل کا یہ وہ عالم انگیز فلسفہ تھا جس کی صحیح تعلیم نے قرون اولیٰ کی اسلامی جماعت کے ہر فرد میں اضطراب عمل اس حد تک پیدا کر دیا تھا کہ لوگ برسوں اور عمروں تک ایک امیر اور ایک نظام، ایک جماعت اور ایک مرکز کے ماتحت سر بکف اور تیغ بر سر پھر کر بھی اپنے آپ کو "استبقوا الخیرات" کا مصداق نہیں سمجھتے تھے، اور آج جبکہ وہ نبوی اور الٰہی درس ذہنوں سے قطعاً نکل چکا ہے، انحطاط عمل کی یہ حالت ہے کہ کسی بھکمنگے کو دو دیکر، یا تسبیح پر چند بار نام خدا رٹ رٹ کر "استبقوا الخیرات" کے مصداق اور جنت کے حقدار بنے بیٹھے ہیں۔ اگر ہوشمند نظروں میں اس نیکی کے اس پست تخیل کا نتیجہ عالم اسلام کے حق میں پست کن ثابت ہوا ہے کہ جہاں قرون اولیٰ کے نکو کار مسلمانوں کو روئے زمین کی بادشاہت انعام میں ملی تھی وہاں دور حال کے نسبیہ پسند تسبیح برداروں اور صالح العمل پاکبازوں سے سلطنتیں چھینی جا رہی ہیں اور ذلت و مسکنت سب طرف سے یلغار، یہاں تک کہ روٹی بھی پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ۔

☆ اس آیہ کریمہ، اور پیشتر کی آیات (۵۷ : ۱۱) اور (۲ : ۲۴۵) میں "قرضاً حسناً" کے الفاظ آئے ہیں، عوام نے اس سے مراد خدا کے نام پر زکوۃ بطور قرض حسنہ دینے کے لیے لیے ہیں۔ ہم نے ترجمے میں ایک حد تک یہی صورت برقرار رکھی ہے لیکن اگر تامل سے دیکھا جائے تو یہاں پر ثنا یا لاگی

اگر تم خدا کے لیئے اپنے مال کا بہترین حصہ کاٹ کر الگ کر دو گے تو تمہارے ہی لیئے وہ اسکو چند در چند کر دے گا، تمہارے عیوب کی پردہ پوشی کرے گا، اور اللہ تو بڑا قدر شناس اور فراخ حوصلہ خدا ہے جو کسی کی اُجرت روک کر نہیں رکھتا۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ۝

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۴۰) کچھ خصوصیت نہیں اگرچہ "قرض" کا لفظ بگڑتے بگڑتے یہی معانی اختیار کر چکا ہے: "قرض" کے اصل معنی کاٹنے کے ہیں، اور اس لحاظ سے "اِن تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا" کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ "اگر تم لوگ خدا کے لیئے اور اُسکی آقائی کو مدِّ نظر رکھکر بہترین ٹکڑا کاٹ کر الگ کر دو گے" تو خدا بھی اس حصے کو چند در چند کر دے گا گویا اس احکم الحاکمین کی خاطر اگر انسان اپنے آرام کا، اپنی جان کا، اپنے مال و جائداد کا، اپنی محبوب اشیا کا بہتر سے بہتر ٹکڑا وقف کر دے، اور اپنے پر تکلیف گوارا کر کے اسکی لڑائیاں لڑے تو یہ اسکی نوکری کی بہترین شہادت ہے یہی بات سورۂ مزمل کے مفصلۂ ذیل الفاظ سے ظاہر ہے جہاں "زکوٰۃ" اور "قرضِ حسنہ" کو الگ الگ بیان کر کے اُنکے مطالب میں تفریق نمایاں کر دی ہے:

فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۚ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا (۷۳ : ۲۰)

تو اِن وجوہ کی بنا پر (جو وہاں تفصیل پر کسی اور موقع پر بیان کی جائینگی)، جو حصہ اس قرآنِ عظیم کا تم آسانی سے مطالعہ کر سکو پڑھ لیا کرو۔ اور الصلوٰۃ پر قائم رہو، اور ایثارِ مال کیا کرو، بلکہ خدا کے لیئے اپنی ہر مملوکہ شے کا بہترین حصہ کاٹ کر الگ کر دیا کرو۔

آیۂ زیرِ بحث میں "وَاللّٰهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ" کے الفاظ بھی غور طلب ہیں۔ "شکر" کے معانی آج قطعاً مسخ ہو چکے ہیں۔ ہر شخص دونوں ہاتھ اٹھا کر اس رسم کو ادا کر دیتا ہے اور چند الفاظ مُنہ سے بڑبڑا کر سمجھ لیتا ہے کہ ایک اہم فرض ادا ہو لیا۔ حالانکہ عام انسانی تعامل میں کیفیتِ قلب کا وجود ہی سچا شکر ہے جو شخص دل سے اپنے منعم کی عطا کی ہوئی نعمت کی قدر کرے وہی شاکر ہے، اور منعم کا "شاکر" ہونا یہی ہے کہ وہ اپنے خادم کی خدمت کی دل سے قدر کرے۔ اس کیفیتِ قلب کے لیئے ظاہر ہے کہ کسی وقت کی تعیین، یا رسم کی پابندی ضروری نہیں، بلکہ ہم قدر دانی کرنا ہی سچا شکر ہے۔ ایک شخص اگر خدا کی دی ہوئی نعمت کا صحیح استعمال کر رہا ہے، اُسکو برقرار رکھنے کے لیئے مسلسل سعی و عمل کرتا ہے اُس سے متمتع ہونے میں کفایت کو ہر وقت مدِّ نظر رکھتا ہے، اور دل سے خدا کی منعمیت کا معترف ہے تو وہ صحیح معنوں میں شاکر ہے۔ خواہ وہ تمام عمر میں ایک بار بھی رسماً ہاتھ نہ اٹھائے۔ برخلاف اس کے جو شخص خدا کی نعمتوں کا غلط استعمال کرتا ہے، اُن کو برقرار رکھنے کے لیئے حتی الامکان سعی نہیں کرتا، اُن کو حقیر سمجھکر پاؤں سے ٹھکرا دیتا ہے، کفایت کو پیشِ نظر نہیں رکھتا، یا ایک بیہودہ سا استغنا اختیار کر کے اُن کی بے قدری کرتا ہے وہ اگر تمام عمر بھی ہاتھ اٹھائے رکھے اور مُنہ سے شکریہ الفاظ بڑبڑاتا رہے تو شاکر کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ مسلمانانِ عالم نے آج شکر کا مفہوم اسقدر غلط سمجھ لیا ہے کہ صرف الفاظ باقی رہ گئے ہیں اور خدائی مقصود باطل کر دیا ہے۔ "وَاللّٰهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ" کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ خدا بھی اپنے بندوں کا "شکر" ادا کر سکتا ہے مگر ہاتھ اٹھا کر نہیں بلکہ اُن کی خدمات کی سچی قدر دانی کر کے اور وقتاً فوقتاً اُن کا صلہ دے کے۔ "شکر" کے اِن معانی کا قرآنی ثبوت جا بجا آگے چلکر (اور بالخصوص تیسری جلد میں) آئے گا۔

✤ یہ آیاتِ شریفہ گو رسولِ خدا کے زمانے میں احبار اور رہبان کے خلقِ خدا کو لوٹ لوٹ کر بے اندازہ مال جمع کرنے کے متعلق آئی ہیں، مگر میں نے ان کا اطلاق اسلیئے عام کر دیا ہے کہ آج مسلمانانِ عالم کے دلوں میں، اقوام کے بالمقابل، مال کی محبت اسقدر بڑھ گئی ہے کہ ہر شخص کم و بیش اسکا مصداق ہو رہا ہے خود دنیائے اسلام کے اندر اہلِ کتاب کے احبار اور رہبان کے بالمقابل لاتعداد ایسے سرگروہ پیدا ہو گئے ہیں جو اپنی نفسانی خواہشوں کو مدِّ نظر رکھکر لوگوں سے روپیہ بٹورتے ہیں اور پھر اسکو خدا کی لڑائیاں لڑنے میں صرف نہیں کرتے۔ انہی لوگوں کی شان میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں جیسا کہ غالباً تیسری جلد میں عیاں کر دیا جائیگا۔

> اور جو لوگ سونے اور چاندی کے ڈھیر لگائے رکھتے ہیں اور خدا کا نام بلند کرنے کی خاطر کچھ صرف نہیں کرتے، انہیں میری طرف سے دردناک عذاب کی خوش خبری سُنادو۔ روزِ قیامت کو وہی دولت جہنم کی آگ میں رکھکر تپائی جائےگی، اور پھر اس سے اُن کے ماتھے، انکی کروٹیں، اور انکی پیٹھیں داغی جائیں گی، اور اُنسے کہاجائےگا کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کررکھا تھا تو آج اپنے ڈھیروں کے ڈھیر جمع کر رکھنے کا مزہ چکھو۔

کیا مخالفین اسلام کی نظروں میں خلد بریں کی یہ ارزاں فروشی، اور ادائے قرض کے یہ دل خوش کن وعید، اُس خدائے غنی کے کامل غنا اور کمال تنعم کے نقیض نہیں ہو سکتے تھے؟ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاۗءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ[۱] (۳: ۱۸۰) کیا خود سید البشر اور سرور کائنات کے بارے میں زکوٰۃ و صدقات کے اِن نازک اور شکوک انگیز تقاضاؤں کے باعث، معاندین اُمت کی طرف سے طماع و حریص ہونے کا گمان نہیں ہو سکتا تھا؟ کیا "راہِ خدا" کی بظاہر بے معنی اصطلاح کی آڑ میں انفاق مال، جُرمِ عشق کا کوئی خدائی تاوان، یا مذہبی کاروبار کا کوئی آلۂ حصول تھا جو (العیاذ باللہ) کسی بُت پرست مجاور کی طرح، خدا کا گودڑمسی میں یہ مست رسولؐ ہر مسلمان سے وصول کرلیا کرتا تھا؟ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ[۲] (۹: ۱۰۴) کیا خدا کی عبودیت کے اعتراف میں قربانیٔ مال کا یہ وجوب و لزوم بنارس کے کسی مندر کے چڑھاوے یا نذر و نیاز قبور کی کوئی رسم تھی جو خدائے پاک نے اسلام میں گداگروں اور مفت خوروں کی اُمت کو ترقی دینے کی نیت سے وضع کی تھی؟ کیا دینِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طالب جان و مال خدا (العیاذ باللہ) کسی برہمن کی جبینِ نیاز کیش کی غضب آلود دیوی، یا متھرا کے قشقہ نما اور زنار پوش مشرک کا کوئی

۱؎ اللہ نے ان لوگوں کی بکواس سُن لی ہے جو تمہیں طنزاً کہتے ہیں کہ تمہارا اللہ تو محتاج ہے جو قرض مانگتا رہتا ہے اور ہم مالدار ہیں۔ ہم انکی ان گستاخیوں کو لکھ رکھیں گے، اور اُنکے پیغمبروں کے ناحق قتل کو بھی۔ پھر جس دن ہمارے غضب کا دریا جوش میں آئیگا ہم کہیں گے کہ اس بھسم کردینے والے عذاب کا مزا چکھو۔

۲؎ کیا ان لوگوں کو اس بات کی خبر نہیں کہ اللہ اپنے غلاموں کی توبہ بھی ہر وقت قبول کرنے کیلئے تیار ہے اور اس توبہ کی تائید و تصدیق میں خیرات کا مال بھی لے لیتا ہے، اور وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم دل ہے۔

مہیب دیوتا تھا جو انسانی جان کی خوں چکاں قربانی، اور مال و زر کے ہلاکت آفریں جرمانوں کے بغیر مطمئن اور مُسکن نہیں ہو سکتا تھا، اور جسکے نائرہ حرص و غضب کے تنور میں قیامت کے روز مسلمان عاصیوں کی پیشانیاں اور بدن داغے جانے کا وعدہ تھا! اور کیا یہ اسلام کے جابر اور قاہر خدا کا تحکمانہ ظلم و ستم یا محض ایک بے سبب اور بے نتیجہ دراز دستی تھی جسکے رو سے وہ جنّت کے پیش پا افتادہ وعدے کر کے، مومنوں کے جان و مال پر قابض ہو گیا تھا؟

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ† اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (۹ : ۱۱۱)

بیشک اللہ نے ایمان والوں سے اُنکی جانیں اور اُنکے مال اس وعدے پر خرید لیے ہیں کہ انکے بدلے اُنہیں اخروی جنّت دیگا۔ یہ لوگ اب خدا کے نام کا ڈنکا بجانے کی خاطر دشمنوں سے لڑتے ہیں، ان کو قتل کرتے ہیں اور آپ بھی قتل ہوتے ہیں۔ یہ خدا کا پکا وعدہ ہے جو تورات اور انجیل اور قرآن میں ہر مومن کے ساتھ برابر چلا آیا ہے، اور خدا سے بڑھکر اپنے قول کا پورا اور کون ہو سکتا ہے۔ تو اے ایمان والو اپنے اس سودے کی جو تم نے خدا کے ساتھ کیا ہے خوشیاں مناؤ، اسمیں تمہاری بڑی کامیابی ہے۔ اس میں تم کو فلاح دارین ہے۔

آہ معاذاللہ نہیں! اس تمام عجیب و غریب لین دین، اور محیّر العقول ترغیب و تحریص سے خدائے بے نیاز کا مقصدِ وحید ساکنانِ عالم کو اپنی ناپید امثال ذات کا شیدا و مفتون بنا کر، اُنکے دلوں میں

---

† 'مؤمن' کی صحیح تعریف، اور 'الجنّة' کے حقدار بننے کی کامل شرائط اس آیہ کریمہ سے واضح ہیں۔ یہی شرائط بعینہ صفحہ ۱۱۱ کی آیات (۲۳: ۱-۱۱)، اور (۹: ۱۵۱)، اور صفحہ ۱۲۰ کی آیہ (۳: ۱۴۱) میں درج ہیں۔ اگر آج مسلمانانِ عالم نے اپنے نفس کو دھوکہ دے کر کوئی اور شرطیں وضع کر لی ہیں تو اس سے قانونِ خدا میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی، نہ اس خوش اعتقادی کے بدلے میں 'الجنّة' مل سکتا ہے، خواہ لوگ ہزاروں برس تک یہ سبز باغ اور خوش کن خواب پڑے دیکھا کریں۔ شرط پوری جان اور سارے مال کے ایثار کی ہے نہ یہ کہ تھوڑی سی تکلیف برداشت کر کے یا چند پیسے نارواطور پر خیرات کر کے ایک کھرسا بنا لیا جائے۔ جیسا کہ بالعموم ہر مسلمان نہایت التزام سے کر رہا ہے۔ حَقًّا فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ ان دونوں کتابوں پر عمل کرنے والی مجاہد اقوام بھی صحیح معنوں میں مومن اور جنّت کی حقدار ہو سکتی ہیں۔

درد پیدا کرنا تھا! اپنی محبت اور اپنے تعلق سے وہ ورائے عالمیان، انسان کے غرضمند اور انعام طلب قلوب میں ایک اولوالامر کا خوف، اور ایک منعم اعلیٰ کا ڈر بٹھلانا چاہتا تھا؛ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۝[1] (۷: ۵۴)؛ وہ باشندگانِ روئے زمین کا ایک حاکم کُل اور ایک بادشاہ حقیقی تم سے اُنکو پیدا کر کے، اُن کے اعتقادات اور معاملات میں، اُن کے اعمال و افعال میں مشترک عبودیت کا تذلل اور عام نیازمندی کا عجز دیکھنا چاہتا تھا، اور پھر اس عجز و نیاز کی حوصلہ افزائیں، اور حیات انگیز تڑپ سے چار دانگ عالم میں، اِس گنبدِ افلاک کے نیچے، توحید کا نغمۂ مستطیر اور حقانیت کا ہنگامۂ عظیم پیدا کرنا چاہتا تھا!

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۭ وَلِلّٰهِ خَزَاۗىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ۝ (۶۳: ۷)

یہی منافق تو وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو بہکایا کرتے ہیں کہ ان لوگوں کی تائید و تقویت میں جو رسول خدا کے گرد جمع ہو گئے ہیں اپنا مال نہ خرچ کیا کرو۔ جب روپیہ پیسہ ان لوگوں کے پاس نہ ہوگا تو عاجز آکر آپ ہی تتر بتر ہو جائیں گے۔ یہی انکی قوت کا راز ہے۔ آہ لیکن منافقین نہیں سمجھتے کہ مال انکی قوت اور اجتماع کا راز نہیں، اور نہ خدا کو اسکی ضرورت ہی ہے، کیونکہ زمین و آسمان کے خزانے اسی کے ہاتھ

آہ یہ بھی نہیں! اُس صاحب جلال خدا کو جسکی سطوت اور جبروت میں، جسکے حاکمانہ رعب و وقار میں جسکی طاقت اور حکومت میں، روئے زمین کے تمام انسانوں کی سرکشی اور متفقہ انکار بھی یک سرِ مُو فرق نہیں لا سکتی؛ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ۝[2] (۱۴: ۸)؛ فی الحقیقت یہ منظور تھا کہ درد دل کے اِس دائرۂ عمل میں، اور مشکلات و محن کی صبر آزما مجسمر میں، وہ ہر مومن کے قلب کو دنیا کی

---

[1] لوگو! سن رکھو کہ تمام کائنات جہان اسی کی پیدا کی ہوئی ہے اور حکم بھی اسی کے ذریعے سب کچھ ہو رہا ہے نیز اسی کا ہے۔ پروردگار عالمین درحقیقت بڑا صاحب برکت ہے۔

[2] اور موسیٰ نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ اگر تم اور جتنے لوگ روئے زمین پر ہیں سب کے سب ملکر بھی خدا کی نافرمانی کریں تو خدا کو ذرا بھی پرواہ نہیں وہ بے نیاز ہے اور ویسا ہی سزاوار حمد رہیگا۔

خطرات اور بدنی مصائب کے خوف سے پاک کرکے اُن میں صبر انگیز کا کشور کشا نور اور قوت کی جلا پیدا کرلے: وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ ۵۱ (۳: ۱۴۰)، وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۵۲ (۳: ۱۵۴)؛ وہ ہر مسلمان کے دل کو توحید کے مشترک مرکز پر لاکر ان کی جماعت میں وحدت و استحکام کا دستور العمل پیدا کرنا چاہتا تھا: وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ۵۳ (۸: ۱۱)؛ وہ اپنی ذات پر کامل ایمان، اور اپنے جاہ و منصب کے سچے خوف سے اُمت کے ہر فرد میں استقلال کا نظم و نسق، اور اتحاد عمل کا طریق کار دیکھنا چاہتا تھا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۵۴ (۳: ۱۹۹)؛ وہ ایمان کے جرأت انگیز ولولوں، اور مقام خدا کے ہمت آفرین تذکروں سے اسلام کے ہر متنفس میں مقابلے کی ناقابل تسخیر روح اور ثبات کا ناقابل شکست

---

۵۱ اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو خالص بنا دے اور خدا کے وجود میں شک و شبہ کرنے والوں کو ملیامیٹ کر دے۔

۵۲ اور اس غزوۂ اُحد میں تم کو ہرا دینے میں یہ مصلحت تھی کہ خدا اس ایمان کو جو تمہارے سینوں کے اندر چھپا بیٹھا ہے آزمائے، اور دیکھے کہ باوجود ہزیمت کے خدا پر یقین رکھنے والا کون ہے، اور تمہارے دلوں کو ڈر اور وسوسوں، خوف مصائب اور خطرات سے پاک صاف کر دے، اور جانے رہو کہ خدا سینوں کے حالات سے خوب واقف ہے، جب تک تمہارے دلوں میں یہ وساوس اور خدا کے متعلق شکوک ہیں فتح تمہارے قدموں کو نہیں چوم سکتی۔

۵۳ اور خدا یہ چاہتا ہے کہ تائید غیبی کے وصلہ افزا، اور جامع القلوب اثر سے شیطان کی آلائش (یعنی نفاق) کو تم سے دور کر دے، اور تاکہ تمہارے دلوں کو آپس میں جوڑ کر مضبوط کر دے، اور پھر اس اتحاد کے ذریعے سے تمہارے پاؤں میدان جنگ میں جمائے رکھے۔

۵۴ اے ایمان والو! اُن اجتماعی تکالیف کا جو تمہیں پیش آئیں سختی سے مقابلہ کرو، اور ایک دوسرے کو مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے رہو، اور ایک دوسرے میں گھل کر ایک ہو جاؤ، اور خدا سے ڈرتے رہا کرو تاکہ دشمن کے بالمقابل تم کامیاب ہو جاؤ۔

٭ اس آیۂ کریمہ میں 'ایمان' کی بعض اہم شقیں بتلا دی گئی ہیں۔ گویا مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ایمان ہے، (اصْبِرُوا) جماعت کے افراد کے مابین استقلال کا ماحول پیدا کرنا ایمان ہے، (وَصَابِرُوا) اور سب سے اہم یہ کہ کامل اور باہمی اتحاد پیدا کرنا بھی 'ایمان' کا جزو اعظم ہے، (وَرَابِطُوا)۔ جس قوم کے اندر یہ عظیم الشان خاصیتیں موجود ہیں، وہ خدائے عظیم کے ایک اہم حکم کو مان رہی ہے۔ اور وہی ہے جو اس کے قانون کے بموجب کامیاب ہو رہی ہے، (لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ)۔ گویا یہاں پر بھی 'تُفْلِحُونَ' سے مراد دنیاوی غلبہ ہی ہے، اُخروی فلاح کا یہاں ذکر نہیں۔ دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اس استقلال، تلقین صبر، اور اتحاد کو 'اتقائے خدا' پر محمول کیا گیا ہے (وَاتَّقُوا اللَّهَ)؛ گویا وہی قوم 'متقی' ہے جو فی الحقیقت خدا سے، اُس کے قانون سے، اُس کی اٹل سزاؤں سے ڈرتی ہے جس میں استقلال ہو، ایک دوسرے کو مستقل بنانے کی ذہنیت ہو، اور متحد رہنے کی صلاحیت موجود ہو۔ فرقہ بند اور ڈرپوک قوم خدا سے قطعاً نہیں ڈرتی کیونکہ وہ اس کی سزا سے بے خوف ہو چکی ہے اور اسی لیے 'متقی' کہلانے کی اہل نہیں۔

اتقاء کے یہ معانی بالصراحت دو اور آیتوں سے جو مقدمہ کتاب میں صفحہ ۹۰، ۹۱ پر گذر چکی ہیں ثابت ہیں۔ آج کل کے مسلمانوں کو اس خدائی حکم سے عبرت پکڑنی چاہیے۔

جذبہ قائم کرنا چاہتا تھا، یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ؕ سلہ † (۸: ۴۵)؛ وہ اپنی لاشریک اطاعت اور بے ریا عبادت کے آلۂ عمل سے مسلمانوں کے ارادوں میں قوت، حوصلوں میں افزائش، نیتوں میں صداقت، اور پائے عمل میں ثبات دیکھنے کا متمنی تھا؛ وہ اسلام کی دنیاوی شوکت واحتشام اور مادی ارتقاء وعروج کو روحانیت کے بے امان ہتیاروں، اور اخلاق کی اٹل قوتوں سے حاصل کرانا چاہتا تھا، اور اُمت کے اِس اجتماعی اور استیلائی غلبے کو ہر مدعی ایمان کا واحد منتہائے نظر، اسکی فلاح ونجات کا اٹل ضابطۂ عمل، اُسکے تقوے اور عبادت کا صحیح معیار، اسکے کفروشرک کی سچی محک، اسکی جزا وسزا کا قطعی مدار قرار دیتا تھا!

یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ وَیُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِیْنَ وَیَفْعَلُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ ۠ (۱۴: ۲۷)

اللہ ایمان والوں کو اپنے پکے قول کے ساتھ اِس دنیا کی زندگی میں خوب جماکر رکھتا ہے اور آخرت میں بھی اُنکو خوب جماکر رہیگا۔ لیکن کچے ایمانداروں اور بزدلوں کو جو اُسکے احکام کی متابعت نہیں کرتے وہ حفظ وامن کی راہ سے ڈگمگادیتا ہے، اور خدا تو وہی کچھ کرتا ہے جو مناسب سمجھتا ہے۔

سلہ اے ایمان والو! جب دشمن کی کسی فوج کے بالمقابل تم صف آرا ہوجاؤ تو ثابت قدم رہا کرو، اور اُسوقت خدا کا دھیان اور بھی زیادہ دل میں رکھو تاکہ تمہارے حوصلے بڑھیں، اور بالآخر تم دشمن کے بالمقابل کامیاب ہوجاؤ۔

---

† یہاں "ایمان" کو بحرِ دشمن کے بالمقابل ثابت قدم رہنے پر محمول کیا گیا ہے۔ "وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا" کا مقصود یہ ہے کہ جب تم دشمن کے بالمقابل ڈٹ کر کھڑے ہوجاؤ تو اُس حاکم اعلیٰ کا خیال دلمیں لاؤ جس کی ماتحتی میں تم لڑرہے ہو۔ پھر جس طرح ہر سپاہی کو اپنے سپہ سالار کی یاد، اُسکے انعاموں کی یاد، اُسکی سزاؤں کی یاد میدان جنگ میں اور بھی مستعد کردیتی ہے اسی طرح تم بھی مالک زمین وآسمان کی یاد کرکے اپنی ہمتوں کو بڑھاؤ تاکہ تم دشمن پر فتح پاؤ (لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ)۔ گویا یہاں بھی تُفْلِحُوْنَ سے مراد دنیاوی فتح ہے، اُخروی فلاح مراد نہیں۔ اور نہ "وَاذْكُرُوا كَثِیْرًا" سے مقصود یہ ہے کہ گھر بیٹھے تسبیحوں پر خدا کا نام بڑبڑاتے رہو تاکہ قیامت کے دن فلاح پاؤ جیساکہ بعض نادانوں نے سمجھکر آیات الٰہی کو بے ربط اور ٹکڑے ٹکڑے کردیا ہے اور جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ (۱۵: ۹۱) (صفحہ ۴۷) کے مصداق بن گئے ہیں۔

‡ جو عجیب وغریب تاویلیں شارحین قرآن نے اِس آیہ شریفہ کے مطالب میں اپنے پاس سے بنالی ہیں بجائے خود ایک تفسیر۔ بعضوں نے قول ثابت کو کوئی اسم اعظم فرض کرلیا ہے جسپر ایک زبانی سا ایمان، لانا فرض قرار دیا ہے، بعضوں نے عالم اسلام کی موجودہ زبون حالی، اور خدا کے اِس اٹل وعدے میں اختلاف دیکھکر یُثَبِّتُ کے معنے روحانی ثابت قدمی بنالیے ہیں، وغیرہ وغیرہ، لیکن ایمان کی اُن کڑی شرطوں سے جوابتک بیان ہوئیں ظاہر ہے کہ جس قوم میں وہ خصائص موجود ہوں اُسکا اِس دنیا میں جم کر رہنا، مضبوطی اور قوت سے بسر کرنا، علی الرغم عدو غالب آکر رہنا اٹل ہے۔ یہی حقیقت بعینہ اِس آیہ کریمہ میں عیاں کردی گئی ہے، اور جتلادیا ہے کہ صاحب ایمان قوم کا اِس دنیا میں تمکن اور استخلاف فی الارض قطعی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ○
وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ
أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ
مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ○

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۴۳) اور آخرت میں بھی اُسی کا بول بالا ہے۔ گویا اس آیت اور آیہ "اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ" کا مفہوم ایک ہی ہے جو صفحہ ، پر گذر چکی ہے۔

روحانی ثابت قدمی" جس کا ذکر آجکل کے مسلمان اس شد و مد سے کرتے ہیں ایک پادر ہوا اور بے معنی سی بات ہے۔ 'يُثَبِّتْ' کا لفظ قرآن کریم میں جہاں کہیں آیا ہے اسی مادی تمکن اور دنیوی استقلال کے لیے آیا ہے۔ دو مثالیں اصل کتاب میں ابھی ابھی گذر چکی ہیں ، یعنی 'يُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ' (۸ : ۱۱) اور 'اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا' (۸ : ۴۵)۔ دو اور پیش کر دیتا ہوں۔ سورہ انفال میں ہے:

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۗ (۸ : ۱۲)

اے محمد! یہ وہ وقت تھا کہ تمہارا پروردگار ، تمہارا سپہ سالار اعظم خدا ملائکہ کی فوج کو حکم دے رہا تھا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں تو تم ایمان والوں کے پاؤں میدان جنگ میں جمائے رکھو، اُن کے وصلوں کو دو چند کر دو، اُن کے استقلال کو اور بھی مضبوط کر دو ، ہم عنقریب منکرین کے دلوں میں اپنی مٹھی بھر مسلمانوں کی دہشت ڈال دینگے ، تو مارو ان کی گردنوں پر کہ چور چور ہو جائیں ، اور لگاؤ ان کی پور پور پر کہ ان سب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔

مَلٰٓئِكَة کی ماہیت سے یہاں پر بحث نہیں لیکن ظاہر ہے کہ 'فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' سے مقصود ارضی تغلب اور تمکن ہی ہے۔ روحانی استقلال کا کچھ ذکر نہیں۔ یہی الفاظ قریب قریب زیر بحث آیت میں استعمال ہوئے ہیں۔ دوسرا موقع سورہ نحل میں ہے:

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ (۱۶ : ۱۰۲)

اے محمد! تم علی الاعلان کہدو کہ اس قرآن عظیم کو روح القدس میرے پروردگار کے ہاں سے لیکر اسلئے اُترا ہے کہ جو لوگ اسکے احکام پر ایمان لائے ہیں اُن کو اس دنیا میں مضبوطی سے ، اور جما کر رکھے اور تاکہ یہ قانون جلیل تسلیم کرنے والوں کو صحیح راہ عمل دکھائے (هُدًى)، اور اُن کو اجتماعی سلامتی اور خندہ داں کی بشارت دے (بُشْرٰى)۔

روح القدس کی حقیقت سے یہاں پر بحث نہیں۔ صفحہ ۸۸ کے تحت المتن میں پیغمبران خدا کی بشارت کی نوعیت واضح کر دی گئی ہے۔ اس آیہ کریمہ ظاہر ہے کہ یہاں بھی 'لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' کے الفاظ سے دنیاوی ثبوت اور استقلال ہی مراد ہے۔ "روحانی ثابت قدمی" کی ترغیب پیش کرنا منکر قوم کے لیئے کچھ معنی نہیں رکھتا۔ دنیاوی خوشحالی کا لالچ ہی وہ شے ہے جو ہر مخالف کو ماننے پر مجبور کر سکتا ہے۔

'قول ثابت' کے الفاظ جو زیر بحث آیت میں آئے ہیں، اُن سے مراد وعدہ خدا کی توثیق ہی ہے اور کچھ نہیں۔ ضمناً اس آیت سے 'يُضِلُّ' کے معانی بھی صاف ہو گئے کہ یہ 'يُثَبِّتُ' کی ضد کے طور پر آئے ہیں۔ گویا اس دنیا کی زندگی میں مضبوطی اور تمکن سے نہ رہنا ہی ضلال ہے۔ 'ظالمین' کا لفظ پھر یہاں استعمال ہوا ہے۔ اس سے پیشتر صفحہ ۱۴۰ کے متن کی آیت (۳ : ۱۳۹) میں ہوا تھا۔ یہاں پر بھی 'ظالمین' سے مراد کچے ایمان والے ہی ہیں کیونکہ جو لوگ اپنے ایمان کی کمی کی وجہ سے دشمن سے شکست کھا جائیں وہ فی الحقیقت اپنی جانوں پر آپ ظلم کر رہے ہیں۔ آج 'ظلم' کی قرآنی اصطلاح کے معانی بالکل بدل چکے ہیں۔ لیکن آئندہ مجلدات میں وقتاً فوقتاً اسکے مختلف مفہوم بیان کر دیئے جائینگے۔ مقدمۂ کتاب میں 'ظالم' قوم کے متعلق قرآنی محاکمہ پیش کیا گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ ظالم قوم اجتماعی ہلاکت یقینی ہے (دیکھو صفحہ ۱۸۔ آیات (۲۸ : ۵۹)، (۶ : ۴۷) گویا 'يُضِلُّ' اور 'ظالمين' کا تعلق ظاہر ہے۔

'يَشَآءُ' کے معنی ہم نے 'مناسب سمجھتا' کیے ہیں۔ لیکن اسکا ثبوت فلسفہ عمل (غالباً تیسری مجلد) میں آئے گا۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (۳: ۱۰۱ - ۱۰۴)

اے ایمان والو! مقام خدا سے ڈرتے رہا کرو جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے، اُسکے احکام کے آگے ہر دم سر تسلیم خم رکھو؛ اور مرتے دم تک سرتاپا تسلیم بنے رہو۔ اور سب ایک دوسرے سے مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑے رہو اور تتر بتر ہرگز نہ ہو جانا۔ اور اللہ کا وہ احسان یاد کرو جب تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کے برخلاف عداوتیں اور کینے بھرے پڑے تھے، پھر خدا کو اپنا سچا آقا ماننے کے باعث اُس نے تمہارے دل آپسمیں جوڑ دیئے، پھر تم اسکی اس نعمت کے باعث بھائی بھائی بن گئے۔ تم اِس سے پہلے اسقدر بکھر چکے تھے کہ گویا آگ کے گڑھے کے کنارے جا لگے تھے، پھر اس نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اِس طرح خدا اپنے احکام تم سے کھول کھولکر بیان کرتا ہے تاکہ تم راہِ راست پر آجاؤ۔ اور تم میں ایک ایسا گروہ بھی ہونا چاہیئے جو صرف اِسی اتحاد (الخیر) کی دعوت دے، اِسی عظیم القدر نیکی (المعروف) کی تلقین بالتخصیص کرتا رہے، اور تفرقے کی مکروہات (المنکر) سے باز رکھتا رہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنکو ہم اس دنیا میں کامیاب کرینگے۔ اور دیکھو ہم تمکو کہے دیتے ہیں کہ اُن جیسے نہ بن جانا جو ایک دوسرے سے بچھڑ گئے، اور جنھوں نے خدا کے کھلے کھلے احکام آئے پیچھے بھی آپس میں فرقہ آرائیاں اور اختلاف قائم کیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنکو ہم درد ناک عذاب دینگے۔

کیفیّتِ اتقا

صَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۳: ۲۰۰)

(ایک دوسرے کو استقلال کی تلقین کرو، باہم مل کر ایک جتھہ بنو اور خدا سے ڈرتے رہو کہ کامیاب ہو جاؤ)

جامع القلوب خدا کی نظروں میں ایک مدعیٔ ایمان کا صحیح **تقویٰ** اِسی کامل **مصالحت** اور

---

* ان آیاتِ قرآنی کے مطالب نہایت قابل غور ہیں۔ اصل کتاب میں سیاق کلام کو پیش نظر رکھکر ایک مربوط ترجمہ کر دیا گیا ہے مگر دو ایک باتیں خاص طور پر لائق ذکر ہیں جو یہاں بیان کر دی جاتی ہیں:-

اوّلاً:- اعتصام بحبل اللہ، اور جماعت کے کامل اتحاد کو پھر تیسری بلکہ چوتھی بار "اتقائے خدا" پر محمول کیا گیا ہے۔ پہلی مثالیں صفحہ ۴۹، ۹۰،

اتحاد (لَا تَفَرَّقُوْا (۳: ۱۰۳)) کا مسلک عمل تھا۔ یہی وہ سچی ہدایت (لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ (۳: ۱۰۲)) اور یقینی فلاح (اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۳: ۱۰۴)) تھی جسکا حاصل کرنا ہر مسلمان کا منتہائے سعی اور مقصد حیات ہو سکتا تھا۔ خدائے برتر کی صحیح معنوں میں عبادت (غلامی)، اور اُسکے جاہ و منصب کے سچے خوف (تقویٰ) کا صحیح پیش نہاد یہی ہو سکتا تھا (اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ (۳: ۱۰۱)) کہ ایک مقتدر حاکم کے کئی ملازموں کی مانند، اُسکے بندوں میں تالیف قلوب کے جذبات، اور اخوت و مساوات کے اصول قائم ہو جائیں (فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۴۵) اور ۱۴۲ پر گذر چکی ہیں۔ گویا کسی قوم کا بالاجماع قانون خدا (حَبْلِ اللّٰہِ) کو مضبوط پکڑے رکھنا اور آپس میں فرقہ بند نہ بننا ہی "اتقائے خدا" ہے۔ وہی قوم فی الحقیقت شدید العقاب خدا کی اٹل سزاؤں سے ڈرتی ہے، وہی اسکی عالی مقامی اور طاقت انتقام سے خوفزدہ ہے جو آپس میں اختلاف پیدا کرکے اپنے آپ کو کمزور نہیں کرتی۔ کیونکہ فرقہ بندی کا اٹل نتیجہ شکست و ریخت ہے اور یہ قانون اسقدر عالمگیر ہے کہ اسکا اطلاق ہر جا اور ہر وقت ہو رہا ہے۔ کوئی اُمت یا گروہ اس کُلیے سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ جبتک ایک حاکم اعلیٰ کا ڈر دل میں بس رہا ہے رعیت کے افراد آپس میں لڑ بھڑ نہیں سکتے۔ جب تک کئی غلام ایک مقتدر آقا کی غلامی (عبادت) کر رہے ہیں اُن کا ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہونا محال ہے!

ثانیاً: ائتلاف قلوب کو نعمت خدا کہا گیا ہے اور "اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ" کے الفاظ نہایت قابل غور ہیں۔ اگرچہ بادی النظر میں اس جملے کے معنی یہی ہیں کہ "خدا نے تمہارے دلوں کے درمیان الفت کی راہ و رسم پیدا کردی"۔ لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس ائتلاف کا واقع ہونا خدا کا کوئی غیبی، استبدادی یا تقدیری فعل نہ تھا جس پر آجکل کے مسلمان نہایت تن دہی سے اعتقاد رکھتے ہیں اور بلا سعی و عمل اسکے پھر واقع ہونیکے منتظر رہتے ہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اُس ایک خدا کی عبودیت ہی تمہارے اتحاد کا باعث ہوئی۔ تم سب نے اسکو صحیح معنوں میں آقا اور حاکم اعلیٰ مان لیا اور پھر اُسکے سچے خوف و اتقا کے باعث تمہارے دل آپس میں جُڑ گئے۔ گویا اتحاد کا واقع ہونا ایک مسبب بالاسباب فعل تھا جس کا بالواسطہ محرک خدائے عظیم کا صحیح معنوں میں ڈر تھا۔

ثالثاً۔ باہمی تفریق اور اختلاف کو "عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ" کہا گیا ہے۔ یعنی جس قوم میں باہمی عداوتیں اور کینے رونما ہیں وہ جہنم کے کنارے پر کھڑی ہے۔ یہاں پر فرقہ آرائی کو "النَّارِ" سے تعبیر کرنا از بس معنی خیز ہے۔ گویا اجتماعی ضعف اور عدم اتحاد ہی دنیا کا سب سے بڑا جہنم ہے۔ جن خوش اعتقاد مسلمانوں نے قرآن کے لفظ "النَّار" کو خالصتہً اُخروی جہنم سمجھا ہے اُن کے لیئے یہ الفاظ نہایت غور طلب ہیں۔ لیکن ان آیاتِ الٰہی میں سب سے زیادہ غور طلب آیت آیۂ "وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ" (۳: ۱۰۴) ہے۔ جو بات لائق دریافت ہے یہ ہے کہ "دعوۃ الی الخیر"، "امر بالمعروف"، اور "نہی عن المنکر" کا صحیح مفہوم کیا ہے، اور وہ کیا فرائض ہیں جسکی تبلیغ و تلقین کے لیئے ایک جماعت قائم کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ادنیٰ سا تامل بھی ہر صاحب نظر کو اس نتیجے پر پہنچا دیتا ہے کہ "الخیر" اور "المعروف" کا صحیح مفہوم اس آیت میں اصلاح و اتحاد اور صرف اتحاد ہی ہے، اور اسی نقطۂ نظر سے ان الفاظ پر "ال" تخصیصی واقع ہوا ہے، اور چونکہ پیشتر اور بعد کی آیات میں اتحاد کی خوبیاں اور اختلاف کی برائیاں ظاہر کیگئی ہیں اور یہ آیت ان کے درمیان گھری ہوئی ہے اس لیئے خدائے عظیم نے عالم اسلام کے لیئے ایک ایسی جماعت بنانے کا حکم دیا ہے جو سب اُمت کو اتحاد کی دعوت بالتخصیص دیتی ہے اور اُنکو تفرقے کی کروہات (المنکر) سے دمبدم باز رکھے۔ اس مطمع نظر کے ماسوا یا اس سے کم و بیش حتماً اس آیت کا اور کچھ مطلب نہیں۔ کلام الٰہی کو مربوط اور مدلل یقین کرنیوالوں کیلئے اِسکے سوا کسی اور نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں۔

مسلمانان عالم اور شارحین قرآن نے اس آیت کا مفہوم قطعاً غلط سمجھا ہے، اور "الخیر" و "المعروف" کے معنی عام کرکے عالم اسلام کو ایک غلط

اِخْوَانًا (۳: ۱۰۲)؛ وہ سب کے سب یکجان و یک زبان ہوکر اُسکی حکومت کے ہر آن شاہد، اور اُسکی بارگاہ عالیہ سے بہر حال مرعوب رہیں؛ وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۙ (۲۳: ۶۰)؛ وہ اللہ کو ہر وقت اپنے ذاتی مناقشات میں حاضر و ناظر، اور ہر حالت میں نگرانِ اعمال یقین کرکے اُسکے رُعب و وقار کا احترام اور احکام کا پاس کرتے رہیں؛ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۭ مَا یَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ

لہ خدا سے ڈرنے والے تو وہ لوگ ہیں جو باوجود اسکے کہ جو کچھ اُن کے پاس ہے اعلائے کلمۃ الحق میں صرف کر دیتے ہیں، مگر اُنکے دل اندر سے ہلتے رہتے ہیں کہ اُنھوں نے ایک دن خدا کے حضور میں جوابدہی کے لیے کھڑا ہونا ہے (اور ممکن ہے کہ خدمت خدا کا حق ادا نہ ہوا ہو!)

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۴۶) اور مہمل، نامعلوم اور نامحدود رستے پر لگ گئے ہیں۔ مطالب کی اس عام افراتفری میں چنانچہ آج یہ حالت ہوگئی ہے کہ اسلامی جماعت کے ہزار در ہزار گروہ 'امر بالمعروف' اور 'نہی عن المنکر' کے ظاہری ادعا کی آڑ میں' ہر طرف پھیلے ہوئے خلق خدا کو دھوکہ دے رہے ہیں' اور کسی مستقل پیش نہاد نہ ہونے کے باعث ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہوکر اسلام کی رہی سہی قوت کو اور بھی منتشر کر رہے ہیں۔ ہر گروہ اپنے آپ کو 'داعی الی الخیر' کا خطاب دیکر جماعت میں تفریق و اشتتات پیدا کر رہا ہے۔ سب کے سب اپنی اپنی ہٹ دھرمی اور ضد کے باعث مختلف رستوں پر نہایت کبر و تحکم سے جا رہے ہیں' اور اپنے زعم میں خدا کے ایک اہم حکم کی تعمیل کر رہے ہیں! جو حیرت انگیز فرقہ بندیاں ان گروہوں کی متخالف اور متقابل تعلیم و تلقین سے پیدا ہو رہی ہیں' بجائے خود خدائے عظیم کے مقصدِ اصلاح و اتحاد اور اس آیت کے منتہائے نظر کو باطل کر رہی ہیں' وہ 'اعتصام بحبل اللہ' اور 'ائتلاف قلوب' اور 'اخوانیت' جو 'امر بالمعروف' اور 'نہی عن المنکر' سے مطلوب تھی یک قلم مٹ رہی ہے۔ ہر گروہ اپنی دُکان سجائے سر بازار بیٹھا ہے اور حتی الوسع چرب زبانی اور لفاظی سے کام لیکر بے وقوف اُمت کے گاہکوں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے!

اگر بنظرِ تعمق اس آیۂ شریفہ کے مضمون کیطرف دیکھا جائے تو عیاں ہو جاتا ہے کہ ربِ کون و مکان تعالیٰ نے تمام عالم اسلام کیلئے صرف ایک گروہ اور ایک جماعت ہی کو 'دعوت الی الخیر' اور 'امر بالمعروف' کے لیے تجویز کیا ہے نہ دس بیس مختلف گروہوں کو، جو 'وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ' کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ پس لامحالہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسے عالم آرا، ایسے یکتا اور منتخب گروہ کا مقصد بھی یہی ہو سکتا ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک کے مسلمانوں کے مابین اتحاد قائم رکھے، اُن کو اعتصام خدا کی دعوت دے، اُن کے اختلافات کو وقتاً فوقتاً دور کرتا رہے، اُن میں فرقہ بندیاں نہ پیدا ہونے دے، سب دنیائے اسلام کو بجز ایک مقصد وحید، ایک مطمح نظر اور ایک راہ عمل کی طرف لیجائے وہ گروہ خود کسی مقتدر نظام کے ماتحت کام کر رہا ہو، اور تمام مسلمانوں کا صحیح معنوں میں قائم مقام ہو۔ ایسا گروہ تاریخ شاہد ہے کہ قرن اول سے قطع نظر مسلمانوں نے آجتک نہیں بنایا اور اسی لیے میرا یقین ہے کہ اُمت مرحومہ اس آیۂ کبریٰ کے خدائی مطالب کی تعمیل کرنے سے حتماً قاصر رہی ہے!

اس گروہ کے متعلق 'وَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ' کا ارشاد ہے۔ 'فلاح' کے معانی قرآن کریم میں دنیاوی کامرانی کے بھی ہیں جیسا کہ کئی ایک مثالوں سے جو پیشتر دی گئیں ظاہر ہے۔ گویا بتلا دیا ہے کہ یہی وہ گروہ ہے جو فلاح دارین حاصل کرے گا اور اُمت کو صحیح معنوں میں قوت دیگا۔ آگے چلکر فرقہ بند اُمت کے لیے 'وَاُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ' کہا گیا ہے۔ گویا یہ عذاب بھی دنیاوی ہی ہے جو ہر اختلاف زدہ اُمت کو دنیا میں ملتا ہے۔ 'اُولٰٓىِٕكَ' کا تکرار بھی لامحالہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ 'دعوت الی الخیر' اور 'امر بالمعروف' کا مفہوم دنیائے اسلام کو ایک مقصد و منتہا پر قائم و متحد کرنا ہی ہے اور وہ پیش نہاد دنیوی قوت اور تمکن ہے اسکے ماسوا حتماً کچھ نہیں۔

لیکن اس تمام خارجی استدلال سے صرف نظر کرکے قرآن حکیم کے الفاظ میں داخلی غور و فکر بھی اس نتیجے کی طرف راغب کرتا ہے کہ 'اَلْخَیْرُ' 'اَلْمَعْرُوْفُ'، اور 'اَلْمُنْكَرُ' کے اصلی مطالب وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے۔ 'اَلْخَیْرٰتُ' کے صحیح مفہوم کے متعلق ایک مختصر بحث ابھی ابھی صفحہ ۱۲۹ کے

رَّابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ[۱] (۵۸ : ۷)؛ وہ اُسکی محتسبانہ رقابت میں سب جزوی معاملات اور فرعی مختلفات کو بالائے طاق رکھکر اُسی کی خدمت و اعلا میں ہمہ تن مصروف ہوجائیں؛ وہ اس احکم الحاکمین کے

---

[۱] اے انسان! کیا تونے اس حقیقت پر کبھی غور نہیں کیا کہ اللہ تو جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہو رہا ہے اسکا علم رکھتا ہے۔ جب تین شخص آپس میں صلاح و مشورہ کرتے ہیں تو ہر حال چوتھا وہ ہوتا ہے، اور پانچ ہوں تو چھٹا وہ ہوتا ہے، اور اس سے کم ہوں یا زیادہ اور کہیں بھی ہوں وہ اُن کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ پھر جو جو کام یہ آج کر رہے ہیں اُن کو روز قیامت کو موبمو بتلادے گا، لوگو! در حقیقت خدا ہر چیز سے واقف ہے!

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۴۷) تحت المتن میں ہوچکی ہے جس سے ظاہر ہے کہ صاحب القرآن تعالیٰ نے اتحاد کے اجتماعی حسن عمل کو یہاں پر لفظ 'الخیر' سے یاد فرمایا ہے (يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ)۔ 'المعروف' اور 'معروف' کے الفاظ بھی کلام الٰہی کے اندر بالالتزام دو شخصوں یا فریقوں کے درمیان محبت یا صورت اصلاح و اتحاد پیدا کرنے کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں خاوند اور عورت کے باہمی تعلقات کی کشیدگی کے بارے میں ہے؛ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا (۲ : ۲۳۱)، "اور جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو اور اُنکی عدت پوری ہونے کو ہو تو یا طلاق کا ارادہ فسخ کرکے اُنکو پوری صلح صفائی سے (بِمَعْرُوْفٍ) پھر زوجیت میں رکھ لو، یا اُن کو مصالحت سے رخصت کردو، اور دُکھ دینے کی نیت سے اُنکو نہ رکھو کہ بعد میں زیادتی کرو۔" یہی مضمون اس آیت میں بھی ہے؛ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (۲ : ۲۲۹) "یعنی یا صلح صفائی کے ساتھ پھر زوجیت میں لے لینا، یا خوش اسلوبی سے رخصت کردینا۔" ایک آیت پہلے پھر اسی مضمون کی تصریح ہے، وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۲ : ۲۲۸)، "یعنی اور اگر اُنکے خاوند مصالحت کرنا چاہیں تو اُن کو پورا حق ہے کہ اس اثنا میں اپنی عورتوں کو پھر اپنی زوجیت میں واپس لے لیں، اور اس صورت میں جس طرح پر مصالحت اور صلح صفائی سے رہنا عورتوں پر لازم ہے (عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ) اسی طرح پر مردوں کی طرف سے عورتوں کے ساتھ (لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ) مصالحت کا سلوک کیا جانا بھی لازم ہے۔" اسی رکوع میں مطلقہ عورتوں کے بارے میں ہے؛ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (۲ : ۲۳۲)، "یعنی طلاق ہوئے پیچھے تم ان عورتوں کو منع نہ کرو کہ نئے خاوندوں سے نکاح کریں اگر وہ فریق آپس میں مصالحت اور اتحاد پر (بِالْمَعْرُوْفِ) راضی ہوگئے ہوں۔" آگے چلکر دودھ پلانے کی اُجرت کے بارے میں ہے؛ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۲ : ۲۳۳)، "اور باپ پر لازم ہے کہ ایسی زیر تجویز مطلقہ ماؤں کو صلح صفائی کے ساتھ کھانا اور کپڑا دے۔" اور اگر دایہ سے دودھ پلانے کا باہمی سمجھوتہ ہوجائے تو فرمایا ہے: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (۲ : ۲۳۳)، "یعنی اس صورت میں دایہ سے دودھ پلوالینے میں کچھ مضائقہ نہیں بشرطیکہ جو کچھ ماؤں کو دینا کیا تھا صلح صفائی کے ساتھ دے دو۔" رانڈ عورتوں کے دوسرے بیاہ کے بارے میں ہے؛ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۲ : ۲۳۴)، "پھر جب وہ اپنی مدت پوری کرچکیں تو نیک نیتی اور صلاح روی سے (بِالْمَعْرُوْفِ) جو کچھ دوسرے بیاہ کے بارے میں اپنے دل میں ٹھان لیں اسکی پرسش تم وارثان میت سے کچھ نہیں، اور اسی لیئے تمہیں اس فعل سے واسطہ نہیں جو چاہیں اُن کو کرنے دیں۔" اس موقع پر للمعروف سے مراد رانڈ عورت کا صلاح روی کے ساتھ دوسرا بیاہ کرنا ہے، نہ یہ کہ اُٹھے اور وہ وطیرہ اختیار کرے جس سے خاندان کی ناموس برباد ہو اور خانگی فساد کی صورت پیدا ہو۔ گویا یہاں بھی مقصود اصلاح و اتحاد اور فساد کو مٹانا ہی ہے۔ شادی شدہ باکرہ عورتوں کو شب زفاف سے پیشتر طلاق دینے کے بارے میں ارشاد ہے کہ کچھ گناہ نہیں مگر ہاں اُن کو بطور احسان کے کچھ دے دینا چاہیئے؛ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ (۲ : ۲۳۶)، "مقدور والا اپنی حیثیت کے مطابق اور بے مقدور اپنی حیثیت کے موافق۔ تم اسکو ایک نذرانہ

پاس ادب اور لحاظ سے دلوں کے بُغض اور سینوں کے حسد نکالکر باہم گرمتحد اور متفق ہوجائیں؛ وہ دانائے نہان و آشکارا کی متجسسانہ دانش اور متفحصانہ بینش کا کامل یقین کرکے، دلوں کی تہ کے سرائر و خفایا کو آلائش گناہ سے قطعاً پاک صاف کردیں مخلص اور عقیدتمند خواجہ تاشوں کا اپنے آقائے حقیقی سے یہ وہ معترفانہ خوف، اور وہ غیر متزلزل اِتقا تھا جس نے ہر ناگہاں مصیبت کے وقت

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۴۸) سمجھو جسکی غرض و غایت یہ ہے کہ طلاق صلح صفائی کے ساتھ اور بغیر دنگے فساد کے طے پائے (مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ) اور سچ تو یہ ہے کہ مصالحت سے چلنے والے اشخاص پر یہ نذرانہ تو ایک طرح کا حق ہے۔ کچھ آگے چلکر مطلقہ عورتوں کے بارے میں بھی اسی قطع کا حکم ہے: وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ (۲: ۲۴۱) یعنی مطلقہ عورتوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ نذرانہ بطور احسان یا یادگار ہونا چاہیئے تاکہ فریقین صلح صفائی کے ساتھ ایک دوسرے سے جُدا ہوں، اور خدا سے صحیح معنوں میں ڈرنے والوں کے لیے تو یہ معمولی سی رواداری بطور ایک فرض کے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص صحیح معنوں میں متقی ہے اُسکا منتہائے نظر دنیا میں ہمیشہ یہی رہتا ہے کہ انتہائی معاملات میں بھی کم سے کم فساد پیدا ہو۔ طلاق وہ مکروہ شے ہے جو دو فریقوں کے درمیان ایک ناقابل برداشت شقاق کا باعث ہوتی ہے۔ اگر اسکا واقع ہونا بہر نوع ضروری ہوگیا ہے تو ایک صلح پسند آدمی پر فرض ہے کہ اُس عورت کو جسکے ساتھ اس نے اتنی مدت صحبت کی ہے ایک معتدبہ رقم بطور نذرانے کے پیش کرے تاکہ مخالفت کے جذبات انتہا تک نہ پہنچنے پائیں۔ ازدواجی تعلقات کے منقطع ہونے پر فریقین ایک دوسرے کو کم از کم دشمن نہ سمجھیں اور اسلامی جماعت کے اندر شکست انگیز تفریق پیدا نہو۔

ناسمجھ اور کم عقل یتیموں کے سرپرستوں کو سورۂ نساء میں ہدایت ہے: وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۴: ۵) یعنی اُن کے ساتھ صلح صفائی سے بتاؤ کرو۔ محتاج سرپرست کے بارے میں ہے: وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ (۴: ۶) یعنی اگر سرپرست کم مقدور ہو تو اُس یتیم کے مال میں سے بقدر مناسب (بِالْمَعْرُوْفِ) اپنے گذارے کے لیے لے لے۔ یہاں بقدر مناسب سے مراد یہ ہے کہ دل میں اس یتیم کی طرف نیکی، صلاح اور مصالحت کا خیال ہو، اُسکو تباہ کرنے اور لوٹنے کی نیت نہ ہو، اُسکے بارے میں عداوت اور مخالفت کے جذبات موجزن نہ ہوں۔ بیبیوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں ہے: وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۴: ۱۹) یعنی اُنکے ساتھ حُسن سلوک سے رہو۔ لونڈیوں سے نکاح کرنیکے متعلق ہے: وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۝ (۴: ۲۵) یعنی اُن کو اُنکی اس مستقل مصاحبت کے عوض میں اُنکے مہر منصفانہ طور پر (بِالْمَعْرُوْفِ) ادا کردو لیکن شرط یہ ہے کہ وہ گھریلو عورتیں بنکر رہیں، بدکاری اُن کی غرض نہو، اور نہ پوشیدہ طور پر یار کریں۔ یہاں "المعروف" سے مقصود حق مہر کا اس مقدار میں ادا کرنا ہے کہ فریقین میں رضامندی پیدا ہوجائے، گویا منتہائے نظر وہی اتحاد ہے۔

سورۂ نساء میں منافقین اسلام کے بارے میں ہے: لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ (۴: ۱۱۴) "اُن لوگوں کی اکثر سرگوشیوں اور خفیہ ریشہ دوانیوں میں متحد کرنے (خَيْرٍ) یا صلح و صلاح کی صورت (خیرا) بنانے کا تو نام نہیں، اِن کا دار و مدار ہی نفاق پر ہے، البتہ وہ شخص اس سے مستثنےٰ ہے جس نے امراء کو ایثار مال کرنے کی ترغیب دی (اَمَرَ بِصَدَقَةٍ)، مصالحت کا کوئی عنوان قائم کیا (اَوْ مَعْرُوْفٍ) یا لوگوں کے درمیان میل ملاپ کا بیج بویا۔" یہاں صاف 'معروف' سے مقصود اتحاد برخلاف تفرقہ اور نفاق کے ہے جو منافقوں کی اصلی غایت ہوا کرتی ہے۔ سورۂ توبہ میں انہی منافقوں کی تعریف میں ہے: اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ۝ (۹: ۶۷) یعنی نفاق ڈالنے والے مرد اور نفاق ڈالنے والی عورتیں سب ایک ہی تھیلی کے بٹے ہیں، لوگوں کو نفاق (المنکر) کی ترغیب دیتے ہیں، اور مصالحت اور اتحاد (المعروف) سے باز رکھتے ہیں، اور یہی نہیں بلکہ ایثار مال کے

مومنوں کے صبر میں استقامت، اور اتحاد میں استواری پیدا کردی تھی: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا قف وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۳: ۱۹۹)؛ یہی وہ ہیبت انگیز ذکر، اور ارتعاش آفریں یادِ خدا تھی جو تیروں اور تلواروں کی بارش میں بھی پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دیتی تھی: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۸: ۴۵)۔ اسی باہمی ولایت اور اتقا کا لازمی نتیجہ فلاحِ دین اور غلبۂ اسلام تھا: وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ (۵: ۵۶)؛

ا۵ دیکھو صفحہ ۱۴۲، ۵۲ دیکھو صفحہ ۱۴۳، ۵۳ اور جو اللہ کا دوست اور رسول کا معاون بنا رہا، اور جس نے ایمان والوں کے ساتھ اتحاد قائم کیا، وہ اللہ کے گروہ میں سے ہے۔ اور اللہ کا گروہ ہی تو غالب گروہ ہے۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۴۹) موقع پر اپنی مٹھیاں بھینچ لیتے ہیں"۔ یہاں پہلی دفعہ 'المنکر' کا لفظ آیا ہے اور ہر صاحب نظر بطور خود دیکھ سکتا ہے کہ 'المعروف'، اور 'المنکر'، کا منتہائے نظر اس آیۂ کریمہ میں بعینہٖ وہی ہے جو آیاتِ زیرِ بحث یعنی (۳: ۱۰۱-۱۰۴) صفحہ ۱۴۵) میں ہم نے ظاہر کیا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی تصدیق حیرت انگیز طور پر آیندہ آیتوں سے ہوتی ہے جو مومنوں کی تعریف میں آئی ہیں: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ط (۹: ۷۱)، "اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں ایک دوسرے کے صحیح معنوں میں دوست ہیں، وہ لوگوں کو باہم گرمتحد ہونے (المعروف) کی دعوت دیتے رہتے ہیں، اور نفاق (المنکر) کے مکروہ نتائج سے باز رکھنے کی سعی کرتے ہیں، اور 'الصلوٰۃ' کو قائم کرتے ہیں، اور جب موقع ایثار مال کرتے، اور خدا اور اُن کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں"۔ الصلوٰۃ کی اجتماعی حیثیت، الزکوٰۃ کے اجتماعی فوائد اور اطاعت خدا و رسول کی ماہیت اور سیاسی حکمت عملی پر بحث آیندہ اوراق میں آئے گی لیکن سیاق مضمون سے عیاں ہے کہ المعروف کی دعوت فی الحقیقت اتحاد کی دعوت ہے، اسکے سوا حشو اور حاشا کچھ نہیں۔ المنکر کی آئی اصطلاح تفریق اور مخالفت کے معنوں میں ایک دو اور موقعوں پر استعمال ہوئی ہے جو یہاں لکھ دیئے جاتے ہیں، باقی موقعے اصل کتاب میں عنقریب آئیں گے۔ سورۂ حج میں ہے: وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا (۲۲: ۷۲)، یعنی اے پیغمبر! جب ان منکرین عرب کو ہمارے روشن اور نتیجہ خیز احکام پڑھ کر سنائے جاتے ہیں تو تم ان لوگوں کے چہروں پر مخالفت اور نفاق کے آثار اس شدت سے دیکھتے ہو کہ گویا کوئی دم میں یہ لوگ ہمارے احکام سنانیوالوں پر حملہ کر بیٹھیں گے"۔ گویا 'المنکر' یہاں پر وہ قلبی انکار ہے جسکا نتیجہ تفریق اور اختلاف ہے۔ سورۂ عنکبوت میں حضرت لوط علیہ السلام کا قول اپنی قوم کے بارے میں ہے: اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۵ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ (۲۹: ۲۹)، یعنی کیا تم لوگ عورتوں کو چھوڑ کر لڑکوں کے ساتھ بدفعلی کرتے ہو، شاہراہوں پر ڈاکے مارتے ہو، اور اپنی ٹولیوں میں دنگے مچاتے، اور ناچاقیاں پیدا کرتے ہو (المنکر)"۔ مفسرین نے جو 'المنکر' سے مراد "بے حیائی کے کام" لیا ہے محض بے سبب اور بے سند ہے۔ جب تاتون الرجال اور تقطعون السبیل کے الفاظ میں نوعیت جرم کی پوری تخصیص ہے تو تاتون المنکر میں بھی وہ تخصیص جاری رہنی چاہیئے اور وہ سوا اسکے نہیں جو ہم نے بیان کردی۔ رہزنوں اور لواطت پرست غنڈوں کا شیوہ ہمیشہ سے یہی چلا آیا ہے کہ بات بات پر دنگا کھڑا کر دیتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے خلاف گروہ بن جاتے ہیں۔ یہی وہ جرم عظیم تھے جن کی پاداش میں قوم لوط کی تباہی ہوئی تھی۔ لواطت سے بڑھکر کیا بے حیائی ہوگی جس کا ذکر تاتون الرجال بلکہ اس سے پیشتر کی آیت (۲۹: ۲۸) میں اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ کے الفاظ میں ہو چکا ہے۔ بہر یہ تین دفعہ ایک ہی شے کو بے سبب دہرانا کلام الٰہی کے شایان شان نہیں۔

(باقی)

اسی اتقاء کے قیام اور باہمی نفاق کو دور کرنیکے لیئے قرآن آیا تھا، فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝ (۱۹: ۹۷)؛ اسی الخیر اور المعروف کی مسلسل تبلیغ اور پیہم تلقین کیلئے رب العلمین نے مسلمانوں میں ایک مستقل جماعت کی تاسیس ضروری سمجھی تھی؛ یہ تفریق بین الافراد ہی وہ المنکر، اور صحیفۂ کائنات کا وہ سب سے بڑا گناہ تھا جسکے انسداد و استیصال کے لیئے مسلمانان جہان پر ایک غیر منقطع جہاد لازمی کر دیا تھا: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۳: ۱۰۴)؛ اسی صحیح تقوی کے وسیلۂ عمل سے مسلمانانِ عالم کو ساکنانِ زمین پر ایک امتیازی خصوصیت اور مقام بلند ملنے کا وعدہ تھا؛ اور اسی تقوی کے انعام میں منعم حقیقی نے دنیا کے

سلہ اے پیغمبر! ہم نے قرآن کو تمہاری زبان کا لباس پہنا کر سہل الفہم صرف اسلیئے کر دیا تھا کہ تم اسکے ذریعے سے متقی (اور متحد) قوم کو (اجتماعی بقا) کی بشارت دو اور نفاق ازار اور جھگڑالو قوم کو اجتماعی ہلاکت اور عذاب سے ڈراؤ۔ (اس آیت کا لفظ المتقین ملتے کے متعلق ایک بحث صفحہ ۹۶ کے تحت المتن میں گذر چکی ہے) سلہ ترجمہ کیلئے دیکھو صفحہ ۱۴۵۔

(تتمہ تحت المتن صفحہ ۱۵۰) الغرض جس نقطۂ نظر اور جس تعمق سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر والی آیات کو دیکھا جائے، ہر صاحب نظر قرآن کا مطالعہ تمام اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ کلام الٰہی کی قانونی زبان میں "المعروف" کی اصطلاح سے مراد اتحاد اور "المنکر" سے مقصود نفاق اور اختلاف ہی ہے؛ نیکی اور برائی کے لغوی معانی جو شارحین قرآن نے ان دو اصطلاحوں کے لیئے ہیں اسقدر غیر محدود اور بے نتیجہ ہیں کہ ان کے مان لینے کے بعد کسی ایک حکم خدا کے بارے میں مستقل نتائج پر پہونچنا از بس دشوار ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم ساکنان زمین کے لیئے ایک قانون عمل ہے۔ اور قانونی کتاب کا سزاوار یہی ہے کہ اسکا کوئی قانون قیاس یا رائے یا تاویل کے تابع نہ ہو سکے، بلکہ ایک حکم کا صرف ایک ہی مطلب اور ایک ہی طریق عمل ہو اور بس، نہیں بلکہ سب سے ضروری یہ کہ ہر متفرع للمعانی اصطلاح کی آئینی تعریف خود اُسکے اندر موجود ہو، اپنی وضع کی ہوئی مصطلحات کی شرح و بسط کے لیئے اسکو کسی دوسری کتاب کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ بعینہ انہی معانی میں قرآن عظیم تمام انسانی لغات سے بے نیاز ہے۔ (دیکھو صفحہ ۹۲) وہ اپنی سب مصطلحات کی آپ ہی تعریف کرتا ہے، آپ ہی اپنی لغت، اور آپ ہی اپنی تشریح ہے، اُسکے کسی ایک امر و نہی یا آیت کا صرف ایک ہی منشاء، ایک ہی مقصود، اور ایک ہی طرز عمل ہے۔ دستور خدا کے شارحین کا فرض ہے کہ وہ اُس مقنن اعظم کے واحد عندیے کو صاف اور روشن الفاظ میں واضح کر دیں کہ انتشار عمل کی گنجائش باقی نہ رہے، کوئی شخص یا گروہ تاویل کو دھوکے کی ٹٹی بنا کر گریز کی سبیل نہ نکال سکے، کمزوریوں کی آڑ میں نہ چھپے، حیل کو عذر نہ بنا سکے۔ جو تفسیر اس اہم مقصد کو پیش نظر نہیں رکھتی وہ فی الحقیقت کلام خدا کی شرح نہیں۔ اس کا پیش نہاد تشتت عمل ہے، تفریق قوم اور تضعیف امت ہے۔ جب تک مطالب متین اور غیر مشکوک، واحد اور محدود نہ ہو جائیں کسی حکم کی تعمیل کرنا محال ہے، جب تک آقا کا صحیح عندیہ معلوم نہ ہو غلام کی تعمیل بے معنی ہے: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ † (۱۶: ۴۴)۔ 'المعروف' اور 'المنکر' کے صحیح مفہوم کے متعلق اسی تبیین کی سعی میں نے اس تحت المتن میں کی ہے اور میرا یقین ہو چکا ہے کہ جہاں جہاں ان الفاظ کا استعمال قرآن کریم میں ہوا ہے وہاں الٰہی مقصود وہی ہے جو اوپر بیان ہوا۔ بہر نوع یہ تمام بحث تمحیص اس دعوے کا مزید اور حتمی ثبوت ہے کہ قرآن حکیم اپنی اصطلاحات کی تبیین میں تمام انسانی لغات سے بے نیاز ہی نہیں بلکہ لغت اسکے مطالب کی تشریح کیلئے اکثر اوقات گمراہ کن ہے کیونکہ تغیر پذیر ہے اور لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶: ۱۱۶) کے تحت میں نہیں آ سکتی۔ صفحہ ۹۲-۹۳

---

† مطالب کے بیانے دیکھو اصل کتاب صفحہ ۵۹۔

شاداب اور سرسبز ملکوں کی بادشاہت مومنوں کے لیئے اپنے پاس بطور امانت رکھ لی تھی!

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ
وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ○ (۸: ۲۹)

اے ایمان والو! اگر تم خدا کا سچا خوف کرکے (متحد بنے) رہوگے تو وہ تمہارے لیئے ایک امتیاز پیدا کر دے گا، تمہاری سب اجتماعی واماندگیوں اور دنیاوی خستہ حالیوں کو تم سے دور کر دیگا، تمہاری پچھلی غلطیوں سے چشم پوشی کرے گا، اور خدا تو فی الحقیقت بڑا فضل کرنیوالا ہی بشرطیکہ بندے اُسکے حکموں پر چلیں۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ○ إِنَّ اللَّهَ
مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ○ (۱۶: ۱۲۷-۱۲۸)

اور اے پیغمبر! مخالفوں کی ایذاؤں کو صبر اور استقلال سے برداشت کرو۔ جہاں تمہیں تکالیف خدا کی وجہ پہنچ رہی ہیں، وہاں تمہارا تحمل بھی خدا ہی کی وجہ سے ہوگا (ورنہ یہ لوگ فی الحقیقت صبر کے اہل نہیں) لیکن انکے سلوک کو دیکھکر غم بھی نہ کھاؤ اور جو چالبازیاں یہ تمہارے برخلاف کر رہے ہیں اس سے دل تنگ بھی نہ ہو جاؤ، بلکہ استقلال سے اپنے اصولوں پر جمے رہو، کیونکہ تقویٰ کا صحیح مفہوم یہی ہے۔ اللہ بیشک اُنہیں کا ساتھ دیتا ہے جو بمقام خدا کا سچا خوف دل میں رکھکر اسکی لڑائیاں استقلال سے لڑتے ہیں، اور جو اجتماعی بہبودی کو پیش نظر رکھکر حسن عمل کرتے ہیں (هُم مُّحْسِنُونَ۔ دیکھو حسنات کا مفہوم تحت المتن صفحہ ۱۳۰۔ الیٰ آخرہ)

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ○ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَ
بِئْسَ الْمِهَادُ ○ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ

✝ یکفر عنکم سیئاتکم، کے الفاظ کی تشریح کافی طور پر صفحہ ۱۳۱ کے تحت المتن میں ہو چکی ہے جہاں پر بیان کر دیا ہے کہ اس جملے سے صاحب القرآن تعالیٰ کی مراد اجتماعی اور دنیاوی بدحالیوں، اور قومی واماندگیوں کا دور کرنا ہے۔ یجعل لکم فرقانا، کے الفاظ سے ان مطالب کی اور بھی تائید و تصدیق ہوتی ہے کیونکہ فرقان، یعنی امتیاز باقی اقوام عالم کے بالمقابل، اور دنیاوی حیثیت ہی سے ہو سکتا ہے ورنہ بے معنی ہے، اور اگر یہ امتیاز بعد قیامت ہی کو عیاں ہونا ہے جیسا کہ آجکل کے ناکارہ مسلمانوں نے فرض کر لیا ہے تو یغفر لکم، کے الفاظ اس مطلب کو ادا کرنے کے لیئے بالکل کافی تھے۔ یہ بات 'واللہ ذو الفضل العظیم' سے بھی ظاہر ہے کیونکہ جیسا کہ پہلے ثابت کیا جا چکا 'فضل' کے معنی از روئے قرآن دنیاوی افضال ہی کے ہیں۔

✝ ان آیات الٰہی سے ظاہر ہے کہ 'صبر' یعنی مصائب و نوائب کا استقلال سے مقابلہ کرنا "تقویٰ" کی ایک اہم شق ہے یہی بات آیہ (۸: ۱۲۰) سے ظاہر ہے جو مقدمہ کتاب میں صفحہ ۳۹ پر آچکی ہے۔

فِيهَا نُزُلًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ ۝ † (۳: ۱۹۵ - ۱۹۷)

اے پیغمبر! دشمنانِ خدا کا اِن تمہارے شہروں میں چلنا پھرنا، اور ایمان والوں کے بالمقابل دنیا میں آرام و آسایش سے رہنا تمہیں کہیں مغالطے میں نہ ڈال دے۔ یہ سب ایک قلیل فائدہ، اور چند روزہ مہلت ہی جو انکو دیجارہی ہے۔ پھر دیکھ لینا اِن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی بُری جگہ ہی۔ لیکن جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا سچا خوف کیا ہم انکے استقلال اور استقامت، انکے صبر و اتحاد کے بدلے میں انکو ایسے خوشنما باغوں میں داخل کرینگے جنکے نیچے نہریں بہ رہی ہیں وہ اسمیں ایک مدت مدید تک رہینگے۔ یہ تو انکی مہمانی اللہ کی طرف سے اس دنیا میں ہوگی، اور جو کچھ حسنِ عمل کرنیوالوں کے لیئے اللہ کے پاس رکھا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے۔

---

† اِن آیات میں بعض باتیں نہایت غور طلب ہیں:-

اولاً۔ یہاں پر 'کفر' اور 'اتقا' کا باہم مقابلہ کیا گیا ہے۔ کافر اقوام کی دنیوی آسایش اور ریجت کو 'مَتَاعٌ قَلِيلٌ' کہا گیا ہے، اور مراد یہ ہے کہ ایک اقل قلیل مدت کے اندر ہر کافر قوم سے دنیاوی نعمتوں کا چھینا جانا اٹل ہے، اور بعد ازاں اس دنیا کے اندر شکست و ریخت ابدالآباد تک اُن کا حصہ ہو (ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ)۔ کافر قوم کے دنیاوی عذاب اور اجتماعی ہلاکت کے متعلق مقدمہ کتاب کے آخری حصے (صفحہ ۹۰) میں قرآن حکیم کا محاکمہ پیش کر دیا تھا، اور وہ یہ تھا کہ ہر کافر قوم کی اجتماعی ہلاکت قطعی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے 'مَتَاعٌ قَلِيلٌ' کا مندرجۂ بالا مفہوم عیاں ہے۔ اکثر لوگوں نے 'مَتَاعٌ قَلِيلٌ' کا مفہوم یہ سمجھ لیا ہے کہ کافر اقوام کو جو دنیاوی نعمتیں مل رہی ہیں وہ انکو دنیا کی اس چند روزہ زندگی کیلئے ملتی ہیں اور نسلاً بعد نسل یہ ستور ملتی رہیں گی، پھر مرنے کے بعد یا قیامت کے دن انکو جہنم میں ڈالا جائیگا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب فلسفہ نہایت لچر اور ناپاک ہے۔ سوال یہ ہی کہ جب خدا اُن سے ناراض ہی تو دنیا کی چند روزہ نعمتیں بھی کیوں اُنکو ملیں، یہیں سے عذاب کیوں نہ شروع ہو جائے اور آخر دم تک ملتا رہے۔ کیا یہ بات (معاذ اللہ) خدا کے بس کی نہیں رہی کہ وہ اس دنیا کے اندر اُن سے نعمتیں چھین سکے۔ اور سزا آخرت کے واقع ہونے سے پہلے نہ دے سکے۔ قرآنِ حکیم کی تمام حکمت اس نامعقول سے طرز سر بخلاف ہی۔ اور اس تخیل کا اُمت مرحومہ میں رواج پا جانا بھی درحقیقت 'کافر' اور 'کفر' کے صحیح مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی۔ 'وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ' (۳: ۱۳۹) والی آیت کا مضمون کافر قوم کی دنیاوی خوشحالی کے قطعاً نقیض ہے اور صاف اس امر کا مدعی ہے کہ مومن قوم کی دنیوی فلاح قطعی ہے۔ یہی بات 'فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ' (۵: ۵۶) سے ظاہر ہے، اور اگر قرآن حکیم اختلاف کے معانی عیب سے قطعاً مبرا ہے تو دنیاوی خوشحالی کسی کافر قوم کے شاملِ حال حتماً نہیں ہو سکتی۔ جو بات آیات زیر بحث (یعنی ۳: ۱۹۵-۱۹۷) میں کہی گئی ہے یہ ہی کہ منکرین خدا کی ظاہری خوش حالی، اُن کا تقلب اور تمکن فی الارض ایمان والوں کو دھوکہ نہ دے، اُن کو متعجب نہ کر دے کہ خدا کی طرف سے ان کو انعام کیوں مل رہے ہیں، جو اصل انکو انعام مل نہیں رہے بلکہ رفتہ رفتہ اُن سے چھینے جا رہے ہیں۔ جو تقلب یا تمکن اُن کو اپنے آبا و اجداد کی طرف سے وراثۃً ملا ہے وہ ایک متاع قلیل ہو، ایک اقل قلیل مدت میں انکے نااہل اور بے ایمان ہو جانے کے باعث چھین لیا جانے والا ہے گویا تمہارے ہاتھی سے چھینے جانے کی تیاری ہو رہی ہے اور ہلاکت اُن کے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ پھر جب عذاب الٰہی آ پہنچے گا تو اُن کا ٹھکانا جہنم ہے! (ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ)۔

ثانیاً آیات زیر بحث (۳: ۱۹۵) میں کافر قوم کی متاع قلیل کے بالمقابل مُتقی قوم کی دائمی آسایش کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ بتلایا ہے کہ جہاں کافر قوم کی دنیوی طاقت روز بروز ڈھل رہی ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ وہ صفحۂ زمین سے نیست و نابود ہو جائے وہاں متقی قوم کا یہ حال ہے کہ سرسبز زمینوں کی بادشاہت اُن کا حصہ ہے (لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ)، وہ ان زمینوں کے مالک سدا سدا کو رہیں گے

آہ! یہ کیا **فرقانِ عظیم** تھا؟ یہ کیا میتر مقام تھا؟ یہ کیا نہروں والے باغوں کی دائمی بادشاہت تھی جو دربارِ رب العٰلمین سے تقویٰ کے صلے میں جسمانی خدا بنکر نازل ہونی تھی اور جلد تر ہوئی! کیا یہ تقویٰ، کیا یہی تقویٰ جو آج ہماری مسخ مصطلحات، غلط محاورات، اور تحریف شدہ مطالب کے رو سے تسبیح کے دانوں کا دیوانہ وار مرتعش انگلیوں کے درمیان سے سرکاتے رہنا، لمبے لمبے جبّے، بڑے بڑے عمامے اور رنگ دار داڑھیاں بنا بنا کر اسلام کُش اور تفرقہ انگیز اعمال کرنا، خلقِ خدا کی آنکھوں میں دُھول ڈالکر پرہیزگار بنے رہنا، یا شبانہ روز بے سوچ واثر سجدوں سے ماتھے کو زمین پر ٹھکرا کر، دنیا و مافیہا سے الگ تھلگ رہنے، اور اللہ کی عزیز القدر نعمتوں پر نہایت بیدردی اور اصرار سے لات مارنے کا مترادف ہے: يَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُونَهَا وَأَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُونَ[۱] (۱۶: ۸۳)، کیا یہی تقویٰ وہ خوفناک اسلحہ تھا

---

[۱] یہ لوگ خدا کی نعمتوں کو اچھی طرح پہچانتے ہیں پھر تجاہلِ عارفانہ کر کے اُن سے منکر ہوتے ہیں اور اُن میں سے اکثر اِن نعمتوں ہی کے منکر نہیں، بلکہ درحقیقت خدا کے منکر ہیں۔ گویا اللہ کے قرآن خدا کی نیوی نعمتوں کی بیقدری کرنی کفر ہے۔ نعمت کا قرآنی مفہوم آگے چلکر اسی جلد میں واضح کر دیا جائے گا)

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۵۳) (خٰلِدِيْنَ فِيْهَا)۔ گویا جبتک قرآنی اصطلاح میں مُتقی رہینگے دنیوی تغلب اُن کے حصے میں رہیگا!

"اتقا" کی مکمل تشریح ابھی تک نہیں ہوئی، اسکے لئے ابھی بہت وقت درکار ہے مگر جو کچھ ابتک حاصل ہوا ہے یہ ہے کہ اللہ نے قرآن (۱) مصائب کا استقلال سے مقابلہ کرنا، "اتقا" ہے (دیکھو صفحہ ۳۔ آیت (۲: ۱۷۷) اور صفحہ ۱۰۱۔ آیات (۳: ۱۲۰-۱۲۵)) (۲) "اُمّتِ واحدہ" بنے رہنا، "اتقا" ہے (دیکھو صفحہ ۹۳۔ آیت (۲۳: ۵۲))، (۳) "قَوْمًا لُدًّا" نہ بننا "اتقا" ہے (دیکھو صفحہ ۹۔ آیت (۱۹: ۹۷))، (۴) "اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ" اور "لَا تَفَرَّقُوْا" کا مصداق بننا، "اتقا" ہے (دیکھو صفحہ ۳۳۔ آیات (۳: ۱۰۱-۱۰۲))، (۵) "اصْبِرُوْا" اور "صَابِرُوْا" اور "رَابِطُوْا" پر عمل کرنا "اتقا" ہے (دیکھو صفحہ ۱۰۔ آیت (۳: ۱۹۹))۔ جس قوم میں یہ خاصیتیں موجود ہیں وہ از روئے قرآن مُتقی ہے، اور ایسی مستقل مزاج، اعلیٰ العزم، متحد، نافرقہ بند، اور صاحبِ اخوت قوم کا روئے زمین پر تسلط قطعی ہے۔ اِس مقام نظر سے ثابت ہے کہ زیرِ بحث آیت میں کافر قوم کا مُتقی قوم سے مقابلہ کر کے اِس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اوّل الذکر قوم کی دنیاوی نعمتیں محض چند روزہ ہیں، مگر مؤخر الذکر کے لئے جنّات زمین میں جنکے نیچے نہریں پڑی بہ رہی ہیں، وہ اُن میں جبتک متقی بنے رہیں گے، رہیں گے۔ یہ جسمانی اُن کی اِس روئے زمین پر خدا کے ہاں سے مہمانی (نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ) اور جو کچھ بعد آخرت کو اِس بادشاہت زمین کے سوا خدا کے پاس (عِنْدَ اللّٰهِ) ملیگا، وہ اِس سے بدرجہا بہتر (خَيْرٌ) ہے۔

"نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ" کے الفاظ کے بعد "وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ" کہنا، اور بعدازاں مقابلے کے لئے "خَيْرٌ" کا لفظ استعمال کرنا صاف اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ "جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ" سے مراد بادشاہت زمین ہی ہے لیکے ماسوا اس کے کچھ نہیں، اور "وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ" کا مفہوم "الجنّة" کی آسائش ہے جو آخرت میں ملیگا، اور جو بادشاہت زمین کی نعمت سے بدرجہا بہتر ہے۔ "خٰلِدِيْنَ فِيْهَا" سے شارحین قرآن نے مراد ابد تک ہمیشہ رہنا لیا ہے لیکن خلود کے معنی محض مدت تک رہنے کے ہیں اِس سے زیادہ کچھ نہیں۔ "نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ" اور "وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ" کا تقابل صفحہ ۴۴ کی آیت (۳: ۱۹۸) میں گذر چکا ہے، اور وہاں بھی "تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ" کے الفاظ موجود ہیں۔ یہ دونوں آیات الٰہی جنّات کے متذکرہ صدر معانی کی زبردست دلیلیں ہیں۔

جس کی آسماں دوفد نذ اور زمیں پاش ٹکر سے قرنوں کی مستحکم اور مقیم سلطنتوں کی بُنیادیں ہل جاتی تھیں؛ جس کی آہنیں ضرب سے رومۃ الکبرٰے اور فارس کے بلند نشینانِ عیش وعشرت کے تخت ہلنے، اور تاج ڈگمگانے لگتے تھے! جسکے قلعہ شکن اور حوصلہ کش گھمسان کے باعث قوی سے قوی دشمن کے حواس باختہ، اور روحیں فنا ہوجاتی تھیں! جس کی خانہ برباد طاقت اور تباہ کن قُوّت کا راز، دشمن سے قطع نظر، آج خود ہمارے لیئے تازیانہ عبرت ہے:

هُوَ الَّذِيٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ (۵۹ : ۲)

وہ خدا ہی تو تھا جسنے اپنے بہادر اور ثابت قدم مومنوں کے ذریعے سے منکرِ خدا اہلِ کتاب کو ان کے گھروں سے پہلی بھاگڑ بناکر نکال دیا! اے ایمان والو! تمہیں اپنی قوت کا صحیح اندازہ نہ ہونے کے باعث گمان بھی نہ تھا کہ یہ لوگ اپنے گھروں سے نکل جائیں گے، وہ اس خیال میں مست تھے کہ انکے قلعے اُن کو خدا کی پکڑ سے بچالیں گے، مگر اللہ کے لشکر نے انکو اُدھر سے دھر پکڑا جدھر سے اُن کو وہم وگمان بھی نہ تھا، اور اُن کے دلوں میں ایمان والوں کی ہیبت بٹھادی! اب وہ اِن گھروں کو اپنے ہاتھوں اور ایمان والوں کے ہاتھوں سے اُجاڑ رہے ہیں، تو اے بصیرت والو! اس واقعہ سے عبرت پکڑو کہ ایمان کیا کچھ کرسکتا؟

کیا یہ اللہ کا محبت آمیز **ڈر**، کیا یہ اُس سب سے بڑے سپہ سالار کا **ہَول** مرتبت، کیا یہ اُس قائدِ اعظم کا عشق انگیز **خوف**، کیا یہ اُس دلق پوش پیغمبر کا **رُعب** رسالت، یورپ کی حصن پاش توپوں اور رومۃ الکبرٰی کی قلعہ نشین فوج کی منجنیقوں سے بدرجہا مدہش اور مُہلک تر **ہتیار** نہ تھا جس نے صدرِ اسلام کے مُتقی مومنوں کو انہی شکستہ نیزوں اور کند تلواروں کے ذریعے سے روئے زمین کے شاداب تر ملکوں کا وارث بنادیا تھا!

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۭ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ + وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

+ یہاں صاف ظاہر ہے کہ متقی قوم کی دنیا بھی درست ہے اور آخرت بھی بغیر گندگی ۔ پس دنیاوی خوشحالی کا ہونا اور رحمتہائے آلٰہی سے فیضیاب ہونے کی اہلیت رکھنا ہی "اتقائے خدا" کی علامت ہے، لیکن یہ بحث پانچویں جلد سے پہلے نہ ہوسکیگی: "اشاعت" کے متذکرہ صدر معانی کا ثبوت فلسفۂ عمل میں آئے گا۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (٧ : ١٥٦)

اور اُنہوں نے کہا کہ اے پروردگارِ عالم! تو اِس دنیا کی بہتری اور آخرت کی فلاح ہمارے نام لکھدے کیونکہ ہم سب سے الگ ہوکر تیری ہی طرف آگئے ہیں، تو اللہ نے فرمایا کہ ہم اپنا عذاب تو اُسی پر نازل کرتے ہیں جسکو ہم بوجوہ مستوجب سزا قرار دیتے ہیں (مَنْ اَشَآءُ)۔ لیکن ہماری رحمت تمام عالم پر چھائی ہے تو ہم بہبودیٔ دنیا اور فلاح آخرت عنقریب اُن لوگوں کے نام پر لکھدینگے جو ہم سے بچے طور پر ڈرتے ہیں، جو ہمارا بول بالا کرنے کی غرض سے قربانیٔ مال کرتے رہیں، اور جو ہمارے احکام کے نفع مند ہونے پر ایمان رکھکر اُن پر عمل کرتے ہیں (یُؤْمِنُوْنَ)۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ† وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (٥ : ٣٥)

اے ایمان والو! مقامِ خدا سے ڈرتے رہا کرو، اور پسندیدہ اعلا کاموں کے وسیلے سے اُس سے قرب حاصل کرنے کی سعی کرو۔ اور اسکی حمایت میں جانیں لڑادو تاکہ تم آخرکار اِس دنیا میں کامیابی اور آگے چلکر فلاح حاصل کرو (لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ)۔

---

† جس حیرت انگیز نادانی بلکہ تجاہل عارفانہ سے بعض ناعاقبت اندیش اور مفاد پرست مسلمانوں نے اِس آیت الٰہی کے مطالب میں قصداً تحریف کرکے ابتغوا الیہ الوسیلۃ کے الفاظ کو اپنے اپنے انسانی کارستانیوں اور پیروں کی تلاش، اور انکے توسل سے قرب خدا حاصل کرنے پر محمول کیا ہے، اور جس ظاہری سکوت اور باطنی اطمینان سے پیر حضرات نے بھی اِس آیت کو اپنی طرف منسوب دیکھکر زمانے اسلام کی مسند نشینی خود بخود قبول کرلی ہے، اُس سے کم ازکم یہ پتہ چلتا ہے کہ جہاں مسلمانانِ عالم نے قرآن حکیم کے الفاظ کی حفاظت میں اِس شدومد سے حصہ لیا کہ باقی دنیا انکے اِس کارنامے پر ہمیشہ رشک کرتی رہے گی، وہاں کتاب الٰہی کے مطالب کی حفاظت کی طرف سے کامل بے اعتنائی اور بےحسی اختیار کرکے دینِ اسلام کی بیخ کو نہایت سرعت سے فنا کررہے ہیں۔ اب ہر شخص جس آیت کا جو مطلب چاہتا ہے بنالیتا ہے، اور الفاظ کے مطالب کو کھینچ تان کر اُسکو اپنے لیے ایک نہایت آباد اور پررونق دکان سجالیتا ہے۔ آج تاویل کے محشرستان کرۂ فساد میں کسی ایک آیت الٰہی کے معانی کی تعیین مشکل ہوگئی ہے، ہر شخص اپنے اپنے ٹکڑے اور من مانی تاویل کو ہاتھ میں لیے ہوئے تفریق و انتشار کے عدم آباد کی طرف نہایت شوق سے جارہا ہے، اور خدا سے قطعاً نہیں ڈرتا کہ جن مطالب کی نشر و تبلیغ وہ نہایت تن دہی سے کررہا ہے، اور جس خدمت اسلام کے بہانے پر وہ نجات آخرت کا امیدوار ہے اس خدمت اور مطلب کی کوئی خدائی سند بھی ہے۔ آج یہی آیہ "وَسِيْلَةً" (٥ : ٣٥) پیر پرستی کی سند میں ہر موقع پر اِس تیقن اور التزام کے ساتھ پیش کردی جاتی ہے، قرآن سے دن رات سروکار رکھنے والے مسلمان اور پیروں کے پڑھائے ہوئے مرید خدا تک پہنچنے کے لیے پیروں کے توسل کو اسقدر ناگزیر سمجھتے ہیں کہ اُن کے طرزِ استدلال اور تعقل، اُن کی قرآن فہمی اور تدبر کو دیکھکر عقل کانپ اُٹھتی ہے۔ لیکن یہ خدا کے اِس آخری کلام کا زندہ معجزہ ہے کہ جس جس آیت کے مطالب مسلمانوں نے اپنا مطلب نباہنے کیلئے محرّف کردیئے ہیں اُن کی تغلیط کا پورا سامان خود قرآن کے اندر حیرت انگیز استقلال کے ساتھ موجود ہے۔ قرآن حکیم کا ہر حصہ اپنے مطالب کا آپ محافظ ہے، اُسکو کسی مفسر یا شارح کسی من مانی لغت یا طول سے بنائی ہوئی حدیث کی حاجت نہیں۔ آیہ وَسِيْلَةً کے اِن تارو اسانی کا پورا رد سورۂ بنی اسرائیل کے اندر موجود ہے اور یہ رد اِس درجہ مسکت ہے کہ کسی بڑے سے بڑے پیر پرست کو اسکے آگے دم مارنے کی مجال نہیں بشرطیکہ ذہن کو کام میں لانے کی توفیق اُسکو ارزانی

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ

أَوَّلَ مَرَّةٍ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ٭ (۹:۱۳)

اے ایمان والو! تم اُن لوگوں سے دل کھول کر کیوں نہ لڑو جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور

رسول خدا کو وطن بدر کرنے کا ارادہ کیا، اور ایذا دینے میں پہل بھی انہوں نے کی۔ کیا تم ان

لوگوں کی طاقت اور تعداد سے ڈرتے ہو؟ پس اگر تم میں ایمان موجود ہے تو خدا ان سے کہیں

بڑھکر حق رکھتا ہے کہ تم اس سے ڈرو۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۵۶) ہو جائے! انسان کے انسان کی عبادت کرنیکے متعلق کتاب خدا کا حکم ہے:

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا. أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ٥ (۱۷:۵۶-۵۷)

اے محمدؐ! ان لوگوں سے کہہ دو کہ خدا کو چھوڑ کر تم نے جن انسانوں (الَّذِينَ) کو اپنے زعم میں اپنا کارساز سمجھ رکھا ہے (جن کو تم خدا کے ساتھ ساتھ طاقتور اور مشکل کشا سمجھ بیٹھے ہو) ان کو پکار دیکھو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ لوگ نہ تو تم سے تکلیف کو دور کر سکیں گے اور نہ اسکو بدل ہی سکیں گے۔ یہ شخص جنکو نادان لوگ حاجت روا سمجھ کر پکارتے ہیں (اور جنہیں اپنا مشکل کشا اور سفارشی بنا کر ان کی آس لگائے بیٹھے ہیں) وہ خود اس قدر محتاج ہیں کہ ان میں سے خدا کے جو سب سے زیادہ مقرب ہیں (أَيُّهُمْ أَقْرَبُ) اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کے وسیلے ڈھونڈتے رہتے ہیں (يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ)، اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں، اور اسی کی سزا سے ہر آن خوفزدہ رہتے ہیں (تو وہ پھر مشکل کشا اور سفارشی آپ کیسے ہو سکتے ہیں)، اور لوگو! خدا کا عذاب وہ شے ہے جس سے ڈرنے کے سوا کسی کو چارہ نہیں۔

یہاں پر انسان کو انسان کی عبادت اور اطاعت اختیار کرنے سے منع کیا ہے، اور بصراحت تمام اس بات پر زور دیا ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان بڑے سے بڑا انسان اور معزز سے معزز بشر بھی حاجت روائی کا وسیلہ یا نجات کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان میں سے جو سب سے زیادہ مقرب بارگاہ ہو وہ بھی صاحب کبریا و جبروت کے سامنے اس قدر عاجز و بے بس ہے کہ اسکو اپنا ہی قرب اور تقرب برقرار رکھنے کے لیے وسائل ڈھونڈنے سے فرصت نہیں ملتی، پھر وہ کسی غیر کی سفارش یا مشکل کشائی کیا کر سکیگا۔ گویا جب سب سے بڑا نبیؐ بھی اپنی ہی نجات کے فکر میں سرگرداں ہے اور اسکے لیے شب و روز سعی کر رہا ہے تو پھر کسی خودساختہ "پیر طریقت" یا "ولی" کی کیا مجال ہے کہ کارسازی کر سکے۔ جب اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی انسان کسی انسان کا وسیلہ نہیں ہو سکتا، اور بڑے سے بڑا انسان حتیٰ کہ نبی بھی اپنی نجات کا وسیلہ ڈھونڈتا ہے تو يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ کے لفظ الْوَسِيلَةَ کا مفہوم عمل پیہم اور سعی مسلسل کے علاوہ کوئی اور شے ہے جو اشیاء سے مقرب بارگاہ انسان بھی تلاش کرتے ہیں، اور وہ شے سعی و عمل کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے "اَقْرَب" بارگاہ الٰہ ہونے میں کسی ایک مسلمان کو اعتراض نہیں ہوگا، اور یہ بھی مسلم ہے کہ آپؐ نے اپنی زندگی میں کوئی پیر نہیں پکڑا تھا بلکہ تمام عمر سعی و عمل کرتے کرتے انتقال کر گئے۔ یہی بات آیت زیر بحث کے سیاق سے ظاہر ہو جہاں وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ کے ساتھ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ کہا گیا ہے جسکے واضح معنی یہی ہیں کہ خدا کی راہ میں اپنا جان مال، تمام گھر بار سب کچھ، بیدریغ بہا دو کہ اسکی خوشنودی اور قرب حاصل کرنے کیلیے یہی سعی و عمل ضروری ہے نہ یہ کہ بادشاہوں کی لڑائیاں تم نے اپنا کے اور تحفہ حاصل کرنے یا کرسی نشین بننے کیلیے دوسروں کی سفارش کا طلبگار رہے۔ خدائے زمین و آسمان کی حکومت اہل فرنگ کی حکومت کی طرح معاذ اللہ ایسی نہیں ہے کہ تم کسی کی سفارش پہ یا سعی و عمل بجا لایا کریں۔ یہی آیات کا مضمون کچھ یاد دینے والا مضمون ہے، بشرطیکہ مسلمان غور کریں۔

٭ یہاں ایمان کی شرط لازمی و ناگزیر قرار دی گئی ہے کہ انسان خدا کے سوا کسی کمتر ہستی سے خوفزدہ نہ ہو اور دشمن سے بےخوف و خطر قتال کرے۔

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ۝ (۹: ۴۴-۴۵)

اے پیغمبر! جو لوگ خدا پر ایمان لاتے ہیں اور روز آخرت کے محاسبے کا بھی اُنکو یقین ہے، وہ تو تم سے اس بات کی رخصت مانگتے نہیں کہ اپنے مال و جان سے شریک جہاد ہوں اور اللہ تو سچے تقویٰ والوں کو خوب جانتا ہے۔ نہ شامل ہونیکے لیئے لنگ عذر پیش کر کے تم سے خواہانِ اجازت وہی لوگ ہوتے ہیں جو اللہ اور روز حساب کا یقین نہیں رکھتے۔ اُنکے دل شک میں پڑے ہیں، اور اسی شک میں پڑے تذبذب کر رہے ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَاۗءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰي فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (۱۰: ۶۲-۶۴)

یہاں ’ایمان‘ کی شرط جہاد بالمال والانفس ہے، اور یہی شرط تقویٰ کی ہے (وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ)۔ گویا خدا جیسے حاکم اعلیٰ سے ڈرنے کے یہی معنی ہیں کہ اُسکی راہ میں جان و مال سے دریغ نہ کیا جائے۔ آج بھی شیوہ ہر ملازم کا اپنے مشاہرہ دہ آقا سے ہے۔ وہ اگر جانباز سپاہی لو سچا غلام ہے تو اپنے مالک سے ڈر کر اور اُسکی حفاظت میں جان تک لڑا دے گا۔

یہاں صاف ظاہر ہے کہ متقی قوم کو جہاں آخرت میں کچھ باک نہیں وہاں اسکی دنیا بھی درست ہے۔ کوئی قوم جسکی دنیا درست نہیں ’متقی‘ ہونے کی مصداق نہیں ہوسکتی، اور چونکہ اتقا کے معانی صاف ہوچکے اسلیئے جو قوم متحد ہوکر رہے گی، مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرے گی، ’صَابِرُوْا‘ اور ’رَابِطُوْا‘ پر عمل کرے گی، خوشنودی خدا حاصل کرنے کیلئے ابتغائے وسائل کرے گی، ’قَوْمًا لُدًّا‘ نہ بنے گی، اسکی دنیا بہر نوع اور لامحالہ اچھی ہے، اور وہی ’لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ‘ کی بشارت کی سچی اہل ہے، اُسکو یہاں پر بھی کسی دشمن کا ڈر نہیں لو آگے چلکر تو ابدالآباد تک امن ہے۔ ایسی قوم ہی ’اولیاء اللہ‘ ہونیکی صحیح مصداق ہے۔ وہ یکساں خدا کی دوست ہے اور خدا اسکا دوست ہے کیونکہ یہاں بھی سب نعمتیں دے رہا ہے اور آگے چلکر بھی بے حساب دیگا۔

مسلمانوں نے نہ معلوم کس بنا پر ’اولیاء اللہ‘ کا خطاب اُن دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے فقرا، اور پریشان مو اصحاب کو دیا ہے جو تمام عمر اپنے اعتکاف خانوں میں بند رہ کر خلق خدا سے بیزار رہے، جنہوں نے امت کو متحد کرنے میں کچھ سعی نہ کی، جنہوں نے خدا کی لڑائیاں لڑنے میں اپنی جان کو پیش نہ کیا، جنکو خدا نے حیاۃ دنیا میں کوئی بشارت نہ دی، جو خلق خدا کو متحد کرنے کی بجائے اُلٹا اپنے اپنے پیچھے لگا کر متخالف الآرا اور منتشر العمل کر گئے، جنکی تمام تر زندگیاں نہایت رنج و غم اور ذلت و مسکنت میں کٹیں۔ خدا کا دوست وہی ہے جو اُسکی خاطر تکلیف اُٹھائے لیکن یہ دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مالک الملک خدا اُسکو اس تکلیف اُٹھانیکے صلے میں سب سے بیخوف و خطر کردے۔ اگر یہ نہیں تو کچھ ’دوستی‘ نہیں اگرچہ ساری دنیا اُسکو ’ولی‘ کہکر پکارتی رہے! آج اگر سطح زمین کے طول و عرض میں خدا کا صحیح معنوں میں دوست کوئی ہے تو وہ بندۂ خدا جو اپنی جماعت کی بہتری کی خاطر تن بدن کو تکلیف میں ڈال رہا ہے، جو دشمن کی قوت سے خوفزدہ نہیں ہوتا، جو ما سوا سے قطع نظر کر کے خدا ہی سے ڈر رہا ہے، جو فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ (۹: ۱۳) پر عمل کرکے سب سے بیخوف و خطر ہوگیا ہے۔ اگر کسی خدا کے بندے میں یہ ڈر اور یہ نڈری، یہ تقویٰ اور یہ بیخوفی، یہ خوف خدا اور لا خوف ولا حزن ما سوا آچکا ہے تو وہ بلاشبہ ’ولی‘ ہے، وہ لاریب خدا کا دوست ہے۔ خواہ وہ چین کا رہنے والا ہو یا ہند کا۔ خدا کو اپنی دوستی میں کسی ملک یا مذہب کی تخصیص نہیں!

لوگو! یاد رکھو کہ خدا کے سچے دوستوں کو نہ تو کسی قسم کا خوف ہے اور نہ وہ آزردہ خاطر ہوتے ہیں
یہی وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور مقامِ خدا سے ڈرتے رہے۔ انہیں اس دنیا میں بھی عافیت اور امن
کی بشارت ہے، اور آخرت میں بھی فلاح ہے۔ خدا کے وعدوں میں ردّ و بدل کا امکان ہرگز نہیں لو
یہ فلاح دارین تو بڑی بھاری کامیابی ہے۔

وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۚ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ ○ (۱۴:۱۴)

اور دشمن کے غارت ہوئے پیچھے ہم ضرور تم کو اسی سرزمین میں بسائیں گے۔ یہ صلہ اُس شخص کا ہے جو میرے
مقام و منصب سے ڈرتا رہا اور جس نے میرے عذاب سے بچنے کی سعی کی۔

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا خَيْرًا ۗ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ
وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ ○ (۱۶:۳۰)

اور ان لوگوں سے جنہوں نے مقامِ خدا کا سچا احساس کیا پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے
اپنے ہاں سے تمہاری اس خدمت کے عوض میں کیا دیا تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اچھے سے اچھا
جن لوگوں نے بھی خدمت کی اور اپنے حسنِ عمل سے خدا کو خوش کر دیا انکے لیے اس دنیا میں بھی
بہتر سے بہتر نعمتیں ہیں اور آخرت کا گھر تو اس سے کہیں اچھا ہے اور تقویٰ کرنے والوں کا ٹھکانا
تو بہرحال نہایت ہی اچھا ہے۔

قُلْ يَا عِبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۗ وَأَرْضُ
اللَّهِ وَاسِعَةٌ ۗ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (۳۹:۱۰)

اے پیغمبر! ہماری طرف سے کہدو کہ اے ہمارے بندو! جو ہم پر ایمان لاچکے ہو، مقامِ خدا کا تقویٰ
کرتے رہا کرو۔ جنہوں نے ہم سے ڈر کر ہماری حمایت میں جان و مال کی پروا نہ کی اُن کے لیے اس دنیا
میں زمین کی بادشاہت کا بہترین اجر ہے۔ اور خدا کی زمین تو بڑی وسیع ہے۔ بیشک مصیبت برداشت
کرنے والوں کو ان کا عوض بے حساب دیا جائے گا۔

✣ یہاں متقی قوم کے لیے بادشاہت زمین کا انعام صاف ہے۔
✣ یہاں باوصاف طریقہ متقی، قوم کے لیے دنیا کے بہترین انعام وقف کردینے کا وعدہ ہے۔
✣ یہاں پھر روئے زمین کی وسیع بادشاہت متقی قوم کے لیے وقف ہے۔ اور صاف فرمادیا ہے کہ دنیاوی انعامات اسقدر بےحساب ہیں کہ تمام کرۂ زمین کی ملکیت اس میں شامل ہے (وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ) یعنی یہاں حُسن عمل ہی (لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ) ہے اور یہ کا صالح عمل کی یہی سچی تعریف ہے جس کی تلاش ہم کر رہے ہیں۔ حسنات کے تحت ملاحظہ صفحہ ۳۰ میں بھی أَحْسَنُوا سے یہی مراد ہے! (دیکھو آیہ (۱۶:۳۰) ضمناً اس آیہ میں پھر بتلادیا ہے کہ صبر! یعنی مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنا، اتقائے خدا کی ایک اہم شق ہے۔ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ

اِس اتحادِ عمل اور تزکیۂ اخلاق کا اصلی راز خدائے واحد کی **خالص** عبادت، اور براہِ راست عبودیت تھی۔ قرآن کی حیرت انگیز تعلیم، اور داعیٔ اسلام کی حیرت انگیز یقین آفرین صحبت نے خداوند عالم کا اپنے عاجز اور محتاج بندوں سے براہِ راست تعارف کرا کے عبد و معبود کے درمیان سے سب مشکوک حجاب دور کر دیئے تھے۔ رسول خدا کی ناقابلِ انکار صداقت اور انکسارِ نفس نے بندے کا ہاتھ مالک ارض و سما کے مقتدر ہاتھ میں دے کر خود ایک بے تعلق اور پیغام رساں بشر کی حیثیت قبول کر لی تھی۔ ذاتیات اور شخصیت کا مہلکِ ایمان اور مضعفِ یقین عنصر اسلام کے خمیر میں قطعاً نابود تھا، توحید تمام امت کے اجماع کا نقطۂ وحد بن گئی تھی؛ ہر فرد بشر کا معاملہ، بلاوساطت غیرے اور بلا مشارکت احدے، اُس معبود منزل حقیقی کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا جسکی قدرت اور عظمت کے صحیح اندازے نے ایک عالم کو کپکپا دیا تھا! نفع اور ضرر کے اسی بےمثال یقین نے سرزمین عرب میں **خوف** خدا کی مشترک لہر دوڑا دی تھی؛ اِسی خوف کے باعث باہمی عداوتیں مٹ گئیں، کینے اُچک لیے گئے، بھائی چارے کا سماں ہر طرف بندھ گیا تھا! انسان کی عزت و تکریم، اور اُسکے انعام و اکرام کا معیار بھی خدا کے نزدیک اُس کا تقوے ہی تھا؛ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (۴۹ : ۱۳)[1]، قلوب کے اندر ایک مشاہود حاکم کی مانند اُسکے رعب مرتبت اور ہول جاہ کی بجلیاں، نفع و ضرر اور بیم و رجا کی لاانتہا تاروں کے ذریعے سے دوڑ گئیں؛ پھر وحدت امیر[3] کی کشش اتصال نے، اور یک معنی کے متحد القلوب خوف نے ہر مومن کے قلب میں مشترک عبودیت کی عصبیت، اور عالم آرا اخوت کا اعتصاب پیدا کر دیا: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۴۹ : ۱۰)[2] یہی وہ **عملی تقوی** اور وہ **مخلصانہ توحید** تھی جو

---

[1] اللہ کے نزدیک تم میں سے بڑی عزت والا اور مستحق فضل و کرم وہی ہے جو خدا سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ اور اللہ تو انسان کی قدر و قیمت کو بڑا جاننے والا، اور اُسکے حال و احوال سے بڑا باخبر ہے۔

[2] خدا پر ایمان رکھنے والے تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، پس تمہارا فرض ہے کہ اگر وہ باہم لڑیں تو درمیان مصالحت کرا دو اور خدا کی خفگی سے ڈرتے رہو اور اُسکا تقویٰ کرو کہ وہ تم پر مہربان ہو جائے۔

---

[3] یہاں پر مصالحت اور مواخات کو تقاضائے الٰہی پر محمول کیا گیا ہے۔ جس قدر خوف رعیت کو حاکم اعلیٰ کا ہے اسیقدر اُنکے افراد متحد رہیں گے۔

سالہا سال تک اسلام کو نئی طاقت اور نئی زندگی بخشتی رہی، قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ ﴿١١﴾ وَأُمِرْتُ لِأَنْ أَكُونَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٢﴾ ۱ (۳۹: ۱۱-۱۲)، قُلِ اللَّهَ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِينِي ۲ (۳۹: ۱۴)، اِسی تقویٰ کی پاداش عمل میں اللہ کی رحمتوں کے دریا اُمڈ جاتے تھے! یہی اتقا و اتحادِ عمل اُس جلیل القدر ذات کی سچی عبادت اور اُسکی موجودگی اور وحدت کا زندہ اشتہار تھا۔ اِسی کی بے انتہا برکت سے نصرت حق اور فتح مبین ہر وقت شامل حال رہ کر اشاعت اسلام کا قطعی باعث ہوا کرتی تھیں: إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ﴿١﴾ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ﴿٢﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۳ (۱۱۰: ۱-۳)۔ اللہ کے یہ محکوم اور خالصۃً اُسی سے ڈرنے والے سپاہی، عقیدت کے سرفروشانہ جوش، مستعدی کی داعیٔ انقلاب اُمنگ، اور محبت کی مضطربانہ امتحان وفا کے باعث صبر اور استقلال، توکل اور مردانگی کے عدیم النظیر پیکر

---

۱ اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہدو کہ مجھکو تو خدا کے ہاں سے یہی حکم ملا ہے کہ میں تمام ارادت اور اخلاص (الدِّين)، تمام عقیدت اور اعمال (الدِّين) کو خالصۃً خدا ہی کیلئے وقف کر کے ہمہ تن اُسیکا غلام بنا رہوں (أَعْبُدَ اللَّهَ)۔ اور مجھے یہی حکم ملا ہے کہ میں ہی سب سے پہلے اُسکو اپنا آقائے حقیقی تسلیم کروں، اور عملی طور پر اُسکی عبودیت میں رہوں (أَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ)۔

۲ ان سے کہدو کہ میں اپنی تمام ارادت اور محبت کو اُسی کے لیئے خالص کر کے اُسکی غلامی کر رہا ہوں (أَعْبُدُ)۔

۳ اے پیغمبر! جب اللہ کی مدد آئے گی، اور دین اسلام کی فتح عظیم کا وقت آ پونہچیگا اور تو دیکھے گا کہ لوگ جوق در جوق دین خدا میں داخل ہو رہے ہیں، تو اُس وقت اپنے پروردگار کے شکر کرنے میں سر بسجود ہو جاؤ، اُسوقت اپنی جماعت کی اور اپنی گذشتہ تقصیروں کی معافی طلب کرو کیوں کہ وہ فی الحقیقت بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے اور ایسی مہربانیوں کے موقعے پر ہی اُس سے ایسی درخواستیں کرنی چاہئیں۔

✽ یہاں 'أَعْبُدُ' کے معنی صاف ظاہر ہیں اور اس سے مقصود نماز پڑھنا قطعاً نہیں ہو سکتا۔ 'دِين' کے معنی قرآن کی اصطلاح میں طرزِ عمل یا رویہ عمل کے ہیں۔ یہی معنی لفظ مذہب کے ہیں۔ گویا 'أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ' کا مفہوم یہ ہے کہ اپنا تمام طریق عمل خالصۃً خدا کی منشا کے مطابق کر کے اُسکے غلام بنے رہو۔ ہر ایک ملازم (یعنی عبد) کا شیوہ بھی یہی ہے کہ وہ کوئی کام اپنی مرضی سے نہیں کرتا۔ اُسکی سب بھاگ دوڑ آقا کی مرضی پر منحصر ہے اور وہ اپنی مشیت اور اپنی خواہشات کو مالک کے حکم کے بالمقابل فنا کر دیتا ہے۔ رہا اس امر کا تصفیہ کہ مالک زمین و آسمان کی مشیت فی الواقع کیا ہے؟ یہ ایک بڑا دقیق سوال ہے اور اصل کتاب میں اسی کی ایک اہم شق پر بحث جاری ہے۔ بہر نوع ان دونوں آیتوں سے ظاہر ہے کہ دین کے معنی کسی شخص کا مسلمان ہونا یا نصرانی ہونا، یا یہودی ہونا نہیں بلکہ ہر غلام کا اپنے آقا کے حق میں طرزِ عمل ہی اُسکا دین ہے۔ والا مُخْلِصًا لَّهُ دِينِي کے کچھ معنی نہیں بنتے یہی بات لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (۱۰۹: ۶) سے ظاہر ہے۔ یعنی تمہیں تمہاری خدمت کا اجر ملیگا اور مجھے میرے کیئے کا۔ خدا کو مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ (۱: ۳) بھی اسلیئے کہا کہ وہ دن اعمال کی اجرتوں، اور خدمتوں کی مزدوریاں ادا کرنے کا ہوگا۔ (دین کے اصل مطلب کی حقیقت کیلئے دیکھو دیباچہ کتاب صفحہ ۰)۔

✽ اس سورۃ کے صحیح معانی کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ایک دفعہ سوال کیا گیا تھا۔ میں نے مربوط اور ناقابل انکار معانی لکھ دیئے ہیں۔ خدا کی نصرت قطعاً کسی قوم کے شامل حال نہیں ہوتی جبتک کہ اسکی سعی و عمل خدا کو فی الواقع خوش نکردے یہی وقت فی الحقیقت کسی حاکم سے کچھ مانگنے کا بھی ہے۔ اسیوقت اسکی رحمت کا دریا جوش میں آتا ہے اور وہ بسا اوقات علی الحساب دے دیتا ہے۔

بن گئے تھے؛ انکی قوت و استحکام کا راز دروں اُنکے متحد اور متفق قلوب میں مضمر تھا؛ نیتوں کی یگانگت اور تہذیب نفس کے التیام آفریں اثر نے اُن کے اعمال میں نا قابل یقین ضبط، اور افعال میں طبعی یکسانیت پیدا کر دی تھی؛ بڑے بڑے مقتدر اور جبری عساکر جو مدت مدید کی تیاری اور صرف کثیر کے بعد اُن کے مقابل کھڑے ہوتے تھے، انکے ضابطہ عمل، انکی پیش بندی اور اہتمام، اُنکے نظم و نسق، اور خوف قانون خدا، انکی مشق تحمل اور ستم برداری پر دنگ رہ جاتے تھے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ + وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ل (۵۹:۱۸)؛ لالچ اور بددلی، ہراس موت اور قنوط، تشتت اور جمود کے اُن زر خرید اور بے مولا، اُن نا آشنائے پایانِ عمل اور کرایہ پر لیئے ہوئے

ل اے ایمان والو! قانونِ خدا سے ڈرتے رہا کرو اور تمہیں چاہیئے کہ ہر شخص اس بات پر نظر کرتا رہے کہ اُس نے آنے والے کل کے لیئے کیا تیاری کی ہے اور آیندہ مصائب کے لیئے کیا حفظِ نفس اور پیش بندی کی ہے۔ اور قانونِ خدا سے مکرر ڈرتے رہو۔ اللہ جو کچھ سعی و عمل کر رہے ہو اُسے بخوبی واقف ہے۔

+ اس آیت الٰہی میں پیش از وقت تیاری اور دور اندیشی کو تقاضائے تقویٰ پر محمول کیا گیا ہے اور دشمن کے بالمقابل حفظ نفس کو اسقدر اہم قرار دیا ہے کہ دو دفعہ "اتقوا اللہ" کے الفاظ ایک آیت کے اندر آئے ہیں۔ اس تکرار سے مقصود لامحالہ یہ ہے کہ خدا کا قانون اٹل اور واجب الخوف ہے، وہ اسی قوم کو انعام کا مستحق قرار دیتا ہے جو ہر نوع اسکی اہل ہو، جس نے سعی و عمل سے اپنے آپ کو فتح و ظفر کا اہل ثابت کیا ہو، جس نے آنیوالے کل کے لیئے تیاری کی ہو (مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ)۔ خدا کسی قوم کی کوئی بے جا رعایت مدنظر نہیں رکھتا، جس جس نے جتنا زاد راہ کل کے لیئے جمع کیا ہو، جسقدر تحفظ اُس نے آنے والی مصائب کے برخلاف اختیار کیا ہے، اُسیقدر اجر اُسکو لامحالہ مل رہیگا۔ یہی بات "إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ" سے ظاہر ہے گویا خدا عمل اور صرف عمل کو چاہتا ہے اور اُسیکو دیکھکر فیصلے صادر کرتا ہے۔

نیم پسند اور آخرت کے شیدائی مسلمانوں نے "مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ" کے معنی "روز قیامت کی تیاری" کے لیئے ہیں حالانکہ "غد" کے معنی کسی آنے والے کل کے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اسپر الف لام تخصیصی بھی داخل نہیں کہ اسکے معنی خاص روز قیامت کے ہوں۔ جامع ترمذی (المتوفی ۲۷۹ھ سنہ ۸۹۲ء) میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ "أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَا يَدَّخِرُ شَيْئًا لِغَدٍ" یعنی "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کل کے لیے کوئی ذخیرہ جمع نہ کرتے تھے"؛ روایت کی صحت یا عدم صحت سے بحث نہیں، صرف "لغد" سے مطلب ہے جسکے معنی یہاں پر صاف آنیوالے کل کے ہیں روز قیامت کے نہیں ہیں۔ خود قرآن کریم میں چار موقعوں پر "غدًا" کا لفظ استعمال ہوا ہے اور چاروں موقعے آنیوالے کل کے معنی میں ہیں۔ سورہ یوسف میں یوسف علیہ السلام کے متعلق اُنکے بھائیوں کا قول ہے: أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (۱۲:۱۲)، یعنی "ہمارے ساتھ کل یوسف کو بھیجو کہ کھا پئے اور کھیلے، اور ہم اسکی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں"۔ سورہ کہف میں ہے: وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا (۱۸:۲۳) "یعنی کسی شئے کی بابت یقینی طور پر مت کہو کہ میں اسکو ضرور بالضرور کل کرونگا"۔ سورہ لقمان کے اخیر میں ہے: وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا (۳۱:۳۴) "اور کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل کیا کریگا"۔ علیٰ ہذا القیاس سورہ قمر میں قوم ثمود کی تباہی کے متعلق ہے: سَيَعْلَمُونَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْأَشِرُ (۵۴:۲۶) یعنی "یہ لوگ عنقریب کسی آنے والے کل کو دیکھ لیں گے کہ کون جھوٹا اور گستاخ ہے"۔ تعجب ہے کہ اس شہادت کے ہوتے ہوئے "غد" کے معنی کسطرح قیامت کے ہو سکتے ہیں، اور کس بیدردی سے مسلمان آیات خدا کو توڑ موڑ کر تحریف معنوی کے مجرم بنتے ہیں۔

سپاہیوں کی، اِن اللہ کے عاشق، بیقرار ابتلا و محنِ نصرتِ حق اور وراثتِ زمین کے موعد، موت کے تشنہ و منتظر، دست پختِ گہوارۂ امید، اور جنت خرید غلاموں کے مقابلے میں کیا بساط تھی جو بروئے کار آتی، مومنوں کے فلک کشا حوصلے اور متحدہ دلوں کی کوہ شکن طاقتیں، دشمن کے جمِ غفیر کو پہلے ہی پیوندِ زمین کر دیتیں، ایمان کا جرأت افزا اثر مسلمانوں کی قوتِ عمل کو چند در چند کر دیتا، اور ایک حیرت انگیز طریقے پر بظاہر اکمل سامان جماعتِ دشمن کا تہس نہس کر دیتی!

یارِ مردانِ خدا باش کہ در کشتیِ نوح

ہست خاکے کہ بہ آبے نخرد طوفاں را

لَأَنْتُمْ أَشَدُّ رَهْبَةً فِي صُدُورِهِمْ مِنَ اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ۝ لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُحَصَّنَةٍ أَوْ مِنْ وَرَاءِ جُدُرٍ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ۝ (۵۹: ۱۳-۱۴)

مسلمانو! تم اللہ پر ایمان رکھنے کے باعث ہی ان منکرینِ خدا کے دلوں میں اشد شدید ہیبت بٹھا رہے ہو، اور یہ محض اسلئے ہے کہ یہ ایک ناسمجھ قوم ہے، جسکو ایمان کی قوت کا علم نہیں۔ اب تو انکی یہ حالت ہے کہ سامنے کے سارے ملکر بھی تم سے لڑنے کی تاب نہیں رکھتے مگر یہ کہ محفوظ بستیوں یا دیواروں کی آڑ میں ہوکر لڑیں۔ بات یہ ہے کہ انکی آپس کی لڑائیاں اور باہمی عداوتیں سخت ہیں۔ بظاہر

---

* قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ، اور قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ کے الفاظ یہاں پر نہایت قابلِ غور ہیں۔ گویا یہ منکرینِ خدا لوگ اِس بات کا تفقہ اور تعقل ہی نہیں کرتے کہ قانونِ خدا کیا ہے، وہ کن اقوام کو دنیا پر برقرار رکھتا ہے، کن کو سزا نہیں دیتا ہے۔ یہ لوگ آپس میں لڑ مر کر اپنی قوتوں کو ضائع کر رہے ہیں اور دشمن سامنے آتا ہے تو دُم دبا کر بھاگ جاتے ہیں ان کو اتنی عقل ہی نہیں کہ سمجھیں کہ اتحاد اور اختلافِ قلوب میں کیا برکتیں ہیں، اور خدا کس طرح متحد اور مغلوب قوم پر اپنی رحمتیں نازل کرتا ہے۔ گویا ان آیات میں رمزاً اور کنایۃً جتلا دیا ہے کہ نزولِ متفرق اور معاندہ ہونا کافر قوم کا خاصہ [illegible] آج مسلمانانِ عالم خود قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ، اور قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ، اور تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ کے صحیح مصداق بنے ہوئے ہیں دوسری قوموں سے اپنے افراد کے مابین اتحاد پیدا کر لیا ہے۔ مسلمان اُن کے خوف سے بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں اور قلعوں کی اوٹ میں جھگڑے بھی [illegible] نہیں سکتے۔ ہر جگہ شکست در شکست ہے، خوف در خوف ہے، رنج و ماتم ہے؛ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ، اس قدر ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ آہ! لیکن خدا کوئی مسلمانوں ہی کا خدا نہیں وہ رب العالمین ہے اور ہر قوم کو اس کی سعی و عمل کے مطابق اجر دے رہا ہے۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ!

* بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تمہارے متعلق اُن کا خوف آپس میں بہت شدید ہے مگر اس سے مطلب کافی طور پر مربوط نہیں ہوتا۔

تو انکو مجتمع اور متحد دیکھیگا لیکن اُنکے دل ایک دوسرے سے جُدا ہو چکے ہیں یہ اسلئے کہ ان لوگوں میں سلیقۂ اتحاد نہیں، انہیں عقل نہیں۔ یہ متحد قلوب کو کیا جانیں۔ اور ایک نصب العین پر قائم ہونے کی قوت کو کیا سمجھیں۔

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِن تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ (۴: ۱۰۴)

اے ایمان والو! دشمن قوم کی تسخیر و تعاقب میں نرم نہ پڑ جاؤ، اگر لڑائی میں تم کو تکلیف پہنچ رہی ہے تو جیسے تم کو پہنچتی ہے انکو بھی پہنچ رہی ہے، اور تم کو تو خدا سے وہ وہ امیدیں ہیں جو انکو ہرگز ہرگز نہیں۔ اور اللہ طرفین کے سب حالات سے اور قتال کی حکمت عملی سے خوب واقف ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ۝ الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ (۸: ۶۵-۶۶)

اے پیغمبر! ایمان والوں کو دشمنانِ خدا کے برخلاف لڑنے پر برانگیختہ کیا کرو۔ ایمان والوں کی قوت تو بقدر زبردست ہی کہ اگر تم میں سے برداشت کرنے والے بیس مومن بھی ہوں تو وہ مخالف فریق کے دو سو نفر پر غالب رہیں گے، اور اگر تم میں سے ایسے سو ہوں تو کفار کے ہزار نفر پر غالب رہینگے یہ اسلئے کہ یہ قوم ایمان کی غلبہ فرما طاقت کو سمجھتی ہی نہیں۔ اس وقت اللہ نے اپنے حکم کا بوجھ تم پر سے ہلکا کر دیا ہے، اور محسوس کیا ہے کہ ابھی تم میں کمزوری و سائل باقی ہے۔ تو اس کمزوری کی حالت میں بھی تم میں سے ایک سو صابر ہونگے تو وہ دو سو دشمن نفر پر غالب رہیں گے، اور اگر ایک ہزار ہونگے تو وہ دو ہزار پر غالب رہیں گے، اور اللہ تو مستقل مزاج لوگوں ہی کا ساتھی ہے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۝ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ ۝ وَإِنَّ

؎ یہاں صبر کے مطالب اسقدر صاف ہوگئے ہیں کہ اسکے بعد کسی مزید تشریح کی حاجت نہیں رہتی۔ قوم لَّا يَفْقَهُونَ کے الفاظ یہاں پڑھتے ہیں اور مقصود یہ ہے کہ یہ لوگ صبر کے غلبہ فرما نتائج کو نہیں سمجھتے۔ ان آیات میں صبر کو ایمان پر محمول کیا ہے (حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ) گویا ایمان کی ایک شق صبر بھی ہے لیکن جو اہم نتیجہ ان آیات کے مطالعے سے نکلتا ہے یہ ہے کہ جو قوم اس نسبت کے اندر اپنے سے کم تعداد قوم سے پھر بھی شکست کھا گئی وہ بکفر صریح انتہائی کفر پر کہ اپنے سے دس گنا سے شکست کھائی لیکن اگر اپنے سے نصف تعداد سے پچھڑ جائے تو یہی کافر ہے۔ انتہائی ایمان یہ ہے کہ ایک مومن دس کو پچھاڑ دے لیکن اگر ضعف کی حالت میں دو کو بھی ہرا سکے تو ایمان کا کچھ نہ کچھ دعویدار ضرور رہتا ہے۔ گویا کفر کی ایک اہم شق بمنشاء قرآن بزدلی اور نامرادی ہے، میدان جنگ سے بھاگنا ہے! لمبی داڑھیاں رکھنے یا شرعی پاجامے پہننے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک کافر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس مطلب کیلئے صفحہ ۱۶۲ کا تحت المتن بھی دیکھنا چاہیئے۔

جُندَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ؁ (۳۷: ۱۷۱-۱۷۳)

اور لوگو! ہمارے پیغامبر بندوں کے حق میں ہمارا پہلے ہی ارشاد ہو چکا ہے کہ ہمارے ہاں سے ضرور انکو مدد دیجائے گی، اور بیشک ہمارے بندوں کی فوج ضرور غالب آکر رہے گی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ۝* (۴۱: ۳۰-۳۲)

بیشک جن لوگوں نے خدا کو اپنا آقا مان لیا اور پھر اُس پر تندہی اور استقلال سے جمے رہے، اُن پر ہماری رحمت کے علمبردار فرشتے نازل ہو کر اُن سے کہتے ہیں کہ اے خدا کے خاص بندو! دنیا کے مصائب اور دشمن کے ہجوم کو دیکھکر کچھ اندیشہ مت کرو اور غم نہ کھاؤ بلکہ اپنے تحمل اور استقلال کے صلے میں بہشت کی، جسکا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، خوشیاں مناؤ۔ خدائے عزوجل فرماتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں ہم تمہارے مددگار ہیں اور آخرت میں بھی تمہارا ساتھ نہ چھوڑینگے۔ اور تمہارے لیئے دنیا اور آخرت دونوں جگہ میں (فِیْهَا) جو کچھ تمہارا جی چاہے گا ملیگا، اور جو کچھ بھی طلب کرو گے حاضر کیا جائے گا۔ غفور و رحیم خدا کے ہاں سے یہ تمہاری مہمانی ہے۔

---

† ان آیات اور بعد کی آیات سے صاف ظاہر ہے کہ دنیاوی تمکن اور ارضی تغلب کا ایمان والوں کے شامل حال ہونا قطعی ہے۔ اس موقع پر گرچہ "عِبَادِنَا الْمُرْسَلِیْنَ" کے الفاظ آئے ہیں مگر بعد کی آیتوں میں یہ قید اُٹھا دی گئی ہے۔ "مَنْ یَّنْصُرُهٗ" کی نصرت سے بعض عافیت پسند اور کاہل مسلمانوں نے یہ غلط نتیجہ نکالا ہے کہ صرف پیغامبر ہی مظفر و منصور ہو سکتے ہیں یا وہ مومن جو اُن کی معیت میں خدا کی لڑائیاں لڑتے ہیں۔ بعد کے مومنوں کیلئے "اَعْلَوْنَ" بنکر رہنے کی کوئی شرط نہیں وہ صرف زبانی ایمان سے "مومن" کے درجے تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہ بجز اس کے ایک تاویل اسقدر مضحکہ انگیز ہے کہ اسکے لیئے کسی رد کی ضرورت نہیں۔ فتح و نصرت کا سلسلہ دنیا میں روز اول سے لگا ہے اور روز قیامت تک جاری رہیگا۔ کاہل قومیں اسیطرح کے مکر بنا بناکر اپنے نفس کو دھوکہ دیتی ہیں۔ "اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ" کا محاکمہ اسقدر صاف اور ناقابل تاویل ہے کہ اسکے بعد کسی مکر و حیا کی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن یہ بحث و تمحیص چوتھی اور پانچویں مجلد کے لیئے وقف کر دی گئی ہے۔

* ان آیات سے ظاہر ہے کہ ایمان والوں کی دنیا بھی درست ہو اور آخرت بھی۔ "قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ" سے مراد صرف منہ سے کہنا نہیں بلکہ خدا کو دل سے اپنا حاکم اعلےٰ ماننا، اور اسکے احکام کی نہایت تندہی سے تعمیل کرنا ہے۔ "مَلٰٓئِكَة" سے یہاں پر بحث نہیں مگر اسقدر ضرور ظاہر ہے کہ "مَلٰٓئِكَة" خدائے عظیم کی وہ مخلوق ہے جو فتح و نصرت کا پروانہ اس دنیا میں لیکر پہنچتی ہے۔ جو قوم "لَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ" کی مصداق ہے، جسکو اس دنیا میں قوت اور امن نصیب ہے، جو دشمن کے خوف و حزن سے نجات پا چکی ہے اس پر خدا کے ملائکہ کا نزول ہو رہا ہے۔ رہی یہ بات کہ کیونکر نزول ہوتا ہے، اسکی تشریح میں ابھی دیر ہے۔ "نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ" کے جملے سے ظاہر ہے کہ فِیْهَا کی ضمیر کا مرجع "الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا" بھی ہے۔

إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ۝ * (۴۰: ۵۱)

اے لوگو! بگوشِ دل سُن رکھو کہ ہم اپنے پیغامبروں، اور اُن لوگوں کی جو سچے دل سے ہمارے خدا ہونے پر ایمان لے آتے ہیں مدد کرتے ہیں، ان کو غلبہ عطا فرما کر رہتے ہیں؛ اور یوم قیامت کو بھی اُن کی تائید کریں گے۔

ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا كَذَٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنجِ الْمُؤْمِنِينَ ۝ ** (۱۰: ۱۰۳)

اے لوگو! پھر جس دن ہمارے عذاب کا وعدہ آپہنچا ہے تو ہم اپنے پیغامبروں، اور ایمان والوں کو عذاب کی شکست سے نجات دیتے ہیں۔ یہی ہمارا قانون ہے اور ہم نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ ایمان والوں کو ہر نوع نجات دیں۔

فَانتَقَمْنَا مِنَ الَّذِينَ أَجْرَمُوا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ۝ *** (۳۰: ۴۷)

پھر اے لوگو! ہم نے مجرموں کو شکست دیکر اُن سے بدلہ لیا، اور ایمان والوں کو مظفر و منصور کرنا تو ہم پر لازم تھا۔

وَنَجَّيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝ ✱ (۴۱: ۱۸)

اور پھر اے لوگو! ہم نے ایمان والوں کو غلبہ عطا فرمایا اور اُن لوگوں کو جو ہمارا سچا اتقا کیا کرتے تھے۔

رب الافواج اور عزیز و حکیم خدا نے **ایمان** کی اِسی متقلب العمل کیفیت، **اتحادِ قلوب** کی اِسی

---

* یہاں بصراحت تمام کہہ دیا ہے کہ 'رُسُلَ' کے سوا صاحب ایمان قوم کی دنیوی فلاح یقینی ہے۔

** یہاں پھر 'رُسُل' کے ساتھ ساتھ 'وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' بھی ہے۔ اور نجات کے مطالب صاف ہو گئے ہیں کہ اس سے مراد دنیاوی تمکن ہی ہے۔ نجات کو محض 'اُخروی نجات' سمجھنا آج ناکارہ مسلمانوں نے اپنی طرف سے بنا لیا ہے۔

*** یہاں 'رُسُل' کا خاص طور پر ذکر نہیں کیا گیا۔ صرف 'ایمان والوں' کی نصرت کا حتمی وعدہ ہے بشرطیکہ وہ 'ایمان والے' ہوں۔ صفحہ ۱۱۴ آیات (۳: ۱۳۹-۱۴۲) میں غزوۂ احد کی شکست کے بارے میں خدائے عظیم نے مسلمانِ 'بھگوڑوں' کو کافر اور ظالم کہا تھا۔ گویا اگر سب کے سب صاحب استقلال ہوتے تو یہ شکست نصیب نہ ہوتی۔ یہاں پر تاکیداً اسی مضمون کو دوسری عبارت میں دُہرایا ہے اور فرمایا ہے کہ جو قوم صاحب ایمان ہو اُسکو نصرت عطا کرنا ہمارے لیے لازم ہو چکا ہے۔ خدائے عظیم کی اپنے پر یہ پابندی از روئے عدل ہے نہ از روئے احسان و امتنان! جیسا کہ بے سعی و عمل مسلمانوں نے فرض کر لیا ہے، اور آج پے در پے شکستوں کو دیکھکر حیران ہیں کہ خدا کا وعدہ کیوں پورا نہیں ہوتا!

✱ صفحہ ۱۰۵ کے متن کی آیات میں ہم نے جستہ جستہ قرآن عظیم سے وہ موقعے پیش کر دیئے تھے جس میں 'متقی' اقوام کی دنیوی فلاح اور تمکن فی الارض کا قطعی وعدہ کیا گیا تھا۔ 'اتقا' کی بعض اہم شرطیں بیان کر دی تھیں۔ اِن آٹھ موقعوں پر جو کتاب کے متن میں پیش کر دیئے ہیں صرف 'ایمان والوں' کی دنیوی فلاح کا ذکر ہے، لیکن خاص اِس آیت یعنی (۴۱: ۱۸) میں 'ایمان' اور 'تقویٰ' دونوں کو یک جا کر کے 'متقی' اور 'مومن' قوم کی دنیوی نجات کا فیصلہ کر دیا ہے۔ ایمان کی شرائط اس سے پیشتر ذکر کر دی گئی ہیں۔ اور اُن میں اور تقوے کی شرطوں میں مماثلت عیاں ہے۔ چنانچہ آگے چل کر صفحہ ۱۰ پر ثابت کیا جائے گا کہ ایمان اور اتقا قریب قریب ایک ہی شے ہیں۔

عدو شکن طاقت، اور صبر کی اِسی عزم گسل استطاعت کو مدِنظر رکھکر رسول کریم کو اطمینان دلایا تھا کہ کامیابی اسلام کیلئے **توحید** کا یہی **وحدت** انگیز ماحول، اور **ایمان** والوں کی یہی چھوٹی سی جماعت کافی ہے!

وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۚ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ○ (۸: ۶۳-۶۴)

اے پیغمبرؐ! سب سے بڑا احسان جو خدا نے تم پر کیا ہے یہ ہے کہ اُسنے مومنوں کے دل گانٹھ دیئے! اگر تم روئے زمین کے خزانوں کو خرچ کر ڈالتے تو بھی انکے دلوں میں یہ الفت نہ پیدا کر سکتے تھے لیکن وہ خدا کی مشترک عبودیت ہی تو تھی جسنے ان کو آپس میں جوڑ دیا! بیشک وہ خدا اثر زبردست اور صاحب تدبیر ہے۔ اے پیغمبرؐ اب تمہیں اللہ اور یہی مومن جو تمہارے تابع فرمان ہیں ہر ایک سے نبٹنے کے لیے کافی ہیں۔

کفایتِ خدا کا یہ عظیم الشان وعدہ عرب کے بے زر اور بیضرر نبیؐ سے اُس وقت ہوا تھا جب کہ بعثت کے چھٹے سال میں اسلام کا وہ زبردست اور تُند خو دشمن عمرؓ محمدؐ کے خُلقِ عظیم کے آگے سپر ڈال چکا تھا، اور عرب کے کُل برّاعظم میں صرف **چالیس** مرد اور **پندرہ** عورتیں ایمان لائی تھیں! مگر **اُلفت** کی دلوں کے بیچ میں چلی ہوئی نہرِ سلسبیل نے اور **طاعت** کے پیدا کیئے ہُوئے ابرِ بہار نے اِس بے نشان اور کمزور پودے کو ایک دن سر بفلک درخت بنا کر سایہ پرور اور زمیں شگاف کر دینا تھا!

مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۖ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا ۖ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ۚ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ

---

† وَاللّٰہُ اَلَّفَ بَیْنَہُمْ کے مطالب کے لیے صفحہ ۱۳۷ کے تحت المتن کو دیکھنا چاہیئے۔ مرقومہ صدر سطور میں ہم نے ان معانی کا ماحصل بیان کر دیا ہے۔ خدا کو ہم معنوں میں خدا مان لینے کے بعد اسکے ماننے والوں کا آپس میں متحد ہو جانا قطعی ہے۔ اسی حقیقت کو اصل کتاب میں توحید کا وحدت انگیز ماحول کہا گیا ہے۔ اگر آج یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی تو اسکا باعث یہ ہے کہ مسلمان خدا کو درحقیقت خدا نہیں مانتے۔

فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْکُفَّارَ
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ۝ (۴۸: ۲۹)

اے دین خدا کے دشمنو! یاد رکھو کہ محمد خدا کا بھیجا ہوا نبی ہی، اور اسی لیے تمہاری سب کارستانیوں کے باوجود بیخوف و خطر ہے! جو لوگ اُسکے ساتھ ہیں اعدائے اسلام کے حق میں بڑے سخت ہیں، آپس میں بیحد رحمدل ہیں، رافت اور محبت کی ایک نہر سلسبیل اُنکے دلوں میں بہ رہی ہی تم اُنکو دیکھوگے کہ ہمارے حضور میں کبھی گھٹنوں کے بل کھڑے ہیں، کبھی زمین پر ماتھا ٹیکے ہیں۔ گویا سراپا مطیع رہکر فضلِ خدا اور خوشنودیٔ رب العالمین کی طلبگاری میں لگے ہیں۔ اطاعت کے نشان (اَثَرِ السُّجُوْدِ) اُنکے چہروں میں (فِیْ وُجُوْهِهِمْ) عیاں ہیں (سِیْمَاهُمْ) حکمبرداری کی علامتیں اُنکی شکلوں سے نظر آ رہی ہیں۔ یہی اوصاف اُنکے توریت اور انجیل میں مذکور ہیں، یہی آج اُنکا طرز عمل ہے، وہ روز بروز اسطرح زور پکڑتے جائینگے جیسے ایک کھیت ہو جسنے پہلے زمین سے اپنی سوئی نکالی، پھر جلد بڑھا اور جلد آب سے آہستہ آہستہ زور پکڑا، پھر رفتہ رفتہ موٹا ہو کر اپنی جڑ پر سرو قد کھڑا ہو گیا۔ اب کسان ہیں کہ اپنی محنتوں کو بارآور دیکھکر باغ باغ ہو رہے ہیں، اور دشمن ہیں کہ مارے حسد کے جل رہے ہیں۔ اے لوگو! خدا نے محمد کے ساتھیوں میں سے جو سچے دل سے ایمان لائے، اور جنہوں نے تندہی سے مناسب اعمال بھی کیے (اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ) اس دنیا میں اجر عظیم دینے اور اُنکی اجتماعی واماندگیوں اور بدحالیوں پر پردہ پوشی کرنے کا وعدہ فرمالیا ہے!

---

* یہ آیۂ جلیلہ "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کی پہلی قسط ہی جو ہم نے صفحہ ۳۰ کے جواب میں 'ایمان' کی تشریح کے بعد پیش کر دی ہے گویا 'اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ' ہونا، 'رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ' ہونا، تعمیل احکام خدا میں 'رُکَّعًا سُجَّدًا' رہنا، اور سب سے اہم یہ کہ ہر دم اور ہر آن **خدا کے انعامات کی تلاش** میں لگے رہنا، **قوت اور طاقت، تمکن اور تسلط** کے درپے رہنا (یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ)؛ اور اسکے لیے وسائل تلاش کرنا ہی **ایمان اور عمل صالح** ہی۔ جو قوم دشمن کے ساتھ نہایت سختی سے پیش آ رہی ہی، آپس میں نہایت متحد اور رحمدل ہی، قانون خدا کی نہایت پابند ہی، خدا کی دنیاوی نعمتوں اور وراثت زمین حاصل کرنے کے درپے ہی اور ساتھ ہی خدا کے حضور میں اپنے آپ کو عاجز شمار کرتی ہی، وہی **اعمال صالحہ** کر رہی ہی، وہی **ایمان** کی شرطوں کو پورا کر رہی ہی، وہی حیرت انگیز سرعت سے نشو و نما پا رہی ہے، وہی اس زمین کے طول و عرض میں اسطرح پھیل رہی ہے کہ نام نہاد مسلمان آج اُسکے تمکن کو دیکھکر دنگ ہو رہا ہے، اور شدت غیظ کے باعث اپنی انگلیاں کاٹ رہا ہے۔ آہ!
لیکن خدا صرف مسلمانوں ہی کا خدا نہیں وہ رب العٰلمین ہے اور جو اُسکے قانون پر چل رہا ہے وہی انعام پا رہا ہے!

سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ اُن لوگوں نے نمازیں پڑھ پڑھکر اپنی پیشانیوں پر گٹے ڈال لیے ہیں جیسا کہ آجکل بعض سادہ لوح مسلمان اپنے ماتھوں کو زمین پر رگڑ رگڑ کر ڈال لیتے ہیں اور اس ترکیب سے "معیت رسول" اور "اَجْرًا عَظِیْمًا" (۴۸: ۲۹) کے حقدار بنتے ہیں بلکہ یہ خیر قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی **کیفیتِ قلب اور شدت اطاعت کا تمثیلی اظہار** ہے گویا یہ کہا ہے کہ اطاعت کے نشان تم اُنکے چہروں پر دیکھوگے جسطرح آج کسی کو کہا جاتا ہی کہ ذہانت و اقبال اس شخص کے چہرے پر نظر آتے ہیں۔ ہمجا تے کا داغ تک نہیں بلکہ چہرے (وُجُوْهِهِمْ) کا ہی اور تمام چہروں پر اطاعت نظر آ رہی ہی نہ صرف ماتھے میں۔ اس ہو سکی تصدیق ذٰلِکَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ سے ہوتی ہی کہ انجیل کے الفاظ نے کبھی بھی گٹوں کا ذکر نہیں کیا کیونکہ زمین پر ماتھا رگڑنا اہل کتاب کا شیوہ نماز نہ تھا۔ سیما کے معنی نشان کے ہیں چنانچہ سورۂ بقرہ میں مجاہدین فی سبیل اللہ فقرا کے بارے میں ارشاد ہی: تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ (۲: ۲۷۳) یعنی تم ایسے لوگوں کو اُنکے نشانوں سے پہچان جاؤگے (دیکھو بحث ملاحظہ صفحہ ۲۰۱) یہاں بھی گٹوں کا قطعاً کوئی ذکر نہیں اور نہ ہی گٹے ڈال لینے سے کوئی شخص مطیعِ خدا ہرگز نہیں ہو سکتا خواہ وہ گٹے تمام چہرے پر ڈال لیے ہوں! ایک قابل توجہ بات اس آیت میں لفظ مِنْهُمْ ہے جس سے ظاہر ہے کہ رسول خدا کے ساتھیوں میں سے بھی اجر عظیم کا وعدہ صرف اُنہی کو ہے جو اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے مصداق رہے، گویا کلمہ پڑھکر مسلمان بن جانا کافی نہیں بلکہ ہمیشہ عمل کرتے رہنا اور ہمہ وقت مجسمۂ ایمان بنے رہنا شرط ہے!

اطاعتِ رسولؐ

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴: ۸۰)

جس نے رسول کا حکم مانا اُس نے گویا خدا کی اطاعت کی

طاعتِ رسولؐ ، اور اُسکے منجانب اللہ ہونے کا یہ یقین تھا کہ عین اُسوقت جبکہ مردوں اور عورتوں کی ایک جماعت اس پاک نبیؐ کی امامت میں اللہ جل شانہٗ کے حضور میں ، اپنے عجز اور بینوائی کی داستان گڑگڑا گڑگڑا کر سُنا رہی تھی ، اور مُسلمانوں کے ایمان سے منوّر دل اُس بارگاہ عالیہ کی رحمت کا سماں اپنے سامنے صاف دیکھ رہے تھے ، تحویل قبلہ کا حکم ملا ! قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کو پاش پاش کر دینے والے یہ مومن مگر اس اللہ کے سچے نبیؐ کی تبدیل سمت پر اسی طرح بیچون وچرا دستہ بے شائبہ استعجاب منتقل ہو کر پھر صف بستہ ہوگئے ، اور آستانۂ خدا پر سر ٹیکنے لگے ! عرش کے دم بخود اور صف آرا فرشتے جنہوں نے اپنی مدۃ العمر طاعت ، بے اختیارانہ عبودیت اور دم مزن عبادت کے حوصلے پر ایک مرتبہ اللہ کی جناب میں انسان کو بُرا بھلا کہنے ، اور اپنی فوقیت جتلانے کی جراٗت کی تھی ، اور جنہیں خدائے پاک نے انسان کی خفت وتوہین کرنے پر ٹوک✝ دیا تھا ، اس کیفیت کو دیکھکر انگشت بدندان رہ گئے ، مگر جریدۂ رحمت کے کاتبوں کو حکم ملا کہ اس نادرۂ روزگار اُمت کے نام پر روئے زمین کی بادشاہت اور اللہ کی سب نعمتوں کی وراثت ابھی سے لکھ دی جائے !

✝ سورۂ بقرہ میں اِس عبرت آموز اور شاندار قصے کا یوں ذکر ہے ۔ ہم نے ایک لفظی ترجمہ کر دیا ہے لیکن اس کا نتیجہ خیز مفہوم تیسری جلد سے پہلے بیان نہ ہو سکے گا ۔ ملائکہ کی تشریح اور سورۂ بقرہ کا ربط پانچویں جلد میں عیاں کر دیا جائے گا :-

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲: ۳۰)

اور اے پیغمبر! ساکنانِ زمین کو وہ وقت یاد دلاؤ جب تمہارے پروردگار نے "ملٰٓئکہ" سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے فرشتو! میرا ارادہ ہے کہ اس زمین میں اپنا ایک قائم مقام بناؤں ۔ فرشتوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ! کیا حضور کسی ایسی مخلوق کو اپنا نائب منتخب فرمائینگے جو اس زمین میں فساد پھیلائے اور آپس میں خونریزیاں کرے ، حالانکہ ہم ہیں کہ رفتارِ آفرینش سے تیری تعریف میں لگے ہیں ، اور تعمیل احکام کر کے تیرا ہی بول بالا کر رہے ہیں ۔ پروردگار عالم نے جواب دیا کہ ہاں بیشک لیکن میں اپنی ان شہنشاہی مصلحتوں کا خوب علم رکھتا ہوں جنکی ماہیت تک تم نہیں پہنچ سکتے

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ† إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ۝ (۲: ۱۴۳)

اور اے پیغمبر! ہم نے کچھ عرصے کے لیے بیت المقدس کو قبلہ اسی غرض سے قرار دیا تھا کہ جب مستقل قبلے کا حکم پہونچے تو ہم اِن لوگوں کو جو رسول کی بے چون وچرا پیروی کریں، اُن سے جو سرتابی کرکے الٹے پاؤں پھر جائیں، الگ معلوم کرلیں۔ اور قبلے کا دفعۃً بدلا جانا بلاشبہ ایک اہم بات تھی مگر جن لوگوں کو خدا نے اطاعت رسول کا رستہ دکھا دیا تھا اُنکے لیے کچھ قابل اعتراض نہ تھی۔ اور خدا ایسا نہیں کہ رسول کی صداقت پر تمہارے اِس حیرت انگیز علی ایمان کو ضائع ہونے دے، وہ تو ایسے اعمال کو دیکھکر بیشک تمام عالم پر بیحد مشفق اور مہربان ہوجاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ‡ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ۝ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۝ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝ (۸: ۲۰-۲۲)

اے ایمان والو! اللہ کے احکام مانو، اور رسول کے بالمشافہ احکام کی بھی بلا حیل وحجت تعمیل کیا کرو، اور درانحالیکہ تم اسکا حکم سن رہے ہو (یعنی دیدہ و دانستہ) اُس سے سرتابی نہ کیا کرو۔ کیونکہ وہی تمہارا اولوالامر ہے۔ اور نہ تم ان لوگوں کی مانند بنو جو منہ سے ہاں کہہ چھوڑتے ہیں اور پھر حکم کی تعمیل فوراً نہیں کرتے۔ اللہ کے نزدیک بدترین حیوانات وہ ڈھیٹھ اور مچلے لوگ ہوتے ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے خواہ انکو کتنا ہی سمجھایا جائے، اور اطاعت امیر کی لم سے بیخبر ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ† إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ

---

† اِس آیۂ کریمہ سے ظاہر ہے کہ قرونِ اولیٰ میں متابعت رسول بھی فی الحقیقت ایمان کی ایک اہم شق تھی۔ رہا یہ امر کہ یہ اتباع کن معنوں میں تھا اور آج جبکہ رسول خدا صلعم موجود نہیں کیونکر ہوسکے اسکی تصریح اِسی صفحہ کے آیندہ تحت المتن میں کردی ہے۔ تحویل قبلہ کی متذکرہ صدر توضیح سے صاف ظاہر ہے کہ رسول خدا کے قدم بقدم چلنا اور بے چون وچرا اُسکے حکم کی تعمیل کرنا اُسپر ایمان لانیکے مرادف تھا یہی بات "آمنوا بہ" کے الفاظ سے ظاہر ہے جو آیہ (۷: ۱۵۷) میں آگے چلکر آرہی ہے۔ دیکھو صفحہ ۱۷۲)۔

‡ "أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ" کا آلہی مقصود مرور مدت اور نسیان درس کے باعث مسلمانانِ جہان کے ذہنوں سے اسقدر محو ہوگیا ہے کہ وہ آج اِس انحطاط کے زمانے میں شرعی رسوم اور فقہی مسائل کی ایک نمایشی سی پابندی کو ہی اطاعت خدا ورسول سمجھکر اپنے آپکو دین اسلام کے ایک اہم فریضے سے سبکدوش کررہے ہیں۔ اُنکے نزدیک صوم وصلوٰۃ وغیرہ وغیرہ ارکانِ دین کا شرعی التزام یا کتب احادیث کا مکتبی درس اور سطحی اتباع ہی اُطاعت خدا ورسول کا انتہائی مقصود ہے۔ اِسکے سوا کوئی دوسری شئے اُنکے ذہنوں میں سماتی نظر نہیں آتی، کوئی آلہی یا پیغمبری آواز آج اُن کی

يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ○ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ
ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ○ (۸: ۲۴-۲۵)

اے ایمان والو! جب اللہ اور رسول تمہیں کسی ایسے کام کے لیے بلائیں جو تمہیں زندگی اور قوت بخشتا ہے (یعنی قتال اور متعلقہ فرائض) تو تم اُنکے احکام کو بگوش دل سنو اور مستعدی سے اُنکی تعمیل کرو۔ اور خوب

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۷۰) خواب استراحت میں مُخل نہیں، کوئی امر امیر لائق امتثال و استیجاب نہیں۔ اطاعت خدا، اور اطاعتِ رسولؐ کی اصلی اور ابتدائی غرض و غایت کو عیاں کر دینے کا یہ موقع نہیں۔ یہ موضوع "اطاعتِ امیر" کے عنوان میں بالاستقلال باندھا گیا ہے جو دوسری مجلد میں آئے گا۔ مگر متذکرہ صدر آیات (یعنی ۸: ۲۰-۲۲ اور ۸: ۲۴-۲۵) سے جو یہاں پر بطور تمہید کے پیش کر دی گئی ہیں، ظاہر ہے کہ "اطاعت خدا" کا عملی منظر قرن اول میں کچھ ہی ہو، لیکن "اطاعت رسولؐ" کا مقصود نبی آخر الزمان کے عہدِ حیات میں انکے بالمشافہ احکام کی تعمیل ہی تھا۔ آیات (۸: ۲۰-۲۱) میں "وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ" اور "قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ" کے الفاظ، اور آیہ (۸: ۲۴) میں "إِذَا دَعَاكُمْ" کی قید اس دعوے کی صریح تائید میں ہے۔ گویا رسول خدا کا کسی بات کو مُنہ سے کہنا، اور صدر اسلام کے مومنوں کا بطیب خاطر اُس حکم کی فوری تعمیل کرنا، اور تنگ خدرت پیش نہ کرنا ہی "اطاعت رسول" تھا۔ صدر اسلام میں نہ کوئی حدیث کی کتابیں تھیں جن کی رسمی درس و تدریس اطاعت رسول کے مترادف تھی، نہ فقہی تصانیف تھیں جنکو عینک لگا کر پڑھ لینا، اور پڑھکر بادب تمام بالائے طاق رکھدینا اتباع رسول کے ہم معنی تھا۔ جیسا کہ آج اکثر سہل پسند مسلمانوں کا شیوہ اعتقاد ہے۔ قرن اول میں رسول خدا مسلمانوں کے قائدِ اعظم اور سپہ سالار ہونیکی حیثیت میں وقتاً فوقتاً احکام نافذ کیا کرتے تھے جو مصالح وقت کے لحاظ سے مسلمانوں کے اجتماعی فلاح کے لیے ضروری تھے، عرب کے جس جس گوشے میں ان فرامین کی صدائیں پہنچتی تھیں لوگ لبیک لبیک کرتے حاضر ہو جاتے، اور اپنا تن من دھن اس نیک سیرت سردارؐ کی خاطر قربان کر دیتے! یہ اطاعت رسول کا صحیح مفہوم تھا۔ رہا یہ امر کہ آج جب کہ رسولؐ خدا بذاتِ خود مصلحت وقت کے مطابق حکم دینے کے لیے موجود نہیں تو اطاعت رسول کا بدل کیا ہو، اور کسکے حکم کی تعمیل فرض ہے، یہ ایک علیحدہ سوال ہے جسکی تصریح اپنے موقع پر کی جائیگی مگر اس صحبت میں آیہ (۸: ۲۵) کے مطالب خاص طور پر قابل التفات ہیں جسمیں عصیان خدا و رسول کا نتیجہ وہ فتنۂ عظیم قرار دیا گیا ہے جسکی لپیٹ میں بلا امتیاز اور سے ساری کی ساری جماعت آرہتی ہے۔ یہ فتنہ لامحالہ سیاسی شکست ریخت اور اجتماعی بدنظمی ہی ہے جو امیر جماعت کی نافرمانی اور تشتت آراء سے ہر جا پیدا ہوجاتی ہے اور جو نظام کائنات کا اصل اصول ہے۔ اس نقطۂ نظر سے "اطاعت رسولؐ" اور "استجابت للرسول" کے معانی اور بھی صاف ہو جاتے ہیں اور اسلامی جماعت کی رہنمائی کے لیے ہر وقت کسی ایسے امیر کا موجود ہونا لازم و ملزوم ہو جاتا ہے جو خدا و رسول کے احکام کی تابعداری کرا سکے اور جب موقع آئے تو امت کو شکست و ریخت سے بچانے۔ "لِمَا يُحْيِيكُمْ" (۸: ۲۴) کے الفاظ بھی اس دعوے کی حتمی تائید کرتے ہیں کہ یہ لیا اجتماعی اور سیاسی قوت کا حاصل کرنا ہی تھا۔

اب رہا یہ امر کہ "أَطِيعُوا اللَّهَ" کا کیا مفہوم ہے۔ اسکا جواب اعتقاداً اور نظریۃً اگرچہ یہی رہا ہو کہ جو کچھ کلام الٰہی کے اندر لکھا ہے اُسکی پیروی کرنی اطاعت خدا ہے مگر عملی مقام نظر سے یہ بات ناممکن العمل اسلیے ہے کہ قرآن حکیم ایسے احکام و قوانین کا مجموعہ ہے جنمیں کثیر کی بیک وقت پیروی کرنی محال ہو جاتی ہے۔ ان میں سے بعض (مثلاً جہاد بالسیف اور ہجرت وغیرہ) ایسے اوامر ہیں جن کا نفاذ وقتی اور مقامی حالات و احوال کو دیکھکر ہوتا ہے اور جو لامحالہ کسی امیر کے ماتحت رہکر ہی ہو سکتے ہیں۔ اسی بنا پر بھی مسلمانوں کی اُمت کا کسی ایک "ولو الامر" کے اذن میں رہنا از روئے قرآن ضروری ہے۔ مگر رسولؐ خدا کے عہد حیات میں اطاعت خدا سے مراد عملاً رسول خدا کے احکام کی تعمیل ہی تھی خواہ وہ احکام بالمشافہ اور مصلحتی تھے یا بذریعہ وحی خدا کے ہاں سے پہنچتے تھے، حتیٰ کہ سورۂ نساء میں "مَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ" (۴: ۸۰) کہہ کر اطاعت خدا کو فی الحقیقت اطاعت رسول میں مدغم کر دیا ہے۔ گویا قرون اولیٰ کے عرب بارگاہ خداوندی سے حکم ہوتا ہے کہ جس شخص نے رسول خدا کے کہے کو بلا چون و چرا مانا اُسنے فی الحقیقت خدا ہی کے کہے کو مانا۔ پس "أَطِيعُوا اللَّهَ" کا مفہوم صدر اسلام میں اطاعت رسول ہی تھا۔ اس کُلیے کی تائید "وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ" (۸: ۲۰) اور "إِذَا دَعَاكُمْ" (۸: ۲۴) کی واحد غائب ضمیروں سے بھی ہوتی ہے

سمجھ لو کہ اللہ آدمی اور اُسکے دل کے درمیان حائل ہے، اور جو کچھ اُن کے درمیان بخت وپز ہوتی ہے
اُسکو خوب جانتا ہے۔ یہ بھی جانتے رہو کہ تم ایک نہ ایک دن اُسکے حضور میں حاضر کیئے جاؤ گے۔ اور اُس
اجتماعی موت سے ڈرتے رہا کرو جو امیر جماعت کی حکم عدولیوں اور داخلی فتنہ و فساد سے بالآخر
پیدا ہوتی ہے اور جو خاص کر اُنھی لوگوں پر نازل نہیں ہوگی جنھوں نے تم میں سے سرتابی کی ہے؛
بلکہ تم سب اُسکی زد میں آجاؤ گے، اور جانتے رہو کہ اللہ کی مار بڑی سخت ہے۔

فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (۷: ۱۵۷)

تو جو لوگ اِس رسول کی صداقت اور منجانب اللہ ہونے پر ایمان لائے، اور اُنکی حمایت کی، اور اُن کو مدد
دی، اور بعینہ جو راہ ہدایت اُنہوں نے اِس نور عظیم (قرآن) کے ذریعے سے دکھلائی جو اُن کے ساتھ
اُترا، یا جو اُن کے قلب میں تھا، اُسکی متابعت کرتے رہے تو بھی وہ لوگ ہیں جو اِس دنیا میں کامیاب ہونگے۔

آہ! یہ وہ صادق النّیۃ متابعت، اور وہ محیّر العقل اطاعت امیر تھی جو مومنوں کے بے مثال ائتلاف قلوب اور طہارتِ نفس کا نتیجہ تھی؛ یہ وہ کرشمۂ اتحاد و عمل تھا جس کا قطعی اور حتمی باعث حسنات نفس اور اتقائے خدا تھا؛ یہ وہ محتبانہ اتقا، اور مقامِ خدا کا ہول تھا جس کا محرک اصلی وجودِ خدا کا یقین اور اُسکی خالص عبادت تھی: فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ ۝ أَلَا لِلّٰهِ الدِّينُ الْخَالِصُ ۝ (۳۹: ۲-۳)؛ یہ وہ غیر

؎ تو خالص خدا ہی کی فرمانبرداری مدنظر رکھ کر اُسی کی خدمت کیا کرو۔ دیکھو سچی خدمت گذاری خدا ہی کے شایاں ہے۔

(تتمہ تحت المتن صفحہ ۱۷۱) جن کا مرجع رسول ہی ہے، تثنیے کی ضمیروں کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لیکن ان باتوں سے قطع نظر، آیہ (۸: ۲۵) میں ظَلَمُوا کا لفظ سب سے زیادہ قابل غور ہے۔ مقدمہ کتاب میں کئی جگہ (مثلاً صفحہ ۸۱، ۹۶، پر) اس قرآنی اصطلاح کی جامعیت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ ان آیات (یعنی ۸: ۲۴-۲۵) سے صاف ظاہر ہو کہ شارع کائنات کی نگاہوں میں امیر جماعت کی نافرمانی کرنا ظلم ہے اور اسکا نتیجہ عذاب خداوند اجتماعی شکست ہی ظلم کے معانی کی یہ دوسری قسط ہے جو ضمناً یہاں پر ادا کر دی گئی ہے۔ پہلی قسط صفحہ ۱۲۰ کی آیہ کریمہ (۳: ۱۳۹) کے تحت المتن میں ادا کی تھی جہاں بتلایا گیا کہ جو قوم بزدل ہو کر میدان جنگ میں لڑتی ہے وہ رب زمین و آسمان کی نظروں میں ظالم ہے۔

☆ ان آیات کے مطالب پر غور کرنیکے بعد لفظ 'دِین' کے معانی اور بھی صاف ہو جاتے ہیں جو صفحہ ۱۶۱ کے تحت المتن میں بیان ہوئے۔ 'لِلّٰهِ الدِّينُ الْخَالِصُ' کا مقصود یہی ہے کہ انسان کا سب سعی و عمل (الدِّینُ) خالصۃً (الخالص) خدا ہی کی رضا میں وقف (لِلّٰہ) ہو، سب خالص فرمانبرداری (الدِّینُ الخالص) خدا ہی کی ہو ماسوا کی نہ ہو، سچے دل سے اطاعت (الدِّینُ الخالص) اُسی احکم الحاکمین کی ہو، خالص راہِ عمل (الدِّینُ الخالص) خدا کے لیے مخصوص کر دیا جائے گویا 'دِین' کے معنی 'راہِ عمل' کے ہیں اور یہ طرزِ عمل ہی خدا کی نظروں میں کسی شخص کا 'چلن' یا 'مذہب' یا 'دین' ہو سکتا ہے۔ اعتقادی یا نظری 'دین' کے معنی خدا کی نگاہوں میں کچھ نہیں، جیسا کہ آج کل بعض خوش اعتقادوں نے دین اسلام کو سمجھ لیا ہے۔ مزید تشریح کیلئے اردو دیباچے کے پہلے صفحوں پر غور کرنا چاہیئے۔

محلل اور منکر ماسوا توحید تھی جسنے دل کی اقلیم پر خدائے برتر کی کامل حکومت قائم کر کے انسان کو تسلیم کا خوگر اور قانون آلٰہی کا پابند کر دیا تھا: فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗ اَسْلِمُوْا ؕ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِى الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝[51] (۲۲: ۳۴-۳۵)؛ اور یہ وُہ ادب آموزِ باطن، ماحیٔ نفس، مبطلِ کذب، اور محرک اعتصاب اسلام تھا جسکا واحد منتہائے نظر تقویتِ قوم اور استحکام جماعت تھا۔ خدائے جل و علےٰ کو اسکے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بندوں اور نطفۂ منی سے پیدا کیئے ہوئے انسان کے رسمی سجدوں، ظاہری عبادتوں، قربانیوں اور پیسوں کی مطلق حاجت نہ تھی: وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝[52] (۳: ۹۶)۔ وہ اِس ہیچمیرز بشر کے ترک اولاد اور ترک وطن، ایثارِ مال و ایثار جان سے قطعی بے نیاز تھا۔ اسکو اس فرد مقدار اور بے حقیقت انسان کی نصرت کی کچھ خواہش نہ تھی: وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ † ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝[53] (۶: ۲۹)؛ وہ اگر چاہتا تو ایک آنکھ کی جھپک میں سرکش اور متمرد انسان کو فطرت کی زمیں پاش طاقتوں کے قابض ارواح ملائک، اور طبیعت کے عالم آشوب حوادث کے علمبردار مصیطروں کو ایک اشارہ کر کے مکھی یا مچھر کی طرح مسل ڈالتا:

وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ۝ وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ۝ (۳۶: ۶۶-۶۷)

اور اگر ہم چاہیں تو فوراً ان سب کی آنکھوں سے بینائی اچک لیں اور پھر یہ رستے کی طرف دوڑیں تو کہاں سے دیکھ پائیں، اور اگر ہم چاہیں تو یہ جہاں ہیں وہیں انکی صورتیں اور طاقتیں مسخ کر دیں پھر نہ تو یہاں سے آگے جانا ہی بن پڑے اور نہ لوٹتے ہی بن پڑے۔

---

[51] تم سب کا خدا بھی خدائے واحد ہے پس اُسیکے احکام کی تعمیل کیا کرو اور اُسی کے آگے سر تسلیم خم کرو۔ اور اے پیغمبر! تم ہماری طرف سے ہمارے حضور میں عاجزی سے رہنے والے بندوں کو بشارت دو کہ ہم انکی خدمت سے خوش ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تعمیل احکام نہیں کرتے، جب اللہ کا نام اُنکے آگے ذکر کیا جاتا ہے تو انکے دل لرز اٹھتے ہیں اور اُنکی حالت یہ ہے کہ جو جو مصیبتیں بھی اُن پر آن پڑتی ہیں بطیب خاطر برداشت کرتے ہیں اور پہروں میں پانچوں وقت ہمارے سامنے ماتھا رگڑتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انکو دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ [52] اور جو کوئی خدا سے منحرف ہوا تو اللہ وہ غنی ذات ہے کہ تمام جہان سے بے نیاز ہے۔
[53] اور جس نے تکلیفیں سہیں اور جہاد کیئے، سعی و عمل کیا اور مصائب کا مقابلہ کیا سو وہ کچھ اپنے ہی بھلے کے لیئے کرتا ہے ورنہ خدا تو تمام عالم سے قطعاً بے نیاز ہے، اُسکے واسطے کسی کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔

---

† اس ذاتی مفاد اور لِنَفْسِهٖ کی تشریح عنقریب آئندہ صفحوں میں آئے گی۔ (دیکھو صفحہ ۱۸۰-۱۸۱)

مگر اسکی شانِ عاطفت اور کبریائی اِس بات کی مقتضی تھی کہ وہ انبیائے کرام اور کتابِ وحی کے ذریعے سے اُس ظلوم و جہول انسان کو جسنے فہم و ادراک کی امانت اپنے ذمّے لیکر (۳۳ : ۷۲) اور حیوانوں کی نسبت اپنے آپ کو قانونِ فطرت سے قطعی بے خبر کر رکھا ہے، جسکے ایک حد تک صاحبِ اختیار ہونے کی وجہ سے اسکو اپنی راہِ عمل میں ہر قدم پر لغزش کا سامنا ہے، جو آپ صاحبِ ارادہ ہونیکے باعث اپنے مالکِ حقیقی کے ارادے سے طبعًا نا آشنا ہے، جسکے صاحبِ تدبیر ہونیکے جرم میں فطرت نے اُس کو اپنے پاس سے کوئی ہدایت نامہ یا طرزِ عمل مہیا نہیں کیا، جسکے فساد فی الارض کی اور خونریزی کی داستانیں، جسکے ظلم و ستم اور تمرّد، نفس پرستی اور خودپسندی کی حکایتیں، اسکی نشاءِ اوّل سے پہلے ہی، زمین و آسمان کی حکمبردار قوتوں، اور مقدس فرشتوں کے بزبان ہو چکی تھیں، جو آج اپنے علم و عقل کے غرور اور ہوش و تمیز کے گھمنڈ میں کتابِ خدا حتّٰی کہ وجودِ خدا کا بھی متکبرانہ انکار کر رہا ہے؛ اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ (۳۶ : ۷۷)[۵۱]، جو اپنی تجربہ پر نازاں، اور اپنی سعی و عمل پر فریفتہ ہو کر قدرت کی قاہر اور جابر روحانی قوتوں، اور کارخانہ جہاں کے اٹل اور عدیم المثال اخلاقی اصولوں کی معاندانہ روک اور تسخیر کے درپے ہے: فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۡ ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ ۭ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳۹ : ۴۹)[۵۲]، ہاں وہ کتابِ وحی کے ذریعے سے اِسی ظلوم و جہول انسان کو فطرت کے عالم آرا اخلاقی اور احسانی، مادی اور روحانی قانون سے باخبر کر کے، ابدالآباد تک بےخوف و خطر، اور قوت و استقامت سے رہنے کے قابل بنا دے، وہ اُسکی قوائے مُدرکہ کے سامنے **فطرت** کی کتابِ مبین کا فوری اور تیار ملخص پیش کر کے کارگاہ

---

۵۱ کیا انسان کو معلوم نہیں کہ ہم نے اُسکو گندے پانی سے پیدا کیا پھر بھی کھُلم کھُلا ہمارا مخالف بنا رہتا ہے اور ہماری نسبت باتیں بنانے لگا ہے، اپنی اصل کو بھول گیا اور کہتا ہے کہ بھلا گلی سڑی ہڈیوں کو کون از سرِ نو زندہ کرے گا۔

۵۲ انسان کی عادت ہے کہ جب اُسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارنے لگتا ہے۔ پھر جب اسکو کوئی نعمت ہم بطور احسان عطا فرماتے ہیں تو کہنے لگتا ہے کہ یہ تو مجھے میری ذاتی لیاقت کی وجہ سے (یعنی سمع و بصر اور ذہن سلیم کے صحیح استعمال کے باعث (علیٰ علم کا ترجمہ دیکھو صفحہ ۸۳) ملی ہے۔ اے ناسمجھ انسان! یہ نعمت تو آزمائش کے طور پر ہی ہے کہ ہم دیکھیں کہ تو اسکا جائز استعمال کہاں تک کرتا ہے لیکن افسوس کہ انہیں سے اکثر لوگ ہماری فیاضی کے قانون کا علم نہیں رکھتے۔

قدرت کے عظیم الشان اور ممتنع الحصول اسرار سے آگاہ کردے : تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ (۲-۱:۲۷)، الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ؕ كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ؕ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ؕ (۸-۴:۹۶)؛ وہ اسکے محدود اور ناقص علم پر حکیم حقیقی کی لامتناہی حکمت کے مہتم بالشان سرائر و خفایا کا اضافہ کرکے اُسکو حفظ نفس اور اجتماعی استحکام کے اٹل اصول سکھلا دے، وہ اسکے جزوی اختیار کے بالمقابل قادر مطلق کی ناپید اکنار قدرت اور استطاعت کی علمی سرحد مقرر کرکے، بنی نوع انسان کو تجاوز کے نفس کُش عمل، اور عدوان کے ضبط شکن فعل سے روک دے : تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۲۲۹:۲)؛ وہ اُن کو نظم و نسق کا طبعی اور صحیح طریقہ سکھلا کر، ان کے اعمال میں فطری صلاحیت، اور عزائم میں لازوال استقامت بخش دے، وہ انسان کے تنگ افقِ نظر کو کتاب خدا کے اٹل فیصلوں، اسکی فقید المثال ہدایت اور بشارت، برکت اور رحمت، علم اور حکمت، نور اور شفا کی وساطت سے وسیع تر کرکے اقوامِ عالم کے تمکن و بقا کا مسئلہ سہل تر کردے : وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔ (۵۲:۷)۔ وہ الغرض انسان کی دینی اور دنیاوی، انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کو اعتدال کے زریں اصول، صلاحیت کی محکم

لہ یہ قرآن کریم کی آیات ہیں اور اس کتاب مبین کے احکام ہیں جو ہر شخص کے پیش نظر ہے۔ ایمان والوں کے لیے یہ احکام سر تا سر ہدایت اور بشارت ہیں۔

ٹہ خدا وہ پاک ذات ہے جس نے ظلوم و جہول انسان کو کتاب ہی کے ذریعے سے (بالقلم) وہ عظیم الشان حقائق سکھلا دیئے جو اس سے پہلے وہ ہرگز نہیں جانتا تھا۔ نہیں نہیں، درحقیقت انسان کی کمال سرکشی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہدایت سے بے نیاز سمجھتا ہے اور اگر وہ بنظر عمیق دیکھے تو وہ اسقدر محتاج ہے کہ ہر بات میں اُسکو اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنے کی حاجت ہے۔

ٹلہ یہ قانون فطرت ہے، اور یہی اسکی مقرر کی ہوئی حدود ہیں، پس ان سے تجاوز نہ کرو، حدود سے آگے نہ بڑھو۔ اور جس قوم نے خدا کی حدود سے تجاوز کیا وہی ظالم ہے۔

ٹکہ اور ہم تو ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لائے ہیں جس میں ہم نے ہر اہم امر کی تفصیل اپنے علم کے ذریعے سے کر دی ہے۔ ایمان والی قوم کے حق میں اسکے احکام سر تا سر ہدایت اور رحمت ہیں۔ (دیباچہ تشریح صفحہ ۸۸ کے متن اور صفحہ ۸۹ کے تحت المتن میں آچکی ہے)

---

* کِتَابٍ مُّبِيْنٍ کی ضمنی تشریح مقدمہ کتاب میں صفحہ ۲۱، ۲۲ پر گذر چکی ہے جہاں اس آیت کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

* یہاں ظالمون کے متعلق فیصلہ کر دیا ہے کہ جو قوم قانون فطرت کی حدود سے تجاوز کرے وہ شارع کائنات کی اصطلاح میں ظالم ہے۔ اور آیہ (۲: ۳۴) صفحہ ۸۱ کے مطابق ہلاکت کی اہل۔ ظالمون کے معانی کے متعلق یہ تیسری قطعی جزم ہے جو ہم نے لوا کر دی ہے۔ پہلی دو قطعیں یعنی فتنہ فی القتال اور عصیان امر صفحہ ۱۲۷ کے تحت المتن میں آچکی ہیں۔ * قرآن حکیم کے متعلق صفحہ ۸۸–۹۰ کے تحت المتن کی آیات کی طرف اشارہ ہے۔

سطح، اور اتفاق و اتحاد کی استوار زمین پر لاکر انکی جماعت کو پیش از وقت شکست کے **خوف** سے قطعی نجات اور بیوقت **فنا** سے عملاً مامون و مصئون کر دے!

قَدْ جَآءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَٰبٌ مُّبِينٌ ۝ يَهْدِى بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَٰنَهُۥ سُبُلَ السَّلَٰمِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَٰتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِۦ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝† (۵: ۱۵-۱۶)

اے باشندگانِ زمین! پروردگارِ عالم کی طرف سے تمہیں وہ نور اور واضح کتاب آچکی ہے جسکے ذریعے سے خدا اُس قوم کو جو منشائے ایزدی کی متابعت کرتی ہے، قیام فی الارض اور سلامتی کے رستوں پر لے جائیگا، اُنہیں اپنے فضل و کرم سے جہالت اور ناعاقبت اندیشی کی ظلمتوں سے نکالکر علم اور حفظ نفس کے نور کی طرف لائیگا، اور انہیں اس نعمتِ عظمیٰ کے سیدھے رستے پر ڈال دیگا!

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَٰبَ تِبْيَٰنًا لِّكُلِّ شَىْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ۝ (۱۶: ۸۹)

اور اے محمدؐ! ہم نے تم پر یہ کتاب اِس پایہ کی نازل کی ہے کہ اسمیں انسان کے متعلق تمام اصولی قواعد کا مفصل بیان موجود ہے۔ اور تسلیم و عمل کرنے والی قوم کے لیئے تو یہ سرتاسر ہدایت ہی، رحمت ہی اور سلامتی اُمم کی بشارت ہی!

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِى هَٰذَا الْقُرْءَانِ مِن كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِى عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ (۳۹: ۲۷-۲۸)

اور ہم نے تو کافۃ الناس کو راہ ہدایت اور طریق عمل جتلانیکے لیئے اِس قرآن میں ہر ممکن حالت کو پیش نظر رکھکر مثالیں بیان کر دی ہیں تاکہ لوگ اُن سے نتائج اخذ کر سکیں۔ اسی وضاحت کے لحاظ سے ہم نے اسکو عربی زبان میں کر دیا ہی۔ اسمیں کسی طرح کی پیچیدگی یا منطق کی کجی نہیں رکھی۔ اور یہ سب اِس لیئے

---

† آیہ (۵: ۱۵) کے متعلق بحث صفحہ ۹۲ کے تحت المتن میں گذر چکی ہے۔ سُبُلَ السَّلَٰمِ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ قرآن حکیم کا منتہا اقوام عالم کو تمکن فی الارض اور حفظ نفس کے اصول سکھلانا ہے۔ ظُلُمَٰتِ کا صحیح مفہوم بھی جہالت اور عدم تعقل قانونِ خدا کی تاریکیوں کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مقدمہ کتاب میں ثابت کر دیا گیا ہے کہ قرآن کا مطمح نظر لئے اشیاء اور اسکا علم ہی ہی اور یہی بات آیہ (۲: ۱۹) سے ظاہر ہے جو صفحہ ۱۵ کے متن میں آچکی ہی۔ "روحانی ظلمتوں" اور "روحانی نور" کا ذکر جو بعض ناقرآن شناس مسلمان کرتے ہیں ایک بے معنی سی اور بے نتیجہ بات ہی صفحہ ۸۸ کی آیت (۲: ۱۱۷) بھی انہی معانی کی مؤید ہی... پر مکمل بحث بعد میں ہوگی۔ ضمناً ان آیاتِ کبریٰ سے یہ بھی مستنبط ہوتا ہی کہ سُبُلَ السَّلَٰمِ یعنی حفظ نفس کی راہوں پر چلنا اور جہالت کی ظلمتوں سے نکلکر علم کی منور راہوں پر گامزن ہونا ہی صراطِ مستقیم ہی۔ صفحہ ۳۰، ۹۴ اور ۹۵ کے حواشی میں کسی قوم کا علم کی حقیقت نما راہوں پر چلنا سبیل خدا پر چلنے کے مترادف قرار دیا گیا تھا، اور قریب قریب یہی مضمون ان آیات میں ہی۔ صراطِ مستقیم کے مکمل مفہوم بیان کرنے میں ابھی کچھ دیر ہی مگر اسکی پہلی قسط یہی ہے کہ اُمّت اجتماعی **خوف** (دیکھو مسئلہ انتقامات المتن صفحہ ۱۲) کے ماحول سے نکلکر سلامتی اور امن کی راہ پر قدم بڑھائے، اور جہالت کی قیود سے آزاد ہوکر علم کے جہاں کشا نور سے مزین ہو۔ یہ ہی صراطِ مستقیم ہی جس کی درخواست ایک دن میں پانچ وقت خدا کے حضور میں ہوتی ہے: اِهْدِنَا الصِّرَٰطَ الْمُسْتَقِيمَ (۱: ۵) اے خدا ہم کو صراطِ مستقیم یعنی سیدھی راہ پر چلا۔

کہ لوگ اِن مشرح احکام کو سُنکر اتقا پیدا کریں، بربادی سے بچیں۔ اور حفظِ نفس اختیار کریں۔ تیسری مثال:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝ يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِنْكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي ۙ فَمَنِ اتَّقَىٰ† وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۷: ۳۴-۳۵)

اور ہر ایک قوم کے صفحۂ ہستی سے مٹنے کی ایک میعاد مقرر ہے۔ پھر جب اُنکی تباہی کے اسباب مکمل ہو چکتے ہیں تو اُس سے ایک گھڑی نہ پیچھے رہ سکتے ہیں، نہ ایک گھڑی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ پھر اگر اسوقت کوئی عذر پیش کرے گا تو ہم کہیں گے کہ اے بنی آدم ہمنے تمہیں پہلے ہی کہدیا تھا کہ جب کبھی ہماری طرف سے تم ہی میں سے ہمارے قاصد تمہارے پاس پہنچیں اور ہمارے احکام تم پر واضح کردیں۔ تو جو قوم ہلاکت سے دامن بچا کر چلی اور جسنے اپنی حالت کی اصلاح کرلی، اُنکو اس دنیا میں کسی قسم کا خوف و خطر لاحق نہیں ہوگا۔

بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ‡ ۝ (۲: ۱۱۲)

اصل تو یہ ہے کہ جسنے اپنے آپ کو ہمہ تن قانون خدا کے سپرد کردیا، اور اسکے بتلائے ہوئے پسندیدہ عمل کیے تو اسکا اجر تو اس شخص کو اُسکے پروردگار کے ہاں سے ملیگا لیکن وہ قوم دنیا میں بے خوف و خطر ہے!

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ

---

† یہ آیت مسئلہ ارتقا کے تحت متن صفحہ ۱۳ میں آچکی ہے مگر وہاں پر ۱ اتّقٰی' اور ۲ اَصْلَحَ' کے صحیح مفہوم کو ملتوی کردیا گیا تھا۔ اس وقت تک ۱ اتقا' کے اصلی مفہوم کی کئی شقیں ظاہر ہو چکی ہیں، مثلاً اُمّت واحدہ بننا (آیہ ۲۳: ۵۲، صفحہ ۴۹)، باہمی اخلاص قائم رکھنا (آیہ ۳: ۹۹، صفحہ ۱۵۰)، ایک دوسرے کو استقلال کی تلقین کرنا (آیہ ۳: ۱۹۹، صفحہ ۱۵۰)، تفرقہ نہ پیدا کرنا (آیات ۳: ۱۰۱-۱۰۲، صفحہ ۱۴۴)، محتاجین الغرض یقین کرانا (آیہ ۱۰: ۴۹، صفحہ ۱۶۰)، آیندہ مصائب کے لیے پیش از وقت تیاری کرنا اور حفظ نفس کے لیے مستعد رہنا (آیہ ۱۰: ۱۵۹، صفحہ ۱۶۲) وغیرہ وغیرہ سب اعمال ۱ اتقا' میں داخل ہیں۔ جس قوم میں یہ خاصیتیں بدرجۂ اتم موجود ہوں گی وہ از روئے قرآن 'فَمَنِ اتَّقٰی' کا مصداق ہے۔ اور اس دنیا کے اندر 'وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ' کا مصداق بننا بھی اُسیکا حصہ ہے۔ ۲ اَصْلَحَ' کی تشریح بھی کچھ کچھ ہو چکی ہے۔ مثلاً 'رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ' والی آیت (۴۸: ۲۹، صفحہ ۸۱) کے متن میں، اور ان آیتوں میں جو مقدمۂ کتاب میں صفحہ ۳، ۸۰، اور ۱۵۹ پر ہو چکی ہیں۔

‡ 'اسلام' اور 'احسان' کا ذکر جو اس آیت میں آیا ہے وہ در اصل 'اتقا' اور 'اصلاح' ہی کے دوسرے نام ہیں جیسا کہ کچھ دیر بعد عیاں کردیا جائے گا۔ اسی لیے 'مُسْلِم' اور 'مُحْسِن' قوم ہی دنیا میں بے خوف و خطر ہے۔ بَلٰی سے رَبِّہٖ تک واحد کی ضمیر استعمال کرنا اور بعد ازاں 'عَلَيْهِمْ' اور 'يَحْزَنُونَ' میں جمع کی ضمیر لانے کا مقصود یہ ہے کہ ہر متنفس کو اُسکے ذاتی عمل کا اجر آخرت کی صورت میں واضح ہو جائے (فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ) اور جس قوم کا وہ رکن ہو اُسکا دنیاوی اجر 'لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ' کی صورت میں ہویدا ہو۔ حق یہاں بھی اجتماعی موصول ہے جسکی ایک مثال صفحہ ۴۳ پر گذر چکی ہے۔

فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ (۵: ۱۱)

اے ایمان والو! اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جب ایک دشمن قوم نے تم پر اپنا دست تعدی
دراز کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اور اللہ نے تمہیں صبر اور استقلال، تہور اور اتحاد کا سبق دیکر تم سے انکے
ہاتھوں کو روک دیا۔ اور اے مسلمانو! مقام خدا کا خوف دل میں ہر آن رکھکر اسکے احکام کی متابعت
کرتے رہو کیونکہ دشمن پر غالب آ جانے کا راز اسی تقوٰی میں ہے اور ایمان والوں کو چاہیئے کہ اپنی
حتی الامکان سعی کے بعد نتائج کے بارے میں خدا ہی پر توکل کیا کریں۔

آہ! اُس مالک الملک، اُس رب العالمین خدا کی عالم آرا رواداری امت رسولؐ کے ہی خوف
حزن کو امن و امان میں بدل دینے کے اہتمام میں تھی۔ قرآن حکیم کے اوامر و نواہی، آجکل کے عام اور
پست کن تخیل کے مطابق، دنیاوی نقطۂ نظر سے محض بے وجہ اور بے نتیجہ نظریئے نہ تھے، وہ کسی تہی شدہ
آخرت اور زاد معاد کے بے سبب اور بے وسیل، انفرادی اور شخصی سامان نہ تھے جنکا تیار کرنا خوشنودی
خدا کے لیئے "مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ (۵: ۱۶)" رسما اور فرضا ضروری تھا، بلکہ وہ مستقل اور نتیجہ خیز اجتماعی اعمال تھے
جن کا اولین پیش نہاد اِس دنیا کو خوش اسلوبی سے نباہنا ہی تھا۔ خدائے واحد پر ایمان، اسکی عبادت
اور طاعت، اسکے تقوے اور اتحاد، اسکے جہاد اور ہجرت، صبر اور توکل، بلکہ صدقات اور زکوۃ کا صحیح مآل
یہی تھا کہ دین اسلام مسلمانوں کے متفقہ کسب و عمل سے دنیا کی تمام مجتمعات پر سیاسی اور اجتماعی
معنوں میں غالب آ جائے۔ وحدت جماعت، مصالحت افراد، ائتلاف قلوب، اطاعت خدا،
اطاعت رسول، متابعت اولوالامر، ایمان کے وہ لاینفک اجزا، اور اتقائے خدا کے وہ ناقابل انفصال

---

† اس آیۂ شریفہ کے مطالب کی مسئلہ ارتقا کی شق سوم (صفحہ ۱۶۱) سے مماثلت عیاں ہے۔ قابل لحاظ بات یہی کہ اسمیں دشمن سے بچ نکلنے کو نعمت خدا سے تعبیر کیا گیا ہے اور ظاہر کر دیا ہے کہ قانون خدا پر چلنا ہی دشمن کے دست تشدد سے بچنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ نہیں بلکہ قرآن حکیم کی حکمت جامعہ نے حفظ نفس کا تیر بہدف نسخہ "وَاتَّقُوا اللّٰهَ" کے جامع اور مانع الفاظ کے اندر بند کر دیا ہی۔ گویا جس قوم کے افراد میں اتقا کی صلاحیتیں موجود ہیں جو قوم متحد اور متفق بنکر رہی ہے جس نے تفرقے سے اپنے آپ کو بچائے رکھا اور حفظ ما تقدم کے طور پر اپنے آپکو ہمہ وجوہ تیار کیا وغیرہ وغیرہ (دیکھو تحت رستن صفحہ ۱۷۰) اس پر کسی دشمن کی دست درازی عبث ہے۔ آیت کے آخری حصے سے "توکل" کے معانی کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ گویا توکل یہ ہے کہ انسان قانون خدا پر کما حقہ چلکر نتائج کا منتظر رہے، عافیت پسند مسلمانوں نے آج توکل کے معانی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر

حصص تھے جنکا مآل کار لامحالہ اس دنیا میں حصول عافیت اور غلبۂ اسلام ہی تھا، فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۸: ۱)، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۴: ۵۹)، قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۵: ۱۱۲)۔ ہجرت اور جہاد کے جارحانہ اور مدافعانہ اوامر بھی حفظ نفس اور تقویت جماعت کے وہ عالم آرا، معرکۃ الآرا اور جلیل القدر اصول تھے جن پر ظہور آفرینش سے آج تک روئے زمین کی ہر زندہ قوم، عالم حیوانات کی ہر صالح اور مستعد نوع بلکہ کائنات فطرت کی ہر ذی حیات جنس طبعاً اور حتماً کاربند ہے! شارع فطرت کے نزدیک اعلائے حق کی خاطر حزب خدا اور علون بننا ہی وہ لازمۂ ایمان، مستحق اجر، اور مستوجب رضا فعل تھا جس کا انجام راحت دنیا اور فلاح عاقبت دونوں تھا: رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸: ۲۲)، فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۵: ۵۶)، وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳: ۱۳۹)

؎۵۱ پس اس احکم الحاکمین کے مقام و منصب سے ڈرتے رہو اور اگر تمہیں اسکے منصب کا صحیح احساس ہے تو آپس میں کامل طور پر متحد اور مصالحت سے رہو۔ اور اگر تم ایمان اور تقوے کے مدعی ہو تو خدا کے سب احکام کی کلی متابعت کرو اور اسکے علاوہ رسول (یعنی تمہارے امیر جماعت) بھی جو کچھ تمہیں کہیں مانا تعمیل کیا کرو۔

؎۵۲ اے ایمان والو! اللہ کے احکام کی پوری اور کلی متابعت کرو، رسول کا کہا بلا چون و چرا مانا کرو، اور تم میں سے جو شخص تمہارے گروہ کا امیر مقرر کیا گیا ہو اسکے احکام کی بھی پوری متابعت کرو۔ پھر اگر خدانخواستہ تمہارے اور حاکم وقت کے درمیان کسی معاملے میں جھگڑا بھی ہو جائے تو اللہ اور رسول پر چھوڑ دو اور حاکم جماعت کی اطاعت میں کسر اٹھا نہ رکھو اگر تم فی الحقیقت اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور روز قیامت کا تمہیں پورا یقین ہے اس دن آپ ہی خدا اور رسول نبٹ لینگے کہ کون غلطی پر تھا، یہی تمہارے لئے بہترین طریق عمل ہے اور تمہاری اطاعت گذاری کی بہترین تاویل ہے۔

؎۵۳ تو اس سے کہا کہ اگر تم میں فی الحقیقت ایمان موجود ہے تو خدا کو ہر دم محسوس کرتے رہا کرو اور اس کا اتقا کرو (یعنی وہ اعمال پیدا کرو جو اتقا کے لئے ضروری ہیں)

؎۵۴ خدا ان سے انکے اعمال کے باعث خوش ہو چکا ہے اور وہ خدا سے اپنے کئے کا اجر پاکر خوش ہو گئے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کی فوج اور اسکے سپاہی ہیں، منکرو! اچھی طرح ہوش سے سن رکھو اور مومنو! مطمئن رہو کہ خدائی فوج ہی اس دنیا میں غالب آئیگی اور آخرت میں فلاح پا کر رہے گی۔

؎۵۵ تو لامحالہ خدا کے سپاہی ہی اس دنیا کے اندر غالب آکر رہیں گے۔

؎۵۶ اور اگر تم فی الحقیقت ایمان والے ہو تو بالآخر تم ہی غالب آکر رہو گے۔

✤ اس وسیع التاویل، پیچیدہ، لیکن اہم اور سبق آموز آیت کے صحیح مطالب کی تصریح دوسری جلد میں پیش کر دی جائے گی۔ یہاں پر مطلب صرف اس قدر بحث ہے کہ "اطاعت خدا" اور "اطاعت رسول" کو ایمان کی شرط لاینفک قرار دیا گیا ہے۔ اطاعت اولو الامر کا سوال بعد میں اٹھایا جائیگا

✤✤ اس آیت میں صاف طور پر اتقا کو شرط ایمان قرار دیا ہے گویا اتقا کے اعمال کا موجود ہونا فی الحقیقت ایمان کے موجود ہونے کے مترادف ہے (دیکھو صفحہ ۱۶۶ آخری سطر)۔

"خوشنودیٔ خدا" کی خاطر ایثارِ مال اور ایتائے زکوٰۃ بھی وہ مصدقِ ایمان، محرکِ عشق اور مطہرِ قلب† اعمال تھے جن کی تہ میں اسلامی جماعت کی اقتصادی استواری اور مالی استحکام کا عظیم الشان راز مضمر تھا، انہی کے باقاعدہ اجرا و التزام میں **تاسیسِ بیت المال** کی وہ عظیم المنفعت اور کثیر النفع **حکمت** پنہاں تھی جو سب مہمات امور میں اور خوف و خطر کے موقع پر، اُمت کو مالی مشکلات سے قطعاً بے نیاز کر سکتی تھی۔ بالغرض اُس چارہ فرمائے جہاں ؐ کو جس کی ذات مستجمع الصفات عارضۂ احتیاج سے قطعاً مستبعد ہے اِس تمام کارفرمائی سے انسانوں کی اپنی ہی بہبودی مدِ نظر تھی: هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ

---

† قرآن حکیم نے جا بجا قربانیٔ مال کو ایمان کا جزوِ اعظم قرار دیا ہے، بلکہ ایک رو سے ایمان کی تصدیق کا معیار ہجرت، جہاد فی سبیل اللہ، نصرتِ تابعہ مہاجرین کے ساتھ ساتھ (جن کا ذکر صفحہ ۱۴۴ کی آیہ (۸: ۷۴) میں ہو چکا ہے) اقامت صلوٰۃ اور جہاد بالمال کو بھی تسلیم کیا ہے جیسا کہ سورۂ انفال کی مفصلہ ذیل آیت کے الفاظ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا سے ظاہر ہے:

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۞ (۸: ۳-۴)

اور یہ وہ لوگ ہیں جو الصلوٰۃ پر قائم رہتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دے رکھا ہے اُس میں سے ایک معتد بہ حصہ تقویت جماعت کے لئے صرف کرتے ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو فی الحقیقت ایمان والے ہی ہیں۔ پروردگارِ جل و علیٰ کے نزدیک ایسے ہی لوگوں کے مدارج بلند ہونگے، اُن کی بھول چوک سے اغماض کیا جائے گا (مغفرۃ) اور عزت و آبرو کے مقام اُنکے لئے وقف ہونگے۔

الصلوٰۃ کی حقیقت سے یہاں بحث نہیں، مگر المؤمنون حقاً کا استعمال تمام قرآن میں صرف انہی دو موقعوں پر ہوا ہے۔ اور ان سے ایثارِ مال کا مصدقِ ایمان ہونا ظاہر ہے۔ کلامِ الٰہی نے 'صدقہ' (بمعنی انفاق مال) کی اصطلاح بھی اسی قرینے سے وضع کی ہے (دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۱) اور اسی شخص کو صادق، اور مصدق، ٹھیرایا ہے جو اپنے زبانی دعووں کو عملاً یعنی زر خرچ کر کے سچ کر دکھائے۔ سورۂ حدید میں ہے:

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۞ (۵۷: ۱۸)

اِس میں شک نہیں کہ اپنے ایمان کی تصدیق کرنے والے مرد اور تصدیق کرنے والی عورتیں وہی ہیں جنہوں نے خدائے زمین و آسمان کی خاطر اپنے مال کا بہترین حصہ کاٹ کر الگ کر دیا، یہی وہ لوگ ہیں جنکو اُن کے ایثار کا اجر چند در چند کر دیا جائے گا، اور آگے چلکر بھی اُنکی اِس خدمت کا باعزت بدلہ ملیگا۔

ایثارِ مال کا محرکِ عشق بھی ہونا سورۂ آل عمران کی اِس آیت سے ظاہر ہے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ڛ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۞ (۳: ۹۱)

لوگو! خدا کی محبت کے بارے میں تزکیۂ نفس اور اخلاص کے مرتبے (البِرّ) کو تم ہرگز نہ پہنچ سکو گے جب تک کہ اُسکے اعلاء میں، اور اُسکے احکام کی تعمیل میں اُن چیزوں میں سے نہ خرچ کرو جنکو تم محبت کرتے ہو (مقابلہ کرو اسکا آیہ 'وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ' (۲: ۱۶۵) سے جو صفحہ ۱۱۸ پر گذر چکی ہے اور جس میں بتلایا ہے کہ خدا کی محبت کے بالمقابل کسی شئے کی محبت ٹھیر نہیں سکتی) اور یاد رکھو کہ جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے خدا اُس سے خوب واقف ہے۔

اس آیۂ شریفہ میں بالصراحت اِس واقع الامر کا اظہار کیا گیا ہے کہ کسی محبوب کی خاطر کسی عزیز شئے کا ایثار کرنا عاشق کے شعلۂ محبت کو اور بھڑکاتا ہے بالخصوص اُس حالت میں کہ عاشق کو اطلاع ہو کہ محبوب کو اُسکے ایثار کا علم ہے۔ بِرّ کی مکمل تعریف میں ابھی بحث رہے۔ یہاں ہم نے ترجمے میں ظاہر کر دیا ہے کہ

مَنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ† وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ؏ (۴۷: ۳۸)، وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۚ† اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۞ (۲۹: ۶) ؎ وہ مسلمانوں کے سب اعتقادات اور معاملات اور ہر فعل و عمل کو انکی دنیاوی فلاح و بہبود کی خاطر ہی درست کرنا چاہتا تھا، وہ انکو دنیا کی اس عظیم الشان کشمکش میں غیر اقوام کے بالمقابل قوت اور زور سے رکھنا چاہتا تھا، وہ کائناتِ جہان کی اس ہولناک اور تاب گسل مزاحمت میں مسلمانوں کو سلامتی کے طریقے، حفظ و امن کے دائمی اصول، اور عافیت اور تمکن کے اٹل قواعد بتلانا چاہتا تھا، وہ توحید کے متحد القلوب ماحول اور عبودیت کے سر فروشانہ ولولے میں مسلمانانِ عالم کو ایک نصب العین پر قائم کر کے انکو حقیقت اور حریت کے

ساہ تم لوگ بگوش ہوش سن رکھو کہ تم وہ قوم ہو کہ آج تمہیں خدا کی راہ میں اپنے قومی فائدے کے لئے خرچ کرنے کو بلایا جاتا ہے۔ اس پر بھی تم میں ایسے آدمی موجود ہیں جو دینے سے بخل کرتے ہیں۔ اور جو آج بخل کرتا ہے تو حقیقت میں اپنے آپ سے بخل کرتا ہے ورنہ اللہ تو غنی اور بے نیاز ہے اور تم ہی اسکے محتاج ہو۔ اور اگر تم نے حکم خدا سے روگردانی کی تو اسی بخل کے باعث ہلاک ہو جاؤ گے اور خدا دوسرے لوگوں کو تمہاری جگہ لا بٹھائیگا اور وہ تم جیسے بدعمل، نفس پسند، اور ناکارہ لوگ بھی نہ ہونگے۔ ۱ سہ ۲ اور جسنے خدا کی جماعت میں اپنے پر تکلیف سہیں اور دشمن سے جہاد کیا تو وہ اپنے ہی بھلے (یعنی حصول قوت) کیلئے سعی کرتا ہے ورنہ خدا تو دنیا جہان کے لوگوں سے بے نیاز ہے (۲۹: ۶۔ کو مد نظر رکھکر جَاهَدَ کا یہ ترجمہ کیا گیا)

(تتمہ تحت المتن صفحہ ۱۸۰) ماسوا کی محبت سے خدا کی محبت کو مبرّا رکھنا ہے؟ کا جو لازمی نتیجہ ایثار مال کا مطلب ہونا جو فی الحقیقت زکوٰۃ کا مقام حاصل کرنیکے مترادف ہے، کلام الٰہی کی اس آیت سے ظاہر ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۞ (۹: ۱۰۳)

اسے پیغمبر! ان متشکّکین اور منافقین جو ہیں (انکے تذبذب اور نفاق کے قلبی مرض کو دور کرنے کی غرض سے) انکے مال میں سے کچھ حصے بطور صدقہ لے لیا کرو (کہ یہ صدقہ بادی النظر میں انکی مزعومہ قلبی کیفیت کی تصدیق کرتا ہے) اتم یہ طریقہ اختیار کرکے فی الحقیقت ان کے دلوں کو محبت ماسوا سے پاک کرو گے (تُطَهِّرُهُمْ) اور انکے نفوس کو آلایش حب زر سے مبرا کرو گے (تُزَكِّيْهِمْ) اور یہی نہیں بلکہ ان کا شکریہ ادا کیا کرو (صَلِّ عَلَيْهِمْ) انکو دعائے خیر دو (صَلِّ عَلَيْهِمْ) انکے اس فعل کے عوض میں تحسین و آفرین کہو (صَلِّ عَلَيْهِمْ) کیونکہ تمہاری شاباش (صَلٰوتَكَ) انکے لیئے موجب تسکین ہوتی ہے اور انکو اور بھی بہتر کام کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور یوں تو خدا ہر شخص کے ظاہر و باطن کو سننے والا اور عمل کی کیفیات کو خوب جاننے والا ہے۔

"صَلِّ" اور "صَلٰوتَ" کے مفہوم کے متعلق تفصیل بحث صفحہ ۱۲۱ کے تحت المتن میں ہو چکی ہے۔ یہاں پر اس نقطہ نظر کی کامل تصدیق ہو جاتی ہے۔ ماظاہر ہے کہ صَلٰوۃ سے مقصود تحسین و آفرین ہے لیکن ضمنًا یہاں پر تُزَكِّيْهِمْ کے لفظ سے "زکوٰۃ" کی وجہ تسمیہ بھی معلوم ہو گئی کہ زکوٰۃ فی الحقیقت وہ شئے ہے جس سے تزکیہ نفس ہو یعنی مال کی محبت گھٹے اور خدا کا عشق بنے!

† آیہ (۴۷: ۳۸) سے صاف ظاہر ہے کہ انفاق مال فی سبیل اللہ کی صحیح غرض و غایت اُمت کی اجتماعی اور سیاسی بہتری ہی ہے، اور اسمیں بخل کرنا گویا اپنی قومی بہتری میں مخل ہونا ہے۔ اس امر کی تائید کہ "يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ" سے مراد قوم کی دنیاوی اور اجتماعی بہبودی سے بخل کرنا ہی ہے، (نہ روز قیامت کے بہشت سے بخل کرنا جیسا کہ بعضوں نے زکوٰۃ کے اصلی مدعا کو مسخ کرنے کی غرض سے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے) "وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ" کے الفاظ سے ہوتی ہے جو معًا بعد میں آتے ہیں گویا ایثار مال نہ کرنے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ قوم کی مالی قوت کو نقصان پہنچے گا، اور اسی طرح سے غیروں کے بالمقابل اسکی مدافعت نہ ہو سکے گی!

علمبردار، اخوت اور مساوات کے مبلغ، عالم آرا عصبیت کے محافظ، اور وراثت زمین کے اہل بنانا چاہتا تھا!

هُوَ الَّذِيٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُۥ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُۥ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِۦ
وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا۟ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَٰرَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ
أَلِيمٍ ۝ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَتُجَٰهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَٰلِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ
خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا
الْأَنْهَٰرُ وَمَسَٰكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّٰتِ عَدْنٍ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا ۖ نَصْرٌ
مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۶۱: ۹-۱۳)

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۸۱) مجاہدین کو ہتھیاروں سے لیس کرنا متعذر ہو جائے گا اور بالآخر کوئی دوسری قوم جو اعمال میں اس کم ہمت قوم سے بہتر ہوگی ان کے ملک پر قبضہ کرے گی اور اس قوم کی سیاسی قوت کو تباہ کر دے گی۔

جن خوش اعتقادوں نے 'زکوٰۃ' کو بیت المال کی حکمت عملی سے الگ سمجھ کر کسی بھک منگے کو چار پیسے دینا سمجھ لیا ہے اُنکے لیے یہ آیت از بس قابل غور ہے لیکن 'فی سبیل اللہ' کے صحیح معانی اور 'زکوٰۃ' کے متعلق باقی بحث آگے چلکر آئے گی۔

آیہ (۹: ۱۲۹) میں بھی 'انفسہم' کا لفظ ہے، اور ان دونوں آیتوں کے مضامین کی مماثلت سے ظاہر ہے کہ یہاں بھی 'فانما یجاھد لنفسہ' سے مراد اپنی دنیاوی بہتری کے لیے سعی و عمل کرنا ہے۔ باغ بہشت کا قصہ جو لوگ آسانی سے وضع کر لیتے ہیں اور 'جاھدوا' کے لفظ سے مراد تسبیح پھیرنا اور روحانی مجاہدے کرنا لے لیتے ہیں، اُسکی سند قرآن میں موجود نہیں۔ بہشت بھی آخرت میں تبھی ملسکتا ہے جب سب اُمت آیتوں کی متفقہ طاقت عمل سے 'اعلون' بنکر رہے ورنہ نرے روحانی مجاہدے بے معنی ہیں اور اُنکی کچھ اُجرت نہیں لیکن اس بحث کو چھیڑنا یہاں پر پیش از وقت ہے۔

(۶) ان آیات جلیلہ میں چند باتیں غور طلب ہیں:-

(۱) اسلام کا اس دنیا میں منتہائے وحید 'اعلون' اور غالب بنکر رہنا ہے، اور اسی **واحد** غرض و مطلب کے لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے تھے۔ قرآن کے تمام طول و عرض میں رسول کے بھیجنے کی اِسکے سوا کوئی اور غرض کہیں نہیں بتلائی گئی۔ یہ اس عنوان کا جواب ہے جو ہم نے صفحہ ۱۰۱ پر قائم کیا تھا۔

(۲) جہاد بالسیف اور جہاد بالمال کا نتیجہ قرآن حکیم نے 'عذاب الیم سے نجات'، 'ذنوب کی مغفرت'، 'جنّت میں داخل ہونا اور مساکن طیبہ' بتایا ہے۔ اگر یہ سب باتیں روز قیامت سے متعلق کر لی جائیں تو بھی 'اُخریٰ تحبّونہا نصر من اللہ و فتح قریب' کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اُمت کی دنیاوی اور اجتماعی بہتری کا خدا کا وعدہ ہے۔ پس نقطۂ نظر سے ایثار مال یعنی 'زکوٰۃ' کی غرض اور بھی عیاں ہو جاتی ہے۔

(۳) 'جنّت' کی تشریح کے ضمن میں ہم نے صفحہ ۱۱۲ پر دعوےٰ کیا تھا کہ قرآن حکیم میں یہ لفظ ارضی بادشاہت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور آخرت کے باغ بہشت کے لیے 'الجنّۃ' کا لفظ مخصوص ہے۔ یہاں پر اس دعوے کی بادی النظر میں تغلیط ہوتی ہے مگر چونکہ ساتھ ہی 'لیظہرہ' اور 'فتح قریب' کے الفاظ استعمال کر کے سیاسی اور دنیاوی غلبے کو واضح کر دیا ہے، 'جنّت' کا ذکر عمداً اس انداز سے کیا ہے کہ دنیاوی تغلب اور اُخروی انعام دونوں سمجھے جائیں گویا جس مجاہد بالمال والانفس کو باوجود اُسکے جہاد کے جنّات زمین کی بادشاہت نہ مل سکی اسکے لیے اُخروی جنت مخصوص ہے۔ اس طرح کا استثنائی استعمال قرآن میں ایک دو جگہ اور ہوا ہے جو آگے آئینگے مگر یہ مستثنیات ایسی ہیں کہ ان سے نفس دعوے کی تردید نہیں ہوتی۔

(۴) صفحہ ۱۰۱ کے تحت المتن میں بشارت رُسل کی نوعیت واضح کی گئی تھی یہاں 'وبشّر المؤمنین' (۶۱: ۱۳) کے الفاظ سے پھر اس دعوے کی تائید ہوئی کہ بشارت اجتماعی تمکن کی بشارت ہی ہے۔ ایمان کی ماہیت کے بارے میں اب تک جو کچھ قرآن حکیم سے مستنبط ہوا ہے یہ ہے کہ (۱) فطرت کا بغور مشاہدہ کرنا (۱۰: ۱۰۱) صفحہ ۱۰۲ و ۱۰۳، (۲) لرزش قلب کا موجود ہونا (۸: ۲) صفحہ ۱۰۳، (۳) مخالف متقین سے اعلائے اسلام کے لیے قطع تعلق کرنا آیہ (۵۸: ۲۲)

خدا وہ پاک ذات ہی جسنے اپنے رسول کو عظیم الشان ہدایت اور سچا دین (راہ عمل) دیکر بھیجا تاکہ اسکے ذریعہ سے باقی سب غلط راہ ہائے عمل پر غالب آجائے اگرچہ دشمنوں کو بُرا ہی لگے۔ ای ایمان والو! کیا میں تمہیں کوئی ایسی سوداگری بتلاؤں جو تمکو دُنیاوی شکست کے دردناک عذاب سے نجات دے۔ وہ یہ ہی کہ خدا کو فی الحقیقت اپنا حاکم اعلیٰ مانو (تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ) اور اُسکے رسول کے لائے ہوئے احکام کی تعمیل کرو۔ اللہ کی حمایت میں اپنی جانیں اور مال لڑادو۔ تمہاری بہبودی اور غلبۂ اُمت کیلئے یہی بہترین دستور العمل ہی اگر تم اسکو سمجھو۔ ایسا کرتے رہوگے تو خدا تمہاری اگلی تقصیروں پر پردہ پوشی کریگا، تم کو خوشگوار باغوں میں داخل کریگا جنکے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، آخرت کے دائمی باغوں میں نہایت عمدہ مقام دیگا اور یہ بہت بڑی کامیابی ہی۔ اور اس انعام کے علاوہ ایک اور نعمت بھی ہی جسکو تم پسند کرتے ہو وہ یہ کہ تم کو اس دنیا میں خدا کیطرف سے مدد ملیگی، فتح تمہارے شامل حال ہوگی، اور اے پیغمبر! یہ بشارت تمکن بھی ایمان والوں کو دے دو۔

(تتمہ تحت المتن صفحہ ۱۸۲) صفحہ ۱۰۴، (۴) اَعِدُّوْا لَہُمْ اور جَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِہَادِہٖ کا مصداق بننا (۲۲: ۷۷-۷۸) صفحہ ۱۰۵، (۵) راہِ خدا میں جہاد اور ہجرت کرنا، مجاہدین کو مدد اور پناہ دینا (۸: ۷۴) صفحہ ۱۱۴، (۶) مشکک فی اللہ نہ ہونا اور جہاد بالمال والانفس کرنا (۴۹: ۱۵) و (۹: ۲۰-۲۲) صفحہ ۱۱۵ اور (۹: ۸۸) صفحہ ۱۳۴ و (۹: ۱۱۱) صفحہ ۱۴۰، (۷) ثابت قدم ہو کر لڑنا (۳: ۱۴۰) صفحہ ۱۲۰ و (۳: ۱۶۵) صفحہ ۱۲۴ تحت المتن، (۸) اِصْبِرُوْا اور صَابِرُوْا اور رَابِطُوْا کا مصداق بننا (۳: ۱۹۹) صفحہ ۱۳۲، (۹) دنیا کے اندر جم کر رہنا (۱۴: ۲۷) صفحہ ۱۴۳، (۱۰) اعتصام بحبل اللہ کرنا اور فرقہ بند نہ بننا (۳: ۱۰۱-۱۰۳) صفحہ ۱۴۴-۱۴۵، (۱۱) دشمن کے دل میں اپنی قوت کی ہیبت بٹھادینا (۵۹: ۲) صفحہ ۱۵۵، (۱۲) اتقائے الٰہی کرنا اور سعی و عمل سے قرب خدا کی تلاش کرنا (۵: ۳۵) صفحہ ۱۵۶ و (۵: ۱۱۲) صفحہ ۱۵۹، (۱۳) ماسوا سے نہ ڈرنا (۹: ۱۳) صفحہ ۱۵۷، (۱۴) جہاد کے وقت لنگ عذرات نہ کرنا (۹: ۴۴-۴۵) صفحہ ۱۵۸، (۱۵) اولیائے خدا بننا (۱۰: ۶۲-۶۴) صفحہ ۱۵۸، (۱۶) بادشاہ زمین بننا (۳۹: ۱۰) صفحہ ۱۵۹، (۱۷) حفظ نفس کرنا (۵۹: ۱۸) صفحہ ۱۶۲ و (۵: ۱۱) صفحہ ۱۶۰، (۱۸) قتال بالسیف کی طرف راغب ہونا (۸: ۶۵-۶۶) صفحہ ۱۶۴، (۱۹) آپس میں کامل طور پر متحد ہونا (۸: ۶۳-۶۴) صفحہ ۱۶۷، (۲۰) اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ وغیرہ ہونا (۴۸: ۲۹) صفحہ ۱۶۸، (۲۱) امیر جماعت کا کامل طور پر مطیع ہونا (۸: ۲۰-۲۲)، (۸: ۲۴-۲۵) صفحہ ۱۷۰ و ۱۷۱، (۲۲) امیر جماعت کی مدد کرنا (۷: ۱۵۷) صفحہ ۱۷۲، (۲۳) اطاعت اولی الامر کرنا (۴: ۵۹) صفحہ ۱۷۹

(۲۴) اَلصَّلٰوۃ پر قائم رہنا اور اَلزَّکٰوۃ دینا (۸: ۳-۴) صفحہ ۱۸۰، (۲۵) یُظْہِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ کا مصداق بننا (۶۱: ۹-۱۳) صفحہ ۲۰۷ - ایمان ہے۔ صحیح بخاری باب الایمان میں ہی کہ ایک دفعہ حضورؐ نے فرمایا 'ایمان کی کچھ اوپر ستاٹھ شاخیں ہیں جن میں ایک شاخ حیا ہے' چنانچہ اسوقت تک پچیس شاخوں کی توضیح اس کتاب میں کردی گئی ہے۔ اسکے بعد اب جہاں جہاں قرآنی آیات میں لفظ ایمان آئیگا وہاں مراد یہی اعمال لینے چاہییں

(۵) رسولؐ کے ساتھ 'الھُدٰی' اور 'دِیْنِ الْحَقِّ' کے بھیجے جانے کا ذکر ہی۔ 'دِیْن' کے معنی 'راہ عمل' میں نے صفحہ ۱۶۱ کے تحت المتن مرتب کردیئے ہیں۔ یہی شاید 'دِیْنِ الْحَقِّ' اس دنیا میں قوی بنکر رہنے کیلئے وہ صحیح راہ عمل ہی جو عرب نے رسولؐ خدا کی سیادت میں اختیار کی تھی۔ جبتک مسلمان غالب رہے یہ راہ عمل اندر سے قرآن درست رہی۔ جب اعلون بنکر رہنے کا نصب العین نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تو مسلمانوں کا طرز عمل بھی 'دِیْنِ الْحَقِّ' نہیں رہا، اور یہی وجہ ہے کہ 'لِیُظْہِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ' کا میثاق ایزدی آج پورا نہیں ہوتا۔ ثابت ہوا کہ 'الھُدٰی' کیا شے ہی۔ اسکا علی الحساب جواب تو یہی قرآن ہی جو مجسمہ ہدایت ہی مگر صحیح مفہوم وہ تکیف عمل اور صحت عمل، وہ صلاحیت اور استعداد کار ہی جو قرون اولیٰ میں رسول خدا کی تعلیم نے پیدا کردی تھی اور جو آج قطعاً مفقود ہی لیکن کسی زمانے میں دین اسلام کا واحد مطمح نظر تمکن فی الارض اور غلبہ استعداد تھا کہ آٹھویں صدی ہجری کا مشہور مسافر ابن بطوطہ لکھتا ہی کہ شاہ محمد تغلق کے سکوں پر ایک طرف اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْہِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ کے الفاظ کندہ تھے۔ ساتھ ہی اُس غلبے کو حاصل کرنے کے لیے اطاعت امیر کو درس مسند تانہ تھا کہ دوسری پشت پر 'من اطاع السلطان فقد اطاع الرحمٰن' بے خوف و خطر لکھا تھا گویا خدا رسول اور سلطان کی اطاعت اصلاً ایک ہی شے ہی (دیکھو صفحہ ۱۷۰)

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝ †
هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝ (۹: ۳۲-۳۳)

یہ لوگ تو چاہتے ہیں کہ اللہ کی شعل نور کو پھونکیں مار کر بجھا دیں اور خدا اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ علی الرغم اعدا اپنے نور کو پورا کر کے رہے۔ خدا ہی تو وہ پاک ذات ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق دیکر بھیجا تاکہ اسکو دنیا کے تمام مذاہب پر غالب کرے، گو مشرکوں کو یہ بات کیسی ہی ناگوار لگے۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ۝ ‡ (۴۸: ۲۸)

وہ خدا کی مقدس ذات ہی تو ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسکو بالآخر دنیا کے تمام طرق عمل پر غالب کر دے، اور در حقیقت اس طرز عمل کو کامیاب کرنے کیلئے خدا نگہبان بس ہے۔

وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ۝ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ۝ (۸: ۷-۸)

---

† اس آیۂ کریمہ سے جس کے لگ بھگ ایک آیت سورۂ صف میں بھی متذکرہ صدر آیات (۶۱: ۹-۱۳) سے عین پہلے آئی ہے، اور بھی ظاہر ہے کہ "لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" سے مراد اسلام کا اجتماعی اور سیاسی غلبہ ہی ہے۔ اسکے ماسوا اختا کچھ نہیں: کافر عرب اسلام کی دنیاوی طاقت ہی کو مٹانا چاہتے تھے، وہ اپنی گھٹتی ہوئی قوت کے بالمقابل مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے درپے تھے۔ اور اس سیاسی تمکن ہی کو نور اللہ کہا گیا ہے جسکے اتمام کا وعدہ خدائے عزوجل کر رہا تھا۔ کفار کو اسلام کی روحانی طاقت سے کچھ حسد یا تعرض نہ تھا۔ جن نام نہاد مسلمانوں نے آج امت کی زبوں حالی اور شرعی وضع قطع کو مذاہب عالم پر اپنی روحانی فتح سمجھ لیا ہے انکے لیے یہ آیات نہایت سبق آموز ہیں۔ سورۂ صف کی متذکرہ صدر آیت یہ ہے: يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝ (۶۱: ۸)۔ اسکا پھر ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

‡ اس آیۂ شریفہ سے پیشتر کی آیت ہے:

لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ ۖ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ ۖ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَٰلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا ۝ (۴۸: ۲۷)

اسمیں شک نہیں کہ خدائے عزوجل نے اپنے بھیجے ہوئے رسول کو وہ رؤیا سچی جو اسکو پیہم اضطراب اور شانہ روز اہتمام کیا تھا عالم خواب میں دکھائی گئی تھی بالتحقیق سچ کر دکھایا اور وہ رؤیا یہ تھی کہ اگر خدائے بے نیاز نے ہماری سعی و عمل کو پسند فرما کر مناسب سمجھا (اِنْ شَاءَ اللّٰهُ) تو تم لوگ مسجد حرام میں سب دشمنوں سے محفوظ و مامون ہو کر بے خوف خطر داخل ہو گے، اور وہاں جا کر حکم کے مطابق اپنا سر منڈواؤ گے یا بال کتراؤ گے۔ پھر مسلمانو! فتح مکہ کے اس اہم مرحلے تک پہنچنے کیلئے خدا وہ وسیلہ تاڑ گیا جس کا تمہیں علم نہ تھا (فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا) اور حدیبیہ کا معاہدہ مکے کے سر ہونے سے پہلے دشمن سے کرا دیا جو فی الحقیقت ایک ضمنی فتح ہے۔

رؤیا کی حقیقت سے یہاں پر بحث نہیں اگرچہ ہم نے ترجمے میں رؤیا کے واقع ہونے کی توجیہ اور مناسب حالات میں صحیح سعی و عمل کے بعد اسکے سچ ہونے کی طرف بھی اشارۃً بیان کر دی ہے مگر یہ آیت اس امر کا مزید ثبوت ہے کہ زیر بحث آیت یعنی (۴۸: ۲۸) میں لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ سے مراد مسلمانوں کا اجتماعی اور سیاسی غلبہ ہی ہے کیونکہ مسجد حرام میں داخل ہونے اور فتح قریب کا ذکر ہے، روحانی غلبہ، جسکی داستان آجکل کے کم ہمت اور ناکارہ مسلمانوں نے اپنا دل خوش رکھنے کیلئے گھڑی ہے قطعاً مراد نہیں، اور نہ روحانی غلبہ کوئی ایسی شے ہے جس پر وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (۹: ۳۲، ۶۱: ۸) اور وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (۹: ۳۳، ۶۱: ۹) اور وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ (۸: ۸، ۱۰: ۸۲) کا اطلاق ہو سکے، اور جو کافروں کی جڑ بنیاد کٹ سکے، جیسا کہ آگے چلکر سورۂ انفال میں ہے: وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ (۸: ۷)۔

اور لوگو! خدا تو اِس بات کا ارادہ کرتا ہے کہ اپنے احکام کے قوت افزا اثر سے صداقت کو اِس دنیا کے اندر مستحکم کر دے، اور منکرین کی جڑ بنیاد کاٹ ڈالے، اور یہ اسلئے کہ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دکھائے اگرچہ اُن مجرموں کو بُرا ہی کیوں نہ لگے جو اسکے احکام کی تعمیل نہیں کرتے!

وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (۱۰ : ۸۲)

اور خدا اپنے احکام کی قوت افزا وساطت سے حق کو اِس دنیا کے اندر مستحکم کر دیتا ہے اگرچہ مجرموں کو جو خدا کی نافرمانی کرتے ہیں بُرا ہی کیوں نہ لگے۔

غلبۂ اسلام و اتحادِ عالم

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۲ : ۱۳۶)

ہم انبیاء میں سے کسی ایک کے مابین فرق نہیں کرتے (سب کو ایک پیغام کے دینے والا سمجھتے ہیں) اور ہم تو درحقیقت خدا ہی کو حاکم اعلیٰ ماننے والے ہیں

اُس قاضئ حاجات کے پیش نظر درحقیقت ایک ایسی مقتدر جماعت کی تنظیم و تنسیق تھی جو اِس جہان کی مہذب نفس اور مطہر اخلاق قربانیوں سے دنیا کی تمام اُمتوں پر غالب آکر انسان کی دنیوی فلاح اور اجتماعی نجات کا باعث ہو، وہ مسلمانوں کی جماعت کو عبادت خدا کے حوصلہ انگیز عمل، تقویٰ کی وحدت افزا خلش، اور ایمان کی غلبہ اندوز عزم کے ذریعے سے ہر معاند گروہ سے عہدہ برآ کر کے اُسکے عالم آرا اتحاد اور ناقابل شکست اخوت کی ہیبت دلوں میں بٹھانا چاہتا تھا! وہ جہاد فی سبیل اللہ کو حفظ جماعت اور دفاع نفس کا اسلحہ وحید اور فلاح عاقبت کا قطعی اور فوری وسیلہ قرار دیکر، ہر متنفس کے دل میں مقابلے کی ناقابل شکست روح، اور فیروزمندی کی شدید تڑپ پیدا کرنا چاہتا تھا! ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (۶۱ : ۱۱) وہ اسلام کی عالم آرا صداقت، توحید کی ناقابل انکار حقیقت، اور انسان کے مخلصانہ اعمال کے استیلائے اثر سے پہنائے جہان کے اندر اُسکی ہیئت اجتماعی میں روز افزوں تقدم اور ارتقائی تقویت دیکھنا چاہتا تھا۔

---

* غلبہ کو پیش نظر رکھکر اسلام کا اتحاد عالم کی دعوت دینا (جیسا کہ آگے چلکر واضح ہوگا) بظاہر بین نظروں میں دو متضاد باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن ادنیٰ تامل اس نتیجہ پر پہنچا دیتا ہے کہ اسلام انسان کی ہیئت اجتماعی میں ایک ہی ستھرا دل (الملائمہ)، ایک ہی اصول (الدین)، اور ایک ہی صراط مستقیم (دین الحق) پیدا کر کے سب کو مجتمع کرنا چاہتا تھا گویا سب کو فطرت کے اِس واحد راستہ پر چلانا چاہتا تھا جس کا نتیجہ تمکن فی الارض ہو، یہودیوں اور نصرانیوں کی طرح ایک فرقہ بنانا اسکا پیش نہاد خاطر نہ تھا اگرچہ آج ہی بچا ہر ایسی اتحاد اور نسل انسانی کی بہبودی کا مدعا کو پیش نظر رکھکر اپنے سب انبیاء کو ماننے کا اعلان کیا تاکہ فرقوں کا ذاتی تعصب اِس اتحاد میں حائل نہ ہو (دیکھو دیباچہ کتاب صفحہ ۶۲)

نہیں وہ سب نسلی اور تمدنی اختلافات، اور سب مُلکی اور اعتقادی تفرقات کو خدائے مشترک کی مشترک ملازمت (عبادت)، اور ایک قانون اور ایک حاکم کی عملی اطاعت کے بالمقابل نسیاً منسیاً کر کے، انسان کی مختلف العقائد، متخالف الآرا، اور منتشر الاغراض جماعتوں میں بنی نوع آدم کی طبعی یکرنگی، اور کارگاہِ فطرت کی جنسی یک وضعی از سرِ نو قائم کرنا چاہتا تھا! وہ الغرض حیات کی اس المناک کشمکش میں خدا پرستاؤں کی یک عمل اور باعمل، یک خدا اور باخدا، یک قانون اور تابع قانون جماعت کو حصول قوت کے محکم اصول، حفظِ نفس کے لازوال طریقے، اور دنیوی ترقی کے مستحکم ضوابط سکھا دینا چاہتا تھا!

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ †

---

† اِس آیت میں اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کو "اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ" کی مشترک اساس پر بلا کر متحد العمل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہود و نصاریٰ دونوں فرقے کم از کم زبانی طور پر "اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ" کے مدعی تھے۔ اسی لیے اِس کلمے کو "كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ" کہا گیا ہے مگر عملاً وہ خدا کے حکموں کی جو توراۃ و انجیل میں مذکور تھے کچھ تعمیل نہ کرتے تھے۔ آجکل کے مسلمانوں کی طرح خدا کو مُنہ سے خدا کہہ چھوڑنا، یا اُس کے نام پر نماز پڑھ لینا انکا رسمی اعتقاد تھا مگر عبادت یعنی ملازمتِ خدا صحیح معنوں میں ہرگز نہ رہی تھی۔ یہودیوں نے احکامِ خدا کی تعمیل کو خیرباد کہکر، احبار اور رہبان (یعنی اسقفوں اور گوشہ نشینوں) کو اپنا مخدوم بنایا ہوا تھا، وہ ان کے پیچھے لگ کر ایک دوسرے سے الگ اور فرقہ بند بن گئے تھے۔ علیٰ ہذا القیاس نصرانی بھی خدا کی اطاعت اور ملازمت کو چھوڑ کر اپنے اپنے پادریوں کے صحیح معنوں میں ملازم بنے ہوئے تھے۔ گویا اُن کا مرتبہ عملاً خدا کے برابر بلکہ اُس سے بہتر بنا رکھا تھا۔ سورۂ توبہ میں اسی عملاً ماسوا کی طرف اشارہ کر کے احبار اور رہبان کو "اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کہا گیا ہے؛ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ (۳۱:۹)، یعنی اُنھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علما اور مشائخ کو اور مسیح ابن مریم اپنے نبی کو خدا بنا کھڑا کیا ہے اور عملاً ان کی ملازمت اور عبادت میں لگے ہیں"۔ اِس آیہ شریفیہ میں قرنِ اولیٰ کے کارکن مسلمانوں کی طرف سے یہود و نصاریٰ کو دعوت ہے کہ "اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ" کے اصل اصول پر عملاً کاربند ہو جاؤ! (یہی معنی تَعَالَوْا اِلٰى کے ہیں)۔ اور بصراحت تمام بتلایا ہے کہ خدا کی عملاً ملازمت کرنا، کسی شئے کو عملاً اور معناً اُس کے برابر نہ کرنا اور خدا کے حکموں کو پس انداز کر کے علما اور مشائخ کے من گھڑت حکموں پر نہ چلنا ہی عینِ اسلام ہے۔ گویا یہ زبانی اعتقاد کو خیرباد کہکر عمل کیطرف آنا اور خدا کو معناً حاکمِ اعلیٰ سمجھنا ہی مُسلم بننے کے مترادف ہے؛ (فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ)۔ یہ وہ بے مثال دعوتِ اتحاد اور وہ وسیع النظر بنائے مصالحت تھی جس پر قرنِ اول کے مسلمان سب دنیا کو متحد العمل کرنا چاہتے تھے۔ آج جو بُعد المشرقین انکے اور یہود و نصاریٰ کے درمیان واقع ہو چکا ہے، نہیں، بلکہ جو نا قابلِ گذر خلیج انکے آپس کے فرقوں کے درمیان حائل ہے اور جسکے باعث وہ ایک دوسرے کو کاٹ کھانے میں مصروف ہیں، اسلام کی ماہیت نہ سمجھنے اور منشائے خدا کے مطابق عمل نہ کرنے کی صریح شہادت ہے!

ماہیتِ اسلام اور اتحادِ عمل کے متعلق یہ اہم بحث تفصیل کیساتھ پھر پانچویں مجلد میں کیجائیگی۔ سردست جو بات غور طلب ہے یہ ہے کہ آج امتِ مرحومہ کا ایک ایک فرد بذاتِ خود "اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ" کے برخلاف صحیح معنوں میں عمل کر رہا ہے۔ یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے اپنے احبار اور رہبان کے پیچھے لگ کر فرقہ بند بن چکا ہے۔ انکو "اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" بنا رہا ہے۔ ہر گروہ نے اپنا اپنا طریقہ الگ کر کے اُمت کو صدہا بلکہ ہزارہا فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے اور وہ غرض و غایت جو خدا کی مشترک عبودیت اور ایک حاکمِ اعلیٰ کی اطاعت میں مضمر تھی قطعاً مفقود ہو چکی ہے۔ گویا آج انکے طرزِ عمل کو دینِ اسلام کہنا حقیقت کا منہ چڑانا ہے۔

ضمناً اِس آیہ شریفیہ میں "عبادت" کے معانی کی تائید ہوگئی۔ جس پر ایک طول و طویل بحث صفحہ ۱۰ کے تحت المتن میں گذر چکی ہے۔

(اما) چنانچہ اسی آیت میں ان الفاظ کے بعد ہی: وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا (۳۱:۹) گویا عبادتِ خدا صحیح معنوں میں نہ رہی تھی بلکہ کئی خدا بنے ہوئے تھے، یہاں عبادت کا صحیح مفہوم مستعمد روشن ہو گیا

بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○ (۳: ۶۴)

اے پیغمبر! ان سے کہدو کہ اے اہل کتاب! آؤ ہم سب ایک ایسی حقیقت پر متفق ہو جائیں جسکا ہمارے اور تمہارے درمیان کم از کم زبانی طور پر یکساں اقرار ہے، اور جسپر فی الواقع عمل کرنے میں نہ تمہیں کوئی عذر ہو سکتا ہے نہ ہمیں، اور وہ یہ ہے کہ ہم ماسوا خدا کے کسی غیر کے ملازم نہ بنینگے، اور نہ کسی شئے کو اطاعت گذاری میں اُسکے ہم مرتبت کرینگے، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا آقا نہ سمجھے گا۔ پھر اگر اس سچی اور مطلق العمل بات کے ماننے سے بھی منہ موڑلیں تو ان سے کہدو کہ اب گواہی دو کہ ہم تو حقیقت میں خدا کو خدا مانتے ہیں نہ تم۔ کہ صرف منہ سے اقرار کرتے ہو لیکن اسکے احکام پر عمل نہیں کرتے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۡ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ○ (۲: ۱۳۶ - ۱۳۸)

اے ایمان والو! تم تمام عالم کی اُمتوں سے مصالحانہ طور پر کہدو کہ ہم تو اللہ کو اپنا خدا مان چکے ہیں اور ہم قرآن کو اُسکا قانون تسلیم کر کے اُسپر عمل کرتے ہیں اور ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ جو کچھ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اولاد یعقوب پر اُترا، اور جو کچھ بھی موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا، اور جو کچھ دنیا کے دیگر تمام

✣ ان آیات الٰہی میں اتحاد کی طرف ایک اور اہم قدم بڑھایا گیا ہے اور صاف الفاظ میں تمام انبیائے جہان کو بلا تفریق احدے منجانب اللہ تسلیم کر کے متحد العمل ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ لیکن اس اتحاد کا اساس کار پھر وہی خدا کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرنا (وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۲: ۱۳۶) اور اسکی عملی عبادت کرنا (وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ○ ۲: ۱۳۸) قرار دیا گیا ہے۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ کے الفاظ سے عیاں ہے کہ ایمان فی الحقیقت عمل ہی کا دوسرا نام ہے، زبان سے اسکو کچھ تعلق نہیں۔ جو شخص کہتا ہے مگر کرتا نہیں وہ از روئے اسلام کچھ نہیں۔ اس امر کی تصدیق میں کہ دعوت عام ہے اور روئے سخن کسی ایک فرقہ مثلاً یہود یا نصاریٰ کی طرف ہی نہیں بلکہ تمام عالم کی طرف ہے، قرآن حکیم کی اُن آیات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے جن میں بصراحت تمام کہا گیا ہے کہ ہر اُمت بلکہ ہر فرقے میں خدا کا کوئی نہ کوئی رسول ہو گذرا ہے جو لوگوں کو عبادت خدا کی طرف بلایا کرتا تھا۔ سورۂ نحل میں ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ (۱۶: ۳۶)

یعنی "ہم ہر اُمت میں کوئی نہ کوئی رسول اس غرض کے لیے بھیجتے رہے ہیں کہ لوگوں کو بتلائیں کہ اے لوگو! اس خدائے عزو جل کی ملازمت اختیار کرلو، اور شیطان کی غلامی سے بچتے رہو۔"

اس قسم کی اور آیتیں آگے چلکر دوسری مجلد میں آئیں گی۔ دیباچہ کتاب میں میں نے اسلام کی اس اتحادی دعوت کی حکمت کو دوسرے نقطۂ نظر سے واضح کیا ہے۔ (دیکھو صفحہ ۶۲-۶۳)

پیغمبروں کو اپنے پروردگار سے ملا، سب اُسی ایک خدا کی طرف سے تھا۔ ہم اُن میں سے کسی ایک میں بھی، اِس معاملے میں کوئی ما بہ الامتیاز تسلیم نہیں کرتے۔ اور ہم تو ہر نوع اُسی خدائے واحد کے فرمانبردار ہیں۔ تو اگر اسیطرح جس طرح تم نے اپنے آپ کو اطاعت احکام خدا کے لیے وقف کر دیا ہے یہ بھی اپنے آپ کو سپرد کر دیں تو بس راہ راست پر آگئے اور تمہاری ماننے کوئی وجہ پرخاش نہیں لیکن اگر یہ روگردانی کریں تو سمجھ لو کہ تمہاری ضد پر ہیں۔ پھر اس حالت میں خدا تم کو اُن کے شر سے اپنے حفظ و امان میں رکھیگا اور وہی حقیقت میں حالات کا بڑا سمجھنے والا اور بڑا جاننے والا ہے۔ ان سے کہدو کہ جس مصالحانہ اور اتحادی رنگ میں ہم رنگے ہوئے ہیں یہی اللہ کا رنگ ہے۔ اور اللہ کے رنگ سے بہتر رنگ کس کا ہوگا، اور ہم تو اُسی کی خدمت کرنیوالے ہیں۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ † ○ (۳: ۸۳)

اے محمدؐ ان یہود و نصاریٰ سے صلح صفائی سے کہدو کہ ہم تو اللہ پر ایمان لائے ہیں، اور اس کتاب پر جو ہمکو دی گئی، اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جو کچھ ابراہیم اور اسمٰعیل اور یعقوب پر اُتارا گیا تھا اور جو کچھ بھی موسیٰ اور عیسیٰ اور دنیا کے تمام پیغمبروں کو اُن کے پروردگار کیطرف سے دیا گیا تھا، اُسی خدا کی طرف سے تھا۔ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی کوئی فرق تسلیم نہیں کرتے۔ اور ہم تو ہمہ تن اُسی خدا کے فرماں بردار غلام ہیں۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ‡ ○ (۲: ۲۱۳)

---

† صفحہ ۱۸۰ کی آیہ (۲: ۱۳۶) سے اس آیت کی مماثلت عیاں ہے۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ کی شرط یہاں بھی التزام کے ساتھ موجود ہے۔ گویا مسلم بننا خدا کی خدائی کو عملاً تسلیم کر لینے کے ہم معنی ہے۔

‡ شارحین قرآن نے اِس آیۂ شریفہ کے مفہوم کو کیسا غلط سمجھا ہے اور نہایت لایعنی، بے نتیجہ، اور متناقض ترجمہ کر کے معاملے کو گڈمڈ کر گئے ہیں۔ میں نے متن میں ایک بامعنی اور مدلل ترجمہ کر دیا ہے مگر ایک دو باتیں لائق تشریح ہیں:-

(۱) كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً میں 'كَانَ' کسی گذشتہ واقعہ کو بیان کرنیکے لیے استعمال نہیں کیا گیا، بلکہ ایک ایسے واقع الامر کے اظہار کیلئے جو بہرحال درست ہے۔ اِس طرح پر 'كَانَ' کا استعمال قرآن میں بیسیوں جگہ ہوا ہے۔ ہم صرف سورۂ نساء کے پہلے چند رکوعوں سے مثالیں اخذ کرتے

انسان تو حقیقت میں ایک ہی امت ہیں کیونکہ ایک ہی نوع کی مخلوق ہیں اور اسی وحدت کو ملحوظ
نظر رکھکر خدا نے انکی طرف مشیت الٰہی سے باخبر انسان (نبی) بھیجے جو انہیں اجتماعی بقا کی بشارت دیتے
اور اجتماعی ہلاکت سے متنبہ کرتے رہے، اور خدا نے ان سب کے ساتھ بنی نوع انسان کیلئے (مختلف
زبانوں میں) ایک دستور العمل بھیجا تھا جو کتاب کی صورت میں تھا اور مبنی بر حق تھا تاکہ وہ کتاب اُن کے

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۸۸) ہیں: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۝ (۴: ۱۱)، (۴: ۲۴)، بیشک خدا بڑا صاحب علم و حکمت ہے؛ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۝
(۴: ۱۶)، بیشک خدا بڑا توبہ قبول کرنیوالا اور رحم کرنے والا ہے؛ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۝ (۴: ۱۷)، اور خدا بڑا صاحب علم و حکمت ہے؛ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۝ (۴: ۲۳)، بیشک خدا بڑا صاحب عفو و درگذر ہے؛ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا۝ (۴: ۲۹)، بیشک خدا تم پر بہت مہربان ہے؛ وَكَانَ ذٰلِكَ
عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا۝ (۴: ۳۰)، اور یہ بات کرنا خدا کے لیئے بیحد آسان ہے؛ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا۝ (۴: ۳۲)، خدا لامحالہ ہر شئے سے موبمو واقف
ہے؛ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا۝ (۴: ۳۳)، بیشک خدا ہر شئے پر پوری نگرانی کر رہا ہے؛ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا۝ (۴: ۳۴)، خدا لامحالہ
بڑا عظیم و جلیل خدا ہے؛ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا۝ (۴: ۳۵)، خدا بیشک بڑا صاحب علم و خبر ہے؛ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا۝
(۴: ۳۶)، بیشک خدا اُس شخص کو پسند نہیں کرتا جو اترانے اور بڑائی مارتا پھرے؛ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن 'کَانَ' کا یہ استعمال خدائے عزوجل کی صفات کے
متعلق مخصوص نہیں بلکہ ہر واقع الامر کے اظہار کے لیئے آیا ہے۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۷: ۱۱)، اور انسان
بڑا ہی جلد باز ہے؛ علیٰ ہذا القیاس سورۂ کہف میں ہے: وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا۝ (۱۸: ۵۴)، اور انسان کثیر معاملات میں جھگڑالو ہے؛
اسی سورۂ نسا میں آگے چلکر ہے: اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۝ (۴: ۱۰۳)۔ اسمیں شک نہیں کہ نماز وہ حکم الٰہی ہے جو ایمان
والوں پر بقید وقت فرض ہے؛ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا۝ (۱۷: ۵۳)، بیشک شیطان انسان کا
کھلا دشمن ہے؛ الغرض کہانتک مثالیں لکھی جائیں تمام کلام مجید اُن سے بھرا پڑا ہے لیکن اُنکے مطالعے سے عیاں ہو جاتا ہے کہ كَانَ النَّاسُ
اُمَّةً وَّاحِدَةً فَـ (۲: ۲۱۳) میں صرف ایک واقع الامر اور حقیقت کو بیان کیا گیا ہے، اور وہ حقیقت کبریٰ یہ ہے کہ کُل بنی آدم فی الحقیقت ایک ہی
گروہ ہیں، ایک دوسرے کے اعضا ہیں، انکی نوع ایک ہی ہے، ایک جیسی شکل صورت، ایک جیسے اعضا، ایک ہی آبا و اجداد، بلکہ آفرینش بھی ایک ہی
جوہر سے ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس وحدت نوع کے ہوتے ہوئے اُن میں بنائے نزاع و اختلاف طبعًا اور فطرتًا ناروا ہے۔ کارگاہ فطرت کے قانون
کے مطابق اگر کسی غیر انسانی نوع یا فرد کو وجہ پرخاش ہے تو صرف غیر نوع کے افراد سے۔ ہم جنس سے برسر پیکار اور آمادہ جدال رہنا
مقتضائے طبیعت ہرگز نہیں، اور نہ ادنیٰ مخلوق کی طرز معاشرت اس طریق عمل کی تائید کرتی ہے۔ اس آئین طبیعت کی طرف مجمل اشارات
مسئلہ ارتقا کے تحت المتن صفحہ ۱۲ میں کیئے جا چکے ہیں لیکن تفصیل کے لیئے ابھی وقت درکار ہے۔ بہر نوع زیر بحث آیت میں اس گرانقدر حقیقت
کو آشکارا کر کے کہا ہے کہ شارع کائنات نے انسان کو ایک ہی امت گردانکر انکی طرف مختلف اوقات میں مختلف انبیاءؑ کی وساطت سے 'الکتٰب'
یعنی اُن کا واحد لائحہ عمل بھیجا جو اگرچہ مختلف زبانوں میں اتارا گیا مگر اسکا منشا و ماحصل ایک تھا (وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ)۔ اس لائحہ عمل کا
مقصود بالذات نسل انسانی کو اجتماعی بقا کی بشارت دینا، یا عدم تعمیل کی صورت میں اجتماعی ہلاکت سے ڈرانا ہی تھا (فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ
مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ)۔ انبیاؑ کے پیغام کی نوعیت کے متعلق کافی بحث صفحہ ۷۸ کے تحت المتن میں ہو چکی ہے۔ اور یہاں بھی علیٰ ہذا القیاس اجتماعی
بقا کی بشارت مقصود ہے جو قانون خدا کی تعمیل کا طبعی نتیجہ ہے۔ 'الکتٰب' کے صحیح مفہوم کے متعلق زیادہ توضیح کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ آگے چلکر
دوسری جلد میں ہم نے ایک مستقل عنوان اس موضوع کے لیئے باندھا ہے، مگر اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ لائحہ عمل جو مختلف انبیا
کی وساطت سے آیا فی الاصل سب اقوام عالم کیلیئے ایک تھا، اور معقول بات بھی ماحصل یہی ہے کہ ایک خدا کی طرف سے ایک بنی نوع انسان
کی طرف ایک ہی پیغام ہو، خواہ اُسکے پیغامبر کئی مختلف اشخاص ہوں۔ اسی حقیقت کبریٰ کو مدنظر رکھکر قرآن حکیم نے بلا امتیاز سب الہامی

اعمال کی رہنمائی کرے اور اگر کسی امر میں اُن میں اختلاف پیدا ہو تو اُسکا قطعی فیصلہ کر دیا کرے لیکن جن لوگوں کو کتاب دیگئی تھی وہی لوگ اپنے پاس کُھلے کُھلے اور واضح احکام آئے پیچھے اُس کے مقاصد میں اُسکے معانی اور مطالب میں بیجا اختلاف محض آپسمیں ضد کے باعث کرنے لگے اور فرقے بن گئے۔ پھر آخر کار وہ راہ حق جسکے متعلق لوگوں میں اسقدر اختلاف پیدا ہو گیا تھا اللہ نے اپنے حکم سے ان ایمان والوں کو دکھادی اور اللہ تو اُسی کو راہ راست دکھاتا ہے جسکو مناسب سمجھتا ہے۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۸۹) کتابوں کو 'الکِتٰب'، کے جامع اور مانع لفظ سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ آگے چلکر واضح ہوگا، اور یہی وجہ ہی کہ سب انبیائے جہان کو منجانب اللہ تسلیم کرنا، اور اُن میں کوئی مابہ الامتیاز قائم نہ کرنا عین اسلام ہی۔ آیت زیر بحث میں بتایا ہے کہ 'الکِتٰب' اِس لیئے بھیجی گئی تھی کہ انسان کی اُمت واحدہ میں اگر کوئی جزوی یا فرعی اختلاف واقع ہو جائے، تو یہ کتاب جلیل اُسکے متعلق اپنا قطعی حکم دیکر اُس اختلاف کو مٹاتی رہے، اور بنی نوع انسان بدستور اُمت واحدہ بنے رہیں جیسے کہ وہ فطرتاً بنائے گئے تھے، (لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ)۔ بعد ازاں انسانوں نے آپس میں ضد اور ہٹ دھرمی سے ان روشن احکام (الْبَيِّنٰتُ) کو توڑ مروڑ کرنئے معانی پیدا کیئے اور الگ الگ فرقہ بندیاں کرلیں۔ کتاب خدا کے سب انسانی معاملات میں آخری اور قطعی حکم ہونیکے متعلق کئی آیتیں مقدمے کے اخیر (یعنی صفحہ ۹۱) میں پیش کر دی تھیں، مگر آیت زیر بحث سے عیاں ہے کہ 'الکِتٰب' کے بھیجنے اور انبیاءؑ کی بعثت کا مقصود بالذات نوع انسانی کو متحد الغرض اور متفق العمل کرنا ہی تھا، متفرق اور فرقہ بند کرکے ایک فریق کو دوسرے کے برخلاف لڑوانا مقصود نہ تھا۔ یہ اتحاد عالم کا برقرار رکھنا ہی اسلام کی تعلیم کا وہ درس اولین ہے جو اُسکے ہر صفحے سے عیاں ہے اور اسی کیلئے حتی الامکان سعی کرنا عین ایمان ہی، (فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا)۔ یہی سچی ہدایت ہی اور قرآن حکیم کی حکیمانہ لغت میں یہی صراط مستقیم کے مفہوم کی اہم شق ہے، (وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ)۔ صراط مستقیم کے مفہوم کی پہلی شق، یعنی علم فطرت کا حاصل ہونا صفحہ ۳۰ کے تحت المتن (آیہ ۲۴، ۳۴) میں، اور دوسری شق یعنی حفظ نفس صفحہ ۹، کے تحت المتن (آیہ ۱۵، ۱۶) میں بیان ہو چکی ہے۔ دیباچہ کتاب میں جو دعوے میں نے انبیائے کرام علیہم السلام کے ایک پیغام لانے کی بابت کیئے تھے اُنکی تصدیق یہاں پر بالصراحت ہو گئی۔

اس آیہ شریفہ کے مطالب میں نسیان مقاصد کے باعث معنوی تحریف اسقدر واقع ہو چکی ہے کہ مسلمانوں کے لیئے متذکرہ صدر مفہوم کا معترف بن جانا آج نہایت غیر مانوس معلوم ہوتا ہے۔ فرقہ بندی اور مذہبی تعصب انسان کے ہر رگ و پے میں اس شدت سے سرایت کر چکے ہیں کہ اسلام کو جامع ملل مذہب یقین کر لینا آج مسلمانیت کے منافی اکثر ہو چکا ہے۔ تاہم اگر غائر نظر سے حقیقت کی طرف دیکھا جائے تو ماننا پڑتا ہی کہ رب العالمین اور رازق گبر و برہمن خدا جسکے نزدیک سب انسان یکساں ہیں، اور جو سب کو کمال محبت سے پال رہا ہی، جسکے خزانۂ غیب سے سب یکساں انعام پا رہے ہیں، ایسا حکم دینا کیونکر گوارا ہو سکتا ہے جس سے انسان ایک دوسرے کو کاٹ کاٹ کر کھائیں، اُس روحانی باپ کی طرف سے اگر کوئی پیغام ہو سکتا ہی تو یہی کہ سب انسان مل جُلکر رہیں، اتحاد اور اتفاق سے رہیں، ایک حاکم اعلےٰ کے حکموں پر چلیں، شیطان کی ملازمت کم کریں، آپسمیں بھائی بھائی بنیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہی عین اسلام ہی، اور یہی اسلاف صالحین کے اِس قول کا صحیح مفہوم ہے کہ اسلام کے اندر کوئی فرقہ نہیں۔ قرآن حکیم کے بلیغ فی المطالب اور عمیق فی البیان ہونے کی یہ آیت ایک روشن شہادت ہی۔

قرآن کی عبارت کے متعلق ترتیل کے نشانات اور موز اوقاف اہل عرب نے نزول وحی کے بہت دیر بعد غالباً حجاج بن یوسف والی عراق کے ایما پر امیر عبد الملک (المتوفی سنہ ۸۶ھ) کے عہد خلافت میں لگائے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ قرآن کا صحیح علم سینوں کے اندر تازہ تر تھا۔ ایسی وجہ سے کو ملا کے نشان اور اوقاف کی علامتیں اکثر اوقات قرآن کے ربط کو معلوم کرنے اور صحیح مطالب کے حل کرنے میں بہت کچھ مدد دیتی ہیں۔ آیت زیر بحث میں كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً کے بعد علامت قف ہی جس سے مراد یہ ہی کہ مطالب کی تہ تک پہنچنے کیلئے کافی دیر تک ٹھیرنا ضروری ہی۔ اگرچہ پڑھنے والے کو یہاں پر مسلسل عبارت کا گمان ہوتا ہی۔ یہ دلیل بجائے خود اس امر کی شہادت ہی کہ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً کے وہ معنی نہیں جو اخلاف شارحین کے ہیکہ ہیں۔ انبیائے 27
کرام ہرگز اس مطلب کیلئے نہیں آتے تھے کہ فرقہ بند بنکر لوگوں کو آپس میں لڑائیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّآ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○ (۱۰: ۱۹)

اور انسان تو فی الحقیقت ایک ہی اُمت ہیں لیکن انہوں نے خدا اور کتاب خدا کے متعلق باہمی ضد اور ہٹ دھرمی سے اختلاف پیدا کر لیا۔ اور اے پیغمبر! اگر تیرے پروردگار نے انکو ایک معین مدت تک دنیا میں رکھنے کی پہلے سے ہی نہ ٹھان لی ہوتی تو جن باتوں میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں اب تک کبھی کا انکو صفحۂ ہستی سے معدوم کر کے فیصلہ کر دیا ہوتا۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۗ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ○ (۳: ۱۸-۱۹)

خدا کے نزدیک انسان کا سچا دستور العمل یہی اپنے آپ کو خدا کے ہمہ تن مطیع کر دینا ہے۔ اور اہل کتاب اگر "اسلام" کے اس جامع الناس مقصد کو غلط سمجھکر آپس میں ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے تو اس

یہاں بھی وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً سے مقصود ایک واقع الامر کو ظاہر کرنا ہے نہ کسی گذشتہ واقعے کو یاد دلانا: اس طرح کا وَمَا كَانَ کا استعمال قرآن میں بعض جگہ ہوا ہے مثلاً سورۂ شوریٰ کے اخیر میں: وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا (۴۲: ۵۱)، "اور یہ کسی بشر کی مجال نہیں کہ خدا اُس سے دوبدو ہو کر کلام کرے مگر وحی کے ذریعے سے"۔ علی ہذا القیاس سورۂ نمل میں ہے، مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا (۲۷: ۶۰)، یعنی "تمہاری طاقت نہیں کہ ان کے درختوں کو اُگا سکو"۔ اور سورۂ قصص میں مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ط ہے۔ یعنی "انکو کچھ اختیار نہیں ہے"۔
بہر نوع یہاں بھی صاف ظاہر ہے کہ منشائے خدا تمام عالم کو متحد کرنا ہے۔ اور یہ کہ انسان اپنی خود رائی کے باعث آپ متفرق ہو گیا ہے نیز یہ باہمی اختلاف اور ایک قوم کا دوسری قوم سے مجادلے اور محاربے کرنا رب زمین و آسمان کی نظروں میں وہ مکروہ اعمال ہیں جن کا فیصلہ وہ کسی دن کرے گا اور زیادتی کرنے والوں کو کماحقہٗ سزا دیگا!

ان آیاتِ جلیلہ میں "اسلام" کی حقیقت قطعاً عیاں ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام وہ صحیح طرز عمل (الدِّيْن)، وہ سچا انسانی دستور العمل (الدِّيْن)، اور خدا کا وہ طبعی آئین کار (الدِّيْن) (دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۶۱) ہے جس کا دوسرا نام ایک حاکم اعلیٰ کی ماتحتی میں رہکر اتحاد اور اصلاح بین الناس ہے۔ جو اختلاف پہلے حاملینِ "الکتٰب" میں قائم ہو گیا تھا وہ لوگوں کا خود پیدا کردہ تھا اور اس کا اصلی باعث انسان کی آئین خداوندی سے بغاوت تھی (بَغْيًا بَيْنَهُمْ)، ورنہ "الاسلام" اور "اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ" کی صورت میں افتراق قطعاً پیدا ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ ایک آقا کے کئی غلام یا ایک حاکم کے کئی ماتحت ملازم بشرطیکہ وہ اُسکے آقا اور حاکم ہونیکے دل سے مُقر ہوں اور اسکی طاقت سزا و جزا سے خوفزدہ ہوں آپسمیں پھوٹ پیدا نہیں کر سکتے۔ پس یہی اتحاد، یہی قانونِ خدا کے آگے سر جھکا دینا، یہی خدا کو خدا تسلیم کر لینا "اِسلام" ہے اور یہی ہدایت ہے، (فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا)۔ یہاں پھر اتحاد کو ہدایت کہا ہے۔ پہلے دو موقعے آیۂ (۲: ۱۳۷) صفحہ ۱۸۷ و (۲: ۲۱۳) صفحہ ۱۸۸ میں گذر چکے ہیں۔ فتتاحیہ اور دیباچہ کتاب میں میں نے بعینہٖ یہی اسلام پیش کیا ہے۔ دیکھو صفحہ ۷ افتتاحیہ و ۶۲ الخ دیباچہ

علم کے آنے کے پیچھے جو انکو نبیوں کی وساطت سے منشائے خدا کے متعلق ملا تھا۔ اور زیادہ تر اس
اختلاف کی وجہ آپس میں حسد ہی تھی لیکن جو شخص خدا کے صریح احکام کو پس پشت ڈالتے ہیں ان سے
بہت جلد حساب لے لیتا ہے۔ پس اے پیغمبر! اگر مشیت خدا کی اس کامل تشریح کے بعد بھی یہ لوگ
تم سے کٹ حجتی کریں (اور اپنی بزدلی، کم ہمتی، اور ہٹ کے باعث اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنے سے گریز
کریں) تو ان سے کہدو کہ میں تو خدا کے آگے اپنا سر تسلیم خم کر چکا اور جو لوگ میرے پیرو ہیں وہ بھی
اپنے آپ کو اللہ کے غلام بنا چکے۔ پھر ان اہل کتاب اور عرب جاہلوں کو کہو کہ کیا تم اس بات کے
لیے تیار ہو پھر اگر ہاں کریں تو بیشک راہ راست پر آگئے اور اگر منہ موڑیں تو اے پیغمبر! تم پر حکم
خدا کا پہنچا دینا فرض ہے اور بس۔ اور اللہ بندوں کے اعمال کو بغور تمام دیکھ رہا ہے۔

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ
وَلَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○ (۱۶: ۹۳)

ف اس آیۂ شریفہ میں امت واحد بن کر نہ رہنے کو بصراحت تمام ضلال کہا گیا ہے (يُضِلُّ مَن يَشَاءُ)، اور متفق و متحد بننے کو ہر جگہ
ہدایت سے تعبیر کیا ہے (وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ)، اور غور طلب الفاظ میں دہ کہی ہی ہے کہ تفریق و انتشار کی پرسش خدا کی جناب سے ضرور ہوگی
جیسا کہ آج مسلمانان عالم کو ہو رہی ہے، مگر وہ نہیں سمجھتے۔ یہاں "پھٹ" پڑ جانے کو ضلال، اور اتحاد و نظم کو ہدایت کہا گیا ہے۔ پہلی مثالیں صفحہ ۴۳، ۱۰۰ پر گذر چکی ہیں۔
اتحاد کو بالالتزام (۲: ۲۱۳)، (۳: ۱۰۳)، (۱۲: ۱۹)، اور (۱۶: ۹۳) میں ہدایت کے لفظ سے تعبیر کرنا قرآن حکیم کے حیرت انگیز
استقلال مطالب اور بے مثال تطابق کا وہ بدیہی ثبوت ہے جو ہر صاحب نظر پر واضح ہے۔
شَاءَ کا استعمال اس آیت میں تین بار ہوا ہے اور اس قیل المطالب اصطلاح کے متعارف مفہوم کو پیش نظر رکھکر بادی النظر میں اعتراض
ہو سکتا ہے کہ جب خدائے عزوجل نے انسان کو ایک امت بنانا نہیں چاہا، تو اس بیچارے کا اس میں کیا قصور ہے، اور جب خدا اپنے حسب منشا
لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور علی الحساب ہدایت دیتا ہے تو پھر ہم سے پرسش کیوں کرے گا اور کس عمل کو "كُنتُمْ تَعْمَلُونَ" سے تعبیر کرنا نا درست ہے۔
یہ اعتراض بجائے خود اس امر کی روشن دلیل ہے کہ شَاءَ کے وہ معنی قطعاً نہیں ہیں جو عوام نے لے رکھے ہیں۔ مشیت خدا کے متعلق مکمل بحث فلسفۂ
عمل کے عنوان (غالباً تیسری جلد) میں آئے گی اگر متذکرۂ صدر آیات کو پیش نظر رکھکر جو اختلاف پسندی انسان کے متعلق پیش ہوئی ہیں
ظاہر ہے کہ انسان کے اعمال ہی اختلاف کا باعث ہوتے رہے ہیں، خدا کا منشا ہرگز نہ تھا کہ انسان مختلف الغرض اور منتشر الحال ہو کر رہے لیکن
خدائے عزوجل چونکہ تمام فعلی کل شے ہے، اور اسکے بالمقابل انسان کا جزوی اختیار محض ہیچ ہے، اسلئے بلند مقام نظر سے یہ باہمی اختلاف
بھی جو انسان نے اپنے اعمال کے باعث پیدا کیا ہے لامحالہ اسکی مشیت کے مطابق ہو رہا ہے۔ اسکے دائرہ قانون و اقتدار سے باہر ہرگز
نہیں ہوتا۔ منشائے الٰہی اور مشیت ایزدی کے درمیان یہ ایک فرق ہے جس میں اور بھی بیان کر دیا جائے گا لیکن قرآن حکیم میں خدائے
عزوجل کے متعلق شَاءَ کا استعمال جہاں کہیں ہوا ہے اسی اصول کو پیش نظر بیشتر ہوا ہے اور اس آیۂ کریمہ میں "عَمَّا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ" کہہ کر
انسانی ذمہ داری کو قطعاً صاف کر دیا ہے۔ پس جب انسان ہی تمام اختلاف کا بانی ہے تو زیر بحث آیت کا ایک ہی مفہوم ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ
اگر خدا اپنا منشا کرتا (وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ)، بلکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق کرتا اور تمہاری مرضی کو اپنے منشا میں دخل نہ ہونے دیتا (وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ) تو
تم کو متحد و یکسو بنا تا اور قیامت تک یوں ہی بنائے رکھتا (لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً)، کیونکہ تم سب ایک ہی نوع کی مخلوق ہو

اگر اللہ اپنی مرضی کے مطابق کرتا تو تم کو ایک اُمت بنا کر رکھتا اور تم میں کبھی کسی اہم امر کے متعلق اختلاف نہ پیدا ہوتا۔ لیکن جسکو گمراہی کا اہل سمجھتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسکو درخورِ ہدایت دیکھتا ہے ہدایت دیدیتا ہے لیکن لوگو! یاد رکھو کہ یہ سب تفرقہ جو تم بذاتِ خود آپس میں پیدا کر رہے ہو اسکی باز پرس تم سے ضرور ہونی ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ
اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (۵: ۴۸)

اور اے ساکنانِ زمین! اگر خدا اپنی مرضی کرتا (لَوْ شَآءَ اللّٰهُ) اگر وہ اپنے حسب پسند کام کرتا (لَوْ شَآءَ اللّٰهُ) تو ضرور تم انسانوں کو ایک ہی اُمت بنا دیتا (تم سب کے سب متحد الخیال اور متفق الاعمال ہو جاتے اور

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۹۲) اور واحد الاصل ہو) یہاں اللہ کے لفظ پر زور ہے) لیکن چونکہ اُسنے تم اشرف الخلق اور ذی شعور انسانوں کو اپنے اعمال پر ایک بہت بڑی حد تک قدرت دے رکھی ہے اسلیے یہ اختلاف جو پیدا ہو رہا ہے تمہارے اپنے کرتوت سے ہے۔ اس صورت حال میں وہ خدائے عظیم بھی تمہارے اعمال کو دیکھکر جس قوم کو نااہل قرار دیتا ہے اپنی مشیت (یعنی قانون اور سنت اللہ) کے رو سے تفریق و شکست کی راہ ضلال دکھاتا ہے۔ (وَلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ)، اور جسکو بہرہ ور اہل سمجھتا ہے اپنی مشیت کے اٹل رو سے اتحاد عمل کا راہ راست دکھاتا ہے۔ (وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ)، لیکن لوگو! یاد رکھو کہ جو کچھ بھی تم کر رہے ہو اُسکی پرسش ضرور ہوگی۔ (وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ)۔

آگے چلکر ہم دوسری مجلد میں عیاں کر دینگے کہ خدائے خیر آفرین نے اپنی سب ادنیٰ حیوانی مخلوق کی ہر نوع کو جو انسان کی طرح اپنے میں کچھ اختیار و ارادہ نہیں رکھتی، اور جسکا ذاتی اقتدار منشائے خدا میں کچھ دخیل نہیں ہوتا، امت واحدہ ہی بنایا ہے اُن کے افراد کے مابین حقیقی اختلاف رونما نہیں ہوتا۔ وہ سب کے سب مختلف جماعتوں میں منقسم ہیں۔ لیکن آپس میں متحد اور متفق ہیں پس یہ انسان کا اپنی نوع کے ساتھ تخالف و تباین فی الحقیقت اسکی خود رائی اور صاحب اختیار و ارادہ ہونیکے باعث ہے ورنہ فطرت کا منشائے حکم اور کم ایک نوع کے افراد میں اتحاد ہی اتحاد ہے۔

٭ اس آیہ کریمہ سے اور بھی واضح طور پر عیاں ہو جاتا ہے کہ اختلاف کا اصلی باعث خود انسان ہی ہے: (بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ) اور خدا کی عین مرضی یہ ہے کہ بنی نوع انسان متحد ہو کر رہے۔ ملتخبرات کے صحیح مفہوم کی تشریح صفحہ ۱۳۹ کے تحت المتن میں ہو چکی ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ خدا کا کسی اُمت کو اجتماعی انعامات سے مشرف کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ اُمت مشیت ایزدی کے مطابق چل رہی ہے۔ (مثال کے طور پر گروہ اُمت اُمَّةً وَّاحِدَةً بنکر رہتی ہے اور فرقہ بند نہیں بنتی تو لامحالہ خزانۂ خدا سے بادشاہت یا آزادی وغیرہ کا انعام پاتی ہے۔ ابتلائے اقوام کے بارے میں ایک آیت مسئلہ ارتقاء کے تحت المتن صفحہ ۱۳ میں آ چکی ہے۔ اور یہاں بھی ظاہر ہے کہ اقوام عالم کے متعلق منشائے ایزدی انکا سعی عمل اور ایک دوسرے پر مسابقت ہی ہے۔ مسئلہ ارتقاء کو پیش نظر رکھکر اس آیت کا مفہوم اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

ملاحظہ آگے چلکر فلسفۂ عمل میں ہم ثابت کر دینگے کہ مشیت خداوندی الحقیقت اس کا قانون ہی ہے۔ جو قانون خدائے عزوجل نے روز اول سے بنا دیا ہے، اُسی کے مطابق عمل درآمد ہو رہا ہے، اُسیکے رو سے جزا و سزا مل رہی ہے اور وہی اُسکی مشیت ہے۔ ہر متعقل عالم کے شایان شان یہی ہے کہ ایک دفعہ سوچ سمجھکر قانون نافذ کرے اور پھر اسکے مطابق عمل کرنا اپنا فرض گردانے، حق الامکان اُسپر قائم رہے، بلکہ اُسکو ہر عارضی آسیب بچاتے رہے۔ خدا کی مشیت العیاذ باللہ کوئی استبدادی حقیقت نہیں کہ گھڑی میں ماشہ اور گھڑی میں تولہ بن دکھائے بلکہ وہ روز آفرینش سے اٹل ہے، ناقابل رد و بدل اور ناقابل ترمیم ہے، فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (۳۵: ۴۳)، یعنی اے مخاطب تو قانون خدا میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائے گا اور ہرگز کوئی تحول نہیں دیکھیگا۔

تم میں کسی امر کے متعلق کوئی کشمکش پیدا ہی نہ ہوتی) لیکن یہ صورت اختلاف جواب تمہاری اپنی خودرائی، خدا سے برگشتگی، اور ضلال کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اسلئے ہے کہ وہ خدائے عالمیان تم سب مختلف شدہ امتوں کا امتحان اُن ابلیتوں کے بارے میں لے جو اُسنے تم کو دی ہیں (لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَآ اٰتٰكُمْ)، تو اے انسانی امتو! تم بھی اس آزمایش میں پورے اُترنے، اور اس کشاکش عظیم میں فتح پانے کیلئے خداوند عالم کے بہترین اجتماعی انعاموں کی طرف مسابقت کرو (فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ) اور جانے رہو کہ تم سبنے خدا کی طرف لوٹنا، اور اُسکے حضور میں اپنے سعی و عمل کی جوابدہی کرنی ہے، پھر اُسدن وہ انسانوں کا خالق خدا تم کو اُس حقیقت حال سے آگاہ کردیگا جسکے بارے میں تم آپس میں اختلاف پیدا کرتے تھے!

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ [†] ۝ (۱۱: ۱۱۸-۱۱۹)

اور اے پیغمبر! اگر تیرا پروردگار اپنے منشا کے مطابق کرتا تو تمام لوگوں کو ایک امت بنا دیتا۔ لیکن یہ لوگوں کی شقاوت ہی کہ وہ ہمیشہ آپس میں اختلاف قائم کرتے رہتے ہیں۔ اور متحد اور متفق العمل ہوکر

---

† جو حیرت انگیز اور موت افزا معنوی تحریف کچھ مدت سے اِن دو آیاتِ جلیلہ کے مطالب میں بعض نا عاقبت اندیش مسلمانوں نے عمداً اور فطرتاً پیدا کردی ہے، جس دیدہ دلیری اور ابلیسی مکر و ریا سے وہ اِن آیات الٰہی کو سند گردانکر اپنی موجودہ فرقہ بندی اور شکست انگیز حالت کو "جبلت انسانی" بلکہ "مشیت ایزدی" پر محمول کرکے موت کی نیندیں لے رہے ہیں اور چار دانگ عالم سے ایک آواز اس تشریح کے برخلاف اُٹھتی دکھائی نہیں دیتی، اس سے آج عالم اسلام کے فقدان فہم و فکر کا خوب پتہ چلتا ہے اور یہ امر محقق ہو جاتا ہے کہ جب کسی اُمت کی اجتماعی موت قریب ہوتی ہے تو سمع و بصر اور قلب سلیم اُسکے افراد سے خود بخود رخصت ہو جاتے ہیں، اور اِذَا جَآءَ الْحِيْنُ لَمْ يَبْقَ اُذُنٌ وَّلَا عَيْنٌ کا سماں ہر طرف عملاً بندھ جاتا ہے۔ آج مسلمانوں نے 'وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ' کا یہ مطلب سمجھ لیا ہے کہ انسان فطرتاً اور خلقتاً اختلاف پیدا کرنے پر مجبول و مجبور ہے، اور وَلَوْ شَآءَ کا مکالمہ اسکی تائید میں ہے! اور اسی لئے مسلمانوں کی موجودہ حالت طبعاً اور حکماً لا علاج ہی، بلکہ اختلاف پیدا کرنا اور اُمت کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے شکست و ریخت کے جہنم کی طرف گھسیٹنا ہی 'رحمت' الٰہی کی علامت اور مشیت خدا کی تکمیل ہے! اس شرارت انگیز تعلیم کی تلقین آج ہر ملا سیفہ خورندا اپنے ماتم افزا حجرے میں بیٹھکر کبر و تمکنت سے کر رہا ہے اور اپنے زعم میں رب زمین و آسمان کی ایک اہم ہدایت کی تبلیغ کر رہا ہے۔ اور یہ سب نشر و تبلیغ صرف و نحو کے اُن خدا فرستادہ 'قاعدوں' کے تتبع میں ہو رہی ہے جن کے پیغمبر قطرب اور کسائی وغیرہم تھے، اور جنہوں نے اپنی مستبعد کے عمر میں کبھی کہدیا ہوگا کہ ذٰلِكَ کا مشار الیہ قریب کیلئے آتا ہے، اور اشارہ بعید کے لئے ذٰلِكَ کا لفظ وقف ہی۔ اس فرمان واجب الاذعان کے رُو سے ذٰلِكَ کا مشار الیہ 'مُخْتَلِفِيْنَ' ہی ہو سکتا ہے، 'اُمَّةً وَّاحِدَةً' نہیں ہو سکتا۔ اور اسی لئے رب زمین و آسمان اُن کے زعم میں اختلاف کا یکسر حامی ہے! یہ سب طرز استدلال ظاہر ہے کہ نہایت لغو اور شرمناک ہی۔ اور کسی ذہن سلیم کیلئے قابل التفات نہیں۔ یہاں پر اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ کے الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ اختلاف پیدا نہ کرنا اور امت واحدہ بنے رہنا رحمت خدا کی نشانی ہے، اور لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ کا اشارہ قدرۃً اسی رحمت مستمرہ کی طرف ہی، 'وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ' کے الفاظ کی طرف نہیں ہو سکتا

تو وہی رہتے ہیں جن پر تمہارا پروردگار رحم کرے۔ فی الحقیقت خدا نے انسانوں کو پیدا ہی ایسا کیا تھا کہ ایک اُمّت بن کر رہیں، لیکن اگر یہ اختلاف نہ مٹا تو فرمودۂ خدا پورا ہو کر رہیگا کہ ہم کیا جن اور کیا انسان سب سے دوزخ کو ضرور بھر دینگے، اور نافرمانیٔ احکام کا انتقام لیکر رہیں گے۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۹۴) وہ جا پڑے ہیں۔ لیکن اتحاد کا اسلامی تعلیم کا جزوِ اعظم ہونا چونکہ مسلمانوں کی موجودہ فرقہ بندیوں کا شدت سے مانع ہے اور آگے چلکر ایسی اُمّت کے کل جن و انس کو جہنم میں بھر دینے کی دھمکی بھی دی گئی ہے اس لیئے اُمّت حاضرہ پر جسکے اپنے تئیں کے ناخداؤں کے زعم میں جہنم کی آگ مدت سے حرام ہو چکی ہے اسکا اطلاق حتماً نہیں ہو سکتا! اس خوش اعتقادی کا نتیجہ بعض اوقات یہاں تک ظاہر ہوا ہے کہ لوگوں نے وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ تک ایک مضمون سمجھا ہے اور لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ کو نیا مضمون فرض کر کے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر گئے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض حلقوں میں جہنم والے آخری جملے کو پہلے مضمون کے ساتھ ملا کر پڑھنا ناروا سمجھا گیا ہے۔ اور دلیل یہ دی گئی ہے کہ جب اختلاف پیدا کرنے سے مشیت ایزدی کی تکمیل ہو رہی ہے اور یہی انسانی فطرت بھی ہے تو پھر اس میں انسان کا کوئی قصور نہیں، اور جہنم کی سزا بھی اس قصور کے متعلق نہیں۔

اصل کتاب میں ان آیات کے صحیح مطالب واضح کر دیئے گئے ہیں اور ہر صاحب نظر بطور خود سمجھ سکتا ہے کہ قرآن حکیم کس استقلال اور التزام سے جا بجا اتحادِ بنی نوع انسان کا حامی اور وحدتِ اُمّت کا مؤید ہے اور تناقض اور اختلاف کے انسانی عیب سے کسقدر متبرا ہے۔ لیکن آیۃ (۱۱: ۱۱۹) کے آخری جملے کے متعلق تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ کے معانی کی ضروری توضیح باقی ہے جو یہاں پر لکھدی جاتی ہے۔

سورۂ اعراف میں شیطان کے انسانی اغوا کے متعلق یہ معنی خیز مکالمہ درج ہے۔ جس پر آج ہر جگہ حرف بحرف عمل ہوتا ہوا ہر صاحبِ علم کو نظر آ رہا ہے:

قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ ثُمَّ لَآتِيَنَّهُمْ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ ۖ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ۝ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَدْحُورًا ۖ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ أَجْمَعِينَ ۝ (۷: ۱۶-۱۸)

پھر شیطان ربِّ زمین و آسمان کی جناب میں یوں گستاخی سے بولا کہ اے مالکِ کون و مکاں! جس طرح تو نے مجھے ناحق ناروا انسان کے مطیع ہو کر نہ رہنے اور اسکے آگے سجدہ نہ کرنے کے جرم میں جنت کے آرام دہ سبزہ زاروں سے نکالا ہے تو میں بھی بنی نوع انسان کی تاک میں تیرے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر بیٹھا رہونگا، پھر انکو اس صراطِ مستقیم سے بھٹکانے کی غرض سے طرح طرح کے لباس پہنکر اور قسما قسم کے مکر و فریب بچھا کے اٹھ کر کبھی آگے سے آؤنگا اور پیچھے سے جا ملونگا، کبھی داہنی طرف سے آ ملونگا، کبھی بائیں طرف سے آسلام کرونگا، اور جس طرح بن پڑے گا سادہ لوح انسان کو بہکا کر رہونگا، اور اگر میرا تیر نشانے پر بیٹھ گیا تو انسانوں میں اکثر کو تُو اپنا قدردان اور مطیع نہ پائیگا۔ شیطان کی اس انتہائی گستاخی پر خدائے عزوجل تمتما اٹھا اور فرمایا کہ باغِ بہشت سے یکدم نکل باہر ہو، اور ہمیشہ کیلئے ملعون اور مردود بنا رہو۔ لیکن بنی نوع انسان میں سے جس جس نے تیری پیروی کی ہوگی تو یہ میرا پکّا وعدہ ہے کہ میں بھی تجھے اور ان سب سے جہنم کو بالب بھر دوں گا۔

شیطان کی ماہیت سے یہاں پر بحث نہیں، اور نہ اسپر کہ یہ مکالمہ کیونکر ہوا اور کہاں پر ہوا لیکن ان آیات کے آخری جملے سے ظاہر ہے کہ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ والی آیت یعنی (۱۱: ۱۱۹) میں اسی قول کی طرف اشارہ ہے۔ صفحہ ۱۸۸ کے تحت المتن میں آیت (۲: ۲۱۳) کی تشریح کے ضمن میں ہم ابھی ابھی بتا آئے ہیں کہ اتحادِ اُمّت ہی صراطِ مستقیم کی ایک اہم شق ہے۔ پس شیطان کا صراطِ مستقیم سے ورغلانا انسانوں کے درمیان نفاق پیدا کرنا ہی ہے۔ اور اسی اختلاف کی سزا میں شیطان اور انسان دونوں کو جہنم میں بھر دینے کی دھمکی دی گئی ہے اور صاف فرمایا ہے کہ جو قوم اس طرح پر شیطان کی متابعت کرے گی اسپر یہ قول پورا ہو کر رہے گا۔ بعینہٖ اسی طرح کا مکالمہ سورۂ صٓ میں ہے:- (باقی)

تمکنِ اسلام و نقشِ توحید

كُونُوا قَوّٰامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ (۴: ۱۳۵)

خدائے وجود کی گواہی دیتے ہوئے اعتدال پر قائم رہو

آہ! یہ وہ ماحیٔ اختلاف، متحد الاعمال، اور جامع الناس اسلام تھا جس کا آماجگاہ سعی روئے زمین پر ایک اُمّت کا قیام تھا۔ فطرت کی اساسی وحدت اور اتحاد، اور اولادِ آدم کے طبعی اور ذہنی

(تتمہ تحت المتن صفحہ ۱۹۵) قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝ قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ ۝ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ (۳۸: ۸۲-۸۵)

اس پر شیطان لعین نے کہا کہ مجھے تیری عزت کی قسم کہ میں بھی ماسوا اُن چند بندوں کے جو خالصۃً تیرے ہی غلام ہیں اور جو میرے بس کے نہیں باقی سب کو گمراہ کر کے رہونگا۔ ربّ لم یزل نے فرمایا کہ بہت خوب تو نے اپنا عندیہ سچ سچ کہہ دیا اصحاب میں بھی سچ ہی کہتا ہوں کہ اگر یہی ہوا تو ہم بھی تم کو بمع تمہارے چیلے چانٹوں کے جہنم میں بالب بھر دینگے۔

یہاں مِنْكَ کی تخصیص سے ظاہر ہے کہ انسانوں کے سوا خود ابلیس بھی جہنم میں بھر دیا جائیگا۔ گویا آیت زیر بحث یعنی (۱۱: ۱۱۹) میں مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ کے الْجِنَّةِ سے مراد شیطان یا وہ شیاطین کا گروہ ہے جو انسان کو صراط مستقیم سے منحرف کر دیتا ہے۔ میں اس موقع پر حقیقت شیطان یا ماہیت جن کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ صرف اپنے قول کی تائید مزید میں سورۂ کہف کی آیت كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ (۱۸: ۵۰) کو پیش کرتا ہوں جہاں بصراحت تمام ابلیس کو از قسم جن کہا گیا ہے جس نے حکم خدا سے سرتابی کی تھی۔ جہنم کو بھر دینے کا ایک اور اشارہ سورۂ سجدہ میں ہے:

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ (۳۲: ۱۳)

اور اگر ہم اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتے (وَلَوْ شِئْنَا) (یہاں بھی آیہ (۱۱: ۱۱۸) صفحہ ۱۹۴ کی طرح شِئْنَا کے نا پر زور ہے) اور انسانی اختیار و ارادے کو اپنے منشا میں دخیل نہ ہونے دیتے تو ہم منصوبا بالضرور ہر فرد متنفس کو اُسکے صراط مستقیم اور صحیح راہ عمل (هُدَاهَا) پر چلا دیتے ہیں اور وہ ہدایت لامحالہ یہی امت واحدہ بننے کی ہدایت ہوتی، لیکن چونکہ انسان اصلاً خود رائے ہے اور ہدایت کو من و عن مان لینا کسر شان سمجھتا ہے اس لیئے لامحالہ میرا وہ قول پورا ہو کر رہے گا جو میں نے شیطان سے کیا تھا کہ میں منصوبا بالضرور جہنم کو جن و انس سب سے لبالب بھر کر رہوں گا۔

یہاں وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا اور لَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً میں معنوی ترادف عیاں ہے کیونکہ ہدایت کے قرآنی معانی کی ایک اہم شق ہم اتحادِ امت ثابت کر چکے ہیں (دیکھو صفحہ ۱۹۲) اور یہاں پر اس مفہوم کی تائید مزید ہوتی ہے۔

بہر نوع اِس تمام استدلال کو پیش نظر رکھکر یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ امّتِ واحدہ بنے رہنا فطرت انسانی ہے اور منشاء الٰہی کے عین مطابق ہے، اختلاف کی سزا شکست ریخت کا جہنم اس دنیا میں، اور آخرت میں اس سے بدترین حالت ہے۔ اسلام تمام عالم کو توحید کے نصب العین پر متفق العمل کر کے امت واحدہ بنانے آیا تھا، فرقہ بندیاں پیدا کرنا اسکا آل کار ہرگز نہ تھا۔ سب انبیاءؑ کو منجانب اللہ تسلیم کر لینا، سب الہامی کتابوں کا نفس موضوع ایک سمجھنا، ایک خدا کی ملازمت پر متفق العمل ہو جانا، ایک حاکم اعلیٰ کو ماننا، اور اُسکے سوا کسی دوسرے رب کے پیچھے لگ کر فرقہ بند نہ بننا، اسلام کی اصلی تعلیم تھی۔ اُمّت واحدہ بنے رہنا اسکا بتایا ہوا صراط مستقیم تھا، متحد للغرض اور متفق العمل رہنا اسکی ہدایت تھی۔ یہی الهُدٰی اور دِيْنُ الْحَقِّ کا صحیح مفہوم تھا (دیکھو آیہ (۶۱: ۹) صفحہ ۱۸۲) اسی فطرت کے عظیم الشان اصل اصول کو لیکر رسولؐ آیا تھا اور سب کا نتیجہ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ تھا۔ اسی پر عمل کر کے قرنوں تک مسلمان عالم پر غالب رہے، اسی پر آج سب مغرب چلکر غالب آ رہا ہے، یہی وہ دین فطرت کی ایک اہم شق ہے جس پر تمام عالم مجبول ہے (فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۳۰: ۳۰)) اور اگر آج مسلمان اس سبق کو بھولکر شکست پر شکست کھا رہے ہیں تو اسکی وجہ بھی اسی دین فطرت سے انحراف کے سوا اور کچھ نہیں!

ائتلاف کی طرف یہ آخری بازگشت تھی جسکا اولین پیشِ نہاد ساکنانِ عالم کو پابندِ خدا، اور بریدہ ماسواکے ایک کر دینا تھا! دینِ اسلام کی صلائے عام (۱۳: ۹۳، ۸۳:۳، ۵۱:۲۱) انسان کی اعتقادی اور نسلی، ملکی اور تمدنی تفریق و تحزیب کے برخلاف وہ عربدہ جو صدا، اور آمادہ پیکار آواز تھی جس سے عہدہ برآ ہونے کی شرط وحید توحید کا عملی اقرار، اور بندگی خدا کا عملی اعتراف تھا، وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ؁ (۳: ۸۵)، فَادْعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ؁ (۴۰: ۱۴) بین الملی مصالحت اور جنسی اتحادِ عمل کی یہی وہ طبعی اور قابلِ تسلیم بنا، اور یہی وہ مشترک اساس تھی جس پر خلقِ خدا کے اجماع و ائتلاف کا امکان ہو سکتا تھا! اس اللّٰہ احد کی عملی اور نتیجہ خیز للکار میں ہی وہ آسمان شگاف

---

۵۱ اور جو شخص اس عملی اسلام کے سوا کسی اور مذہب عمل کی تلاش میں ہوگا، اُسکا وہ مسلک ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوگا، اور یا آخرت زیاں کاروں میں سے ہوگا۔

۵۲ تو اے ایمان والو! اپنی تمام ارادتمندی اور عقیدت کو اُسی خدا کے لیے مخصوص کر کے اُس کو پکارا کرو، اگرچہ منکرینِ خدا کو بُرا ہی کیوں نہ لگے۔

✤ یہ آیہ شہیرہ قرآن حکیم میں صفحہ ۸۳ کے متن کی آیہ قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ؁ (۳: ۸۴) کے عین بعد واقع ہوئی ہے۔ دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ الْإِسْلَامُ درحقیقت انبیائے جہان کو صرف ایک پیغام اور الکتب کا حامل سمجھنے، اُن میں سے کسی ایک کو دوسرے سے الگ مذہب کا موجد نہ تعیین کرنے، بنی نوع انسان کو مشترک اساس عمل پر لانے اور خدا کو قول و عمل میں حاکمِ اعلیٰ تسلیم کر کے اسکے قانون پر عمل کرنے کا نام ہے۔ یہی وہ راہ عمل (دین) تھی جسکے سوا کوئی اور طرزِ عمل اختیار کرنا خدا کی نظروں میں پسندیدہ نہ تھا، (فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ) گویا تفرقہ ایجاد بنتا، عمل میں اتحادِ انسانی کو پیشِ نظر نہ رکھنا، اور اپنے سعی و عمل کا مطمحِ نظر اصلاح بین الناس نہ بنانا وہ شیوہ کار ہے جسکا نتیجہ بہت بُرا ہے، جس کا انجام شکست و ریخت ہے، (وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ) جس میں بالآخر نامرادی ہی نامرادی ہے۔ یہ دونوں آیتیں اسلام کو مجسمۂ اتحاد ثابت کرنے میں بے مثل ہیں مگر آج لوگوں نے آیہ وَمَنْ يَبْتَغِ کا مطلب یہ سمجھ لیا ہے کہ جب تک کوئی قشقہ نما برہمن اپنی چُٹیا کاٹ کر، اور زنّار توڑ کر کسی امام مسجد کے ہاتھ پر اُس کے کہنے کے مطابق کلمۂ شہادت نہ پڑھ لیگا، اور بعد ازاں ٹخنوں تک کے پائینچے والے پاجامے اور شرعی جبّہ و دستار کو تا دمِ موت اپنا اسلامی شعار نہ بنائے گا تب تک اِس بے چارے کو قیامت کے دن گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ گویا آخرت کو سنوارنے کے لیے اس ہیئت کذائی میں ہونا لازمی ہے اور ربِ زمین و آسمان اسی طرح کی قطع کی ہوئی قمیص و ازار کو پسند فرماتا ہے۔ کسی دوسرے خیاط کے ہاں کا بنا ہوا کپڑا اُسکو پسند نہیں۔ آہ! قرآن حکیم کے الفاظ اُسی طرح باقی ہیں صرف روح نکل چکی ہے۔ اور بلکہ کسی حقیقت شناس اور دقیقہ رس قوم کے جسم کی کمیں بن رہی ہے! مگر جس قوم میں حلول کر گئی ہے۔ اُس کی رگ رگ میں تیز کرانتیں حیات کا طلاطم خیز خون ٹھاٹھیں مار رہا ہے مسلمان لاکھ بار اپنے اس شرعی اور صورت انگیز اسلام کو اسلام سمجھتے رہیں لیکن اسلام وہیں ہے جہاں اُس خدائے بے نیاز اور حاکم عادل کیطرف سے قبولیت کی سند مل رہی ہے، جہاں طاقت اور حکومت عزوشرف کا دریا اُمڈ رہا ہے جہاں سلطنتیں لونڈیاں بنی ہوئی ہیں، جہاں بادشاہت زمین کی عروس جلوہ گر ہے۔ جہاں دولت، وقار، رعب اور حکم کی دیویاں ہاتھ باندھے کھڑی ہیں نہ کہ جہاں سب طرف عجز و سکنت ہی خوفناک بھاگی ہے، مانگے ہوئے ٹکڑوں پر گذراں ہے اور جوئیں جزو بدن ہو رہی ہیں!

۵۱ کملہ صفحہ ۱۰۰ و ۱۰۱۔

طاقت، اور وہ انجذابی اثر پنہاں تھا جو ہر مقامی نصب العین، اور ہر نسلی مطمح نظر کو نالائق التفات کر دیتا تھا؛ اسی حقیقت کی عالم آرا عظمت، اور مستم بالشان نافعیت[+] کے باعث مومن کا ایمان ایثار کا لازوال مصدر، اضطراری عمل کا عظیم الشان پیکر، اور ہجوم قوت کا بے خوف و خطر مسکن بن گیا تھا۔ لیکن یہ توحید ہی وہ مسکنِ قلب اور مزکّی نفس دوا تھی جو غلبے کے مسکر اثر کے باوجود قدم قدم پر بہیمی جذبات کو مشتعل ہونے سے روکتی تھی، جو بڑے سے بڑے دشمن کے بالمقابل رِفق و مساحت، حُسنِ معاملت اور اخلاق کے ملکوتی صفات کو ہر مومن کے قلب میں موجزن کیئے رکھتی تھی، جو احتساب نفس کی پیہم قطع و برید کے باعث اُسکے ادنیٰ سے ادنیٰ عمل کو بھی حدِ اعتدال سے گذرنے نہ دیتی تھی، جو حق خدا کی ہر دم محافظ، اور حقوق عباد کی ہر آن نگران تھی، جسنے حُسنِ اخلاق کی ربانی فضیلتیں، اور خوفِ خدا کی قدوسی بزرگیاں ہر متنفس کے اعمال میں جاری و ساری کر دی تھیں، جسکے صحیح نقش نے مومنوں کے زندہ قلوب میں باہمی محبت کا حس، اور یک رنگی کی لہر دوڑا دی تھی، جسکے مصلح اعمال اثر نے مسلمان کی زندگی کو ہر انسان کے لیئے قابلِ تقلید نمونہ بنا دیا تھا۔ اسی توحید کے نفع مند اور نتیجہ خیز یقین نے، مسلمانوں کے روزانہ معاملات میں بلا تفریق قوم، اور بلا امتیاز مذہب راستی اور صلاحیت پیدا کر دی تھی: بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ۝[۱] (۳: ۷۵)؛ میدانوں میں لڑنے والے یہ شیر ببر، اور پہاڑوں سے ہاتھاپائی کرنے والے یہ

---

[۱] سچ تو یہ ہے کہ جو شخص بھی اپنے عہد پر قائم رہا، اور خوفِ خدا کے باعث بد معاملگی سے بچا تو اللہ تقویٰ کرنے والوں کو بیشک دوست رکھتا ہے۔

[+] توحید کے متعلق میں نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ اس کا اصل نتیجہ اتحاد قلوب ہے علیٰ ہٰذا القیاس جو قوم متحد ہے اُسکے افراد کے دلوں میں توحید بس رہی ہے! چونکہ سب ایک کام کر رہے ہیں اسلیئے اُنکا آقا بھی ایک ہی ہے جو قوم متفرق ہے اُسکے خدا بھی الگ الگ ہیں بلکہ اُسکا خدا درحقیقت شیطان ہے جا بیجا عداوتیں دلکشا رہتا ہے ہر شخص اپنے اپنے خدا میں منہمک ہے۔ اسی لیئے تعاون عمل کی کوئی صورت پیدا ہو نہیں سکتی۔ یہی راز اللّٰه اَلَّفَ بَیْنَهُمْ (...) کے الفاظ میں مضمر تھا۔ اسی نقطۂ نظر سے توحید کی ...

[+] یہاں ایفائے عہد کو اتقائے الٰہی پر محمول کیا گیا ہے گویا جو شخص اپنے قول کا پکا اور معاملے کا راستباز ہے وہ خدا سے صحیح معنوں میں ڈر رہا ہے۔ اُسکو اللہ کے ہر دم حاضر و ناظر ہونے کا یقین ہے، وہ فی الحقیقت اُس پاک ذات کو اپنے اور فریق ثانی کے درمیان گواہ یعنی شاہد اور ضامن ٹھیرا کر عہد کرتا ہے، اور پھر ایسی جلیل القدر ذات کی ضمانت میں اُس عہد کو نباہنے کے لیئے اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتا۔ ایسا کھرا شخص اور ایسی خوش معاملہ قوم بلاشبہ خدا کی دوستی کے قابل ہے: اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ۝۔ سورۂ نحل میں ہے:

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْكِیْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَیْكُمْ كَفِیْلًا اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ۝ (۱۶: ۹۱)

(باقی)

جانباز بطل، اسلام کی تنبیہی صدا اور اللہ کے امر و نہی کے آگے یوں جُھک گئے تھے کہ اُنکے اعمال کو دیکھ کر بعض اوقات ان کی بشریت پر گمان گذرتا تھا! وہ سلاطین عالم پر تحکم کی نظر رکھتے تھے، مگر استکبار و تعلّی کا

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۹۸) اور لوگو! جب جب کسی شے کے کرنے کا اپنے دل میں عزم مصمم کرلو تو اس خدا سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کرکے رہو، اور یہی نہیں بلکہ ان معاہدوں کو جنکو تم اپنے داہنے ہاتھوں (الایمان) کو ایک دوسرے سے ملا کر کرتے ہو، پکا کئے پیچھے نہ توڑو کیونکہ اگرچہ معاہدہ دو شخصوں ہی کے درمیان ہوا ہے مگر تم فی الحقیقت خدا کو اپنا ضامن ٹھہرا چکے ہو اور اس میں شک نہیں کہ جو کچھ تم کرتے ہو خدا اُس سے بخوبی واقف ہے۔

اسلام نے ایفائے عہد کو ہر حالت میں سختی سے برقرار رکھنا اپنے پر اسقدر لازم کر لیا تھا کہ عین اُسوقت جب کہ اکیس برس* کی مسلسل سعی و عمل کے بعد مدینے میں مسلمانوں کی اجتماعی طاقت اوج کمال پر پہونچ چکی تھی، جب دشمنان دین کو خدا کی جناب سے قتال کی صلائے عام مل رہی تھی اور برارت کی آیتیں نازل ہو رہی تھیں، رب عز و جل نے مسلمانوں کو عہد پورا کرنے کی بہر حال تلقین فرمائی اور کہدیا کہ میری دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ میری ضمانت رسوا نہ ہونے پائے، جبتک عہد ہو چکا ہے تب تک قائم رہے بعدازآں تمہارا اختیار ہے لیکن اُس سے پہلے دشمنوں کو چھیڑنا اتقائے خدا کے برخلاف ہے:

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝ (۹:۴)

ہاں یہ سب کرو لیکن دشمنان دین میں سے جن لوگوں کے ساتھ تم نے صلح کا عہد و پیمان کر رکھا ہے، اور بعدازآں انہوں نے ایفائے عہد میں تمہارے ساتھ کسی طرح کی کمی نہیں کی، اور نہ تمہارے مقابلے میں کسی کی مدد کی، وہ مستثنیٰ ہیں۔ اُن کے ساتھ جو عہد و پیمان ہے اسے اس مدت تک جاننے کے ساتھ ٹھیک ٹھیک پورا کرو اور جانے رہو کہ خدا سب سے زیادہ انہی لوگوں کا دوست ہے جو اس کے صحیح معنوں میں ڈرتے رہتے ہیں اور بہر حال اُسکی آبرو کو برقرار رکھتے ہیں۔

یہاں چند سورتوں کے تفاوت کے بعد ایفائے عہد کے بارے میں پھر وہی إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ کے الفاظ دہرانے، اور تکمیل عہد کو اتقائے الٰہی پر محمول کرنا قرآن کے حیرت انگیز تطابق اور اتحاد مطالب کا بدیہی ثبوت ہے۔

عہد و پیمان کو برقرار رکھنا، اسمیں ذاتی اغراض کو بہر حال حائل نہ ہونے دینا، ہر دم خدا کو فریق ثالث سمجھتے رہنا، اور ایفائے عہد کا اطلاق بلاتفریق رنگ و نسل ہر قوم پر کرنا وہ عظیم الشان سیاسی اصول ہیں، جنپر ہر سلطنت کی بنیادیں استوار ہوتی چلی آرہی ہیں۔ جبتک مسلمانان عالم نے اس اہم اصول کو برقرار رکھا وہ تمام عالم کے بادشاہ بنے رہے، جب اُن سے یہ حبل متین چھوٹ گئی، اور مغربی اقوام کی استواری عہد کی دھاک بیٹھی تو مغرب کو ایشیائی اقوام پر تسلط ممکن ہوا اور حقیقت کو دُنیا پر آشکار ہو کر نصیب ہوا کہ دنیا عش عش کر اٹھی، اور آج جبکہ انگلستان کے عدم اتحاد و بدعہدی کا چرچا ہر جا ہو رہا ہے تو اُسکے رعب و وقار کی بنیادیں بھی اس تیزی سے ہل رہی ہیں کہ ہر صاحب نظر قانون خدا کے اٹل ہونے کا ثبوت پاکر کپکپا جاتا ہے۔

قرآن حکیم کے عجائب خانے کے اندر وہ آیتیں وہ عزیز القدر جواہر ریزے ہیں جو قرنوں کے اندر لپٹے ہوئے موجود ہیں، انکی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانا، انکی حکمت عالیہ کی تہ تک پہونچنا ناشناس کا کام ہرگز نہیں! یہ وہ انمول موتی ہیں جنکو نا اہل کا ہاتھ لگنا بھی جائز نہیں، وہ جو سنگ و خزف سمجھکر پھینک دیگا، اُسکے اُلٹے سیدھے معانی کرکے دلیں اساطیر الاولین سمجھ لیگا۔ لیکن جن قوموں نے ان کشور کشا اصول کو لیکر خزانہ غیب سے انعام پائے ہیں وہی ان الفاظ کو سمجھیں گی، نادان کیا سمجھے اور کیا پائے۔ اسکا پلید دماغ اور ناروا زبان قرآن کے پاکیزہ مقولات کو معرض بحث میں لاکر در حقیقت پلید کر رہا ہے اور اسی لیئے قرآن عظیم کو ایسے شخص کے ہاتھ لگنے سے چڑ ہے:

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ۝ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۝ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۝ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ (۵۶: ۷۷-۸۰)

* سورۂ برارت کی پہلی آیتوں کا نزول سنہ ۹ھ میں ہوا تھا گویا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کو اکیس برس گذر چکے تھے۔

اُن میں نام نہ تھا؛ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ۵۱ ٥ (۱۷: ۳۷)؛ وہ آسمان کی زمینوں پر تمکن سے کے چشم براہ تھے، مگر اللہ کی اِس زمین پر دھیمے چلتے تھے! وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا ۵۲ ٥ (۲۵: ۶۳)؛ مغرور و متکبر شہنشاہوں کے تاج آئے دن

---

۵۱ اور اے انسان! میری اِس زمین پر اکڑ کر مت چلا کر کیونکہ اِس دھاکے کے ساتھ چلنے سے تو زمین کو پھاڑ نہیں سکیگا، اور نہ تن کر چلنے سے تو پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکیگا۔ ۵۲ اور اللہ کے پیارے بندے تو وہ ہیں جو اِس زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں، اور جب کم علم اور لغو ران آدمی اُنسے بحث مباحثہ کریں تو سلام کہہ کر ٹال دیا کریں۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۱۹۹) لوگو! یہ قرآن عظیم بڑی ہی عزیز القدر کتاب ہے۔ اسکے اندر کے جواہر ریزے اوراق میں تہ در تہ اس طرح لپٹے ہوئے ہیں کہ قدر شناس لوگوں (المتقین) کے سوا کوئی اسکو چھونے نہیں پاتا، کوئی اسکی تہ کو نہیں پہنچتا، اسکی عظیم الشان نافعیت کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ ہائے کے اندھیرے بھاگو ہر کیوں نہیں یہ تو پروردگار عالم کی طرف سے اتارا ہوا کلام ہے!

سلطنت کے امورِ عالیہ تو یک طرف، ذاتی اور چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی آج مسلمان کو قطعاً حس نہیں رہا کہ وعدہ کیا شئے ہے، اسکے ایفا کے کیا معنی ہیں، وہ کس سبیل کا نام ہے، اسکے کرتے ہی کسقدر اہتمام کی ضرورت ہے، خدا کے نزدیک اسکا پورا کرنا کسقدر محبوب ہے۔ اسلاف صالحین کے نزدیک کریم النفسی بلکہ مردی یہی تھی کہ وعدہ بہر حال وفا ہو خواہ اسکے ایفا میں جان چلی جائے (نحیہ الکریم آنا وعد وفی)۔ اور قول موئس جان اردو کے مقولہ اسکی شہادت میں ہیں۔ لیکن آج بدعہدی اور نایادہی کا شیوۂ زنان مسلمانوں میں اسقدر سعواج پا گیا ہے کہ مرد ایک نظر نہیں آتا۔ یورپ کی قومیں مقابلۃً اب بھی بدرجہا اچھی ہیں، ان میں ایفائے عہد کا خاص اہتمام ہے، پابندیِ وقت یہ ہے، زمین و آسمان ٹلجائے لیکن ادسط مغربی اپنے وعدے کو ٹال دینا نامردی سمجھتا ہے اور اسی لیئے صحیح معنوں میں متقی ہے، محبوب خدا ہے، اور اسی محبوبیت کے صدقے میں بادشاہت زمین کا انعام پا رہا ہے!

♦ تکبر نہ کرنا اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنا جہانبانی، حکمرانی، اور عزیزی کا وہ عظیم الشان اصل اصول ہے جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے متکبر و فرعون اعمال اقوام کی بادشاہت کے تختے اپنی آنکھوں سے الٹتے دیکھے ہیں۔ آج مغرب کے متمرد و ناانجام شناس حاکموں کی اپنی رعیت سے فرعونی سلوک کا دردناک نتیجہ ہندوستان کی مسافر نواز اور غیر پرور زمین میں سے دیکھ رہا ہے کہ برطانیہ کی عالم آرا سلطنت کی بنیادیں سو برس کی نہایت قلیل مدت میں متزلزل ہو چکی ہیں، وہاں پر حکومت کے آثار قطعاً باقی نہیں رہے، اعتماد کا اکثر حصہ کالعدم ہو چکا ہے، رعیت کے دل بگڑ چکے ہیں، اور اگر نظام سلطنت باایں ہمہ باقی ہے تو کشت و خون و تعدی کے ذریعہ سے جڑ کھوکھلی ہو چکی ہے، اور کوئی انسانی تجویز آج اسکو مضبوط نہیں کر سکتی۔

♦ اِس آیۂ شریفہ میں منکسر المزاج اور فروتن انسانوں کو "عِبَادُ الرَّحْمَٰنِ" کا خطاب دیا گیا ہے۔ گویا ایسا اخلاق پیدا کرنا صحیح معنوں میں خدا کی عبادت ہے۔ جو شخص اِس قطع کا ہو، ہر ایک سے نہایت اخلاق سے پیش آنے، عجب و غرور کا اُسمیں نام تک نہ ہو، اور جو بڑے سے بڑا دنیاوی مرتبہ رکھنے کے باوجود خوش خلقی سے پیش آئے وہ فی الحقیقت خدا کی خدائی سے مرعوب ہے، اپنے آپ کو اُسکے بالمقابل ہیچ سمجھتا ہے، سب انسانوں کو برابر یقین کرتا ہے، اور اسی لیئے صحیح معنوں میں اُسکا بندہ (عبد) ہے۔ علی ہذا القیاس جاہل اور کم علم آدمی سے بحث نہ کرنا اور حکمت عملی سے اسکو ٹال دینا بھی عبادت میں داخل کیا گیا ہے گویا باوجودیکہ تمام انکسار طبیعت کے لغو اور لایعنی آدمیوں کی صحبت سے حتی الوسع اعراض کرنا بھی ملازمت خدا میں شامل ہے۔ سورۂ قصص میں صاحب ایمان لوگوں کی تعریف میں ہے:

وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ ٥ (۲۸: ۵۵)

اُن کے قدموں پر نچھاور ہوتے تھے، مگر اُن کے انکسارِ طبع، اُنکی لینتِ دل، اُنکی ملائمتِ سلوک، اُن کی نیچی نظروں میں فرق نہ آتا تھا؛ فرمانروائی کی اُمنگیں، اور جہانبانی کے ولولے اُن کے دلوں میں موجزن تھے مگر طبائع میں وہی سادہ پن اور خاکساری، وہی اطاعت کیشی اور اللہ کا شغف، وہی فکرِ انجامِ قوم اور ناموسِ اسلام کا پاس گھر کر گیا تھا۔ انکی زندگیاں فطرت کے اعتدال کی صحیح تصویریں، اور انکے دل خشیتِ خدا کے مستقل نشیمن بن گئے تھے: قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ (۷: ۲۹)؛ اُن کا ہر عمل اور ہر شغل ربّ

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۰۰) اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کسی لغویات کو سنتے ہیں تو اس سے حتی الوسع کنارہ کش ہو جاتے ہیں، اور ایسے لوگوں سے کہہ دیتے ہیں کہ بھائی جو ہم کرتے ہیں اسکا نتیجہ ہم کو ملیگا اور جو تم کرتے ہو تمہارے ساتھ ہے۔ آپ مہربانی فرمائیں اور ہم کو اس بحث میں شامل نہ سمجھیں، خدا کی سلامتی تم پر ہو لیکن ہم ان لوگوں کی تلاش میں نہیں جو علم نہیں رکھتے اور بے علم الجھیں ہوئے ہیں۔

یہاں پر قریب قریب یہی مضمون ہے جو زیر بحث آیت (۲۵: ۶۳) میں ہے۔ بلکہ قَالُوْا اور سَلٰمٌ اور الْجٰهِلِيْنَ کے الفاظ بھی مشترک ہیں اگرچہ سَمِعُوا اللَّغْوَ کا مضمون آیۂ (۲۵: ۶۳) میں بالصراحت بیان نہیں کیا گیا بلکہ آگے چل کر اسی سورۃ میں عِبَادُ الرَّحْمٰنِ کی تعریف کے تسلسل میں بیان کیا گیا ہے؛ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۲۵: ۷۲)، یعنی خدا کے بندے وہ ہیں جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب کسی بیہودہ مشغلوں کے پاس سے گزرتے ہیں تو بے نیاز ہو کر گزر جاتے ہیں۔ اس تکرار کو پیش نظر رکھو وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۲۵: ۶۳) اور وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۲۵: ۷۲) کے دو قریب المعانی مضامین میں ایک ہی بیان کے سیاق میں واقع ہوتی ہے، مجھے خیال پیدا ہوا ہے کہ اول الذکر آیت میں جٰهِلُوْنَ سے مراد کم علم اور اُجڈ لوگ نہیں بلکہ ناواقف اور ناآشنا لوگ مقصود ہیں جیسا کہ سورہ بقرہ میں مستحق زکوٰۃ فقراء کے بارے کہا گیا ہے؛ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاۤءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (۲: ۲۷۳) یعنی یہ فقراء وہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے اور اپنے مال و جان کو لٹانے والے ستِ الست لوگ ہیں کہ ناواقف ان کی ظاہرا بے نیازی اور خودداری کو دیکھ کر اُن کو غنی سمجھتا ہے، اُنکے چہرے اسقدر بارونق اور پیشانیاں اسقدر کشادہ و کشیادہ ہیں کہ تم اُن کی صورت سے اُنکو صاف پہچان جاؤگے، وہ بھک منگوں کی طرح لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے؛ علی ہذا القیاس خَاطَبَهُمُ سے مراد بھی مخاطب ہونا یعنی بالمقابل آجانا ہے نہ بحث و مباحثہ کرنا۔ اگر اس تاویل کو تسلیم کر لیا جائے تو آیۂ (۲۵: ۶۳) کے معانی نہایت مربوط اور صاف ہو جاتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

"اور اللہ کے خاص بندے تو وہ ہیں جو اس زمین پر فروتنی اور انکسار کے ساتھ چلیں، اور انکی اخوت کا حس
اس قدر تیز ہے کہ جب ناواقف اور ناآشنا آدمی بھی سر بازار اُن سے دوچار ہو جاتے ہیں (خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ)
تو انہیں سلام کرنے میں سبقت کرتے ہیں"

یہ تشریح اسقدر مستحسن و نتیجہ خیز ہے کہ میں اسکو عالمِ اسلام کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ یہ ناواقف اور ناآشنا شخص کو سلام کرنے میں پہل کرنا عالی ہمتی اور حُسنِ خلاق کا وہ انتہائی درجہ ہے جسکو مسلمان کسی زمانے میں سیکھ کر تمام عالم کے بادشاہ بن گئے تھے، اسی کے باعث ایک زمانہ انکے قدموں پر نثار ہو گیا تھی، یہی وہ عالم آرا اخوت تھی جسنے دشمن کو یکجا دیا تھا۔ رسولِ خدا خود اسی خلقِ عظیم کے موجد تھے۔ راہ چلتے لوگوں کو سلام کرتے، اور ہمیشہ پہلے سلام کرنے میں بازی لیجاتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب الایمان میں ہے کہ آپ نے فرمایا "بہترین اسلام یہ ہے کہ فقراء کو کھانا کھلاؤ (یعنی ان فقراء کو جنکی تعریف (۲: ۲۷۳) میں گذری) اور کسی سے جان پہچان ہو یا نہ ہو اسکو سلام کرو" یہی اسوۂ حسنہ فاروقِ اعظمؓ کا تھا۔ اسلام کا یہ جابر امیر المؤمنین اور احزابِ اکابر اولوالعزم سپہ سالار مدینے کی گلیوں میں مشک اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے چاروں طرف واقف اور ناواقف سب کو سلام سلام کرتا گذرجاتا تھا۔ اور اگر آج مسلمانانِ عالم بھی چند لمحوں کے لیے یہ شیوہ عمل اختیار کر لیں تو اب بھی انکی سب بگڑی پھر بن سکتی ہو گر ہاں! اب اخوت کا وہ پرانا احساس باقی نہیں! اور اُنسے تکبر و عجب کی بنا خلاقِ امۃ کا فردوس میں چلا گیا ہے!

لم یزل کے وجود کی صریح شہادت، اور اسلام کے دین اللہ ہونے کا زندہ ثبوت تہا۔ توحید کی یہ روح عمل لاریب اُس مصورِ حقیقت، اُس سید البشر، اُس ہادیِ اسلام (علیہ التحیۃ والسلام) کی حیرت انگیز تعلیم اور مقلب القلوب صحبت کا نتیجہ تھی جسنے غارِ حرا کی انجمن آرا خلوتوں سے نکلکر، ریگزارِ عرب کے اِن بادیہ پیما بدؤوں کے سامنے خدائے بیمثال کی ذات اسقدر مشخص کردی تھی!

سرِّ خدا کہ عابد و زاہد بکس نگفت
درحیرتم کہ دُرد کشاں از کجا شنید

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (۴: ۱۳۵)

اے ایمان والو! علی الاعلان خدا کے وجود کی گواہی دیتے ہوئے اعتدال اور میانہ روی پر قائم رہو، خواہ یہ اعتدال تمہیں اپنے پر یا والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ کرنا ہو!

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۵: ۸)

اے ایمان والو! انصاف کے شاہد بنکر خدا کی حمایت میں جم کر کھڑے ہو جاؤ اور کسی قوم کی عداوت بھی تم کو بے انصافی کے ارتکاب کی باعث نہو۔ نہیں! بہر حال انصاف کرو، یہی تقوی ہے، اور خوف خدا سے قریب تر ہے۔ اور اللہ سے ہر دم ڈرتے رہو، وہ جو کچھ تم کر رہے ہو اچھی طرح جانتا ہے۔

✚ یہاں ہر معاملے میں قسط و اعتدال پر قائم رہنے، اور عدل کو ہر حال اور بلا امتیاز اعدے رہنمائے حیات بنانے کو اتقائے خدا پر محمول کیا گیا ہے گویا وہی شخص خدا کے وجود کا صحیح معنوں میں شاہد ہے وہی اسکا نوکر اور اُس سے بیگان ڈرتا ہے جو بڑی سے بڑی آزمایش اور ذاتی مفاد کے موقع پر بھی ناانصافی نہیں کرتا، بلکہ ہر آن اُسکو حاضر و ناظر یقین کر کے اُس کے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔

آہ: صدرِ اسلام کا عالم انگیز زمانہ تو درکنار، نزول قرآن کے کامل سات سو برس بعد تک بھی مسلمانوں نے فخرِ رسل کے آسمان سے لائے ہوئے پیغام پر عمل کرنا اِسقدر ضروری سمجھا ہوا تھا کہ محمد شاہ تغلق بادشاہ ہند کی انصاف پسندی کا ذکر کرتے ہوئے مشہور مسافر ابن بطوطہ (المتوفی ۷۷۹ھ) اپنا چشم دید واقعہ (۷۳۴ھ) بیان کرتا ہے کہ ایک دفعہ کسی امیر کے لڑکے نے دعویٰ کیا کہ بادشاہ نے بلا سبب اُسکو مارا ہے، قاضی نے حکم دیا کہ بادشاہ یا لڑکے کو راضی کرے، ورنہ قصاص دے۔ ابن بطوطہ ذکر کرتا ہے کہ شاہ تغلق نے لڑکے کو دربار میں بلایا اور لکڑی اُسکے ہاتھ میں دیکر کہا کہ اپنا عوض لیلے۔ پھر اپنے سر کی قسم دلا کر کہا کہ جیسا میں نے تجکو مارا ہے تو بھی مار۔ لڑکے نے ہاتھ میں لکڑی لیکر اکیس بید بادشاہ کے لگائے۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ اُسکی کلاہ بھی سر سے گر پڑی!!

ہاں! لیکن جہاں اُسکے ماننے میں حکم خدا کی تعمیل یہ تھی، جہاں خوف خدا اِس اوجِ کمال تک پہونچ چکا تھا وہاں بارگاہ خدا سے انعام بھی یہ تھا کہ مسلمانانِ عالم کے دنیا کے طول و عرض کے بادشاہ بن گئے تھے، دنیا انکے رعب و وقار کے آگے لرزہ براندام رہا کرتی تھی۔ آج جبکہ قرآن کو چوم چوم کر بالائے طاق کرنا اسلام کا ماحصل بن چکا ہے تو خدا بھی کان سے پکڑ پکڑ کر ملکوں سے نکال رہا ہے۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ۔

حکمتِ عبادات

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ (۲۲: ۶۷)

ہر اُمت کے لیئے ہم نے ایک نشانِ بندگی مقرر کیا ہے جس کو وہ شعار بنائے ہوئے ہیں تو چاہیئے کہ لوگ قانونِ خدا کے بارے میں تم سے جھگڑا نہ کریں

اِس رُوحانیت، اور علوِ اخلاق میں وہ آسمانی طاقت، اور زبردست تبلیغی اثر پنہاں تھا جو اسلام کی تقویت اور اشاعت کا بہترین سامان تھا؛ بڑے بڑے دشمنانِ دین اور جبابرۂ کفر مومنوں کے اِن اعمال کو دیکھ کر وجودِ خدا کے از خود قائل ہو جاتے، اور دینِ الٰہی کے بہترین معاون اور مددگار بنتے! اسلام کا زورِ اثر قرونِ اُولیٰ کے ابتدائی ایام میں، ایک بہت بڑی حد تک اسی خاموش طریقِ عمل، شہادتِ خدا، اور تقوے پر تھا؛ مومنوں کا اصلاحِ عمل، اُنکی ربانیت، اُن کا سچا زہد و تورّع خود بخود دلوں میں گھر کر جاتا اور وہ آپ نمونۂ اخلاق بنکر عوام کے لیئے ایک مستقل اور غیر متزلزل ہدایت کا باعث بنتے۔ خود رسول کریم کی پاکیزہ زندگی کا مقصود بالذات خلقِ خدا کے سامنے انسانی حیات کی ایک لائقِ رشک اور قابلِ تقلید مثال قائم کرنا تھا۔ قرآنِ حکیم کی اصلی غرض و غایت فی الحقیقت بنی نوعِ انسان کی درستیٔ اخلاق اور صلاحِ اعمال ہی تھی؛ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (۱۱: ۸۸)[۱] اسلام اور سب باتوں سے قطعِ نظر امر بالمعروف کا سراپا مجسمہ، اور نہی عن المنکر کا مکمل ضابطہ ہی تھا مگر اور سب مذاہب کی غیر مانند، اُسکی حیثیت خالصۃً داعیانہ تھی، اُسکی نسبت بزرگ تر تھی؛ وہ ختمِ رسالت کی تمامیت اور پیامِ اخیر کی قطعیت کا حکم رکھتا تھا؛ اُس میں پیغامِ خدا کی انانیت، اور انتخابِ ربّ العرش کی رعونت تھی! إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (۳: ۱۹)[۲] اُسمیں تقویتِ نفس کا ہیجان اور اجماعِ خلق کا

۱؎ اس پر شعیب علیہ السلام نے اہلِ مدین سے کہا کہ میں تو حتی الامکان تمہارے اعمال و اخلاق میں اصلاح ہی پیدا کرنا چاہتا ہوں، مجھے تم سے اجرت اور زر تقاضا نہیں، انکار ۱۱: ۸۸ قرآن کریم، میرا اِس بارے میں کامیاب ہونا خدا ہی کے اختیار میں ہے، اسی پر توکل کر کے میں نے اپنا کام شروع کیا ہے، اور نتائج کے بارے میں میرا رجوع بھی اُسی کی طرف ہے۔

۲؎ خدائے زمین و آسمان کی نگاہوں میں اسلام ہی پسندیدہ ترین مذہب ہے؛ یہ ایک سرسری ترجمہ ہے جو ہم نے کر دیا ہے اور جو عوام کے ذہنوں میں رائج ہے مگر صحیح مفہوم یہ ہے: آلاسلام (یعنی خدا کو علاً احکم الحاکمین تسلیم کر لینا) ہی معطر شکل دین ہے جو خدائے زمین و آسمان کی نظر میں پسندیدہ تر ہے؛ جیسا کہ ہم نے صفحہ ۱۹۱ میں واضح کر دیا ہے۔

اضطرار تھا! دعوتِ جہاں اُسکا مایۂ خمیر، اور کل کائنات اسکی مشارٌالیہ تھی؛

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۷:۱۵۸)

اے محمدؐ! تمام عالم کے لوگوں سے کہدو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اُس خدائے عظیم کا قاصد ہوں جسکی سلطنت تمام آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے۔ اُسکے سوا کوئی شے لائق عبادت نہیں۔ وہی زندہ کر دیتا ہے، وہی مارتا ہے۔ تو آؤ! اُس پاک ذات کو اپنا مالک یقین کرو اور اُسکے بھیجے ہوئے اُمّی نبیؐ کو جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے، اور اُسکے احکام بجا لاتا ہے! اپنا رہنما تسلیم کرو۔ اور اسی کی پیروی کرو تاکہ تم راہ راست پر آجاؤ! (گویا ایک آقا کو مان کر سب کے سب متحد ہو جاؤ دیکھو ھدایت کا مفہوم تحت المتن صفحہ ۱۹۲)

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۴:۲۸)

اور اے محمدؐ! ہم نے تو تم کو تمام دنیا کے لوگوں کی طرف قاصد بنا کر بھیجا ہے تاکہ تم ہمارے قانون پر چلنے والوں کو اجتماعی بہبودی کی خوشخبری اور ہمارے منکروں کو دائمی عذاب کا پیغام پہنچا دو۔ لیکن اکثر لوگ ابھی تک اس رفیع الامر سے مطلع نہیں ہیں کہ تمہارا پیغام تمام عالم کے نام ہے

ہر متنفس قوم، اور مجتمع انسانی کے پیش پیش رہنا اسکی حیات کی علامت تھی! اسکے صلائے عام میں سیماب کی جاذبی تڑپ، اور قبلہ نما کا مقناطیسی اضطراب تھا! حصول قوت اسکا نشانِ سیما، اور غلبۂ عام اُس کا طرۂ امتیاز تھا! وہ عامۃ الناس کو اپنی حقیت اور سادگیٔ تعلیم سے، اپنے روز افزوں اثر اور جماعتی اقتدار سے، اپنی انقلاب انگیز تجویز اور بے مثال ہدایت سے، مومن کے زورِ اخلاق اور روحِ عمل سے خدائے احد کی عملی عبادت اور غلامی کیطرف کھینچ کر جامعیت اور وحدت پیدا کرنا چاہتا تھا، اِسی حیثیت کی بنا پر اُسکے اوامر و نواہی کا ہر شعبۂ عمل جلب اقتدار، توسیع اثر، اخوت اور مساوات کا بطور خود متواتر جہاد تھا۔ اخلاق کی درستی میں بلاشبہ ایک سطحی نقطۂ نظر سے متنفس کی ذاتی ہدایت یا اِنفرادی نجات ہی پیش نظر تھی، صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے انفرادی افعال بظاہر ایک مسلمان کے اپنے خدا سے تعلق قائم کرنیکے انفرادی ذرائع ہی تھے، صوم کا فریضہ بادی النظر میں، کسی ایمان دار کا شخصی ایثار یا اُسکے نفس امّارہ کا شخصی اجتہاد ہی تھا، طواف بیت الحرام بھی بظاہر مسلمانوں کے درمیان خدا سے اظہار ارادت کا ایک مرتسم شیوہ ہی تھا، قرآن حکیم کے اوامر و نواہی بھی سطحی نظروں میں تدین اور نکوکاری کی بھی انفرادی شان لیے ہوئے تھے،

✱ دیکھو تحت المتن صفحہ ۸۱

مگر سرنوشت اُمت کے اُس خوشنویس اجل نے، اِن تمام احکام کی تہ میں، غلبۂ اسلام کی وہ نستعلیق حکمت عملی ملحوظ نظر رکھی تھی جو صدہا برس تک مسلمانوں کو دوسری امتوں کے بالمقابل، مابہ الامتیاز مقام دیتی رہی: اِن احکام کی اجتماعیت، اِن کی مرکزیت، اِنکی پابندئ وقت اور یک رنگی میں فطرت کی صلائے اتحاد کی تکرار، انسان کی نوعی وحدت کا اظہار، ضبطِ نفس کی تعلیم، مساوات کا حوصلہ افزا اثر، اور عصبیت کی روح تھی، اُنکے استمرار و تعقل میں، اُن کے تعود اور تسلسل میں حکومتِ خدا کا متواتر سماں اور اتقائے قلوب کا پیہم ضبط باندھ دیا تھا؛ وہ تقویت اسلام کے بہترین اوزار، اور تکثیر جماعت کے زبردست محرک تھے، وہ تہذیب نفس اور اصلاح اعمال کے بہترین کفیل تھے۔ اِس

الصّلوٰۃ

کے پنجوقتہ قیام میں باہمی محبت کی لہریں تھیں! اسمیں خدا کی خدائی کا مشترک اقرار، اور اللہ کی غلامی کا مشترک اعلان تھا! اسمیں ہر دل کی دوسرے دل سے سچی رسم و راہ تھی! اسمیں خوف خدا کی مشترک لرزشیں، اور نیاز مندی کی مشترک خلشیں تھیں! وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۚ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ[1]† (۷: ۵۶)! اسمیں ہم آہنگ دلوں کی طبعی ہمرنگی، اور ہم غرض انسانوں کی فطری یکجہتی تھی! اسمیں یک منصوں کا باہمی اُنس و اجلاس، اور ہم انعاموں کا برادرانہ ربط و اختلاط تھا! اسمیں ایک امیر کی عملی اطاعت، ایک غرض اور ایک غرض، ایک کی پیشوائی اور سب کی اقتدا، ایک کے عرض حال اور سب کے سکوت کا سچا سماں باندھ دیا گیا تھا! یہ ایک منظم اور منضبط، ایک مرعوب خدا اور منکسر پا سوا، ایک لرزہ براندام اور سربکف فوج کی پنجوقتہ اپنے قائد اعظم کے حضور میں پیشی تھی! اسمیں عصیان کار اور خود پسند، تفرقہ ایجاد اور مختلف نواز

---

[1] عذاب خدا سے ڈر کر اور انعام کی آس میں دونوں موقعوں پر اُسکو پکارا کرو، بیشک فضل خدا ان لوگوں کے شامل حال ہے جو خلوص دل سے اُسکو پکارتے ہیں اور اُسکے احکام کی متابعت میں حسن عمل کرتے ہیں۔

† اَلْحُسْنٰی کا صحیح قرآنی مفہوم صفحہ ۱۳۰ پر واضح کر دیا تھا جس سے ظاہر ہو کہ یہاں پر خوف و طمع سے باجماعی شکست کا خوف اور اجتماعی راحت کی طمع ہی ہے شخصی خوف و طمع مراد نہیں۔ اُدْعُوْا اور خُفْيَةً، کا جمع کا صیغہ بھی اسی پر دال ہے۔

انسان کو دن میں پانچوقت ایک کی قیادت اور سب کی پیروی، ایک کے اقدام اور سب کے اتباع، ایک کی خدائی اور سب کی عبودیت کا عملی سبق دیا گیا تھا! یہ جماعت کے خارجی✝ نظم ونسق، باطنی ضبط اور ظاہری مساوات، وحدت خدا اور وحدت امام کی سچی متحرک تصویر تھی! اسکے رکوع وسجود میں ادنیٰ اور اعلیٰ، شاہ وگدا کی تمیز عمداً اٹھا دی گئی تھی! اسکے وضوء میں احکم الحاکمین کی پیشی کا اہتمام، جسم کی پاکیزگی اور لباس کی تطہیر ظاہر کی صفائی اور خوف پریشان حالی کا سماں چھایا ہوا تھا! وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝[۵۱] (۷۴: ۳-۵)؛ اسکی تسویہ صفوف نے پیشگاہِ خداوندی کا ضبطِ ادب، مساوات کا باطنی احساس اور قرب وہم پلگی کی عصبیت پیدا کردی تھی، مساجد میں جماعت کے بے تکلف قیام نے مسکینانِ فقر وافلاس کو صدرنشینانِ جاہ وحشم کے ساتھ، ایک قطار میں کھڑا کرکے ایک کردیا تھا! وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ[۵۲] (۷: ۲۹)؛ بارگاہ رب العالمین میں اس پنجوقتہ محاسبے اور غیر منقطع حاضری نے ان کے نفس عصیان ونفاق سے پاک کردیئے تھے! إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ اللَّهِ

---

۵۱ اور اے پیغمبر! اپنے آقائے نامدار کا بول بالا کیا کرو، اور جب جب اُسکے حضور میں جانے کا ارادہ کیا کرو تو صاف ستھرے اور پاکیزہ کپڑے پہنکر جایا کرو، اور کپڑوں کی پاکیزگی کے علاوہ بدن کو تمام نجاست اور آلایش سے پاک صاف رکھو۔

۵۲ اور درگاہ احکم الحاکمین میں ہر ماتھا رگڑنے کیوقت ہمہ تن توجہ بن جایا کرو اور اپنی تمام ارادتمندی اور عقیدت کو اُسی کیلئے مخصوص کرکے اُسکو پکارا کرو۔

✝ جن لوگوں نے "الصّلوٰۃ" کی ماہیت کا امعانِ نظر سے مطالعہ کیا ہے انکو یقین ہو چکا ہے کہ اس روزانہ حاضری کی تہ میں خدائے عزّوجل کی حکمت عملی بعینہ یہ تھی کہ اُمت کے افراد کو دن میں پانچ وقت خارجی اور باطنی ضبط کا وہ مکرر سبق دیا جائے جو اسکو کبھی بھولنے نہ پائے۔ اگر ایک فوج کے سپاہیوں کو ہر روز علی الصباح میدان میں نکالکر قواعد سکھائی جاتی ہے، اگر انکو معلمِ قواعد کی آواز پر حرکت کرنیکی تعلیم دیجاتی ہے، اگر سب کو ایک حکم پر چونک اُٹھنے کا سبق پڑھایا جاتا ہے، اور وہ سب کے سب بیک وقت اور بالالتزام ایک ہی انداز پر حرکت کرتے ہیں تو اسکا مقصود یہی ہوتا ہے کہ میدان جنگ میں اُنکی اس اطاعت سے فائدہ اٹھایا جائے، اور وہ اپنے سپہ سالار کے حکموں پر فی الفور عمل کرنیکا سبق سیکھیں گو لڑائی میں سپہ سالار کے احکام اس روزانہ قواعد کے احکام سے مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی مقصود بعینہ نماز سے تھا اور امام مسجد کی پنجوقتہ اطاعت سے امیر جماعت کی اطاعت حسب موقع مراد تھی، یہی حکمت تسویہ صفوف میں تھی، یہی راز وقت کی پابندی اور مقتدیوں کے خاموش رہنے میں تھا۔ اور اسی نکتے کو پیش نظر رکھکر اگر ایک شخص امام کے پیچھے کئی گز یا ایک میل دور بھی کھڑا ہو (مثلاً عیدین کے موقع پر) اور اُس کی قرأت کا ایک لفظ بھی نہ سن سکے لیکن رکوع وسجود کے تتبع میں اطاعت کیا جائے تو اُسکی نماز کا ہونا علمائے سلف نے مسلّم قرار دیا تھا کیونکہ نماز کا مقصود بالذات اتحادِ عمل اور اطاعت تھا، خدا کو اس پنجوقتہ چاپلوسی کی کچھ حاجت نہ تھی۔ نبی آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بات اپنے مقتدیوں کی گھٹی میں اسقدر ڈالدی تھی اور نماز کو اطاعت کے نصب العین کیساتھ اسطرح مدغم کردیا تھا کہ عین وسط نماز میں تحویل قبلہ کیوقت بھی انکو کچھ وقت محسوس نہ ہوئی (دیکھو صفحہ ۱۶۹)۔ اسی تعلیم کی بنا پر مدینہ منورہ میں لوگ نفلی نماز کیوقت بھی ضبط کا قائم رکھنا اسقدر ضروری سمجھتا تھا کہ انکے نزدیک مسجد کے اندر وضو کرنے یا سنتیں پڑھنے سے بے ترتیبی اور انتشار کا ماحول پیدا کرنا نماز کی حکمت کے منافی تھا۔ لوگ اپنی اپنی گھروں سے وضو کرکے اور سنتیں پڑھکر آتے اور مسجد میں فقط فرض پڑھ لیتے۔ آج جبکہ الصّلوٰۃ کا الٹا مفہوم لیا جا چکا ہے، لوگ سارا مسجد کے اندر وضو کرتے ہیں، کُلّیاں بھر بھر کر وضو میں پھینکتے ہیں، [illegible] کرتے ہیں، سنتیں پڑھ پڑھکر مسجد کو قبرستان بنا دیتے ہیں، [illegible]
✝ صفحہ [illegible] ثابت کر دیا تھا کہ خدا تعالیٰ کی نگاہوں میں سب سے زیادہ [illegible] المنکر [illegible] کا اصلی مقصود کیا ہے، قرآن حکیم

أَكْبَرُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ ۰ (۲۹:۴۵) ؎ مقامِ خدا کا پیہم اور زندہ احساس اُن کے اعمال کو یکسر سُدھارتا

تھا، دلوں میں حمیتِ دین کے جوش زن تنور، اور ذہنوں میں غلبۂ اسلام کے مواج دریا تھے۔ پھر ذلّل و

سلہ بیشک نماز بشرطیکہ اسمیں خدا کا سچا احساس ہو، اور اسکو الصّلٰوۃ کہہ سکیں، وہ مطہرِ نفس شے ہے جو تمام اخلاقی بداعمالیوں (الفحشاء) اور اجتماعی تفرقہ اور نفاق (المنکر) سے روکتی ہے۔ اور خدا کا پیہم احساس تو نماز سے زیادہ موثر ہے۔ اور خدا جو کچھ بھی تم کرتے ہو سو جانتا ہے۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۰۶) میں الفحشاء کا ذکر چند موقعوں پر آیا ہے۔ لیکن وہ مواقع معانی کی تعیین کے لیے کافی ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۰ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۰ (۲:۱۶۸-۱۶۹)

اے لوگو! زمین میں جو چیزیں پاکیزہ صورت اور خوش تاثیر، مفیدِ صحت اور دافعِ شہوات (حلالاً طیباً) ہیں انکو کھایا کرو اور نفسِ امارہ کا کہا ان کر شیطان کے قدم بقدم نہ چلو کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور ہمیشہ ایسی چیزوں کے کھانے کی ترغیب دیگا جس سے تمہاری شہوات نفسانی کا ہیجان ہوتا ہے، شیطان یعنی تمہارا امارہ تمہیں بدی اور بے حیائی (السّوء و الفحشاء) کے کام کرنے کو کہیگا، اور خصوصاً اس بات پر آمادہ کرے گا کہ نفس پرستی کے جوش میں جوش موش وہ احکام خدا کی طرف منسوب کرو جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔ آیۂ (۲:۱۶۹) کا مقابلہ آیۂ (۷:۲۸) سے کرو جو اسی نوٹ کے اخیر میں ہے)

حلال و حرام کی حکمت سے یہاں پر بحث نہیں۔ یہ موضوع پانچویں مجلد میں آئے گا۔ نہ یہاں پر شیطان کی حقیقت سے سروکار ہے۔ لیکن الفحشاء سے مراد یہاں پر صاف بیحیائی، نفس پرستی، اور شہوات نفسانی کو فروغ دینے والی باتیں ہیں۔ کیونکہ آگے چلکر آیہ (۲:۱۷۳) میں لحم خنزیر کو حرام کیا ہے۔ جو بلاشبہ شہوت انگیز تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی سورۃ میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۰ الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۰ (۲:۲۶۷-۲۶۸)

اے ایمان والو! اپنی محنت کی کمائی اور اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر اپنی کمائی میں سے بہترین اشیاء (طیبٰت) صرف کیا کرو، اور جو اشیاء ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں اُن میں سے بھی بہترین چیزیں دو، اور ناکارہ چیز کے دینے کا ارادہ بھی نہ کرنا کہ اگر وہی سے خیرات کی چند اسامی بنو حالانکہ وہی شے اگر کوئی تم کو دینا چاہے تو تم اسکو بطیبِ خاطر منظور نہ کرو، سوائے اسکے کہ دیدہ دانستہ اپنی بات رکھنے کے لیے اُس شے کے عیب سے چشم پوشی کرو۔ جانے رہو کہ خدا ان چیزوں کو اپنے لیے نہیں مانگتا، جو کچھ ہے تمہاری اپنی خاطر ہے، اور وہ بڑا بے نیاز اور بڑا سزاوار حمد ہے۔ شیطان یعنی تمہیں ایثار مال اور بہترین اشیاء کے دینے کے وقت افلاس سے ڈراتا ہے، اور بخلِ امساک کی باطنی بے حیائی (الفحشاء) کا حکم دیتا ہے لا خدا تمہیں اس ایثار کے بعد اجتماعی بدحالیوں پر پردہ پوشی (مغفرۃ) اور دنیاوی انعام و اکرام (فضلا) کا وعدہ فرماتا ہے اور جانے رہو کہ وہ عظیم جس کی گنجایش والا اور ہر قوم کی نیات سے بخوبی واقف ہے۔

یہاں اُس قلبی بے حسی اور باطنی بے حیائی کو جو قوم کی بہتری کی خاطر ایثار مال نکرنے سے پیدا ہوتی ہے الفحشاء سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ اعراف میں شیطان کے آدم کو بہکانے کے قصے کی تفصیل کے بعد ہے:

يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْآتِهِمَا إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ۰ وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۰ (۷:۲۷-۲۸)

اے اولادِ آدم کہیں شیطان تم کو پھر کسی آزمائش میں نہ ڈالے جس طرح کہ اُسنے تمہارے والدین کو بہشت سے نکلوا دیا تھا اُنکے لباسوں کو بدلوا کر

انکسار کے اس ملکوتی ارتعاش میں سب شخصی معاملات اور ذاتی تمناؤں کو بالائے طاق رکھ کر جو تنہا اور سہم سوال تمام جماعت کی طرف سے متفقہ طور پر، باآواز بلند پیش کیا جاتا تھا یہ تھا کہ اے بار آلہا!

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۰۷) کہ ... رتا تھا کہ اُنکے عیوب اور شرمگاہیں اُن پر ظاہر ہو جائیں، وہ بمع اپنے چیلے چانٹوں کے تمہاری گھات میں لگا ہے اور تمکو وہاں سے دیکھ رہا ہے جہاں تم اُسکو نہیں دیکھتے، پس تم اُس سے حتی الوسع بچتے رہو اور اُسکے دام تزویر میں پھنسکر اپنے آپ کو شکار ہونے اور اپنی شرمگاہوں کو عیاں کرنیکا موقع نہ دو۔ لوگو! ہم نے اس دنیا میں اُن لوگوں کو جو ایمان کے قوت افزا اعمال و خصائص سے بے بہرہ ہیں (اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ) انہی شیطانوں کا محب صمیم (اَوْلِيَآءَ) بنا رکھا ہے۔ اور بے ایمان لوگ وہ ہیں کہ جب جب کوئی منفرد قوم، اُمّت کُش، یا موت افزا عمل (فَاحِشَةً) کرتے ہیں تو اپنی عیب پوشی کے لیے یہ بہانا بنا کر لیتے ہیں کہ ہم نے تو اپنے باپ دادا کو شروع سے یہی کرتے دیکھا ہے، بلکہ درحقیقت خدا نے ہم کو اِس کام کا حکم دے رکھا ہے، اے محمد! ان نادانوں سے کہہ دو کہ خدا ہرگز کسی بیہودہ کام (اَلْفَحْشَآءِ) کا حکم نہیں دیتا جسکا انجام ہلاکت ہو، جسکا نتیجہ فساد اور جنت سے اخراج ہو، کیا تم جھوٹ موٹ خدا پر وہ باتیں تھوپ رہے ہو جن کا تمہیں علم نہیں۔

یہ قصہ نہایت نتیجہ خیز ہے اور اسکا انطباق جو انسان کی مجوزہ نسلوں پر کیا گیا ہے اور بھی عبرت انگیز ہے مگر نفس قصے سے یہاں پر بحث نہیں نہ آدم اور شیطان کی شخصیتوں سے البتہ سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ یہاں پر اَلْفَحْشَآءِ سے مراد قوم کے وہ وحشتی عیوب اور اجتماعی بداعمالیاں ہیں جو لوگ نہایت وثوق سے بدیں خیال کرتے ہیں کہ باپ دادا سے چلی آئی ہیں، اور اِس لحاظ سے خدا کا حکم ہیں۔ ان بداعمالیوں میں مثال کے طور پر فرقہ بندیاں، گروہ پرستی، رسوم قبیحہ، اعتقادات واہیہ وغیرہ شامل ہیں جن کا نتیجہ بحیثیت مجموعی یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کے اجتماعی (سَوْاٰت) عیوب روز بروز عیاں ہوتے جاتے ہیں، اور بالآخر وہ ساری کی ساری قوم شیطان کو دوست رکھنے کے جرم میں قوت اور امن کے دارالسلام سے بیک بینی و دو گوش نکال دی جاتی ہے۔ اَلْفَحْشَآءِ کے ان معانی کی تائید ان آیات سے اگلی آیت سے بھی ہوتی ہے جو متن کتاب میں صفحہ ۲۰۱، ۲۰۶ پر آچکی ہے! قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڛ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ (۷: ۲۹)

یعنی اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ ان بداعتدالیوں کا حکم ہرگز کسی نے نہیں دیا بلکہ میرے پروردگار نے تو مجھے ہر نوع قسط و اعتدال پر رہنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ہر سجدے کے وقت ہمہ تن متوجہ ہو جایا کرو، اور تمام اطاعت مندی اور اخلاص اس احکم الحاکمین کے لیے وقف کر کے اس کے حضور میں کھڑا ہو، جانے رہو کہ تم اُسی طرح بے یار و مددگار اُس کے حضور میں واپس آؤ گے جس طرح کہ تم روز آفرینش کو تھے۔

اس آیت میں صاف کسی ملسوا کو وسیلہ نہ بنانے اور خالصۃً خدا کی غلامی اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور ہر معاملے میں حد سے تجاوز نہ کرنے (قسط) کو پیش نظر رکھنے کی تلقین کی ہے۔ ان تینوں آیتوں میں ظاہر ہے کہ اول سے آخر تک ربط تبھی مکمل ہو سکتا ہے جب اَلْفَحْشَآءِ کو ان معنوں میں لیا جائے جو ہم نے کیے ورنہ اَلْفَحْشَآءِ کے بالمقابل بِالْقِسْطِ اور اَقِيْمُوْا ... مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے الفاظ ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ اَلْفَحْشَآءِ کا ذکر قرآن حکیم میں اور جگہ بھی ہے۔ مثلاً یوسفؑ اور زلیخا کے مشہور قصے میں جب اول الذکر دونوں سے صاف بچ نکلے تو فرمایا: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۱۲: ۲۴) اور وہ عورت تو یوسف کے ساتھ ارادۂ بدکر ہی چکی تھی اور علی ہذا القیاس اگر یوسفؑ کو اپنے خدا کے احکم الحاکمین اور حاضر و ناظر ہونے کی دلیل اُس وقت آنکھوں کے سامنے نہ پھر جاتی تو وہ بھی اس عورت کے ساتھ ارادۂ بد کر بیٹھتے، اور یہ اسباب ہم نے اس لیے پیدا کر دیے کہ یوسفؑ کو بدکاری اور بے حیائی سے الگ رکھیں، اس میں شک نہیں کہ وہ ہمارے خالص اطاعت گذاروں میں سے تھا۔ یہاں اَلْفَحْشَآءِ سے مراد صاف زناکاری اور بے حیائی ہے۔ سورۂ نحل میں خدا کے متعلق يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (۱۶: ۹۰) ہے مگر وہاں اَلْفَحْشَآءِ کا مفہوم کچھ نہیں دیا۔ سورۂ نور میں قصہ افک کے متعلق حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کی بریت کے بعد ایمان والوں سے خطاب ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ

تو اسلام کی جماعت کو سیدھے سے سیدھے، چھوٹے سے چھوٹے، اور قریب سے قریب راستے سے دُنیاوی نعمت
اور اقتدار تمکن فی الارض اور تخلف کے اُس معراج پر پونہچا جسکو حاصل کرنیکے لیئے تو نے اپنا پاک رسول الھُدٰی مع

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۰۸) فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۴: ۲۱) یعنی اے ایمان والو! ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ شیطان کے قدم بقدم نہ چلو اور سطح کی بیحیائی کی باتیں آپس میں نہ پھیلنے دیا کرو اگر تم میں سے جو شخص شیطان کے قدم بقدم چلیگا تو جان لے کہ شیطان یعنی اُسکو ایسی ہی بیحیائی کی باتیں (الفحشاء) کرنے کا حکم دیگا اور آپس میں فساد برپا کرنے اور نفاق پھیلانے (المنکر) کی ترغیب دیگا۔ اور مسلمانو! اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم شامل حال نہ ہوتا تو تم میں سے ایک فرد و تنفس کا دل بھی آلائش عصیاں سے پاک نہ ہوتا۔ لیکن وہ خدائے عظیم جسکو مناسب سمجھتا ہے (یشاء) تزکیہ نفس کی توفیق دیتا ہے، اور وہ برائیوں کو سننے والا (سمیع) اور دونوں کی پخت و پز کو جاننے والا (علیم) ہے۔ یہاں الفحشاء اور المنکر دونوں کو اکٹھا کر دیا ہے اور دونوں کے مطالب کی تصریح کر دی ہے گویا الفحشاء شیطان کی طرف سے نفس امارہ کو وہ باطنی ترغیب و تحریص ہے جس سے کوئی شخص اپنی قوم کے کسی فرد کے متعلق کوئی بیحیائی یا بدنامی کی بات پھیلانے پر آمادہ ہوتا ہے اور المنکر وہ باہمی نفاق اور باطنی کدورتیں، وہ فساد آرا اور انتشار عمل ہے جو ایسی باتوں کے ناحق پھیلانے سے پیدا ہوتا ہے اور جو آج ہر مسلمان کی گھٹی میں پڑا ہے۔

اس تمام بحث و تمحیص سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ الفحشاء سے مراد وہ انسانی عیوب ہیں جو شیطان نفس امارہ کی وساطت سے کراتا ہے اور جن میں بالتخصیص (۱) شہوات نفسانی کے ہیجان کی تدابیر اختیار کرنا (۲) محبت مال میں غلو کرنا اور خدا کیلئے بہترین شے نہ دے سکنا، (۳) آبا و اجداد کی بیہودہ اور ہلاکت انگیز رسوم کی اندھا دھند تقلید کرنا، (۴) زناکاری کی طرف مائل ہونا، (۵) افراد ملت کو بدنام کرنے کی غرض سے بیحیائی کی باتیں لوگوں میں پھیلانا، شامل ہیں یہ باتوں کا کرنا شیطان کا صحیح معنوں میں اتباع اور اسکی پوجا و عبادت ہے۔ زیر بحث آیت یعنی (۲۹: ۴۵) میں کہا گیا ہے کہ الصلوٰۃ وہ شے ہے جو الفحشاء اور المنکر سے قطعاً روک دیتی ہے۔ اگر ایک شخص صحیح معنوں میں الصلوٰۃ کو خدا کے حضور میں حاضری سمجھ رہا ہے، اگر وہ دن بھر کے اعمال کے بعد الصلوٰۃ کو حاکم اعلیٰ کی پیشی میں ان اعمال کا محاسبہ سمجھتا ہے تو وہ لامحالہ فحشاء سے بچیگا۔ علی ہذا القیاس اگر الصلوٰۃ وہی متفقہ دعوت ہے جو تمام اسلامی جماعت کی طرف سے خدا کے حضور میں کی جاتی ہے تو اسکے بعد مسلمانوں کے آپس میں نفاق (المنکر) واقع ہونے کی گنجائش قطعاً نہیں رہتی۔ انہی معنوں میں الصلوٰۃ الصلوٰۃ ہے اور اسی لیئے اُس تخصیصی کا سہرو دخل(?) ہے۔ الصلوٰۃ کی ماہیت کے متعلق مفصل بحث چوتھی جلد میں آئیگی۔ ان اوراق میں اسکی حکمت عملی سے بحث ہے۔ لیکن الفحشاء کی تخصیص اور تحدید جو قرآن عظیم نے متذکرہ صدر آیات میں کی ہے زیادہ تر اس وجہ سے ہے کہ یہ پانچوں شقیں ہر قوم کی اجتماعی زندگی کیلئے ازبس مہلک ہیں۔ اگر مسلمانان عالم نماز کو فی الحقیقت جرم کی پیچ و تہ(?) پیشی سمجھ کر فواحش کی ان پانچوں قسموں سے محترز رہیں تو آج انکی بگڑی پھر بن سکتی ہے۔ مغربی اقوام میں دوسری تیسری اور پانچویں شقیں اسقدر کالعدم ہیں کہ الفحشاء کا ایک عظیم حصہ انکی ہیئت اجتماعی سے بالکل نکل چکا ہے۔ ایثار مال اُنمیں عجیب ہے، آباو اجداد کی واہی رسموں کی تقلید تین صدیوں(?) سے بالکل غائب ہے، علی ہذا القیاس اپنی قوم کے افراد کی بدنامی کے درپے نہ ہونا انکا قومی شعار ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ پہلی اور چوتھی شق یعنی نفسانی شہوات اور زناکاری کی طرف نسبۃً بہت زیادہ مائل ہیں اور ممکن ہے کہ زمانہ قریب میں یہی انکی اجتماعی ہلاکت کا باعث بن جائے لیکن اس موضوع پر بحث غالباً تیسری جلد میں آئے گی۔

الصلوٰۃ کی اس جامع و مانع تعریف کے بعد قرآن حکیم نے زیر بحث آیت یعنی (۲۹: ۴۵) میں وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ کہکر نماز کی حکمت عملی اور صحیح منتہائے نظر کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ بعبارۃ اُخریٰ یہ کہا ہے کہ الصلوٰۃ اگرچہ دن بھر میں پانچ وقت خدا کے حضور میں حاضری اور اپنے اعمال کی جوابدہی ہے لیکن خدا کو ہمہ وقت یاد رکھنا (ذکر اللہ) اُس کا کھٹکا دل میں ہر وقت لگائے رکھنا (ذکر اللہ)، چوبیس گھنٹے اُس حاکم اعلیٰ کا خوف جو در کھنا (ذکر اللہ)، غیبت اور حاضری، نماز اور غیر نماز دونوں حالتوں پر اُسکو حاضر ناظر ہونگر ان اعمال کا تعین کرنا وہ معلع اعمال شے ہے جو الصلوٰۃ سے کہیں بڑھکر (اکبر) ہے۔ انسان کو اگر یہ کیفیت حال نصیب ہو جائے تو الصلوٰۃ سے بدرجہا بہتر ہے۔ ذکر کے معنی وہ نہیں جو لوگوں نے نہایت نافہمی سے وضع کر لیئے ہیں اور وہ یہ کہ سب کام چھوڑ کر تسبیح ہاتھ میں لے لیں اور خدا کا نام تمام دن رٹ رٹ کر بے اثر کرتے رہیں یہ تشریح نہایت لچر اور مضحکہ انگیز ہے اور وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ تمام دنیاوی کاروبار کے ضمن میں خدا کا کھٹکا لگائے رکھنا اور ان اعمال کو قانون خدا کے مطابق کرنا ہی ذکر خدا ہے۔

دِیْنِ الْحَقّ ساتھ دے کر بھیجا تھا!

اِھْدِنَا†

† اَلْھُدٰی اور دِیْنِ الْحَقّ کا اشارہ آیہ ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ (۶۱ : ۹) کی طرف ہی جو صفحہ ۱۹۲ پر مستثنیات اسلام کی تعیین کے ضمن میں پیش کی گئی تھی۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جس اَلْھُدٰی کے بھیجے جانے کا ذکر اس آیت میں ہے، اسکی ایک اہم شق کی توضیح صفحہ ۱۹۲ (دیکھو) پر ہو چکی ہے جہاں پر ثابت کر دیا ہے کہ اَلْھُدٰی کا الٰہی مفہوم وہ استعداد و مصالحت و اتحاد ہے جو پیغمبر آخر الزمان نے عرب قوم کے اندر ایک اقل قلیل مدت میں پیدا کر دی تھی اور جو صحیح معنوں میں لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ کا باعث ہوئی۔ دِیْنِ الْحَقّ کے معنی سچائی کی راہ عمل کے ہیں گویا سورۂ فاتحہ میں جس اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ پر چلنے کی درخواست پنجوقتہ ہوتی ہے وہ یہی دین الحق ہے جو رسول خدا کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ اگلے اوراق میں اسی صراط مستقیم کی تعیین کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیونکر لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ یا اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کا مصداق بنا سکتا ہے۔

† ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے سورۂ فاتحہ کا صحیح مفہوم پالینا، اور بعد ازاں اسکو پیش نظر رکھکر زندگی کا منتہائے عمل بنانا اِس قدر اہم ہے کہ اسکے بغیر نہ کوئی نماز صحیح معنوں میں نماز ہے اور نہ اُس غرض و مطلب کے لیے کوئی مستقل عمل پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر آج قریباً قرن کے تدریجی نسیان اور فقدان علم کے بعد اوسط مسلمان کو یہ بھی پتہ نہیں رہا کہ وہ خدا کے حضور میں پنجوقتہ ہاتھ باندھ کر کیا مانگ رہا ہے، اور ہر سے کچھ مانگتا بھی ہے یا نہیں، یہ رکوع و سجود کیوں ہیں، یہ اُٹھنا بیٹھنا کس مطلب کے لیے ہے، یہ ظاہری ادب اور مسلسل قومے اور قعدے کس اضطراب دل کے مظاہر ہیں، اگر یہ سبق جو نبی آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تیئیس برس کے مسلسل عمل کے بعد پڑھایا تھا قطعاً بھلایا جا چکا ہے تو ایسی نماز سوائے اس کے کہ وہ کچھ بن جائے جو آجکل ہے اور کیا ہو سکتی ہے۔ ان آیات میں بعض امور نہایت غور طلب ہیں: اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کیا شے ہے؟ اگر اس کی تعریف صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ہے تو اس میں اَنْعَمْتَ کا کیا مفہوم ہے؟ اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ سے بعینہ کون مراد ہیں؟ اَلضَّآلِّیْنَ کے مصداق کون لوگ ہیں؟ یہ سب سوالات ایسے ہیں کہ ان کے اطمینان بخش حل کے بغیر اَلصَّلٰوۃ کی ماہیت کو سمجھنا از بس محال ہے۔

شارحین کلام الٰہی نے بالعموم ان عظیم الشان آیات کے مطالب کو اپنے مشہور خود پسندانہ اور تحکمانہ لہجے میں بیان فرما کر چند جملوں میں ختم کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ دین اسلام کا سیدھا رستہ ہے۔ گویا تعریف المجہول بالمجہول ہے۔ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ سے مراد انکی رائے میں روحانی نعمتیں ہیں جن کے اہل صدر اول کے مسلمان قرار پا چکے ہیں۔ اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ یہودی ہیں جن پر قہر خدا صدیاں گذریں نازل ہوا تھا اور اب تک انکی اولاد پر نازل ہو رہا ہے۔ اَلضَّآلِّیْنَ نصرانی لوگ ہیں جن پر غضب خدا آنے والا ہے اور ان کی گمراہی مسلم ہے۔ گویا اس علم نظر سے مسلمان دن میں پانچ وقت وہ شے مانگ رہا ہے جو اسکو الحال حاصل ہے۔ اور ابد الآباد تک حاصل رہے گی بشرطیکہ منہ سے مسلمان بنا رہے! آج یہ نعرہ آجکل ہر مسلمان کی اقلیم خیال میں اس قدر مستحکم اور متمکن ہو گیا ہے کہ کوئی دلیل اسکو اقوام عالم کی اس مفروضہ صدر نشینی سے ہٹانے کے لیے کارگر نہیں ہوتی، بلکہ لطف یہ ہے کہ جب اسکو اسلامی امت کی خستہ حالی اور نصرانی کی دنیاوی خوشحالی یاد دلائی جاتی ہے تو وہ غیظ و غضب میں آکر اور بھی اپنے آپ کو خدا کا منظور نظر اور اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کا صحیح مصداق شمار کرتا ہے۔ اور اس کرسی نشینی سے دست بردار ہونا اپنے لیے گناہ سمجھکر روحانیت کی نادیدہ اور ناقابل ملک کشور میں سر چھپا لیتا ہے۔ اسکی نظروں میں نصرانی ہر نوع مستوجب عذاب ہیں، ان سے خدا بیحد ناخوش ہے، یہ انعام جو آج انکو مل رہے ہیں بلا استحقاق مل رہے ہیں۔ نہیں بلکہ اسکے نزدیک آج دنیاوی نعمت کچھ شے نہیں رہی ہاں گرچہ تیرہ سو برس سے وہ اسی دنیاوی نعمت کا رنگ اڑاتے ہوئے بادشاہت زمین کو اپنے منظور خدا ہونے کا ثبوت دیتا رہا ہے، اور طرفہ تر یہ کہ اسکو یہود کے مغضوب علیہم ہونے کا اعتراف بھی اکثر اسی بنا پر ہے کہ انکی قوم پر اجتماعی مسکنت اور ذلت چھا رہی ہے، انکی کوئی زمینی بادشاہت نہیں رہی وہ دنیا کے ملکوں میں صدہا صد سے مارے مارے پھر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر جب اسی حالت کا اطلاق آج بعینہ اپنے آپ پر ہوتا ہوا دیکھتا ہے تو اسکا ذہن سلیم اسکو یکسر جواب دے دیتا ہے، اور وہ باصرار اسی خیال پر قائم ہو جاتا ہے کہ مسلمان باوجود کس مپرسی اور زبوں حالت کے صراط مستقیم پر ہیں، اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ہیں، مغضوب علیہم ہرگز نہیں، اَلضَّآلِّیْنَ بننے کا امکان ان کے حق قطعاً نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس دل خوش کن تخیل کی ظاہر

(دیکھیے سمت الحق صفحہ ۱۰۰۲) کہ کوئی سند سورہ فاتحہ کے اندر موجود نہیں، اور نہ اس فیصلے سے، خواہ وہ تمام مسلمانانِ عالم کا متفقہ فیصلہ ہی کیوں نہ ہو، قانونِ خدا یا قولِ ربّ العالمین کے مفہوم میں کوئی تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔ جو بات کسی دلیل کی محتاج نہیں یہ ہے کہ ربِّ زمین و آسمان نے اِن آیاتِ شریفہ میں ہر مسلمان کو دن میں پانچ وقت بلکہ ہر نماز میں کئی دفعہ صراطِ مستقیم پر رہنے کی دعا سکھلائی ہے، گویا یہ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ہی وہ شے ہے جس سے ہر انسان کے بھٹک جانے کا ہر لحظہ خطرہ ہے، ہر مسلمان کے اس راہ سے بے راہ ہو جانے کا ہر آن امکان ہے، اور جب تک اِس کی تمام توجہ صرف نہ ہو، اس کا اِس پر از خود چلتے رہنا محال ہے۔ یہ سیدھی سادی دلیل ہر ہوشمند شخص کو اس نتیجے پر پہنچا دیتی ہے کہ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ پر قائم رہنے کے لیے پیہم جدوجہد کی ضرورت ہے اور جب تک وہ سعی و عمل جاری ہے ایک مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہے۔ اگلے وقتوں کے ہوشمند، دقیقہ رس اور اسلام شناس مفکرین نے اِس حقیقت کبریٰ کو اِن نہایت خوب صورت، بلیغ اور تشبیہ خیز الفاظ میں ادا کیا تھا کہ اسلام کا صراطِ مستقیم ایک نہایت دشوار گذار **بال سے سوا باریک اور تلوار سے سوا تیز رستہ ہے** جس پر سے ہر متنفس کو گذرنا ہے، جو شخص **'مسلمان'** ہے وہ اس رستے پر سے آسانی سے گذر جائے گا (کیونکہ مسلمانی کی شرط پیہم ہر لحظہ سعی و عمل کرتے رہنا اور باحتیاط تمام اس راہ کو عبور کرنے کی سعی کرنا ہے) جو مسلمان نہیں وہ کٹ مر کر جہنم میں جا گرے گا۔ وغیرہ وغیرہ" بعد کے جاہل کٹ ملاؤں نے ان الفاظ کی حقیقت کو توڑ موڑ کر صراطِ مستقیم کو عالمِ آخرت کے دوزخ کا کوئی پل بنا دیا اور سعی و عمل سے گریز کرنے کا بہانہ ڈھونڈنے کے لیے اِس معنی خیز بیان کو احوالِ قیامت کا ایک 'قصہ' بنا کر اعلان کر دیا کہ اس پل صراط پر سے ہر شخص گذرے گا، مسلمان اپنی قربانیوں کے دُنبوں پر سوار ہو کر سرپٹ جنت میں جا داخل ہوں گے۔ یہودی اور نصرانی وغیرہ کٹ کر دوزخ میں دھڑام سے گر پڑیں گے! آج یہ سب حکایت حقیقت سے اسقدر دور ہو گئی ہے کہ ہر سلیم الذہن شخص اِس کو سُن کر بے اختیار ہنس پڑتا ہے اور مسلمانیت کو بیہودہ افسانوں کا مجموعہ قرار دے کر اس سے یکسر متنفر ہو جاتا ہے!

ادنیٰ تامل بھی ہر شخص کو اس نتیجے پر پہنچا دیتا ہے کہ جو خطِ مستقیم بال سے سوا باریک اور تلوار سے سوا تیز ہو اُس پر چلتے رہنا کس قدر انتہائی احتیاط کا کام ہے اور اس میں اِدھر اُدھر ہٹنے کی کسقدر کم گنجایش ہے۔ نہیں بلکہ جس طرح کوئی بازیگر کسی رسی پر چلتے ہوئے تمام توجہ **عدل و توازن** قائم رکھنے میں صرف کر دیتا ہے اسی طرح کسی امت کا ہر لحظہ اپنی تمام **احتیاط قسط و اعتدال پر رہنے میں صرف کر دینا صراطِ مستقیم پر چلنے کے مترادف ہے**۔ دینِ اسلام کا یہ اصل اصول قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ (۷: ۲۹) کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے جو اس سے پیشتر صفحہ ۱۰۲ پر آ چکے ہیں۔ اصل کتاب میں آیندہ اوراق (صفحہ ۲۳۹-۲۴۲) میں صراطِ مستقیم کی قرآنی تعریف بصراحت تمام بیان کر دی جائے گی۔ جس کے مطالعے کے بعد واضح ہو جائے گا کہ جو امت صراطِ مستقیم کے اس مفہوم پر بطور تمام اور بسعی اتم چل رہی ہے اُس کا اس دنیا میں قوت اور تمکن سے رہنا اٹل ہے، اُس کا بقائی الارض اور استخلاف قطعی ہے، کوئی دور، کوئی قوم اُس کے بالمقابل صف آرا ہو کر اُس کو میدانِ حیات میں پچھاڑ نہیں سکتی، اسے نیاوی انعام اور افضال الٰہی اُس قوم کے شاملِ حال ہر دم رہیں اور رہیں گے وغیرہ وغیرہ۔ پس یہ دنیاوی تمکن ہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس کی تعریف ربّ زمین و آسمان نے صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے الفاظ میں کی ہے۔ اور اسی سے ہٹ کر قومیں مغضوب علیہم بن جاتی ہیں یا الضَّالِّينَ میں شمار ہو کر خود العتاب خدا کے عذاب کو دعوت دیتی ہیں۔ اِن آیات میں یہود و نصاریٰ کی حتماً کوئی تخصیص نہیں اور نہ مسلمان بالخصوص الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ہیں، وہ بلاشبہ اُس وقت تھے جب قبضہ رس خدا کے انعام اُن کو ہر طرف سے مالا مال کر رہے تھے مگر اب سب طرف قہرِ خدا ہے۔ تاہم نماز میں پنجوقتہ گذارش اسی کی ہے کہ ہم کو اس صراطِ مستقیم پر چلا جس پر چلنے سے تو خوش ہو جائے اور دنیاوی انعامات اور تعززسے مالا مال کر دے۔ یہ دعا ایک تنخواہ دار غلام کی اپنے آقا سے ہو سکتی ہے، اور اسی صلاحیت عمل کا کوئی آقا اپنے غلاموں سے متقی ہو سکتا ہے۔ 'اِهْدِنَا' اور 'الَّذِينَ' اور 'عَلَيْهِمْ' اور 'الضَّالِّينَ' کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ انعام اور سزائیں سب **اجتماعی** ہیں۔ اور اسی لیے الصَّلٰوة خدا کے حضور میں قوم کی طرف سے ایک **متفقہ درخواست** ہے، افراد کا اپنی جماعت سے الگ ہو کر اس دعا کو حضورِ خدا میں گذرانا ایسا ہی بے معنی ہے جیسا کہ کسی مسلمان کا انفراد

الْمُسْتَقِيْمَ ۝

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۱۱) قوم سے الگ تھلگ ہو کر صراط مستقیم پر چلنے کی سعی کرنا جیسا کہ آگے چل کر اس وقت واضح ہو گا جب کہ صراط مستقیم کے متعلق سب اعمال اجتماعی ثابت کر دیئے جائیں گے پیغمبر خدا صلعم نے اسی مقام نظر سے الصَّلٰوۃ کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے باصرار تمام فرمایا تھا کہ جماعت کے بغیر کوئی نماز فی الحقیقت نماز نہیں ہے۔

یہی یہ بات کہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے الفاظ سے دنیاوی نعمتیں ہی مراد ہیں، یہ نماز کی رکعتوں میں دمبدم اٹھنا اور بیٹھنا، احکم الحاکمین کے حضور میں دست بستہ کھڑا ہونا، یہ گھٹنوں کے بل جھک جانا اور بار بار اتنا گرنا، پھر اٹھنا اور گڑگڑانا، وغیرہ وغیرہ سب کچھ دنیاوی انعام کی امید اور اجتماعی سزا کے خوف سے تھا اس کا ثبوت خود قرآن کے اندر موجود ہے۔ قرآن حکیم میں نعمت کا لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے مگر ماسوا ان شاذ موقعوں کے جن کا ذکر آگے چل کر آئے گا سب جگہ نعمت سے مراد دنیاوی نعمتیں ہی ہیں روحانی نعمتوں کا جن کے صحیح معانی کی تعیین بھی از بس مشکل ہے، قرآن حکیم میں کہیں ذکر نہیں۔ توضیح مطالب کے لیئے یہ سب موقعے یہاں پر لکھ دیئے جاتے ہیں مگر خوف طوالت کے باعث بعض حوالوں کو مختصراً بیان کر دیا ہے مزید معلومات کے لیئے سیاق کلام کو دیکھنا چاہیئے۔

(الف) سورہ انفال میں ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۸: ۵۳) یعنی "یہ اس وجہ سے کہ خدا کا دستور ہے کہ وہ کسی قوم پر سے اپنی عطا کی ہوئی نعمت کو نہیں بدلتا جب تک کہ لوگ آپ اپنی استعداد کو نہ بدلیں" یہاں نعمت صاف دنیاوی راحت اور آسائش ہے، اور اَنْعَمَهَا عَلٰى کے الفاظ بھی آئے ہیں جن کی مماثلت سورہ فاتحہ کے اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے عیاں ہے۔ سورہ ابراہیم میں دنیاوی نعمتوں کی تفصیل کے بعد فرمایا ہے: وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۴: ۳۴) "اور لوگو! اس نے تم کو جو کچھ تم نے مانگا بقدر ضرورت دیا، اور اگر خدا کی نعمتوں کو گننا چاہو تو ہرگز نہ گن سکو گے" یہی بات آیت (۱۶: ۱۸) میں ہے مگر اسکے اعادے کی ضرورت نہیں۔ سورہ لقمان میں کشتیوں کے سمندر میں چلنے (اور اس ترکیب سے انسان کے لیئے سہولت سفر پیدا کرنے) کو بھی نعمت الٰہی کہا گیا ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۳۱: ۳۱) یعنی "اے مخاطب! کیا تو نے اس حیرت انگیز حقیقت پر غور نہیں کیا کہ کشتیاں سمندر میں خدا کی نعمت (احسان) کے باعث چل رہی ہیں، اور یہ اس لیئے کہ خدا تم کو اپنی قدرت کے حیرت انگیز عجوبات دکھلائے! اسمیں شک نہیں کہ عجائبات قدرت پر استقلال سے ہر غور کرنے والے (صَبَّارٍ دیکھو صبر کے مطالب تحت المتن صفحہ ۱۱۱) اور نعمتہائے خدا کے صحیح معنوں میں قدر دان (شَكُوْرٍ دیکھو شکر کے مطالب تحت المتن صفحہ ۱۳۳) شخص کے لیئے کشتیوں کے سطح سمندر پر چلنے میں علم و عمل کے بہتیرے اشارات (لَاٰيٰتٍ) موجود ہیں" علی ہذا القیاس سورہ قمر میں کنکروں کے پتھراؤ سے آل لوط کی نجات کو نعمت خدا ہے: اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ۙ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ (۵۴: ۳۴-۳۵) یعنی "پھر ہم نے اس قوم پر پتھروں کی بارش کی مگر خاندان لوط کے لوگوں کو ہم صبح ہوتے ہوتے بچا لے گئے، یہ ہمارے ان سے آل لوط پر نعمت تھی اور جو لوگ ہمارے احکام کی قدر دانی کر کے ان کی کماحقہ تعمیل کرتے ہیں (مَنْ شَكَرَ دیکھو شکر کے مطالب تحت المتن صفحہ ۱۳۳) انکو ہم ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں" سورہ قلم میں حضرت یونس کے مچھلی کے پیٹ سے نکل کر نجات پانے کو نعمت خدا سے تعبیر کیا ہے گویا اس موقع پر بھی نعمت دنیاوی مصیبت سے نجات پانے کے مترادف ہے، روحانیت سے اسکو کچھ واسطہ نہیں: لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَاۗءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ (۶۸: ۴۹) یعنی "اگر خدائے رحیم کا فضل و کرم ان کی دستگیری نہ کرتا تو بڑے حالوں چٹیل میدان میں پھینک دیئے ہوتے" سورہ احقاف میں نعمت کا دنیاوی مفہوم ذرا واضح تر ہے چنانچہ اس نہایت دقیق آیت کے مطالب جسمیں اَنْعَمْتَ عَلَيَّ کے الفاظ قابل لحاظ ہیں بہ اصرار تمام کمال لکھ دیئے جاتے ہیں:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ۭ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۭ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۭ حَتّٰٓى
اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَ

صراط

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۱۲) اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۰ (۴۶ : ۱۵)
اور لوگو! ہم نے انسان کو حکم دیدیا ہے کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے، وہ فی الحقیقت اس سلوک کے مستحق ہی ہیں کیونکہ تکلیف اٹھا کر ہی اسکی ماں نے اُسکو پیٹ میں رکھا، اور دردناک اذیت کے بعد ہی اسکو جنا، پھر یہی نہیں بلکہ اس کا پیٹ میں رہنا اور اسکے دودھ کا چھوٹنا کہیں ڈھائی برس میں جاکر ختم ہوتا ہے (لیکن انسان وہ ناشکر اور احکام خدا سے باغی انسان ہے کہ ماں کی ان تکالیف کی کماحقہٗ پروا نہیں کرتا اور طفولیت کی نادانیوں اور کم عقلیوں میں مست رہکر ماں باپ سے اینٹھا اینٹھا پھرتا ہے اور اُنکے احسان کو کچھ خاطر میں نہیں لاتا۔ اُسکو صحیح معنوں میں ہوش نہیں آتی) جب تک کہ آخر کار وہ سن رشد و تمیز کے کمال کو پونہچکر آپ چالیس برس کی عمر کا ہو جاتا ہے (حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ) پھر جب باپ بن کر خود اُن تکالیف کو سہنے لگتا ہے تو بزبان حال پکار اٹھتا ہے کہ اے میرے پروردگار! مجھے اس بات کی توفیق دے (قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ) کہ میں تیری ان نعمتوں کی صحیح معنوں میں قدر کروں (اَنْ اَشْکُرَ، دیکھو شکر کے معانی تحت المتن صفحہ ۱۳۹) جو تونے مجھ پر طفولیت میں کی تھیں اور آج کر رہا ہے، اور جو میرے ماں باپ پر کی تھیں، اور مجھے توفیق دے کہ میں وہ مناسب اعمال کروں جن سے تو راضی ہو جائے، اور میری اولاد کو بھی (جو ہماری میاں بیوی کی تکالیف سے میسر ہے) مناسب راہ پر لا (وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ)، میں تو اب چالیس برس کی غفلت کے بعد تیری طرف لوٹ آیا ہوں (اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ) اور صحیح معنوں میں تیرے احکام کو پر از حکمت سمجھکر انکو تسلیم کرتا ہوں۔

(قرآن کی بلاغت یہی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطلب ادا ہو جائے اور ہر صاحب غور و فکر فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس آیۂ شریفہ کا بعینہ یہی مطلب ہے جو بیان ہوا اسمیں انسان کی فطرت اور عادت مستمرہ کو واضح کیا گیا ہے۔ چالیس برس کی عمر کو پونہچکر حقیقت حال کا کھلنا ہر صاحب نظر پر واضح ہے۔ زندگی کی اسی منزل پر استعداد و تمیز حد کو پونہچ جاتی ہے اور انسان کو اپنی ماہیت پر غور کرنے اور اس دنیا جہان کے کارخانے کو بنظر تعمق دیکھنے کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ خود رسول خدا صلعم کو نبوت کا خلعت بھی اسی عمر میں عطا ہوا تھا۔ فافہم و تدبر)۔ لیکن اس بحث سے قطع نظر، اس آیہ شریفہ میں 'نعمت' کا مفہوم سراسر دنیاوی احسان ہی ہیں۔ روحانیت کا یہاں پر کچھ ذکر نہیں۔ سورۂ یوسف میں علی ہذا القیاس تاویل احادیث کے علم کو اتمام نعمت قرار دیا ہے؛ وَیُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ وَیُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكَ (۱۲ : ۶)، یعنی اسی طرح خدا تم کو تاویل احادیث کا علم سکھاوے گا اور اپنی نعمت کا تم پر اتمام کرے گا؛ 'تاویل احادیث' کے صحیح مفہوم سے یہاں پر بحث نہیں مگر ظاہر ہے کہ تحصیل علم کو یہاں پر نعمت فرمایا ہے۔ سورۂ نساء آیہ (۴ : ۷۲) میں اَنْعَمَ اللّٰهُ کے الفاظ دنیاوی مصیبت سے نجات پانے کے معنوں میں آئے ہیں اور وہ آیت صفحہ ۱۲۰ کے تحت المتن میں گذر چکی ہے مگر یہاں پر اُس سے استدلال نہیں کیا کہ وہ الفاظ بطور قول غیر استعمال ہوئے ہیں نعمتہا الٰہی مقصود اُن سے مستنبط کرنا روا نہیں سمجھا!

(ب) انسان کی ناقدرشناسی کے ضمن میں کئی جگہ لفظ نعمت کا ذکر ہے جس سے مراد دنیاوی نعمتیں ہی ہیں۔ سورۂ زمر میں ہے: فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ (۳۹ : ۴۹)، یعنی انسان کی عادت ہے کہ جب اُسکو کوئی تکلیف پونہچے تو ہم کو پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اسکو اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا فرماتے ہیں تو کہنے لگتا ہے کہ یہ تو مجکو میرے علم کی وجہ سے ملی ہے۔ سورۂ حم السجدہ میں ہے؛ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِیْضٍ ۰ (۴۱ : ۵۱)، یعنی جب ہم انسان پر اپنا دنیاوی فضل و کرم کرتے ہیں تو وہ ہم سے منہ پھیر کر کنارہ کش ہو جاتا ہے اور جب اُسکو کوئی تکلیف پونہچتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں قریب قریب یہی مضمون ہے؛ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ یَئُوْسًا ۰ (۱۷ : ۸۳)، یعنی ..... تکلیف کے وقت آس توڑ بیٹھتا ہے''۔ ان دونوں موقعوں پر اَنْعَمْنَا عَلٰی، کے الفاظ قابل لحاظ ہیں۔ سورۂ زمر کے شروع میں پھر اسی دنیاوی نعمت کا ذکر ہے؛ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِیْبًا

الـدِّيْنَ

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۱۳) اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ (۳۹ : ۸)، یعنی جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو خدا کی طرف ہمہ تن رجوع ہو کر کراہتا ہے، پھر جب خدا اپنی طرف سے کوئی نعمت اُسکو عطا کرتا ہے تو جس مطلب کے لیے اُس نے خدا کو پہلے پکارا تھا اُسکو بھلا دیتا ہے۔" سورۂ نحل میں ایک جگہ اسی قطع کی یاددہانی ہے: وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ (۱۶ : ۵۳)، یعنی "لوگو! جسقدر نعمتیں تم کو مل رہی ہیں سب خدا ہی کی طرف سے ہیں، پھر جب تم کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اُسی کے آگے آہ وزاری کرتے ہو۔" سورۂ ہود میں پھر اسی ناشکر انسان کا ذکر ہے: وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ (۱۱ : ۱۰)، یعنی "اور اگر اسکو کسی تکلیف کے بعد نعمتہائے الٰہی کی لذت چکھائیں تو وہ کہنے لگتا ہے کہ اب میری سب بدحالیاں (السیئات) دور ہو گئیں، اسمیں شک نہیں کہ انسان بڑا جلد خوش ہو جانے والا اور جلد شیخی میں آجانے والا ہے۔"

(ج) دنیاوی نعمتوں کے بارے میں انسان کو خطاب کئی جگہ ہے۔ سورۂ نحل میں ہے: وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۞ (۱۶ : ۸۱)، یعنی "لوگو! وہ خدا ہی ہے جس نے تمہارے فائدے اور آرام کے لیے پیدا کردہ اشیا کے سائے بنائے، اور تمہاری پناہ کے لیے پہاڑوں کے اوٹ بنائے اور لباس جو تم کو گرمی سے بچائیں۔ اور ایسی زرہیں بھی جو تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائیں، خدا یوں ہی اپنی نعمتیں تم لوگوں پر پوری کرتا ہے، تاکہ تم اسکو صحیح معنوں میں خدا تسلیم کرو۔" یہاں بھی صاف طور پر (نعمتہٗ) سے مراد دنیاوی نعمتیں ہیں جن کا ذکر آیہ (۱۶ : ۸۰) سے برابر چلا آیا ہے۔ اور آگے چلکر تاکید کے طور پر پھر يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۞ (۱۶ : ۸۳) فرمایا ہے، یعنی "لوگ خدا کی نعمتوں کو خوب سمجھتے ہیں، پھر دیدہ و دانستہ اُن سے انکار کرتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ اُن میں سے اکثر ناشکر (کٰفِرُوْنَ) ہیں۔" اس آیۂ شریفہ میں خدا کی عطا کی ہوئی دنیاوی نعمتوں کو **نعمت نہ تسلیم کرنیوالوں کو بصراحت تمام کافر کہا گیا ہے**، جو مسلمان آج دنیاوی نعمتوں کو ہیچ سمجھکر اس دنیا کو قابل نفرت سمجھتے ہیں اُنکے لیے یہ تہدید از بس عبرت انگیز ہے۔ اِسی سورۃ میں انسان کی دنیاوی خوشحالی کو بارِ دگر نعمت سے تعبیر کیا ہے۔ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۱۶ : ۷۱)، "اور لوگو! اُس خدائے ذوالجلال نے ہی تم کو رزق میں ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے تو جن کو زیادہ روزی دیگئی ہے وہ کچھ اپنی دولت اپنے پیش خدمت غلاموں اور ماتحتوں کو لوٹا نہیں دیا کرتے تاکہ آقا اور غلام آپس میں برابر ہو جائیں۔ جب وہ ایسا نہیں کرتے اور اپنے تفضل رزق کو نہایت اہتمام سے برقرار رکھتے ہیں تو کیا اس کے بعد بھی اللہ کے احسانات سے منکر ہیں۔" اس مغلق آیت کے مطالب کے متعلق مُدلّل بحث اپنے موقع پر آئیگی، مگر صاف ظاہر ہے کہ یہاں تفضل رزق کو نعمت کہا گیا ہے۔ اس سے اگلی آیت ہے: وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۞ (۱۶ : ۷۲)، "اور لوگو! خدا ہی وہ کارساز حقیقی ہے جس نے تمہاری آسایش کے لیے تم ہی میں کی بیبیاں بنائیں، اور تمہاری بیبیوں سے تمہارے لیے بیٹوں اور پوتوں کو پیدا کیا اور تم کو نہایت عمدہ رزق ارزانی فرمائے، تو کیا یہ لوگ اس حقیقت کے کھل جانے کے بعد بھی فرضی معبودوں کے لاطائل افسانوں پر ایمان رکھیں گے، اور خدا کی دی ہوئی صریح نعمتوں کا کفران کرینگے؟" یہاں بھی صاف اور غیر مشکوک الفاظ میں بیویوں، اولاد، اور طیبات رزق کو نعمت کہا گیا ہے اور اُنکے عدم اقرار کو کفر پر محمول کیا ہے۔ سورۂ فاطر میں ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ (۳۵ : ۳)، یعنی "اے ساکنانِ زمین! خدا کی نعمتوں کو جو تم کو دی گئی ہیں یاد کیا کرو اور غور کرو کہ کیا فی الحقیقت خدا کے سوا کوئی اور وجود بھی ہے جو اس قدر طاقت رکھے کہ تم کو آسمان اور زمین سے رزق پہنچائے۔" یہاں نعمت وہ مادی وسائل ہیں جن پر انسان کی حیات کا مدار ہے۔ سورۂ لقمان میں ہے: اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ (۳۱ : ۲۰)

ع٥ نعمت بمعنی احسان: وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ (۲۶ : ۲۲) یعنی موسیٰ فرعون سے کہتے ہیں کہ تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ ہمیشہ بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا [illegible]

اَنْعَمْتَ

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۱۴) یعنی کیا تم لوگوں نے اِس بات پر نظر نہیں کی کہ خدا نے تمہارے فائدے اور استفادے کیلئے آسمان اور زمین کے اندر جو کچھ ہے تسخیر کر رکھا ہے، اور اِس تسخیر کے باعث گویا اپنی ظاہری اور باطنی سب نعمتیں تم پر پوری کر دی ہیں"۔ یہ آیہ جلیلہ ناقابل انکار طور پر اِس حقیقت کبریٰ کی مؤید ہے کہ اشیائے فطرت سے استفادہ کرنا ہی ظاہری اور باطنی نعمتوں کی تکمیل ہے، گویا نعمت کا کامل اور مکمل مفہوم خدا کی تمام بنائی ہوئی اشیا کا جائز استعمال ہی ہے، اِس کے ماسوا حتماً کچھ نہیں۔ یہاں پندو حانی نعمتوں کے وجود کی بھی تغلیط ہو جاتی ہے اور جیسا کہ چوتھی جلد میں علم کے عنوان میں واضح کر دیا جائے گا۔ فطرت کی اشیا کے صحیح استعمال کے اندر اور اُس کے ضمن میں ہی رُوحانیت کے تمام مدارج کی تکمیل بھی ہو جاتی ہے۔ اور یہی وہ اوج مرتبت ہے جس کے حاصل ہونے کے بغیر کسی قوم کا اِس دنیا میں تمکن ناممکن ہے۔ (کتاب کے عربی افتتاحیہ میں قرآن حکیم کی اِس تعلیم کی ایک جھلک دکھلا دی گئی ہے (دیکھو صفحہ ۲۸-۳۲)

(ی) انسانوں کی طرف عام خطاب سے قطع نظر بنی اسرائیل کی طرف خدائی خطابات بھی اسی حقیقت کبریٰ کو ظاہر کرتے ہیں کہ قرآن حکیم میں نعمت کا مفہوم دنیاوی افضال و اکرام ہی ہے۔ سورہ ابراہیم میں حضرت موسیٰ کا قول ہے: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ (۱۴: ۶) یعنی ایک وہ وقت تھا کہ جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے لوگو! خدا کی اُس نعمت کو یاد کرو جب اُس نے تم کو فرعون کے لوگوں کے ظلم سے نجات دی تھی، وہ تم کو غلامی میں رکھ کر دردناک طور پر تکلیفیں دیتے، تمہارے بیٹوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرتے کہ تم تعداد میں تھوڑے رہ جاؤ، اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے کہ لونڈیاں بن کر رہیں"۔ یہاں ایک قوم کی سیاسی نجات کو نعمت خدا کہا گیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۵: ۲۰)، "اور ایک وہ وقت تھا کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے لوگو! خدا کی اُس عظیم الشان نعمت کو یاد کرو جب کہ اُس نے تمہی میں سے پے در پے کئی پیغمبر تمہاری ہدایت کیلئے بھیجے پھر تم کو بادشاہ بنا دیا، اور وہ وہ انعامات عطا فرمائے جو دنیا جہان میں کسی قوم کو نہ دیئے تھے"۔ یہاں ایک سطح بین شخص کہہ سکتا ہے کہ انبیا کا بنی اسرائیل میں مبعوث ہونا ایک روحانی نعمت تھی، لیکن ادنیٰ تامل بھی اِس نتیجے پر پہنچا دیتا ہے کہ اِن انبیا کا آنا درحقیقت اُس قوم کی اجتماعی اور دنیاوی بہتری کیلئے ہی تھا، جیسا کہ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا اور اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ خود موسیٰ علیہ السلام کی پیش نہاد بھی بنی اسرائیل کو فراعنہ مصر کے مظالم سے نجات دینا، اور اُس قوم کو قانون خدا کا پابند بنا کر بادشاہ بنانا ہی تھا جیسا کہ متذکرہ صدر آیت (۱۴: ۶) سے بھی ظاہر ہے نہیں بلکہ اِس آیت سے بعد کی آیتیں (یعنی ۵: ۲۱-۲۶) جن میں موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو ارض مقدس پر حملہ کرنے اور دشمن سے مردانہ وار لڑ کر بادشاہت زمین حاصل کرنے کی زبردست ترغیب دی ہے، پیغمبری کے منتہا، اور جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ کی نعمت کے مفہوم کو اظہر من الشمس کر دیتی ہیں۔ آگے چل کر اسی تحت المتن میں اِس واقعے کی مزید تفصیل کر دی جائے گی لیکن ہر صاحب نظر بطور خود دیکھ سکتا ہے کہ بنی اسرائیل کے پیغمبر بشمولیت موسیٰ علیہ السلام، اُس قوم کو اِس دنیا میں متمکن اور مستقل کرنے کیلئے ہی مبعوث ہوئے تھے۔ اور یہ اجتماعی بقا کی بشارت دینا ہی ہر مرسل کا پیغام جلیل ہوا کرتا ہے جیسا کہ صفحہ ۱۱ کے تحت المتن ۳ میں واضح کر دیا گیا ہے۔ نبی اپنی قوم کے لئے یا تمام دنیا کے لئے چند روشن احکام خدا کے ہاں سے لے آتا ہے، پھر جب تک لوگ اُن پر عامل رہتے ہیں اجتماعی بقا کی بشارت اُن کو ملتی رہتی ہے، جب اُس راہ سے ہٹ جاتے ہیں ہلاک ہو جاتے ہیں، یہی سچی رُوحانیت، اور صحیح معنوں میں نعمت ہے۔ اسی حقیقت کبریٰ کو خدا صاحب نے سورۂ بقرہ میں دوسرے لفظوں میں واضح کیا ہے: سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۲: ۲۱۱) یعنی اے محمد! تم بنی اسرائیل سے پوچھو تو سہی کہ ہم نے اُن کو کیا کچھ روشن قانون اور کتنے کھلے کھلے اور غیر مشکوک حکم دیئے تھے (اٰيَةٍ بَيِّنَةٍ)، (وہ اگر اُن پر عامل رہتے تو ہمارے خزانۂ عامرہ سے کیا کیا انعام نہ پاتے)، لیکن جس قوم نے خدا کی نعمت کو اُس کے آ جانے کے

عَلَيْهِمْ

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۱۵) بدل: الا تو خدا نے بھی آخر اُس قوم سے انتقام لینا ہی تھا اور اسمیں شک نہیں کہ وہ بہت شدت سے بدلہ لینے والا ہے" یہاں اُن احکامِ خدا ہی کو نعمت کہا گیا ہے کیونکہ اُن پر عمل کرنے کا نتیجہ اجتماعی راحت تھی، اور رد کرنے کا بدلہ ہلاکت کی صورت میں ظاہر ہوا یہی بات سورۂ بقرہ کے اِس خطاب سے ظاہر ہے: يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ؀ (۲: ۴۷ و ۱۲۲) یعنی اے بنی اسرائیل! میری اُس نعمت کو یاد کرو جو کسی زمانے میں میں نے تم کو عطا کر رکھی تھی، اور بالخصوص اِسکو کہ میں نے تم کو دنیا جہان کی سب قوموں پر ہر طرح کی فوقیت دی تھی" نہیں بلکہ ایک اور موقع پر دنیاوی فضیلت کو دوبارہ واپس دینے کا اقرار کیا ہے بشرطیکہ احکام پر عمل از سرِ نو شروع ہو جائے، یا بعبارۂ اُخریٰ ماسوا کا خوف (جو فی الحقیقت تمام عصیان و عدم تعمیل کا باعث ہے) اُٹھ جائے: يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ؀ (۲: ۴۰) یعنی اے بنی اسرائیل! یاد کرو وہ نعمتیں جو میں نے تمہیں دے رکھی تھیں، یاد کرو کہ وہ کیونکر چھن گئیں اور میری تو یہ شان ہے کہ اگر آج میرے عہد کو پورا کرو گے تو آج ہی میں بھی اپنے عطائے سلطنت کے عہد کو پورا کر دونگا۔ اور وہ عہد یہی ہے کہ مجھکو حاکمِ اعلیٰ مانکر مجھ ہی سے ڈرتے رہو" کسی دوسرے موقع پر اِس عہد و پیمان کی جو خدائے عزّوجل نے بنی اسرائیل سے کیا تھا تصریح کر دی جائے گی، یہاں پر بحث صرف نعمت کے صحیح مفہوم سے ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ نعمت بادشاہت زمین ہی تھی جو اُن سے چھین لی گئی۔ علیٰ ہٰذا القیاس فرعونیوں کی نسبت ہے: كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۙ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۙ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ [۵] (۴۴: ۲۵ [illegible])

(ھ) بنی اسرائیل سے خطاب کے علاوہ قرآن حکیم میں کئی موقعے ہیں جہاں بالخصوص قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں سے خطاب ہے لیکن وہاں پر بھی نعمت سے مراد دنیاوی نعمتیں ہی ہیں۔ سورۂ نحل میں رزق کی حلت اور حرمت کے بارے میں ہے: فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ؀ (۱۶: ۱۱۴) "پس اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو دے رکھا ہے اُنہیں سے پاکیزہ اشیا کو کھاؤ اور اگر تم فی الحقیقت خدا ہی کے تابع اور ملازم ہو (اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ) تو اُنکی نعمتوں کا صحیح استعمال کرو (معانی شکر کے لیئے دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۳۰)۔ سورۂ احزاب میں ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَاۗءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (۳۳: ۹)، یعنی اے ایمان والو! خدا کی اُس نعمتِ عظمیٰ کو یاد کرو جب کہ غزوۂ خندق میں تم پر لشکر کے لشکر آ چڑھے تھے پھر ہم نے اُنکے زور کو توڑنے کے لیئے اُن پر تند ہوا بھیجی اور آندھی کے علاوہ اور مقابلہ کرنے والی قوتیں اور افواج جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے" یہاں بھی نعمت وہ خدائی تائید تھی جسکا نتیجہ دنیاوی فتح کی صورت میں ظاہر ہوا۔ سورۂ مائدہ میں ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ (۵: ۱۱)، یعنی اے ایمان والو! اپنے اوپر خدا کے اُس احسان کو یاد کرو جب ایک گروہ نے تم پر دستِ تعدی دراز کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن خدا نے تم سے اُن کے ہاتھوں کو روک دیا" یہاں دشمن کے حملے سے بچ جانا نعمتِ خدا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں بدرِ صغریٰ کے میلے پر جو تجارتی فوائد مسلمانوں کو حاصل ہوئے اور جو اخلاقی فتح اُنکو ابوسفیان کی دھمکی سے نہ ڈرنے اور بدر میں حسبِ وعدہ آ دھمکنے سے ہوئی اسکے اعتراف میں ہے: فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْۗءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ (۳: ۱۷۴)، یعنی پھر اسلام کا جرار لشکر اور اُن کے بہادر سرخیل لوٹے تو اِس شان سے لوٹے کہ خدا کی نعمتوں اور اُس کے فضل و کرم سے لدے ہوئے تھے، بدر کے میدان میں تین دن رات پڑے رہنے کے باوجود اُن کا بال تک بیکا نہ ہوا (لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْۗءٌ)، وہ خدا کی خوشنودی پر کاربند ہوئے تھے اور خدا بڑا ہی صاحبِ فضل و کرم ہے جو پل میں کچھ کا کچھ کر دیتا ہے" یہاں نعمت کے دنیاوی مفہوم کے علاوہ 'فضل' کے معانی بھی صاف ہو گئے کہ قرآن کی لغت میں اِس کا مفہوم بھی دنیاوی مال و دولت ہی ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں راہِ خدا میں اپنی جان لڑا دینے والے مجاہدین کی نسبت فرمایا ہے۔ وہ مرے نہیں بلکہ زندہ اور خوش بخوشی خدا کے پاس موجود ہیں، اُن مجاہدوں کو جو ابھی مارے نہیں گئے اُخروی امن کی بشارت دے رہے ہیں پھر اِسکے بعد فرمایا ہے: يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ (۳: ۱۷۱)، یعنی وہ لوگ دنیا میں رہنے والے

---

[۵] یعنی ان لوگوں کو ہماری نافرمانی کے عوض کیسے کیسے عمدہ باغات اور چشمے اور کیسی کیسی کھیتیاں اور عزت کے مقامات اور نعمتوں کی چیزیں جنمیں وہ مزے اڑا کر رہتے تھے چھوڑنی پڑیں"۔ دیکھو صفحہ ۱۱۶۔

عنیر

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۱۶) مومنوں کو خدا کے ہاں سے (مِّنَ اللّٰہِ) دنیوی انعام و اکرام اور فضل و کرم کی بشارت دے رہے ہیں۔" یہاں نعمت سے صاف دنیاوی نعمت مراد ہے کیونکہ اُخروی انعام کا ذکر پیشتر کی آیت میں آ چکا ہے۔ سورۂ فتح میں صلح حدیبیہ کی دور رس حکمت عملی کو فتحًا مُّبِینًا (۱:۴۸) کہہ کر اتمام نعمت اور صراط مستقیم کے معنی خیز القاب عطا فرمائے ہیں: وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا (۲:۴۸) یعنی "یہ معاہدہ جو بظاہر ذلت آمیز معلوم ہوتا ہے مگر در اصل مسلمانوں کے لیے فتح مبین ہے کیونکہ ان کو اس اثنا میں اپنی قوتوں کو اور جمع کرنے کا موقع مل جائے گا۔ دشمن اپنی قوت کے غرور میں اور قوی بننے کی سعی نہ کر سکے گا، اور یہ متارکہ فی الحقیقت تم پر خدائے عز و جل کی نعمت مکمل ہو جانے کا پیش خیمہ ہوگا، اور نیز اسلئے کہ خدا تم کو دشمن پر غالب آنے کے صراط مستقیم پر لیجائے۔" یہاں نعمت کے سیاسی مفہوم کی توضیح کے ساتھ ساتھ صراط مستقیم کے مطالب کی بھی ایک حد تک تشریح کر دی ہے۔ سورۂ آل عمران میں قرون اولیٰ کے مومنوں کے بے مثال اتحاد اور اخوت کو دوبارہ نعمت کہا ہے: وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ إِخْوَانًا (۱۰۳:۳)۔ مطالب صفحہ ۱۴۵ پر آ چکے ہیں یہاں اعادے کی ضرورت نہیں۔ سورۂ مائدہ میں بدن کی تطہیر اور نہانے دھونے ہاتھ منہ دھونے کو بھی اتمام نعمت فرمایا ہے: مَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۶:۵)، یعنی "خدا اس وضو اور تیمم کی بندش سے فی الحقیقت تم پر کوئی ناروا یا بے سبب تنگی کرنا نہیں چاہتا، بلکہ وہ انسان ایسی اشرف المخلوقات کو ظاہری نجاست اور آلائش سے ہر نحو قطعاً پاک صاف کرنا چاہتا ہے، اور جہاں اُسنے تمہاری دنیاوی بہتری، معاشری بہبودی، اور اُخروی نجات کیلئے تم کو نہایت گرانقدر اصول سکھلائے ہیں وہاں وہ تمہاری جسمانی صفائی کا یہ چھوٹا سا اصول سکھلا کر فی الحقیقت تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کرنا چاہتا ہے تاکہ تم اُس محسنِ حقیقی کی اس حیرت انگیز محافظت کی دل سے قدر کرو (لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ)۔" گویا یہاں بھی نعمت سے دنیاوی نعمت (یعنی جسمانی صحت) مقصود ہے، محض بدن کو دھو لینا کسی شخص میں روحانیت پیدا نہیں کر سکتا، اور نہ وضو سے اُس روحانیت کا اتمام پیش نظر ہے۔ بعینہ اسی نقطۂ نظر سے اس آیۂ شریفہ سے قدا پہلے احکام حرمت ماکولات کے ضمن میں اتمام نعمت کا تذکرہ کیا ہے: اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (۳:۵) یعنی "آج اے مسلمانو! ہم نے معاشری اور اجتماعی اوامر و نواہی کی کامل شرح و بسط کے بعد حلت اور حرمت کے ان نتیجہ خیز احکام کی بھی توضیح کر کے گویا تمہارے آیندہ اور مجوزہ طرز عمل کو (جو تمہارا دنیا کے اس ابتلا گاہ سعی و عمل میں) پایۂ تکمیل تک پہونچا دیا ہے، بلکہ ایک رو سے اپنی تمام نعمتوں کی تکمیل کر دی ہے، اور تمہارے لیئے اسی تقویت انگیز اور غلبہ انداز اسلام کو بطور راہ عمل پسند کیا ہے۔" حلت اور حرمت کے احکام کی نتیجہ خیز حکمت اور انکی اہمیت کے متعلق فلسفیانہ بحث کرنے میں ابھی بہت دیر ہے۔ یہ موضوع غالبًا پانچویں جلد میں آ سکیگا، مگر پوری آیت کے مطالعے سے ظاہر ہے کہ مُردار شے کے کھانے سے بچنا، لہو جیسی کراہت انگیز شے سے پرہیز کرنا، یا لحم خنزیر سی پلید اور مضر صحت چیز کو حرام سمجھنا، یا دو باقی اشیا جنکی حرمت کی تصریح اس آیت میں ہوئی ہے انکے کھانے سے گریز کرنا فی الحقیقت انسان کی معاشری اور دنیاوی زندگی کی اصلاح کا ایک منظر ہی ہے، ان کو روحانیت سے قطعًا کوئی تعلق نہیں، لہٰذا اسی اتمام نعمت کا مفہوم یہاں پر بھی دنیاوی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس طلاق کے متعلق احکام خدا کی شرح و بسط کے بعد ارشاد ہے: وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ (۲۳۱:۲)، یعنی "مسلمانو! احکام خدا کو ہنسی مخول، بے نتیجہ اور بے مطلب باتیں (هُزُوًا) سمجھکر نہ ٹال دیا کرو، بلکہ اُن کی تعمیل خدا کے اُن بیش قیمت احسانوں کو دل میں رکھکر کیا کرو جو اُسنے وقتًا فوقتًا تم کو مناسب احکام دے کر کیئے۔ اور جو گرانقدر کتاب اُس نے تم پر اُتاری ہے بلکہ حکمت الٰہی کے جو بیمثال نکات اس نے تم کو اپنی جناب سے عطا فرمائے ہیں اور جن کے ذریعے وہ تم کو مناسب راہ عمل بتاتا رہتا ہے اُنکو پیش نظر رکھکر تعمیل کیا کرو۔" یہاں بھی نعمت سے مراد وہ اجتماعی خوش حالی ہے جو احکام خدا پر کما حقہٗ عمل کرنے سے ہر قوم کو اس دنیا میں نصیب ہوتی ہے، روحانی بہجت قطعًا مراد نہیں

المغضوب

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۱۷) قریب قریب یہی مضمون سورۂ مائدہ میں احکام وضو کے بعد ہے: وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۵: ۷)، یعنی "اے مسلمانو! وضو کے بارے میں اِس الٰہی حکم کو بے سبب یا بے نتیجہ نہ سمجھو بلکہ اُس اجتماعی راحت اور قوت (نعمت) کو خیال میں لاؤ (اذکروا) جو تم کو خدا کے ہاں سے دمبدم نصیب ہوتی رہی ہے، نیز اُس الٰہی عہد و پیمان کے قوت انگیز نتائج پر غور کرو جسکے ساتھ اُسنے کچھ مدت ہوئی تم کو وابستہ کر دیا تھا (وَاثَقَكُم بِهِ)، اور جس کی نتیجہ خیز اہمیت کو پیش نظر رکھکر تم نے بھی اُسکے مشمولہ احکام کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے کی ٹھان لی تھی (قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا)، اور دیکھو! خدائے قاہر کے قہر و غضب سے ڈرکر (وَاتَّقُوا اللَّهَ) اُسکے ہر حکم کی بطیب خاطر تعمیل کیا کرو کیونکہ وہ تمہارے دلوں کی کشمکش اور سینوں کی کشش و پیچ کو بھی سو بسو جانتا ہے (عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ)"۔ اِس آیت کا ربط پہلی آیت کے ساتھ نہایت ملحوظ طلب ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ خدائے عزوجل نے صفائی بدن کی اہمیت کو دلنشین کر دینے کی غرض سے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو شہوت کے طورکہ وہ اجتماعی فائدے (نعمت) یاد دلائے جو احکام خدا کی تعمیل کے باعث اِس سے پیشتر مل چکے تھے۔ گویا یہاں پر ترغیب و تحریص کا بعینہ وہی رنگ ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنی رعیت کو کہے کہ فلاں کام بھی اُسی انہماک اور سرگرمی سے کرو جیسا کہ اور حکم مانتے آئے ہو، اور ذرا خیال میں لاؤ کہ پہلے حکموں کی تعمیل کے باعث تم کو کیا کیا فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اِس مقام نظر سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں پر بھی نعمت سے مراد دنیاوی منافع ہی ہیں۔ سورۂ بقرہ میں علیٰ ہٰذا القیاس تحویلِ قبلہ کی بحث کے ضمن میں اسلام کی عالم آرا اُمت کے لیے ایک مرکزی ضرورت کو واضح کرکے فرمایا ہے: وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۲: ۱۵۰)، یعنی "اور یہ تمام عالم اسلام کا ایک نقطے پر تمرکز اسلئے ہو کہ میں اپنی نعمت کی تکمیل تم پر کروں، اور تاکہ تم اس دنیا میں قوت اور اتحاد کے ساتھ رہنے کا راہ راست پا جاؤ"۔ سورۂ عنکبوت میں پھر اسی بیت الحرام کے تقدس اور فوقیت کی شان میں ہے: أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ (۲۹: ۶۷)، یعنی "اے محمدؐ! کیا دشمنان اسلام اِس بات پر نظر نہیں کی کہ ہم ہی نے بیت الحرام کو روزِ اول سے جائے امن بنا رکھا ہے حالانکہ عین اسکی چاردیواری کے باہر یہ حال ہے کہ لوگ اِن کے آس پاس سے بے دریغ جھپٹا مارے جا رہے ہیں (اور کوئی شخص انکی دادرسی نہیں کر سکتا)، تو کیا یہ لوگ لاطائل اور بے نتیجہ باتوں کو مانتے ہیں اور خدا کی اس نعمت عظمیٰ کی قدر نہیں کرتے"۔ گویا خدا کا حرم کعبہ کو پُرخطر ماحول کے عین وسط میں دارالامان بنا دینا نعمت الٰہی ہے اور منکروں کو جو احکام خدا کے امن انگیز ہونے پر کچھ یقین نہیں رکھتے، ایک زندہ مثال انکے گرد و پیش سے پیش کر دی ہے تاکہ بطور خود غور کریں کہ خدا کیونکر خوف و خطر کے گرد و نواح میں امن و آسایش کی صورت پیدا کر سکتا ہے، اور کیونکر ایک وقفِ اجل، خوفزدہ اور تختۂ مشق عدو قوم میں سے ایک بارعب، صاحب وقار اور محفوظ اُمت کھڑی کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ یہاں پر بھی صاف نعمت سے مراد دنیاوی امن و راحت ہی ہے۔ خود پیغمبر آخر الزمانؐ کو الٰہی ارشاد ہے: مَا أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ (۶۸: ۲)، یعنی "اے محمدؐ! تم اپنے پروردگار کے فضل و کرم سے پاگل نہیں ہو (جیسا کہ اہل مکہ کہتے ہیں)"۔ گویا صحیح الاعضا ہونا بھی نعمت الٰہی میں داخل ہے۔ سورۂ والّیل میں خدا کے ہاں سے انعامات کی تقسیم کے متعلق ایک قاعدہ کلیہ بیان کرکے اسکے دنیاوی مفہوم کو اور بھی واضح کر دیا ہے: وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَىٰ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ (۹۲: ۱۹-۲۰)، یعنی "اے لوگو! خدائے عزوجل کے پاس (عِندَهُ) کسی فرد واحد کے لیے بھی (لِأَحَدٍ) کوئی نعمت (مِن نِّعْمَةٍ) نہیں کہ بطور بدلے کے دیجائے (تُجْزَىٰ)، مگر یہ کہ وہ انعام اُس شخص کو اپنے پروردگار برتر و علیٰ (رَبِّهِ) کی تلاش رضا کے صلے میں ملتا ہے"۔ یعنی اِس دنیا کے اندر جسکو جو کچھ مل رہا ہے خوشنودی خدا کے صلے میں مل رہا ہے۔ یہاں پر اِس جلیل القدر کلیے کی صداقت پر بحث نہیں صرف لفظ 'نعمت' سے سروکار ہے۔ سورۂ والضحیٰ میں ہے: وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (۹۳: ۱۱)، یہاں پر بھی نعمت صاف دنیاوی ہے۔

(۹) اِن تمام نصوص صریحہ کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہوا، قرآن میں چند موقعے ایسے بھی ہیں جہاں نعمت کا مفہوم بادی النظر میں

سلہ ضمناً اس آیہ شریفہ میں تَهْتَدُونَ کا لفظ بصراحت تمام ظاہر کرتا ہے کہ ہدایت کا قرآنی مفہوم اتحادی ہے۔ اس مفہوم کی کئی مثالیں پہلے صفحہ ۱۹۲ کے تحت المتن میں دی ہیں۔

عَلَيْهِمْ

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۱۸) مشکوک سا معلوم ہوتا ہے، یا کم از کم اس مفہوم کے متعلق وہاں پر تاویل کی بہت کچھ گنجائش ممکن ہے۔ سورۂ احزاب میں حضرت زید بن حارثہ کے مشہور قصے کے ضمن میں ہے: وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ (۳۳، ۳۷)، یعنی اے محمدؐ! وہ بھی عجب وقت تھا جب تم زید بن حارثہ کو جس پر خدا نے چند در چند احسانات کیے تھے، اور تم بھی جس پر احسان کر رہے تھے، سمجھاتے تھے کہ اپنی بی بی زینبؓ کو زوجیت میں رہنے دو اور اللہ سے ڈرو۔ یہاں شارحین نے کہا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کو بچپن سے پالا تھا، پھر غلامی سے آزاد کر کے اپنی پھوپھی زاد بہن اُن سے بیاہ دی، وغیرہ وغیرہ۔ "أَنْعَمْتَ عَلَيْهِ" میں انہی احسانوں کی طرف اشارہ ہے۔ یہ سب نبوی انعامات ظاہر ہے کہ مادی اور دنیاوی تھے، تخیل کی کوئی پرواز ان کو روحانی قرار نہیں دے سکتی، لیکن "أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ" کے متعلق مفسرین نے بہت کچھ خیال آفرینی کر کے "اسلام کی روحانی نعمت" کو انعام خدا قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ خدائے عزوجل نے اس آیۂ شریفہ میں حضرت زیدؓ کو اسی روحانی نعمت کا احسان جتلایا ہو مگر الفاظِ وحی کے اندر اس دعوے کی قطعاً کوئی سند موجود نہیں، نہیں بلکہ جب پیغمبر خدا کے انعام و احسان کی نوعیت دنیاوی تھی تو غالب گمان یہی ہے کہ خدا نے اپنے احسانات بھی اسی قبیل کے یاد دلائے ہوں، ایک حبشی اور بے پدر غلام کا پیغمبرِ عرب کی خالہ زاد بہن سے رشتہ کر دینا ہی میرے نزدیک اس منعمِ بے حساب کا وہ غیر مترقبہ انعام تھا جس کو صحیح معنوں میں "أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ" کہا جا سکتا ہے، حلقۂ اسلام میں داخل ہونے کا احسان کم از کم یہاں پر نہیں جتلایا، کیوں کہ اولاً اس کی تخصیص حضرت زیدؓ بن حارثہ کے ساتھ نہ تھی بلکہ سب مسلمان اس میں داخل تھے۔ ثانیاً اس احسان کو یاد دلانا یہاں پر اصلاً غیر متعلق ہے کیوں کہ "أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ" سے اس کا کوئی ربط نظر نہیں آتا۔ اگر عورت کو طلاق دینا اسلام میں شرعاً ممنوع ہوتا تو زیدؓ کے مسلمان ہونے کا احسان یاد دلانا کچھ معنی رکھتا۔ یہاں صرف اس قدر کہا گیا ہے کہ تو دیکھ اُن احسانات کو نہ بھول جو خدا نے تمہاری ذات پر کیے، تم کو ایک ادنیٰ طبقے سے اٹھا کر پیغمبر خدا کا کفو اور عرب کا سردار بنا دیا، خود پیغمبر نے تم کو پالا پوسا، غلامی سے آزاد کیا، وغیرہ وغیرہ۔ ایسے منعم کی بہن کو طلاق دینے سے ڈرو اور خدا کا خوف کرو۔ بنی اسرائیل کے خروج کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس بات پر اُبھارا تھا کہ اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے اور پوری ہمت دکھلا کر ارضِ مقدس پر حملہ کر دیں، دشمن کے بالمقابل جم کر لڑیں اور کسی حالت میں پیٹھ نہ دکھلائیں، مگر صدیوں کی یہ محکوم قوم اپنی موروثی بزدلی اور جبن کے باعث اس زبردست دشمن "قَوْمًا جَبَّارِينَ" (۵، ۲۲) پر ہجوم کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو سکی اور لنگ عذرات پیش کر کے ٹال دیا۔ اس واقعہ کا ذکر سورۂ مائدہ میں ہے، بنی اسرائیل کے دو جواں مرد یوشع اور کالب عام قوم کے برخلاف، اس بر انگیخت میں موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے ہم زبان تھے، اُن کی بابت ارشاد ہے: قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۵، ۲۳)، یعنی بنی اسرائیل کے اس بیہودہ عذر پر خدا سے صحیح معنوں میں ڈرنے والوں (مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ)، اور اُس کا سچا تقویٰ کرنے والوں (مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ) میں سے دو شخصوں نے جن پر خدا نے خاص احسان کیا تھا (أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا)، کہا کہ اے نامردو! دشمنوں کی ظاہری ڈیل ڈول کی کچھ پرواہ نہ کرو، لمبے گراں ڈیل عدو دیکھ کر بزدل نہ بن جاؤ (دیکھو آیۂ ۵، ۲۲) اگر تم جس طرح بن پڑے چڑھائی کر کے شہر کے دروازے میں گھسو، اور جب دروازے پر قبضہ کر لیا تو بلا شبہ فتح تمہاری ہی ہے، اور یاد رکھو کہ اگر تم میں ایمان موجود ہے تو ایک دم آمادۂ سعی ہو کر نتائج کو خدا پر چھوڑ دو (فَتَوَكَّلُوا)۔ تمام رکوع کا سیاق و سباق یہی ظاہر کرتا ہے کہ "أَنْعَمَ اللَّهُ" سے مراد وہ ہمتِ مردانہ اور وہ عزمِ صمیم ہے جو ان بندگانِ خدا کو تمام قوم کے جمود و سکون کے بالمقابل بارگاہِ خدا سے عطا ہوا تھا، اور یہی وہ قوتِ ایمانی تھی جس کو بعض مجمل پسند اصحاب نے روحانیت سے تعبیر کیا ہے۔ ادنیٰ تامل بھی ہر شخص کو اس نتیجے پر پہنچا دیتا ہے کہ روحانی نعمت در اصل انسان کی اُس اخلاقی برتری، اسکے استحکامِ ہمت اور تربیتِ نفس کا دوسرا نام ہے جس کا نتیجہ دنیاوی تمکن اور امن ہی ہے، اس سے کمتر کچھ نہیں۔ اس آیۂ شریفہ میں یوشع اور کالب کی "روحانیت" یا بعبارۂ آخری اُن پر خدا کا انعام یہی تھا کہ اُنہوں نے اپنے پیغمبر کے

وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○ (۱: ۵-۷)

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۱۹) حکم کی اطاعت کرنا اپنا فرض عین سمجھ لیا تھا، اور اسکی تعمیل میں اپنی جانوں کو لٹا دینے سے نہیں جھجکتے تھے پس 'نعمت' سے مراد یہاں پر بھی وہ توفیق عمل ہے جسکا نتیجہ قوم کی دنیاوی راحت ہی ہے، وہ کوئی اعتکافی کسرت یا تسبیح ورزش نہیں جنکا اِس دنیا میں بظاہر کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوتا۔ ایمان اور علو اخلاق کی یہی وہ عملی اور نفع مند حیثیت ہے جس کی بنا پر خدائے عزوجل نے احکام الٰہی کے عاملوں، اور رسول کے بالمشافہ احکام کی تعمیل کرنے والوں کو اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ کا لقب عطا فرمایا ہے: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ (۴: ۶۹)، یعنی مسلمانو! تم میں سے جس شخص نے اپنے آپ کو احکام خدا کی متابعت کے لیے وقف کردیا، اور جس نے رسول کے بالمشافہ احکام کی تعمیل تندہی اور خلوص نیت سے کی تو یہی وہ لوگ ہیں جو اُن لوگوں کے دوش بدوش چل رہے ہیں اور مثل انکے اُخروی اجر کے مستحق ہوں گے (مَعَ الَّذِيْنَ) جنپر اللہ نے اپنا خاص احسان کیا (اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ)، مثلاً وہ انبیائے کرام جنہوں نے راہ حق میں جہاد کیے (مِنَ النَّبِيّٖنَ) یا وہ 'صادق' لوگ جنہوں نے عمل سے اپنے ایمان کو سچ کر دکھایا (وَالصِّدِّيْقِيْنَ دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۸۱)، یا وہ 'شہداء' خدا جو اپنے بلند اعمال سے خدا کی گواہی دیتے چل بسے (وَالشُّهَدَآءِ دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۰۵)، یا وہ 'صالح العمل' لوگ جنہوں نے اپنی جماعت کی حالت درست کی (وَالصّٰلِحِيْنَ دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۶۸) اور یہ لوگ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں!" 'اطاعت رسول' کے صحیح مفہوم کے متعلق ایک ضمنی بحث صفحہ ۱۸۱ کے تحت المتن میں گزر چکی ہے وہاں پر اشارہ کر دیا ہے کہ اس سے مراد رسول خدا صلعم کے اُن بالمشافہ احکام کی فوری تعمیل ہے جو آپ بحیثیت قائد اعظم یا رہنمائے اُمت وقتی اور مقامی حالات کو مد نظر رکھکر دیا کرتے تھے، اور جن کا منتہائے نظر تقویت جماعت یا غلبہ اسلام ہی تھا۔ چنانچہ یہاں پر بھی جہاد بالسیف اور ہجرت وطن کے احکام اِس آیت سے پیشتر آیہ (۴: ۶۶) میں اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ کے الفاظ میں ہو چکے ہیں، اور اَنْعَمَ اللّٰهُ کا محاکمہ بھی اسی قطعے کے جان و مال ایثار کرنے والوں کے بارے میں ہے۔ اِس بنا پر مختصر الفاظ میں اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ سے مراد یہاں پر بھی وہ توفیق عمل ہے جو ایمان کا جزو لاینفک ہے اور جسکا اِس دنیا میں نتیجہ فلاح قوم، اور آگے چل کر فلاح آخرت ہی، اسکے ماسوا کچھ نہیں۔ جن لوگوں نے اسلامی اوامر و نواہی کے اجتماعی مقاصد کو نظر انداز کر دیا ہے اور بعد ازاں اُنہیں سے چند سہل احکام مثلاً نماز روزہ کو اپنے لیے پسند فرما کر اُن کی انفرادی مشق پیدا کر لی ہے، اور زہد و تورع کی اِس عامیانہ شان کو 'رُوحانیت' فرض کر کے اپنے آپ کو اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ کا مصداق مانا ہے اُنکے لیے یہ آیت از بس سبق آموز ہے۔ 'صدیق' اور 'شہداء' اور 'صالحین' اور 'انبیاء' کی ہمدوشی کا مقام حاصل کرنیکے لیے انتہائی سعی و عمل شرط ہے، جان و مال کی قربانی شرط ہے، خدمت عباد شرط ہے وغیرہ وغیرہ، پس وہی شخص اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ کا صحیح مصداق ہو سکتا ہے جو اُن جیسے نتیجہ خیز اور غلبہ اندوز، مصلح قوم اور متحرک اعضا کام کر رہا ہے۔ سورہ مریم میں 'صدیق العمل' ابراہیم (۱۹: ۴۱)، 'مخلص الاعمال' موسیٰ (۱۹: ۵۱)، اور 'صادق الوعد' اسمٰعیل (۱۹: ۵۴) علیہم السلام کے ذکر کے بعد ارشاد الٰہی ہے: وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ (۱۹: ۵۶-۵۸) یعنی اے پیغمبر! ابراہیم اور موسیٰ اور اسمٰعیل کے جلیل القدر کارناموں کو یاد کرنیکے بعد اس ہماری کتاب میں ادریس کا تذکرہ بھی کر دے کیونکہ اس میں شک نہیں کہ یہ کارکن شخص بھی اپنے اعمال و افعال سے اپنے ایمان کی بڑی ہی تصدیق کرنے والا (صِدِّيْقًا)، اور قانون خدا سے بڑا ہی باخبر (نَّبِيًّا) تھا، اور اسی وجہ سے ہم نے اُسکو ایک نہایت بلند منصب پر سرفراز کیا تھا، (مَكَانًا عَلِيًّا)۔ اولاد آدم میں سے یہی وہ انبیاء لوگ تھے جنپر خدا نے اپنے بیحد احسان کیے، اور جو اِس دنیا سے بالحقیقت سُرخرو ہو کر گئے"؛ گویا یہ عمل کے ذریعے سے اپنے ایمان کو سچ کر دکھانا اور "صدیق" بنتا ہی خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے، اور یہی سچی "رُوحانیت" بھی ہے۔ گوشہ نشین بنکر خدا خدا کرتے رہنا اور مخلوق سے بے نیاز ہو جانا درحقیقت نہ کوئی عمل ہے اور نہ اسمیں خلق خدا کی بہتری کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ انبیائے کرام علیہم التحیۃ والسلام کی،

اے پروردگار عالم اور اے نعمتوں کے بخشنے والے خدا! تو ہم سب کو اُس سیدھے

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۲۰) بے مثال عملی زندگیوں، انکے ارفع نیابی عالم انگیز کارناموں، اور مخلوق خدا کی اجتماعی اصلاح کے بارے میں ان کی اَن تھک کوششوں کو پیش نظر رکھکر ہی رب زمین و آسمان نے جا بجا اُنپر سلام بھیجا ہو، اُنکے اعمال کو سراہا ہے، اور عوام کے سامنے انکو بطور نمونہ پیش کرکے اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِم کا عزیز القدر لقب دیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں جا بجا اس سلام بھیجنے کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ جن کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں۔

(ش۲) انبیائے عظام کی اسی عاملانہ حیثیت کو پیش نظر رکھکر سورۂ زخرف میں خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں ہے: اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۴۳: ۵۹)، یعنی مسیح تو فی الحقیقت ہمارا ایک حکمبردار اور کارکن غلام (عَبْدٌ۔ دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۰۱) ہی تھا جس پر ہم نے اپنی جناب سے توفیق عمل عطا فرما کر خاص الخاص احسان کیا تھا (اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ) اور یہ نوع عمل اس حد تک ارزانی کردی تھی کہ ہم نے اُسکو بنی اسرائیل کی موجودہ اور غافل قوم کے لیے ایک نمونہ (مَثَلًا) بنا دیا"۔ بنی اسرائیل کے اِس باعمل اولوالعزم نبی پر خدائے جل وعلےٰ کے یہی وہ بے مثال انعامات تھے جن کی بنا پر سورۂ مائدہ میں حضرت کی والدہؑ پر احسان جتلایا ہے۔ یہاں پر ربط قائم کرنیکے لیے اِس سے پہلی آیت بھی نقل کردی جاتی ہے جس سے احسان جتلانے کا سبب اور بھی واضح ہو جائے گا:

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰي وَالِدَتِكَ ... (۵: ۱۰۹-۱۱۰)

اے پیغمبر! وہ وقت بھی نہایت ہی کڑا اور کیکپا دینے والا ہوگا جب وہ مالک زمین و آسمان اور صاحب کبریا و جبروت خدا اپنے سب پیغامبروں اور قاصدوں کو اکٹھا کرکے (يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ) ان سے اپنے پیغام کے صحیح طور پر ادا کرنیکے متعلق محاسبہ کرے گا اور فرمائے گا کہ بہت خوب! آج تم اپنا اپنا بیان پیش کرو کہ ساکنانِ زمین کی طرف سے تم کو جو میرے پیغام کا کیا جواب ملا (فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۵: ۱۰۹)، انہوں نے تم کو کیونکر قبول کیا (مَاذَآ اُجِبْتُمْ) اُس کا باشندگانِ زمین پر کیا اثر ہوا (مَاذَآ اُجِبْتُمْ) اور بعد ازاں اور پیغمبروں سے صرف نظر کرکے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف جس کی امت نے پیغام رب العالمین کی ہیئت کو قطعی مسخ کرکے اُسکو "خدا کا بیٹا" بنا لیا تھا متوجہ ہوگا اور فرمائیگا (اِذْ قَالَ اللّٰهُ) کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! تم میرے اس احسان کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری ماں پر کیے تھے۔

سورۂ مائدہ کے دو آخری رکوعوں کے مطالب کو مربوط کرنے کا یہ موقع نہیں بلکہ پوری آیت (۵: ۱۱۰) کی شرح و بسط کردینا بھی یہاں پر بہت کچھ پیش از وقت ہے، مگر اوقاف قرآن کے رموز کو جاننے والے غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر بطور خود پہنچ سکتے ہیں کہ اس آیہ شریفہ میں اِذْ قَالَ اللّٰهُ سے عَلٰي وَالِدَتِكَ تک ایک مستقل بیان ہے جس میں خدائے عظیم نے احساناً بلکہ تہدید آمیز لہجے میں حضرت عیسیٰ کی توفیق عمل اور منصب نبوت کو اُنپر بلکہ اُن کی ماں پر بھی احسان کے طور پر جتلایا ہے۔ اِس دعوے کی تائید علامت ط سے ہوتی ہو جو وَالِدَتِكَ کے بعد ہے اور جس سے مراد یہ ہے کہ اسکے بعد ٹھیر جانا لازمی ہے۔ ورنہ بعد کی عبارت سے ملاکر پڑھنے سے مطالب کے بگڑ جانے (حتیٰ کہ بعض ظاہر پرست اشخاص کے نزدیک کفر کے مرتکب ہونے) کا خوف ہو! گویا تم جیسے باعمل اور کارکن شخص کا ہونا ہی تم پر خدا کا ایک احسان عظیم تھا، اور بالخصوص اُس ماں پر جسنے ایسا سپوت جنا۔ ماں اور بیٹے دونوں کو احسان جتلانے کا سبب سولہویں رکوع کے شروع میں ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں پندرہویں رکوع کے بعد انبیائے جہاں کے بھرے مجمع میں فرمایا ہے کہ "اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تم نے فی الحقیقت لوگوں کو کہا تھا کہ خدا کو چھوڑکر مجھے اور میری ماں کو خدا بنا لو؟ حالانکہ میں نے ہی تم کو بنی اسرائیل کا سردار بنایا تھا اور تمہاری ماں کو ایسا کارکن بیٹا دیا تھا۔ اکثر شارحین نے کلام خدا کے ربط کو نظر انداز کرکے آیہ (۵: ۱۱۰) میں وَالِدَتِكَ کے بعد کی عبارت کو مذکرۂ صدر نکڑے سے ملاکر اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا، وغیرہ وغیرہ کو نعمت قرار دیا ہے۔ یہ واقعات یعنی تائید روح القدس اور کلام فی المہد وغیرہ خواہ ان کا مفہوم کچھ ہی ہو حضرت عیسیٰؑ پر بطور

راستے پر لے چل، ان لوگوں کے رستے پر جن کو تُو نے اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دیا ہے

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۲۱) احسان کے حامل ہو سکتے مگر حضرت مریم پر ان کا جتانا کچھ بے معنی سا ہے۔ یہ آیت اس امر کی بہترین مثال ہے کہ قرآن حکیم کے اوقاف اور نشانات رکوع جو عُلمائے سلف نے حجاج ابن یوسف کے زمانے میں لگائے تھے کس عزم و احتیاط سے لگائے اور انکو کلام الٰہی کے صحیح مطالب پر کتنا عبور رہا ایں ہمہ ہمیں اغالب گمان بلکہ یقین یہی ہے کہ آیہ (۵ : ۱۱۰) میں بھی نعمت سے مراد حضرت مریم کی وہ حیرت انگیز روح عمل تھی جس نے انکو مَثَلًا لِّبَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ (۴۳ : ۵۹) بنا دیا تھا، اور لوجوہ احسان حضرت مریم پر یہی ہے کہ ایسے جلیل الشان نبی کی ماں تھیں۔ چنانچہ اسی امتیاز کی بنا پر سورۂ آل عمران میں ولادت مسیح کی بشارت دینے والے ملائکہ کا خطاب مریم علیہا السلام سے ہے: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (۳ : ۴۲) یعنی "اے مریم! اس میں شک نہیں کہ خدا نے تمہیں منتخب کر لیا ہے، تم کو آلائش گناہ سے پاک صاف کر دیا ہے، اور یہی نہیں بلکہ دنیا جہان کی عورتوں سے تمہیں اس منصب یعنی اُمّ نبیؑ بننے کے لیے پسند فرما لیا ہے" قرآن حکیم کے مطالب میں مزید غور و خوض کرنے والے شاید اس نتیجے پر بھی پہنچ سکیں کہ یہ انتخاب محض بے سبب یا علی الحساب نہ ہوا تھا بلکہ خود مریم علیہا السلام کی بے لوث اور پاکیزہ زندگی، اُن کا علی ایمان، اُن کی صدیقیت اور حکمبرداری اس انعام و اکرام کا باعث ہوئی تھی جیسا کہ سورۂ تحریم کے اخیر میں رب بے مثال نے وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا کے الفاظ میں زوجۂ فرعون (آسیہ) اور مریم علیہا السلام کی زندگیوں کو ایمان والوں کے لیے بطور نمونہ پیش کر کے مؤخر الذکر کے حق میں فرمایا ہے: وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ (۶۶ : ۱۲) یعنی اے ایمان والو! مریم علیہا السلام کی پاکیزہ زندگی تمہارے لیے نمونۂ عمل اس وجہ سے ہے کہ نیک اور باعمل خاتون ہمیشہ احکام خدا کی بذریعہ عمل تصدیق کرتی رہی، اور اسکی بھیجی ہوئی کتابوں کو قانون خدا سمجھکر عمر بھر حتی الوسع عمل پیرا رہی، اور وہ فی الحقیقت خدا کے فرماں بردار بندوں میں سے ایک بندی تھی" یہی توفیق عمل صحیح معنوں میں وہ نعمت عظمٰی ہے جس کی بنا پر سورۂ مومنون میں عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریمؑ دونوں کو خدا کی نشانی ٹھہرایا ہے، وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً (۲۳ : ۵۰) یعنی "ہم نے ابن مریم اور اسکی ماں کو اُن کی بے لوث صالح زندگی کی وجہ سے خدا کی قدرت کی ایک نشانی اور اعجوبہ بنا دیا تھا" اور اسی نعمت کا ذکر آیہ (۵ : ۱۱۰) میں ہے جس کی تشریح میں یہ سب ضمنی آیتیں پیش کی گئی ہیں۔

ان تمام حیرت انگیز شہادتوں سے جو متذکرۂ صدر عنوانات (الف۔ ز) میں پیش ہوئیں ہر طرح پر ظاہر ہے کہ نعمت کا آئینی مفہوم بہر تن اور بہر کیف دنیاوی ہی ہے، کہیں اس سے مراد وہ اجتماعی تمکن یا مصاحت ہے جو منعم حقیقی اقوام عالم کو ان کے حُسن عمل کے صلے میں عطا فرماتا ہے (الف) (۸ : ۵۳)، (۳۵ : ۵۴)، (ج) (۱۴ : ۶)، (۵ : ۲۰)، (۲ : ۲۱۱)، (۲ : ۴۷)، (۷ : ۱۲۲)، (۲ : ۴۰)، (۴۴ : ۲۶) (ھ) (۵ : ۱۱)، (۳ : ۱۰۳)، (۳ : ۱۷۰)، (۲ : ۴۸)، (۵ : ۳)، (۲ : ۲۳۱)، (۵ : ۶)، (۲ : ۱۵۰)، (۲۹ : ۶۷))، کہیں اس سے مقصود انفرادی کرم و انعام و اکرام ہیں (الف) (۶۸ : ۴۹)، (۳۶ : ۱۵)، (۱۷ : ۹)، (ب) (۳۹ : ۴۹)، (۴۱ : ۵۱)، (۱۷ : ۸۳)، (۳۹ : ۸)، (۱۶ : ۵۳)، (۱۱ : ۱۰)، (ھ) (۶۸ : ۲)، (۹۳ : ۱۱)، (و) (۳۳ : ۳۷))، کہیں پیش نظر بنی نوع انسان کے عام عطیات کو یاد دلانا ہے (الف) (۱۴ : ۳۴)، (ج) (۱۶ : ۸۳)، (۶ : ۱۱)، (۱۶ : ۷۲)، (۳۵ : ۳)، (۳۱ : ۲۰))، کہیں نعمت سے مراد اجتماعی بہتری کے لیے تائید خداوندی ہے (ھ) (۳۳ : ۹)، کہیں وہ حفظِ نفس کے مرادف ہے ((ھ) (۵ : ۱۱))، کہیں یہ خانگی مصالحت، معاشرتی امن، یا بدنی طہارت ہے (ھ) (۵ : ۶)، (۲ : ۲۳۱))، کہیں اسکا مطلع نظر علم ہے ((الف) (۲ : ۶))، کہیں وہ توفیق عمل ہے جس کا نتیجہ دنیاوی اصلاح اور اجتماعی امن ہے ((و) (۵ : ۲۲)، (۲ : ۶۹)، (۱۹ : ۵۶-۵۸)، (ز) (۴۳ : ۵۹)، (۵ : ۱۱۰)) وغیرہ وغیرہ پس سورۂ فاتحہ کے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں بھی انہی دنیاوی اور اجتماعی انعاموں کی طرف اشارہ ہے، فرضی یا خیالی، روحانی یا اُخروی انعاموں کی طرف ہرگز نہیں۔ وہی قوم صراط مستقیم پر صحیح معنوں میں چل رہی ہے جو اُس منعم بے مثال کے اجتماعی انعاموں کی طرف لپک رہی ہے، جو اس غرض و غایت کو پیش نظر رکھکر اپنے افراد میں سعی و عمل

ـــــ یہ الفاظ آیہ (۶۶ : ۱۲) میں آئے ہیں۔

اُن کی راہ نہ دکھا جو تیرے غیظ وغضب کا شکار ہوچکے ہیں۔ اور نہ اُنکی جو تیرے

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۲۲) پیدا کر رہی ہے جو محافظِ نفس ہے، زور آور اور تنومند ہے، فاتح اور غالب ہے۔ ایسی ہی اُمت کے لیے اُخروی انعام بھی وقف ہیں، اور یہی وہ قوم ہے جسکی روحانیت اور تقویٰ، جسکا اخلاقی تفضل اور عملی تعبد اسکو رضائے خدا کے بال سے سوا باریک اور تلوار سے سوا تیز راہ پر لیجا رہا ہے! لیکن اصل کتاب میں بعینہ اسی نتیجے پر ایک اور طریقے سے پونہچنے کی سعی کیجائے گی۔

"الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ" کے صحیح مفہوم کے متعلق بھی قرآن حکیم میں کئی جگہ شہادت موجود ہے۔ یہودیوں کی اجتماعی شکست وریخت اور اُن کے سیاسی انحطاط کے ذکر میں دو جگہ ہے: وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ ۰ (۲: ۶۱)، وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۰ (۳: ۱۱۱)، یعنی "اُنپر ذلت اور غربت لیس دی گئی، اور وہ خدائے قاہر کے غضب میں آگئے"۔ سورۂ اعراف میں ہے: إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۰ (۷: ۱۵۲)، یعنی "جن لوگوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کردی ہے ان پر عنقریب غضب خدا نازل ہونے والا ہے اور اس دنیا میں ذلت انکے دامنگیر ہوگی"۔ اور بھی جہاں جہاں "غَضَبُ اللَّهِ" کے الفاظ آئے ہیں اُن سے مراد اجتماعی انحطاط یا ہلاکت ہی ہے۔ اس شہادت کو یہاں پر جمع کرنیکی ضرورت نہیں کیونکہ مابہ النزاع محض اس قدر ہوکہ "الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ" سے مراد صرف یہود ہی نہیں بلکہ جس قوم کا سیاسی اور اجتماعی اقتدار زائل ہورہا ہے، جو قوم ہلاکت کے قریب پونہچ رہی ہے اُسپر غضب خدا نازل ہورہا ہے، اسمیں کسی ایک قوم کی تخصیص نہیں۔ اس امر کا ثبوت سورۂ طٰہٰ کے اندر مفصلۂ ذیل آیات میں ہو جنکے معانی کی تعمیم اظہر من الشمس ہے:

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ قَدْ أَنجَيْنَاكُم مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوَاعَدْنَاكُمْ جَانِبَ الطُّورِ الْأَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۝ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِي ۖ وَمَن يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِي فَقَدْ هَوَىٰ ۝ وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ ۝ (۲۰: ۸۰-۸۲)

(یعنی انکو خروج مصر کے واقعۂ عظمیٰ کے بعد ہم نے صاف اور غیر مشکوک الفاظ میں موسیٰ علیہ السلام کی وساطت سے بنی اسرائیل پر یہ امر واضح کر دیا تھا کہ) اے بنی اسرائیل! ہم نے اب تم جیسی مجبور زدہ اور غلامی میں پلی ہوئی قوم کو ظالم کار دشمن کی مضبوط گرفت سے نجات دیدی ہے اور مقدس اور بابرکت کوہِ طور (کوہ سینا) کے دامن میں تم کو جمع کرکے تم سے احکامِ خدا کی تعمیل، اور بشرطِ تعمیل تمہاری اجتماعی بہبودی کے سامان مہیا کرنیکا باہم معاہدہ بھی کرلیا ہے (وَعَدْنَاكُمْ) اور یہی نہیں بلکہ اس معاہدے کی پختگی پر کے بعد عین تادیش کی پرفضا وادیوں میں تم کو آباد کرکے (دیکھو تحت المتن صفحہ ۹۰) تم پر شیریں و خوش ذائقہ حلوہ (الْمَنَّ) اور بٹیروں کے شکار کا مائدہ مہمانی کے طور پر نازل کردیا ہے تاکہ تم اطمینان سے اس معاہدے کی تکمیل کرسکو، تو اب تم بیفکری سے جو عمدہ روزی ہم نے تمکو دی ہے کھاؤ پیو، لیکن کھاس ہمارے عہد کے بارے میں جو ہم نے تم سے کیا ہو سر مو تجاوز نکرو (لَا تَطْغَوْا فِيهِ) اگر ایسا کروگے تو تمپر ہمارا غضب نازل ہوگا، اور جس قوم پر ہمارا غضب نازل ہوا تو جانتے رہو کہ وہ قوم ہلاک ہوگئی (هَوَىٰ) اور یہ بھی یاد رہے کہ جو قوم میرے قانون کی طرف لوٹ گئی (تَابَ) جسنے ایمان کی مثل قوتیں اپنے اندر قائم رکھیں (وَآمَنَ) اور جسنے مناسب اعمال بہم پہنچائے (وَعَمِلَ صَالِحًا) اور بعد ازیں اس راہ راست پر قائم بھی رہی تو میں اس قوم کے حق میں بڑا ہی درگزر کرنیوالا ہوں (لَغَفَّارٌ)۔

مَن یہاں پر اجتماعی موصول ہے جسکی شرح وبسط صفحہ ۱۰۸ کے تحت المتن میں ہوچکی ہے۔ "وَمَن يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِي فَقَدْ هَوَىٰ" کے الفاظ سے ظاہر ہو کہ جو قوم ہلاک ہو رہی ہو اُسپر غضب خدا نازل ہورہا ہے۔ یہ ایک عام اور مطلق محاکمہ قرآن حکیم کا ہے جسمیں بنی اسرائیل کی کچھ تخصیص نہیں۔ پس اس عام نظریے سے بھی "غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ" کے الفاظ میں اس امر کی استدعا ہو کہ اسلامی اُمت اس راہ پر چلے جسپر چلکر اجتماعی ہلاکت کا سامنا ہو گویا یہ قوم کی دنیاوی حالت کا بگڑنا ہی صراطِ مستقیم سے ہٹ جانیکے مترادف ہے۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھکر "الضَّالِّينَ" کے مطالب بھی بالکل صاف ہوجاتے ہیں اور اس امر کے ثبوت کی مزید حاجت نہیں رہتی کہ اجتماعی انحطاط کا وقوع ہوجانا ہی صحیح معنوں میں ضلال ہے۔ ضلال کے ان معانی کی حتمی تائید وہ اور آیاتِ الٰہی (۲۲: ۲۲)، (۹۲: ۱۱۷) سے ہوتی ہے جو علی الترتیب صفحہ ۱۰۴ اور ۱۹۲ پر آچکی ہیں اور جنکے متعلقہ حاشیوں سے ظاہر ہو کہ کسی قوم کا اجتماعی طور پر "ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ" اور منتشر ہونا اور ابتر ہوجانا اور تشتت و پراگندگی ہی ضلال ہے۔ ضلال کے ان معانی کے علاوہ ایک اور معنی فقدانِ علم ہے جسکا ذکر متعدد جگہ کتاب صفحہ ۸۸، ۱۹۲، ۹۵ کے حاشیوں میں ہوچکا ہے۔

بتائے ہوئے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔

"صراطِ مستقیم"

بہ نہاں چہا فلسفہ اُس نماز کا جسکے اہم ترحصے کو خود خدائے جل وعلٰی نے مومنوں کی ہدایت اور آیندہ نسلوں کی رہنمائی اور اطمینان مزید کے لیئے، بطور وحی نازل کر کے قرآن کے ورقِ اول پر لکھدیا تھا۔ یہی وہ واحد، فراخور سعی، اور درخورِ طلب نصب العین تھا جو اسلام کی دنیاوی اور اخروی بہتری کے اُس بہترین مجموعے نے، دن میں پانچ وقت مسلمانوں کے پیش نظر کر دیا تھا! اس صراط مستقیم کی دعا میں رب العالمین کے حضور میں نعمت کے جلد تر عطا ہونے کی درخواست تھی۔ اسمیں اُس اعلیٰ مقام حاصل کرنے کا صبرگسل اشتیاق شعلہ زن تھا، اسمیں درنگ کی بے صبرانہ تڑپ، اور تعویق والتوا کا بسلاخہ اضطراب تھا؛

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّیَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا۔ (۴: ۱۷۶)

سو جن لوگوں نے خدا کو اپنا آقا مان لیا، اور جم کر اُسکے قانون کی تعمیل کرتے رہے، اُنہیں عنقریب اپنی مہربانیوں اور بخششوں سے مالامال کر دے گا۔ اور اُنہیں دنیاوی مرفہ الحالی کیطرف مختصر سے مختصر، اور قریب سے قریب راستے سے لے آئیگا۔

اسمیں تولین فرصت پر، اور سہل تر طریقے سے، اِس معاملے کو طے کرنے کی خواہش کیگئی تھی، اسمیں گنجایش صبر اور تابِ مہلت کا انکار تھا، اِسمیں ناقابلیت اور سوء تدبیر، نادور بینی اور غلط طریقِ عمل کی مشکلات سے

---

* اس آیہ کریمہ میں الفاظ یَھْدِیْھِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا۔ اِس امر کی شہادت ہیں کہ صراط مستقیم کا اٰتی مفہوم مختصر سے مختصر اور قریب سے قریب راستہ بھی ہے۔ دو مقامات کے درمیان سب سے مختصر راستہ خطِ مستقیم ہے، اور ایک شئے کو دوسری شئے کی طرف سیدھے رستے سے لیجانے میں اختصار اور سرعتِ نقل و حرکت دونوں مدنظر ہوتی ہیں، ٹیڑھا راستہ اختیار کرنے میں لامحالہ طوالت اور دیری دونوں کا خوف لاحق ہے؛ پس اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ (۱: ۵-۶) کی دعا حصول اس نعمت تک نہایت سرعت اور مختصر سے مختصر راستے سے پہنچنے کی دعا بھی ہے اور اسمیں اس نعمت کے جلد تر حاصل ہونے کا اضطراب مضمر ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے دلوں کی یہ اضطراری کیفیت تھی جو نماز کے وقت منعم حقیقی کے حضور میں اُنکو خشوع و خضوع کرنے بلکہ بار بار اٹھنے اور جھکنے پر بدل مجبور کر دیتی تھی۔ آج یہی اضطرا

نجات مانگی گئی تھی؛ اسمیں عام انسانی لغزشوں، اور سہو و خطا کی طویل اور دشوار گذار راہوں سے پناہ طلب کیگئی تھی۔ یہ ہر اسلامی معاملے میں حُسنِ عمل کی استدعا، اور عطائے سہولت کی عرضداشت تھی؛ نہیں یہ ہر متنفس کی طرف سے سطحِ زمین کی تمام اسلامی جماعت کے حق میں توفیقِ عمل کی گذارش تھی؛ اِھْدِنَا† الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ ریگستانِ عرب کے ہزاروں بلکہ لاکھوں نفوس کی یہ جماعت صبح و شام، زوالِ آفتاب پر اور دن ڈھلے، رات کی خاموشیوں اور دن کی مصروف کاریوں میں، ایک مرکز کی طرف قبلہ رو ہوکر، نہایت عجز و الحاح سے یہ کہا کرتی تھی کہ اے آلہ العالمین! تُو دنیا کی اس عظیم الشان کشمکش

سلہ ہماری تمام اُمت کو نعمت کا صراطِ مستقیم دکھا۔ سلسلے کے لئے دیکھو تمہید (۱)۔ اِهْدِنَا کا صیغہ جمع کا ہے اسلئے خطاب تمام اُمت کی طرف سے ہے۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۲۴) ہر غرضمند شخص اپنے دنیاوی منعم کے روبرو دست بستہ کھڑے ہوکر ظاہر کرتا ہے، وہ انعام کو جلد تر حاصل کرنے اور اپنے منعم کے دل کو اقل قلیل مدت میں نرم کرنے کی غرض سے کبھی اُسکے پاؤں پڑتا ہے، کبھی اپنی پگڑی اُسکے پاؤں پر ڈال دیتا ہے، کبھی اُسکے آگے زمین پر سجدہ کرتا ہے، کبھی گڑگڑا کر اُٹھتا ہے اور پھر ہاتھ جوڑنے لگتا ہے۔ اس تمام اضطراری عمل سے مقصود منعم کے دل کو نعمت کے فوراً عطا کرنے کی طرف مائل کرنا ہوتا ہے اور بس۔ اور میرا یقین ہے کہ نماز کے قومے اور قعدے بھی اُس منعمِ حقیقی کے حضور میں اسی کیفیتِ دل اور اضطراب کے مظاہر تھے۔ گو یہ آج وہ سب کیفِ حال ہر نمازی کے دل سے اصلاً محو ہو چکا ہے۔ فَسَيَدْخِلُهُمْ کے سؔ سے بھی، جو مستقبل قریب کے لئے بالعموم استعمال ہوتا ہے، یہی انعام کا جلد تر عطا ہونا مستنبط ہوتا ہے۔ رَحْمَةٍ اور فَضْلٍ کے دنیاوی مفہوم کے متعلق شہادتیں صفحہ ۲۱۶ کے تحت المتن میں اور چند صفحہ ۱۱۵، ۱۲۳، ۱۵۰ پر گذر چکی ہیں، باقی شہادت کو خوفِ طوالت کے باعث نظرانداز کر دیا ہے۔

يَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا میں اِلَيْهِ کی ضمیر کو بعض سہو پسند اور سطح بین اصحاب نے خدا کی طرف پھیرا ہے اور اس جملے کا مطلب یوں ادا کیا ہے کہ ایمان والوں کو "خدا اپنی طرف کا سیدھا رستہ دکھاویگا"۔ ادنیٰ تامل بھی ظاہر کرتا ہے کہ 'خدا کی طرف کا سیدھا رستہ' وہ ناقابلِ درک شے ہے کہ اسکے صحیح مفہوم کے متعلق ایک برس بحث کرنیکے بعد بھی کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوتا۔ ہم نے اِلَيْهِ کی ضمیر کا مرجع فَضْلٍ ظاہر کیا ہے، یہی از روئے قواعد صحیح تر مرجع ہے، اور اسی سے مطالب بالکل مربوط ہو جاتے ہیں۔

† یہاں پر نَا کی ضمیر اس امر کی شہادت ہے کہ صراطِ مستقیم کی درخواست تمام جماعت کی طرف سے ہے انفرادی نہیں۔ اور اسلئے صراطِ مستقیم بھی لامحالہ وہ اجتماعی طریقِ عمل ہے جس پر چلکر جماعت کے دنیاوی انعام حاصل ہوتے ہیں جیسا کہ آگے چلکر ثابت ہوگا۔ اسلامی نماز کی تمام قراءت میں جو بات غور طلب اور دلچسپ ہے یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں (جسکو پیش امام اُمت کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے بآوازِ بلند پڑھتا ہے درآنحالیکہ مقتدی خاموش کھڑے رہتے ہیں) متکلم اور غائب کی سب ضمیریں جمع کی ہیں۔ باقی تمام حصص جو مقتدی دبی آواز میں بطور خود ادا کرتے ہیں سب کے سب انفرادی ہیں، اُن میں سب متکلم ضمیریں اور صیغے (ماسوا التحیات کے) واحد ہیں گویا اجتماعی حصّوں کو پیش امام کی زبان سے بآوازِ بلند کہنے اور انفرادی حصّوں کو فرداً فرداً دبی آواز میں ادا کرنے کا سبب اُنکا اجتماعی اور انفرادی ہونا ہی ہے۔ اس مقام پر نظر کر کے ظاہر ہے کہ انفرادی طور پر اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی درخواست اصالتاً بے معنی ہے۔ اور نماز کو اسلامی جماعت سے الگ ہوکر، یا خانہ نشین بنکر ادا کرنے سے اسکی اصلی غرض و غایت ایک بہت بڑی حد تک مفقود ہو جاتی ہے۔

سلہ التحیات میں السلام علینا کی نا کی ضمیر لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف ایک فقرہ کا سب اُمت پر انفرادی معنوں میں سلام ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

میں جہاں ہر قدم پر مشکلات کا سامنا ہے، جہاں معاملات کی عظمت و اہمیت کے باعث کم علم اور کوتاہ بین انسان کے لیئے اکثر اوقات حق و باطل میں تمیز، اور صحیح و غلط میں فرق کرنا محال ہو جاتا ہے" تو "اُنہیں" اس وسیع مجادلے میں اسلام کی جماعت کو حصول قوت کے سیدھے اور آسان طریقے بتا دے" تو اُن میں حُسنِ تدبیر اور اصلاحِ عمل کی اہلیت پیدا کرے" تو اُن میں اعتصام خدا اور تسلیم، اتقا اور اتحاد کے جذبات موجزن کرے! وَمَن يَعْتَصِم بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (۳: ۱۰۰-۱۰۲)[له] تو اُن میں صبر کی توفیق اور توکل کی ہمت

[له] اور جو لوگ اللہ کے دامن کو جسم کر پکڑے رہے، (اُسکے قانون کی تن دہی سے تعمیل کرکے اُسی کا آسرا ڈھونڈتے رہے)، وہ تو صراطِ مستقیم پر لگ گئے۔ اے ایمان والو! تمہارے لیئے راہ راست یہی ہے کہ مقام خدا سے ہر وقت ڈرتے رہا کرو اور ایسا ڈرو جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے، اور اُسکے احکام کے آگے مرتے دم تک سر تسلیم خم رکھو۔ اور سب ایک دوسرے سے کھُل مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑے رہو اور دیکھنا آپس میں تفریق ہرگز پیدا نہ ہونے دینا۔

✝ یہاں سے صراطِ مستقیم کی قرآنی تعریف شروع ہے۔ بعد کی آیات جو اس عنوان کے تحت میں پیش کی گئی ہیں۔ سب کی سب الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کے مفہوم کی کسی ایک شق کی توضیح کر رہی ہیں۔ یہاں یہ امر نہایت غور طلب ہے کہ ماسوا **ایک** مقام کے جس کا ذکر آگے چلکر کردیا ہے، قرآن حکیم کے تمام طول و عرض میں الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کے الفاظ سورہ فاتحہ سے قطع نظر، اور کہیں نہیں آئے۔ سب موقعوں پر صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ بالتنوین موجود ہے، جس سے ظاہر ہے کہ ان آیات میں الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کے الٰہی مفہوم کی صرف **ایک** شق بیان کردی ہے، تمام و کمال مفہوم کا ادا کرنا اُس جا مقصود نہ تھا۔ صراطِ مستقیم کے الٰہی مفہوم کی تین شقیں یعنی (۱) **علم فطرت** کا حاصل کرنا صفحہ ۳۰، بحث المتن آیہ (۲۲: ۴۶) میں (۲) **حفظ نفس** پر کاربند ہونا صفحہ ۱۷۶۔ آیہ (۵: ۱۶) میں اور (۳) **اتحاد امت** صفحہ ۱۸۰۔ آیہ (۲: ۲۱۳) میں بیان ہو چکی ہیں دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۹۰۔
آیت زیر بحث (یعنی (۳: ۱۰۱)) کے موضوع کی مماثلت صفحہ ۲۴۴ کی آیت (۴: ۱۷۶) سے واضح ہے۔ 'اعتصام باللہ' اور صراطِ مستقیم کے الفاظ دونوں جگہ استعمال ہوئے ہیں اور مضمون بھی قریب قریب واحد ہے۔ آیہ (۳: ۱۰۱) سے نئے رکوع کے شروع ہونے کے باعث اعتراض وارد ہو سکتا ہے؟ کہ لَا تَفَرَّقُوا یعنی اتحاد کے مضمون کو جو (آیہ (۳: ۱۰۲) میں آیا ہے صراطِ مستقیم کا ایک شقی مفہوم سمجھنا دور از کار تاویل ہے مگر ادنیٰ تامل بھی اس نتیجے پر پہنچا دیتا ہے کہ یہ محاکمہ درست نہیں۔ اولاً قرآن حکیم میں نئے رکوع کا شروع ہونا اس امر کی حتمی کوئی دلیل نہیں کہ بعد کے رکوع کا پہلے رکوع سے تعلق نہیں، برخلاف اس کے کلام الٰہی کے ربط کو سمجھنے والے اشخاص خوب جانتے ہیں کہ قرآنی رکوع بسا اوقات ایک سلسلۂ استدلال کی کئی منازل کے مابین بطور وقفے کے ہوا کرتے ہیں، انکے واقع ہونے سے اُس موضوع کا انقطاع مراد نہیں ہوتا۔ اکثر موقعوں پر کئی رکوعوں میں ایک ہی تواتر بیان اور تسلسل خیال چلا جاتا ہے۔ اور بعد کا رکوع پہلے رکوع کے دعاوی کا مؤید بنکر اُس بیان کی تاکید مزید یا تشریح کر دیتا ہے۔ بعینہ یہی بات ان دو رکوعوں میں ہے جو زیر بحث آیات کے متعلق ہیں جیسا کہ کسی آئندہ موقع پر تمام سورۃ کا مربوط ترجمہ کرتے وقت عیاں ہو جائیگا۔ ثانیاً آیہ (۳: ۱۰۲) میں وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا کے الفاظ اور آیہ (۳: ۱۰۰) میں يَعْتَصِم بِاللَّهِ کو صراطِ مستقیم کی ایک شق قرار دینا اس امر کی روشن دلیل ہے کہ بعد کے رکوع میں صراطِ مستقیم کے مفہوم کی مزید توضیح ہی لَا تَفَرَّقُوا کے الفاظ میں کی گئی ہے اور مضمون برابر ایک ہی چلا آرہا ہے۔ گویا شفقتہ طور پر اعتصام بحبل اللہ کرنا، اور فرقہ بندہ نہ بننا نہ صرف ایمان (آمَنُوا)، اور اتقا (اتَّقُوا اللَّهَ)، اور اسلام (وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ) ہی کی ایک اہم شق ہے بلکہ صراطِ مستقیم کا ایک شوشہ بھی ہے۔

عطا فرما! وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا[۵۱] ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ (۱۴: ۱۲)، تو اُن میں قانونِ خدا کا صحیح علم و عمل، اور ایمان کی اٹل طاقتیں قائم رکھ! وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا[*] اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ[۵۲] ۝ (۲۲: ۵۴)، مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ[*] وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ[۵۳] ۝ (۴۲: ۵۲)، تو ان میں ایثارِ مال کے محبت انگیز ولولے اور ایثارِ جان کا نتیجہ خیز ہیجان پیدا کر! اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ[۵۴] ۝ (۲۳: ۷۲-۷۳)، تو ان کو تفریق کے ہولناک نتائج اور تشتت و انتشار کی

---

[۵۱] اور قاصدانِ خدا نے قومِ موسیٰ سے کہا کہ ہم کیوں نہ اپنا تمام معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں، اور ڈٹ کر شائعِ خدا کی تبلیغ و اشاعت کریں، حالانکہ اسنے ہمارا طریقِ عمل ہم کو بتلا دیا ہے۔ اور ہم کیوں نہ استقلال سے اس دُکھ کو برداشت کریں جو تم نے ہم کو دیا، اور توکل کرنیوالوں کو یہی چاہیئے کہ اللہ پر توکل کریں۔

[۵۲] اور خدا لامحالہ ان لوگوں کو جو اسکے خدا ہونے پر ایمان لے آئے اور جنہوں نے اسکی تصدیق میں فرمودۂ خدا اعمال کیے، صراطِ مستقیم کیطرف ضرور لیجائیگا۔

[۵۳] اے پیغمبر! تم اس سے پہلے کیا جانتے تھے کہ کتابِ خدا کیا چیز ہے، اور کیا سمجھتے تھے کہ ایمان کسے کہتے ہیں، مگر ہم نے اس ایمان کو تمہارے اندر نور کر دیا ہے جس سے تمام اصلیت تم پر کھل چکی ہے۔ اپنے بندوں میں جسکو ہم مناسب سمجھتے ہیں اس نور کے ذریعے سے رستہ دکھاتے ہیں، اور تم تو لامحالہ لوگوں کو صراطِ مستقیم پر ہی چلا رہے ہو۔

[۵۴] اے محمدؐ! کیا تم اِن نابکار اور ناانجام شناس لوگوں (یعنی منافق اہلِ عرب) سے خرچ مانگ رہے ہو، کیا تم اُمت کی بہتری کے لیئے انکو ایثارِ مال کے واسطے کہہ رہے ہو، ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو، خدا کا بھیجا ہوا مال جو پیچھے مسلمانوں کی وساطت سے تم کو ملا ہے تمہاری اُمت کے حق میں بہتر ہے کیونکہ وہ دردمند لوگوں نے دیا ہے اور وہی بہترین رزق دینے والا ہے اور تم تو لامحالہ اِن لوگوں کو صراطِ مستقیم پر ہی بلا رہے ہو۔

---

[*] صَبْر کے صحیح مطالب صفحہ ۳۹، ۴۰، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲ ... کے حاشیوں میں بیان ہو چکے ہیں، علیٰ ہٰذا القیاس توکل کے سمجھنے کے لیئے صفحہ ۸۰، ۸۱ کا تحت المتن دیکھنا چاہیئے: هَدٰنَا سُبُلَنَا سے مراد صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی ہی ہے گویا مصائب کو استقلال سے برداشت کرنا، ان کا جم کر مقابلہ کرنا، ان کے دفعیے کے لیئے سعی کرنا اور بعد ازاں نتائج کے بارے میں خدا کے فیصلوں پر بہرحال اعتماد کرنا اسلامی صراطِ مستقیم کی ایک شق ہے۔

[*] ایمان کی کڑی شرطوں اور اسکے قوت افزا اعمال کے متعلق مفصل بحث ابھی ابھی ہو چکی ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں پر اٰمَنُوْا سے مراد صرف منہ سے اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ کہنا نہیں بلکہ اُن جانگزا اور روح فرسا اعمال کا کرنا ہی جسکا نتیجہ غلبہ قوم ہے اور انہی اعمال کو شعار بنا لینا صراطِ مستقیم کی طرف جاتا ہے۔

[*] الْكِتٰب کے مفہوم کے متعلق ایک ابتدائی بحث صفحہ ... کے تحت المتن میں ہو چکی ہے۔ یہاں مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ الْكِتٰب سے مراد قانونِ خدا ہی ہے۔ اور یہ لفظ مطلق معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے کوئی خاص کتابِ الٰہی مراد نہیں۔ "تو نہیں جانتا تھا کہ قرآن کیا ہے" اس وقت بےمعنی ہے جب کہ قرآن آنحضرتؐ پر نازل بھی نہیں ہوا تھا۔ 'اِیْمَان' سے مراد یہاں پر بھی وہ تکیفِ قلب ہے جسکا نتیجہ خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانی ہے، منہ سے کچھ کہکر چھوٹ جانا مراد نہیں۔ اس مقام نظر سے ایمان کو جَعَلْنٰهُ نُوْرًا کہا گیا ہے اور بالآخر اسکو صراطِ مستقیم کی ایک شق گردانا گیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا کی ضمیر هُوْ کا مرجع نہ صرف 'اِیْمَان' بلکہ 'الْكِتٰب' بھی ہو کیونکہ کتابِ خدا کو نور سے تشبیہ پہلے بھی دی جا چکی ہے۔ دیکھو صفحہ ۱۸۱۔ آیہ (۵: ۱۵)۔

لاعلاج شکست و ریخت سے بچا! وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۖ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ۗ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ (۲: ۲۱۳) ۔ تو اُن میں اپنی سچی ملازمت اور لاشریک عبادت کے ولولے پیدا کر دے! أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ وَأَنِ اعْبُدُونِي ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝ (۳۶: ۶۰) ۔ تو اسلامی اُمت کے لیے ایک منسکِ عمل، ایک طریقِ ملازمت، اور ایک اندازِ عبادت مقرر کر چکنے کے بعد اُنکو اصل قانون (اتحاد) کے متعلق سب تنازعات سے باز رکھ! لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ ۖ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ † ۚ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُسْتَقِيمٍ ۝ (۲۲: ۶۷) ۔ تو اُن کو صورتاً اور معناً ایک مرکز پر جمع کر کے اُنکی جماعت کو قوت کا لازوال مصدر، تمرکز کا بے مثال پیکر، اور شہادت خدا کا بعدیل نمونہ بنا دے! سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ

---

۱ اور کتاب خدا کے متعلق تو اُنہی لوگوں نے آپس میں، صریح احکام آئے پیچھے، اختلاف قائم کر لیا جن کو وہ دی گئی تھی، اور اس اختلاف کی وجہ اُن کی آپس میں ضد ہی تھی۔ پھر آخر کار وہ راہ حق، جسکے بارے میں لوگوں میں اسقدر اختلاف پیدا ہو گیا تھا، اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ان ایمان والوں (یعنی قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں) کو دکھا دی، اور اللہ تو جس کو مناسب سمجھتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف لیجاتا ہے۔

۲ اے اولادِ آدم! کیا ہم تمکو وقتاً فوقتاً تاکید نہیں کرتے رہے، اور کیا ہم نے تم سب کی جبلت سے اِس بات کا معنوی عہد نہیں لیا کہ دیکھو شیطان کی غلامی نہ کرنا کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، اور میری ہی عبادت اور عملی خدمت میں لگے رہنا کہ یہی صراطِ مستقیم ہے، (عبادت کا مفہوم ظاہر ہے کہ یہاں پر بھی نماز نہیں کیونکہ کوئی شخص شیطان کی نماز نہیں پڑھتا، مقصود عملی اطاعت ہی ہے۔ دیکھو تحت المتن صفحہ ۲۰۶۔ اس آیت کے مطالب کا مقابلہ آیہ (۵۱: ۵۶) صفحہ ۱۸۱ سے کرنا چاہیے۔

۳ لوگو! ہم نے روئے زمین کی ہر اُمت کے لیئے خدا کی عبودیت اور قانونِ خدا کی اطاعت کا ایک ظاہری نشان مقرر کر دیا ہے جس پر وہ چل رہی ہے لیکن اصل قانون سب کے لیئے ایک ہے (اور وہ اتحاد ہے) تو لوگوں کو چاہیئے کہ اصل قانون (الامر) کے متعلق تم سے کوئی نزاع قطعاً قائم نہ کریں۔ پس تم سب دنیا کو اپنے پروردگار ہی کی طرف بلا کر ایک مرکز پر جمع کر دو اور اسی توحید کے ذریعے سے اتحادِ عالم پیدا کرو۔ اِسمیں شک نہیں کہ اُمم عالم کے مابین اس اتحادِ معنوی کے قائم کرنے میں تم لامحالہ صراطِ مستقیم پر ہو۔ الامر کی تشریح کیلئے آیندہ تحت المتن کے علاوہ دیباچہ کتاب صفحہ ۳۔۹ و ۳۲۔۳۳ کے مطالب پر غور کرنا چاہیئے۔

---

† اس مشکل آیت کے صحیح مفہوم کو میں نے متذکرہ صدر تشریح میں ظاہر کرنے کی سعی کی ہے اور مطالب کو گذشتہ اور آیندہ سیاق سورۃ سے مربوط کر دیا ہے۔ محولہ بالا مطالب کی صحت کا اندازہ شاید اُس وقت زیادہ صراحت سے ہو سکے گا۔ جب سورۂ حج کے وضعی ربط اور مطالب کو جس میں یہ آیت واقع ہوئی ہے واضح کر دیا جائے گا اور حج کی آلٰہی حکمت عملی بھی ذہن نشین ہو جائے گی۔ حج بیت الحرام کے متعلق ایک ابتدائی بحث دوسری جلد میں آنے والی ہے اور وہاں پر بھی اس آیت کے مذکورہ بالا مطالب کی تصدیق کا موقع مل رہے گا۔ یہاں پر فی الحال لفظ "مَنْسَك" اور لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا کے صحیح مفہوم سے بحث ہے۔ مَنْسَك کے معنی میں نے "نشانِ ملازمت خدا" کیے ہیں، اور میری مراد اس سے وہ اجتماعی رسم و رسوم اور شرعی رواجات ہیں جن کے ذریعے سے روئے زمین کی ہر قوم بلحاظ مذہب و ملت وقتاً فوقتاً معبود سے اپنے تعبد اور تعلق کا رسمی اظہار کرتی رہتی ہے۔ بعض اُمتوں میں یہ مناسک حیوانی قربانیاں ہیں، بعض میں سالانہ اجتماع اور میلے ہیں، بعض میں کسی ظاہری نشان مثل قشقہ و زنار کا لگائے رکھنا ہے، بعض میں عجیب و غریب اور ناقابل فہم رسمات ہیں جن کی اصلی غرض و غایت مرورِ مدت کے باعث مسخ ہو چکی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ الا شرعی

مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۲: ۱۴۲)

تو اُن کو ابراہیم کی مخلصانہ اطاعت اور ایک منعمی کے کامل اتحادِ عمل کی طرف مائل کر ؛ قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ

سلہ ناسمجھ اور نادان لوگ تو یہی کہیں گے کہ بھلا محمد (صلعم) کے پیرو کیوں بے وجہ اور بلا سبب اپنے پہلے قبلے سے ہٹ کر دوسرے قبلے کی طرف آگئے ، اور وہ کیا ہی معمولی سی بات تھی جس پر یہودیوں اور عیسائیوں سے لڑائی مول لی ۔ قانون خدا کے اِن نادانوں کو یہی مختصر سا جواب دے کر چپ کرا دو کہ تمہیں اِس بات کی کیوں خلش ہے ، خدا ہی کا مشرق اور خدا ہی کا مغرب ہے ۔ وہ جو چاہے پسند کرے ۔ لیکن وہ جس قوم کو چاہتا ہے اور جس میں اہلیت دیکھتا ہے تمرکز اور وحدت کا صراطِ مستقیم دکھا دیتا ہے ۔

اس آیہ شریفہ کے صحیح مطالب میں نے مذکورۂ بالا ترجمے میں ظاہر کر دیئے ہیں ۔ شارحین نے جو کچھ لکھا ہے ۔ سوال از آسماں اور جواب از ریسماں کا مصداق ہے ۔ سفہاء اور نادانوں کا اعتراض ہے کہ قبلہ بیت المقدس سے مکہ معظمہ کیطرف کیوں بدل دیا گیا اکھوے دقوفوں کا سا جواب دیا ہے کہ مشرق بھی اللہ کا ہے اور مغرب بھی اسکا ۔ اسنے جو چاہا پسند کر لیا ۔ عاقلوں اور سوچ والوں کے لائق یہ جواب ہے کہ اسلام کو ایک مرکز چاہیئے تھا سو جس قوم میں خدا اہلیت دیکھتا ہے اُسکو ایک مرکز پر آنے کا صراطِ مستقیم دکھا دیتا ہے ۔ اگر بیت المقدس بدستور قبلہ رہتا تو یہ تمرکز ممکن نہ تھا ، عیسائی الگ تھلگ رہ کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جدا بناتے ، یہود جدا شور مچاتے ، اور وہ سچا اتحاد جو پیش نظر تھا قائم نہ ہو سکتا ۔ پس بہتر یہی تھا کہ الگ مرکز بنایا جائے جس پر یہود و نصاریٰ بلکہ تمام عالم مجتمع ہو سکے اور ہو جائے ۔ ضمناً جواب میں اس اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ خدا کو مشرق مغرب کی کچھ تخصیص نہیں ، سب اسی کے ہیں ۔ اسلئے نہ بیت المقدس مقصود بالذات تھا نہ اب مکہ ہے جو مقصود ہے وہ تمرکز اور اتحاد ہے گویا مسلمانوں کو متنبہ کر دیا ہے کہ اصل قانون کی طرف رجوع کریں جیسا کہ میں نے منسک کے تحت المتن کے اخیر (صفحہ ۲۲۳) میں واضح کرنے کی سعی کی ہے ۔ یہ تحت المتن چنانچہ اِس صفحے پر بھی جاری ہے اور اس آیت کے مطالب پر غور اُس تمام تحریر کو پڑھ کر کرنا چاہیئے ۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۲۸) علامات کی پابندی کسی قوم کے اُسکے اپنے معبود سے لگاؤ کا صرف ایک ظاہری نشان ہے ، معبود کے احکام کی تعمیل پر آمادگی پائی کے بتلاتے ہوئے قانون کی پابندی اُن سے لازم نہیں آتی ۔ بہت ممکن بلکہ اغلب ہے کہ ایک شخص اِن رسومات کے ساتھ صحیح معنوں میں ملازم خدا بنا رہے ۔ مگر ہر رسمی نبا ہنے والا غلامی (یعنی عبادت) کا دعوٰے اُس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ اصل قانون اور احکام کی تعمیل بھی کماحقہ نہ ہوتی رہے ۔ اِس مقام نظر سے کسی مذہب کے اُس کے اپنے معبود سے اظہارِ تعلق کی اِن ظاہری علامات کو عبادات کہنا قطعاً نادرست ہے کیونکہ عبادت ' آقا کے حکموں پر پیہم عمل اور اُس کی خاطر مسلسل تکلیف برداری ہی ہے ۔ اور اِن رسوم کو بقید وقت پورا کر لینا صحیح معنوں میں عمل نہیں گو کہ ان کی پابندی بھی معبود کے احکام میں داخل ہو ۔ قرآن حکیم نے اسی نقطۂ نظر سے اِس قطع کے وقتی اور رسمی افعال کو ' مناسک ' کے جامع اور مانع لفظ سے تعبیر کیا ہے ۔ اور ' عبادت ' کا لفظ کسی شخص کے باطنی تعبد اور اُس کی قلبی اطاعت کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے ۔ چنانچہ اسی موضوع پر ایک مستقل بحث عبادت کے تحت المتن صفحہ ۱۰ الخ میں گذر چکی ہے ۔ اسلام میں صلوٰۃ اور حج ، صوم اور زکوٰۃ کے افعال ، یا وہ شرعی مجالس ، فقہی مراسم اور اجتماعی تیوہار جو ظہورِ اسلام کے بعد اُمت میں رواج پا گئے ہیں ، اور جن کے باعث مسلمان باقی مسلمان اُمتوں سے ممتاز نظر آتے ہیں ، سب کے سب ' مناسک ' میں داخل ہیں ۔ اِس میں شک نہیں کہ نماز اور حج کے ادا کرنے یا دن بھر بھوکا رہنے اور نقود زکوٰۃ ادا کرنے کے لیئے ہر متنفس میں کچھ نہ کچھ اطاعت کا مادہ موجود ہونا ضروری ہے ۔ مگر نرے نمازگذار ، صائم یا حاجی وغیرہ بن جانے سے عبد کا درجہ لازماً حاصل نہیں ہوتا جبتک کہ اطاعت کا کیف اِن مناسک کے ادا کرنے کے بعد بھی بہروقت موجود نہ ہے ، اور تمام احکام قرآن کی حسب منشا تعمیل نہ ہوتی رہے ۔ پس ' منسک ' اور ' عبادت ' میں درحقیقت کیف و دل کا فرق ہے اور جو منسک قلبی اطاعت سے ادا ہو اور حاکم کا کشفا پیدا کر دے وہ بلاشبہ عبادت کا ایک جزو ہے ۔ مناسک اسلام کی اسی باطنی استعداد اصلاح کو مد نظر رکھ کو نے صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کو عبادات میں داخل کیا ہے ، اور اصل کتاب میں بحث اُسی الصلوٰۃ پر ہو رہی ہے جو کیفیت دل کے ساتھ ادا ہو کر

رَبِّیٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۞ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۲۹) صحیح معنوں میں تعبّد پیدا ہو سکے۔ نرے قومے اور قعدے کر لینا اگرچہ مناسک میں داخل ضرور ہے لیکن عبادت نہ تھا نہیں۔ قرآن حکیم نے مناسک حج کے اسی سطحی نظارتعبد کو پیش نظر رکھکر سورۂ بقرہ میں واضح کر دیا تھا کہ ان سے اصل مقصود اس حاکم اعلیٰ کا کھٹکا ہی ہے، تو جس وقت وہ مناسک ادا ہو جائیں اصلی غرض و غایت کی طرف بیش از بیش رجوع ہو جاؤ: فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰهَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا (۲: ۲۰۰)، یعنی جب تم مراسم حج ادا کر چکو تو اس احکم الحاکمین کی یاد دل میں اسیطرح لاؤ جس طرح جوش محبت میں اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھکر اسکا کھٹکا لگا رہے تو اچھا ہے۔ یہاں ذکر سے مراد تسبیحیں چلانا نہیں بلکہ فقر خدائے عظیم کی دھک دل میں رکھنا ہے۔ لوگ اپنے باپوں کو تسبیحیں چلا چلا کر یاد نہیں رکھتے بلکہ ان کا خیال کرنا ان سے دلی رسم و راہ رکھنا ہی ان کا ذکر ہے۔ اس آیت سے ذرا پہلے ہے: فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْکُرُوْهُ کَمَا هَدٰىکُمْ (۲: ۱۹۸) یعنی پھر جب تم عرفات سے لوٹو تو مشعر الحرام (یعنی مزدلفہ) میں ٹھیر کر خدا کا کھٹکا اپنے دلوں میں پیدا کرو (فَاذْکُرُوا اللّٰهَ)، اور اسکو اس شدت سے دل میں لاؤ جس طرح تمہیں بتلایا ہے۔ بعینہٖ یہی مقصود الصلوٰۃ کے مناسک ادا کرنیکے بعد پیش نظر کر دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ نسآء میں اُس نماز کے بعد میں جو میدان جنگ میں خوف عدو کے باعث قصر کر دی جائے، ارشاد ہے کہ اسکے مناسک ادا کر لینے کے بعد وہی تکیف دل میں پیدا کرو جو الصلوٰۃ کا منتہائے نظر ہے: فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْکُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۴: ۱۰۳)، یعنی پھر جب میدان جنگ میں نماز کے ارکان کو افرا تفری اور گھبراہٹ میں ادا کر چکو تو اسکے بعد کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے جس طرح بھی ہو سکے خدا کا کھٹکا دل میں پیدا کر لو کہ یہی مقصود اصل نماز کا ہے)، پھر جب دشمن کی طرف سے بے خوف و خطر ہو جاؤ تو اُسی اصلی کھٹکے والی، اور یاد پیدا کرنے والی نماز (الصلوٰۃ) کو پھر قائم کرو، اور یہ جو میدان جنگ میں بھی تم کو نماز پڑھنے کے لیے کہا گیا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ صاحب ایمان بندوں پر یہ پنجوقتہ حاضری بقید وقت فرض ہے (نہ یہ کہ جب جی میں آیا اور قلب مطمئن ہوا پڑھ لی اور جب چاہا ملتوی کر دی)۔ اس آیہ شریفہ کے معانی نہایت غور طلب ہیں اور ان مطالب سے جو پیش کیے گئے ہیں بعض اہم نتائج مترشح ہوتے ہیں: اولاً مناسک صلوٰۃ کو انتہائی خطرے کے وقت بھی ادا کر لینا اسلیئے ضروری ہے کہ پابندیٔ وقت کا درس جو قرآن حکیم نے الصلوٰۃ کی تہ میں رکھا تھا نہ بھولنے پائے۔ ثانیاً الصلوٰۃ 'ایمان والوں' کے لیئے 'موقوت' اسلیئے بھی ہے کہ بادشاہ زمین و آسمان کے حضور میں بروقت حاضر نہ ہونا آداب شہنشہی کے برخلاف، اور اطاعت کے منافی ہے۔ ثالثاً صرف مراسم یعنی قومہ اور قعدہ کر لینے سے نماز ادا نہیں ہوتی بلکہ اسکے بعد خدا کی ٹیس دل میں پیدا کرنا لابدی ہے۔ بہر نوع ان تمام مثالوں سے ظاہر ہے کہ اسلامی مناسک 'عبادت' کے درجے پر اُسی وقت پہنچ سکتے ہیں جب اُن سے ذکر خدا یعنی اطاعت پیدا کرنے والی دھک صحیح معنوں میں پیدا ہو، اور یہ ذکر کا پیدا ہو جانا اُن مناسک کی رسمی تکمیل سے کہیں بہتر ہے۔ جیسا کہ آیۂ (۲۹: ۴۵) میں وَلَذِکْرُ اللّٰهِ اَکْبَرُ کے الفاظ سے ظاہر ہے جو صفحہ ۲۰۹ کے تحت المتن میں گذر چکی ہے۔ اگرچہ مناسک کا اپنے وقت اور موقع پر ادا کرنا بھی ایسا ہی ضروری ہے جیسے اوامر و نواہی کی تعمیل۔ اس مقام نظر سے اسلامی مناسک فی الحقیقت ایک شخص کو مطیع خدا بنانیکے اوزار یا وسائل ہی ہیں۔ بجائے خود منتہا، یا اصالتاً عمل نہیں۔ اُن کے ہوتے ہوئے یا ان کی وساطت سے تعبّد پیدا ہو سکتا ہے مگر انکا اختیار کر لینا فی نفسہ عبادت نہیں اگر ایک شخص کسی حاکم کے نشانات ملازمت مثل چپڑاس یا تمغہ جات، یا رنگ لباس وغیرہ اختیار کرتا ہے، اور اسکو علانیہ پہلے پھرتا ہے تو یہ ہیئت کذائی ایک حد سے اس حاکم اعلیٰ کی اطاعت کرنے کی محرک ہو سکتی ہے، مثلاً بہت ممکن ہے کہ محض نمائش کے لیئے چپڑاس لگاتا پھرے، لیکن فی الحقیقت مطیع نہ ہو! ابراہیم علیہ السلام کی اُس دل شگاف اور سر گداز دعا کا جو آپنے خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت کی تھی بعینہٖ یہی راز تھا، اور اسی لیئے مٹی اور گارے کی ٹوکریاں سر پر اٹھاتے وقت پہلی بے اختیار ٹیس جو اُس اولوالعزم نبیؐ کے دل سے نکلی یہی مُسلم اور مطیع بننے کی ٹیس تھی، رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً

لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؕ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (۶: ۱۶۲-۱۶۴) ۔ تو اُن میں تسلیم کی خُو، اطاعت خدا کا ولولہ، اور اپنی دی ہوئی نعمتوں کی سچی قدر کرنے کی قوت دے! اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً

سلہ اے پیغمبر تم علی الاعلان کہدو کہ اُس خدائے عظیم نے مجھے صراط مستقیم دکھا دیا ہے، اور وہ وہی راہ رہت (دِیْنًا قِیَمًا) ہے جو ابراہیم کا تھا اور جو خالصۃً خدا ہی کے ہو رہے تھے، اُسی کے قانون کی علامتابعت کیا کرتے تھے، اور اطاعت گذاری میں کسی شے کو بھی خدا کے برابر نہ کرتے تھے (مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ)۔ اے پیغمبر تم کہدو کہ میں تو اُس رب زمین و آسمان کے قانون کی عملی اطاعت کی طرف اس طرح جھک گیا ہوں کہ میرے سب افعال، میرا نماز میں جھکنا، میری ملازمت و اطاعت کے سب انداز (نُسُكِیْ) میری خدمت اور بندگی کے سب ظواہر (نُسُكِیْ) میری باطنی اطاعت (صَلَاتِیْ) اور ظاہری عبودیت (نُسُكِیْ) حتیٰ کہ میرا جینا اور مرنا بھی اُسی رب العالمین کے اعلاء کے لئے ہے، اُسی کی حکومت کو لوگوں کے دلوں میں استوار کرنے کے واسطے ہے۔ اور وہ وُہ حاکم اعلیٰ ہے جس کا کوئی ہم پلہ نہیں، جس کے برابر کوئی حکمران نہیں۔ یہی حکم مجھے اُسکے ہاں سے ملا ہے اور میں سب سے پہلے اُسکو اپنا خدا تسلیم کرتا ہوں (اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ)۔

سلہ مناسک کے تحت المتن میں جو اس صفحے پر جاری ہے میں نے آیۃ (۶: ۱۶۳) کی تشریح کر دی ہے۔ چنانچہ یہ آیت حُسن اتفاق سے اِسی صفحے کے ذیل میں آگئی ہے۔ آیۃ (۶: ۱۶۴) کے الفاظ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ سے واضح ہے کہ یہاں پر بھی نُسُک سے مقصود تسلیم و اطاعت ہی ہے۔ اور صاف ظاہر ہے کہ خدا کو چھوڑ کر ماسوا کی محبت میں گرفتار ہونا (مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ)، اپنی تمام قلبی نیازمندی (صَلَاتِیْ) اور ظاہری نشان ملازمت (نُسُكِیْ) اور زندگی (مَحْیَایَ) اور جان (مَمَاتِیْ) کو قانون خدا کے مطیع کر دینا اور تسلیم اپنا شیوۂ عمل بنا لینا صراط مستقیم ہے۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۳۰) لَکَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝ (۲: ۱۲۸) یعنی اے حاکموں کے حاکم اور ہمارے پالنے والے خدا! تو اس ریگستان اور بیابان عرب کے اندر ہماری ناچیز کوششوں کو جو ہم اِس چھوٹے سے بے حیثیت گھر کو تیرے جلیل القدر نام پر موسوم کرنے کے لئے کر رہے ہیں، قبول کر (رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا کا ترجمہ جو آیۃ (۲: ۱۲۷) میں ہے)، تو اِن نیک نیت مساعی کو بارآور کر، اور اے احکم الحاکمین تو ہم کو صحیح معنوں میں اپنا حکمبردار بنا۔ اور ہماری اولاد میں سے ایک اُمت پیدا کر جو فی الحقیقت تیرے حکموں کو ماننے والی ہو، اور ہم کو ہماری ملازمت کے نشان (مَنَاسِكَنَا) بتلا، ہماری گذشتہ واماندگیوں سے درگذر کیونکہ اس میں شک نہیں کہ تو تائب بندوں کے حق میں بڑا ہی درگذر کرنیوالا مہربان ہے۔" اِسی اطاعت کے منتہا کو مدنظر رکھکر ابراہیم علیہ السلام کے "دین قیم" اور "ملت حنیفہ" کو دوسرے موقع پر یوں واضح کیا ہے، قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؕ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (۶: ۱۶۳-۱۶۴) لیکن چونکہ یہ آیات عنقریب آگے چل کر اصل کتاب میں آ رہی ہیں سلئے مطالب کے لئے وہاں دیکھنا چاہئے تاہم ظاہر ہے کہ یہاں پر صلاۃ سے باطنی تعبد اور نسک سے اُس تعبد کے ظاہری نشان مراد لئے ہیں۔ اور یہ اِس وجہ سے کہ از روئے قرآن وہی نماز فی الحقیقت صلوٰۃ ہے جس کا نتیجہ باطنی تعبد ہے ورنہ کچھ نہیں۔ گویا مقصود یہ ہے کہ اگر میرا باطن (صَلَاتِیْ) کسی کی ملازمت کر رہا ہے تو رب العالمین کی اور اگر میرا ظاہر (نُسُكِیْ) کسی کے ملازم ہونے پر دال ہے تو خدا کے۔ اور یہی اصل دین، دین حنیف اور صراط مستقیم ہے! سورۂ حج میں احکام قربانی کی توجیہ بھی اِسی ذکر خدا اور تسلیم کے اصل اصول پر کی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے،

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّیَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ؕ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (۲۲: ۳۴-۳۵)۔

اے مسلمانو! تم قربانی جانور کے اِن ظاہری مراسم کو احکام خدا میں شامل دیکھکر متعجب نہ ہو، ہم نے اس روئے زمین کی ہر اُمت کے لیے اُس کے مخصوص احوال کو پیش نظر رکھکر کوئی نہ کوئی نشان ملازمت مقرر کر رکھا ہے اور ہمارا مقصود اس سے یہ تھا کہ وہ اُنہیں مویشی اور چارپایوں کے عزیز القدر اور بے مثال انعاموں کو جو خدا نے اُنہیں دے رکھے ہیں پیش نظر رکھکر قربانیاں کرتے وقت اُس منعم حقیقی کی تہ یاد دینے والی یاد اُسکا اطاعت کا جذبہ

سلہ چنانچہ یہ آیتیں اسی صفحے کے متن میں آگئی ہیں اور مطالب بھی اسی صفحے پر درج ہیں۔

قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيۡفًا ؕ وَلَمۡ يَكُ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۙ شَاكِرًا لِّاَنۡعُمِهٖ ؕ اِجۡتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۞ وَاٰتَيۡنٰهُ فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ؕ (۱۶ : ۱۲۰-۱۲۲) تو ان کو دشمن کے بالمقابل کامل حفظ و امن عطا فرما کر

---

۵۱ بے شک ابراہیمؑ دنیا کے جلیل القدر رہنماؤں میں سے تھے۔ وہ خدا کے کامل فرمانبردار بندے تھے اور خالصۃً اُسی کے ہو رہے تھے۔ اور کسی شئے کو بھی خواہ وہ اُنہیں کتنی ہی عزیز ہو خدا کے ہم مقام نہ کرتے تھے۔ اور باایں ہمہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی سچی قدر کرنے والے تھے۔ خدا نے انہیں منتخب فرمالیا تھا اور اُنہیں صراطِ مستقیم چلا دیا تھا۔ اور ان تمام اعمال کے صلے میں ہی ہم نے اُن کو دنیا میں ہر طرح کی نعمتوں سے معزز فرمالیا تھا اور بے شک آخرت میں بھی وہ ہمارے معزز بندوں میں سے ہوں گے۔

✽ یہاں قَانِتًا لِّلّٰهِ بننا یعنی تسلیم و اطاعت کو شعار بنالینا اور خدا کی دی ہوئی ہر شئے کا صحیح استعمال کرنا شَاكِرًا لِّاَنۡعُمِهٖ دیکھو معانی شکر تحت المتن صفحہ ۱۳۳) صراطِ مستقیم ہے۔ جو شخص یا قوم نعمتہائے الٰہی کا مناسب استعمال کرتی ہے اسکی دنیا بھی درست ہے۔ اسی لیئے اس پیمبر اعظم کے میں کہا ہے وَاٰتَيۡنٰهُ فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً ؕ۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۳۱) کرنے والا فرد اپنے دلوں میں وقتاً فوقتاً جالیا کریں (لِيَذۡكُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ) لیکن لوگوں نے اس پیش نہاد کو خیر باد کہکر قربانیوں کو نئے نئے معبودوں پر چڑھانا شروع کیا اُنکے اصلی مفہوم سے الگ ہو کر ان نتیجہ خیز رسوم کو بے اثر کر گئے)، تو اے مسلمانو! بگوش ہوش سُن رکھو کہ تمہارا احکم الحاکمین وہی ایک خدا ہے، تم اُسی خدائے واحد کے تابع بن کر رہو (فَلَهٗۤ اَسۡلِمُوۡا)، اور اے پیغمبر! درگاہِ خدا میں خشوع و خضوع کرنے والی قوم کو اجتماعی بقا اور دنیوی امن کی خوشخبری دو۔ اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب خدا کی یاد اُن کو دلائی جاتی ہے تو اُنکے دل تھرا اُٹھتے ہیں اور وہ بیش از بیش احکامِ خدا کی تعمیل میں منہمک ہو جاتے ہیں۔

اِن تمام مثالوں سے ظاہر ہے کہ مناسک کی صحیح حکمتِ عملی یہی تھی کہ اُن کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً انسان کے دل میں شارعِ زمین و آسمان کی یاد پیدا ہو تاکہ لوگ احکامِ خدا کی طرف بیش از بیش رجوع ہوں، اُسکی ہیبت اور ڈر دلمیں رکھیں، اُسکے امن افزا احکام سے غافل نہ ہونے پائیں اُسکی سزاؤں کو یاد کر کے لرز اُٹھیں، اُسکے انعاموں کو خیال میں لاکر تیارِ عمل ہو جائیں۔ اِس سے زیادہ اُن سے فی الحقیقت کچھ مقصود نہ تھا اور جب خدائے عظیم کا دعوےٰ ہے کہ ہر اُمت کے مناسک اُس نے بذاتِ خود مقرر کیئے تھے تو صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک قوم کے مناسک کو دوسری قوم کے مناسک پر کوئی وجہ فضیلت نہیں، اُنکے مابین کوئی بنیادی فرق نہیں، وہ کسی قوم کیلئے فی نفسہٖ مقصود بالذات شئے نہیں، وہ صرف تسلیم، ہیجانِ قلب اور ذکر پیدا کرنیکے آلے ہیں، جو شئے اُنسے ہر نوع مقصود ہے۔ اطاعتِ احکامِ الٰہی ہے، سعی و عمل ہے حکمبرداری اور تقویٰ ہے، احکم الحاکمین کا ڈر اور اتحاد ہے چنانچہ اسی سورۂ حج میں قربانیوں کے احکام کے ضمن میں صاف فرما دیا کہ لَنۡ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوۡمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰـكِنۡ يَّنَالُهُ التَّقۡوٰى مِنۡكُمۡ ؕ (۲۲ : ۳۷)، یعنی "خدا تک نہ تو ان قربانیوں کے گوشت ہی پہنچے ہیں اور نہ اُنکے خون، بلکہ اگر کوئی شئے وہاں بروئے کار آتی ہے تو وہ تمہارا تقویٰ ہے"۔ پس جب تقویٰ کا جزوِ اعظم اتحاد ہے لَا تَفَرَّقُوۡا ہے، اِعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ ہے، صَابِرُوۡا اور رَابِطُوۡا ہے، اُمَّةً وَّاحِدَةً بنے رہنا ہے وغیرہ وغیرہ (دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۵۲)، تو ارکانِ اُمت کا فرض ہے کہ خدائے عظیم کے مقرر کیئے ہوئے مناسک کو اسی اتحادِ قوم، اسی عبودیت، اسی حکمبرداری اور اطاعت کو پیش نہاد بنا کر بالاجماع ادا کریں، انکو فی نفسہٖ مقصود و منتہا نہ سمجھیں کیونکہ اصل قانونِ اُمت کے افراد کے مابین اجماع و اتحاد پیدا کرنا ہے، افرادِ قوم کے دلوں میں خدا کا ڈر پیدا کر کے انکو متحد کرنا ہے، اس سے کمتر حتماً اور اصلاً کچھ نہیں۔

اس تمام بحث و تمحیص کے بعد اصل کتاب کی آیت یعنی لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلۡنَا مَنۡسَكًا هُمۡ نَاسِكُوۡهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِى الۡاَمۡرِ وَادۡعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسۡتَقِيۡمٍ (۲۲ : ۶۷)، کے معانی بالکل صاف ہو جاتے ہیں۔ خدائے عزوجل فرماتا ہے کہ مراسمِ عبادت جسقدر دنیا جہان کی سب اُمتیں چل رہی ہیں فی الحقیقت ہم ہی نے مقرر کیئے تھے لیکن اُن سب کے رائج کرنے کی اساسی حکمت اتحاد بین الافراد اور تقویٰ و تسلیمِ خدا

دنیاوی نعمتوں سے مالا مال کر! وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا✝ ۱۵ (۴۸ : ۲۰)؛ تو اُن کی ہیئت اجتماعی میں تغیر ان جہان

---

۱۵ اے ایمان والو! اللہ تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کر چکا ہے جنہیں تم تمام عالم کے دشمنوں کو شکست دیکر قابض ہوگے تو یہ خیبر کی غنیمت تم کو سو دست دلوا دی اور بڑی بات تو یہ ہے کہ دشمنوں کے دست تعدی سے تم کو بچائے رکھا۔ اور یہ سب افضال الٰہی تمہارے شامل حال اسلئے ہیں کہ ایمان والوں کو قوت ایمان کا پتہ لگ جائے اور تمہیں دشمن کے بالمقابل غلبہ حاصل کرنے کا صراط مستقیم معلوم ہو جائے۔

✝ یہ آیت بیعت رضوان کے ذکر کے عین بعد آئی ہے جہاں حضرت عثمانؓ کی افواہ قتل کے بعد چودہ سو مومنوں نے ایک درخت کے نیچے رسول خدا صلعم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی جہاں تک مرنے کا عزم کیا تھا۔ یہاں اور اس پہلی آیت (۴۸ : ۱۹) میں خدائے عزوجل نے بصورت مومنوں کو مال غنیمت بمقدار کثیر اور بصورت تمام دنیا کا وعدہ کیا ہے؛ دشمن سے بچ نکلنے کو ایمان کا جزو قرار دیا ہے اور ان سب اعمال کو صراط مستقیم کہا ہے۔ گویا اس دنیا میں بچنے کا صراط مستقیم یہی ہے کہ دشمن کے خلاف کامل طور پر حفظ نفس کیا جائے، نہ یہ کہ جب تک جارحانہ تشدد کر کے انکے قلعوں کو توڑا نہ جائے مسلمانوں کی شش و پنج و جامع (صفحہ ۱۷ و ۱۳۱) سے اس قانون الٰہی کی وضاحت بیان ہو رہی ہے کہ فطرت کی ادنیٰ حیوانی مخلوق بھی کشمکش حیات میں دین اسلام اور دین فطرت کی پابند ہے! جن لوگوں نے نفس کو مار کر کسی طرح بچ نکلنے کا خوف ہی گویا اسلام کو بہرحال ایک امن پسند اور صلح جو مذہب بنا رکھا ہے اور جنہوں نے جہاد کے جذبات کو بھی فقط خود میں گم کر ایسی اعمال شعور کے آپس کی کا آئینہ اسلام بکر رہ میں لکھ دیا ہے کیا عاقبت عبرت انگیز ہے۔ سچی حجت و سنت کو صراط مستقیم گردانا ہے (۱۰ : ۶۶) صفحہ ۱۰ میں آپکا ہے، صفحہ ۲۳۳ پر آئیگا، آیت ۱۱۱ صفحہ ۱۰ میں لکھا جا چکا ہے۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۳۲) اور اطاعت خدا ہی تھی کہ یہی اصل قانون اور اس کارگاہ جہان کا اٹل حکم ہے) تو ان لوگوں یعنی یہود و نصاریٰ اور اقوام کو جنکو مناسک اسلام کے قبول کرنے میں اعتراض ہے، چاہیئے کہ ایک منسک اور دوسرے منسک کے مابین ظاہری فرق کو نظر انداز کر دیں اور اصل قانون کے بارے میں تم سے کوئی نزاع پیدا نہ کریں (فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ)، اور وہ اصل قانون لاریب یہی ہے کہ تم لوگوں کو صحیح معنوں میں اپنے پروردگار کی طرف دعوت دیکر متحد العمل کر دو (وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ) اور اسمیں شک نہیں کہ توحید کی یہ مشترک سطح قائم کرنے میں تم لامحالہ راہ راست پر ہو؛ ان مطالب کی صحت کی قطعی شہادت اس آیۂ شریفہ کے عین بعد کی آیات سے ہوتی ہے جو مطالب کو مربوط کرنے کی غرض سے یہاں پر لکھ دی جاتی ہیں؛ اس مضمون کے بعد ارشاد ہے؛

وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۲۲ : ۶۸-۶۹)

اور اے محمدؐ! اگر اس حقیقت کشائی کے بعد بھی یہ لوگ تم سے اختلاف قائم کریں اور اپنے مناسک پر ضد سے اڑے رہیں تو تم ان سے کہدو کہ جو تفرقہ اندازیاں اور انتشار تم نے نوع انسان میں پیدا کیا ہے اور اس سے خدا خوب واقف ہے، اور وہی روز قیامت کو تمہارے مابین ان باتوں کے متعلق فیصلہ کریگا جن میں تم ناحق اختلاف پیدا کر رہے تھے۔

اسلام نوع انسان کے اتحاد کیلئے آیا تھا (دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۵) اور خدا فرماتا ہے کہ منسک بنفسہ کچھ شے نہیں، وہ سب ہم ہی نے مقرر کئے تھے کیا یہود کے مناسک اور کیا نصاریٰ کے، انکا مطلب اتحاد قوم تھا، جب یہ مطلب انسے فوت ہوگیا ہے تو ان پر اڑے رہنا بے معنی ہے۔ اب یہ اسلامی مناسک ہیں جو ہم نے شروع کئے ہیں انکی غرض بھی بعینہ وہی ہے بلکہ ایک رو سے یہ حج کا منسک تمہاری جاہلی اور پیشینہ مراسم زمانہ کی ترمیم شدہ صورت ہی ہے، پس انکو میں نزاع پیدا نہ کرو اور سمجھ جاؤ کہ صراط مستقیم یہی ہے۔ میرے نزدیک مکہ اور بیت المقدس، چین و عرب سب ایک ہیں۔ مشرق و مغرب ایک ہے۔ زمین و آسمان ایک ہے، نہ مجھے تمہاری قربانیوں کے گوشت پہنچتے ہیں نہ خون، مجھ تک تو صرف تمہارا تقویٰ، تمہارا اتحاد عمل، تمہاری اطاعت اور جذبۂ تسلیم، تمہارا قلبی وبک (ذکر) اور لرزش پہنچتی ہے اور بس۔ انہی کو دیکھکر میرے سب فیصلے ہیں۔ انہی پر سزا اور جزا کا سب حصر ہے! لیکن یہ جامع الاقوام اور عالم انگیز اسلامی مناسک آج خود رسم و رواج کی لکیر میں پڑ کر وہ بے مطلب انتشار پرور، وہ اصنام خیز اور تفرقہ آرا شے بن گئے ہیں کہ ایک متنفس بھی آج انکی اس خاص حکمت عملی کا معترف نہیں رہا!

پس لاکلام اس کارگاہ جہان کا وہ مختص قانون، اُس بے پروا خدا کا وہ خاص الخاص حکم، اُس شدید العقاب آقا کا وہ اٹل آئین عمل؟

کی عالی ہمتی، اُن کے اخلاف کا تفضّل، اور اسلاف کی برتری بخش ؛ وَإِسْمٰعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا ۚ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِينَ ۝ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَإِخْوٰنِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ إِلٰى صِرٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ [۱۵] (۶: ۸۶-۸۷) تو عالمگیر غلبہ عطا فرما کر ان کے ہر فرد میں عدل دوستی اور حق پسندی کی خصلتیں برقرار رکھ ! يٰدَاوُۥدُ إِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيفَةً فِى الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللّٰهِ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَن سَبِيلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌۢ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝ [۱۶] (۳۸: ۲۶) ؛ تو اُن میں قانونِ خدا کے احترام، اور حدودِ خدا کی رعایت سے، حمایتِ حق اور طہارتِ نفس سے، تقویٰ کے مقتدر عزائم اور ایمان کی اٹل طاقتوں سے، امانتِ عدل اور نگہداریٔ عہد سے، وہ اجتماعیّت، وہ عزم بالجزم، اور وہ قوتِ نظم وادارت نصیب فرما جو اسلام کے شیرازۂ اُمّت کو تشتّت کی شکست وریخت سے ہمیشہ کیلئے مامون ومصئون کردے !

قَدْ جَآءَكُم مِّنَ اللّٰهِ نُورٌ وَكِتٰبٌ مُّبِينٌ ۝ يَهْدِى بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوٰنَهُۥ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمٰتِ ✝ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِۦ وَيَهْدِيهِمْ إِلٰى صِرٰطٍ

[۱۵] اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس اور لوط (علیہم السلام) یہ سب ہمارے حکم بردار رہنمایانِ خلق تھے۔ اور ہم نے ان سب کو تمام عالم کے لوگوں پر برتری دی۔ ان کو اپنی قوم کا سردار بنایا اور بادشاہت دی۔ اور نہ صرف انہی کو بلکہ ان کے آباء و اجداد اور اولاد اور بھائیوں میں سے بھی بہتیروں کو ان کے علوِ ہمت، حُسنِ عمل، اور شجاعت کے صلے میں دنیا جہان کی قوموں میں سرفراز کیا۔ اور ہم نے اُن کو باقی قوموں سے منتخب کرکے ممتاز کردیا اور اُن کو دنیا میں قوت سے رہنے کا صراطِ مستقیم دکھادیا۔

[۱۶] اے داؤد ! ہم نے جو تم کو اس زمین پر بادشاہ بنایا ہے تو لوگوں کے معاملات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کرو، اور خواہشاتِ نفس کا تتبع نہ کرنا کیونکہ یہی خواہشات نفسانی تم کو اعتدال کی صراطِ مستقیم سے بھٹکادیں گی۔ جو لوگ عدل وانصاف کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں انکو اس دنیا میں سخت عذاب ملیگا۔ اسلیئے کہ روزِ جزا کو بھول گئے۔

(تتمہ تحت المتن صفحہ ۲۳۳) جس کا نام اتحاد ہے۔ اتحاد بین الافراد اور اتصال بین الاجزا ہے۔ اتحادِ عمل اور اتحادِ افراد ہے۔ یہی وہ شئے ہے جس کے باعث آتشیں چشم زمن میں تمکن کے بامِ بلند پر چڑھ جاتی ہیں، اور باعثِ تمامِ عالم اور علتِ تکوینِ کائنات ہے جو فنا و زوال کا حجاب اکبر ہے جس سے ہر شئے میں زندگی ہے۔ جس کا نہ ہونا موت و شکست کے مترادف ہے۔ یہی وہ رازِ حیات ہے جس کے ہوتے ہوئے شکست ناممکن، ناموجود کالعدم، اور نامردی امکان سے خارج ہے۔ میرا یقین ہے کہ روئے زمین کے ہر مذہب وملّت کا اصل اصول یہی تھا۔ یہی وہ پیغام تھا جو سب انبیائے جہان اپنے آقائے نامدار سے لائے تھے۔ اور اسی حقیقتِ کبریٰ کو کتاب کے دیباچے میں میں نے سب مذاہب کی **الاصل** اور احکم الحاکمین کا **الامر** قرار دیا ہے۔ دیکھو صفحہ ۴ و ۳۱۔

✝ الظُّلُمٰتِ سے میں نے اس کتاب میں بالالتزام قانونِ خدا کے عدمِ تعمّل کی تاریکیاں اور اجتماعی انحطاط کی ناراہ بینیاں، اور النُّورِ سے علم و عمل کی انجام شناسیاں اور تمکن فی الارض کی روشنیاں مراد لیا ہے۔ دیکھو صفحہ ۵۵ و ۱۳۳ و ۱۶۹۔ ان معانی پر ایک فیصلہ کن بحث عنقریب اس مجلد کے اختتام پر آئے گی۔

مُّسْتَقِيْمٍ ○ (٥: ١٥-١٦)

لوگو! پروردگار عالم کی طرف سے تمہیں وہ رہنما نور اور وہ واضح قانون یعنی صحیفۂ فطرت کا نقش (دیکھو تحت المتن صفحہ ٦٢) آچکا ہے جس کے ذریعے سے خدا اس قوم کو جو رضائے الٰہی کی متابعت کرتی ہے، قیام فی الارض اور سلامتی کے رستوں پر لے جائیگا، انہیں اپنے فضل و کرم سے جہالت اور ناانجام شناسی کی ظلمتوں سے نکالکر حفظ نفس، علم اور تمکن کے نور کی طرف لائیگا، اور انکو قیام و بقا کے صراط مستقیم پر ڈال دیگا۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (١٠: ٢٥)

اور اللہ تو قوموں کو حفظ نفس اور سلامتی کے گھر کی طرف بلا رہا ہے، اور جس قوم میں اہلیت دیکھتا ہے انکو تمکن اور قیام کا صراط مستقیم دکھا دیتا ہے۔

پس صراط مستقیم کیا تھا! تحفظ و بقا تھا! قوم کی سلامتی تھی! امت کا دار السلام تھا! جماعت کا کامل امن اور فرد کا اضطراب عمل تھا! اتحاد کا اعتصابِ رعن، اور توحید کا کرداری اظہار تھا! تعبد کا معنوی اقرار اور ملازمت کا عملی پہلو تھا!

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○ (٤٣: ٦٤)

اے لوگو! وہ خدائے عظیم میرا اور تمہارا پروردگار ہے: مولیٰ ہے! آقائے نامدار ہے: رازق ہے! شاہنشاہ حاکم ہے! احکم الحاکمین ہے، اسی کے غلام بنے رہو (فَاعْبُدُوْهُ)، اسی کی خدمت میں لگے رہو (فَاعْبُدُوْهُ)، اسی کے قانون کی تعمیل کرو (فَاعْبُدُوْهُ)، اسی کے آگے سر تسلیم خم کرو (فَاعْبُدُوْهُ)، اسی کے سچے بندے بنو کہ یہی صراط مستقیم ہے!

عبادت کا وحدت انگیز کیف، اور اختلاف سے اجماعی گریز تھا: اتقا تھا! اطاعت امیر تھی!

وَلَمَّا جَاۗءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○ (٤٣: ٦٣-٦٤)

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ○ (٤٣: ٦٥)

---

* دار السلام کے معنا کو لوگوں نے بہشت کا نام سمجھ کر اس تمام آیت کو عالم آخرت میں منتقل کر دیا ہے، لیکن اس بیجا تاویل کی کوئی سند نہیں۔ تیسری جلد میں اس رکوع کا جس کا یہ آیت واقع ہوئی ہے بتمام و کمال ترجمہ کر کے واضح کر دیا جائیگا کہ دار السلام بجز کوئی اخروی مکان نہیں۔ لیکن اگر دار السلام جنت کے معنوں میں کوئی اصرار کرے تو خوش اعتقاد شارحین سے پوچھنا چاہیئے کہ پھر سُبُلَ السَّلٰمِ جو آیۃ (٥: ١٦) میں واقع ہوا ہے کیا شئے ہے؟ کیا وہ بھی جنت کی سڑکیں ہیں۔ افسوس کہ لوگوں نے قرآن حکیم کو کیسا افسانہ بنا لیا ہے!

اور جب عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے پاس خدائے جل و علیٰ کے روشن اور کھلے کھلے احکام (الْبَيِّنٰت) لے کر آئے تو اُنہوں نے اُن کو مخاطب ہو کر کہا کہ اے بھائیو: میں تمہارے پاس یہ احکام کیا لایا ہوں، دراصل وہ عظیم الشان حکمتی اصول لایا ہوں جن کا شارح خود خدائے بیمثال ہے (جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ)۔ اور میرے آنے کا اہم مقصد یہ ہے کہ میں تم پر اُن باتوں کی اصلیت واضح لو دل نشین کر دوں جن میں اختلاف پیدا کرنے کے باعث تم ایک دوسرے سے الگ ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہو تم میں اتحاد کی مشترک سطح از سرِ نو قائم کروں، تم سب کو ملا کر ایک کر دوں! پس اے لوگو! اُس شدید العقاب خدا سے ڈرو! اُسکے مشترک خوف سے متحد ہو جاؤ (اتَّقُوا)، اور سب کے سب ایک میری (یعنی میری) اطاعت کرو، میرے پیچھے لگ جاؤ، وہ خدائے عظیم میرا اور تمہارا دونوں کا آقا ہے پس اُسی کی غلامی میں لگ کر ایک ہو جاؤ، اُسی کے سچے بندے بن جاؤ کہ صراطِ مستقیم یہی ہے۔ لیکن لوگوں نے اس اولوالعزم پیغمبرؑ کا کچھ کہا نہ مانا، وہ آپس میں اُسی طرح اختلاف کرتے رہے، اُسی طرح فرقہ بند بنے رہے، تو جن لوگوں نے یوں اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، اُن پر ہلاکت کے دردناک اور کپکپا دینے والے دن کے اعتبار سے ہزار حیف ہو۔

تمسک قانونِ خدا تھا!

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۴۳:۴۳)

تو اے پیغمبرؑ! تم اس قانون کو جو تم پر وحی کر دیا گیا ہے مضبوطی سے پکڑے رہو، اُس پر جم کر عمل کرو۔ اس میں شک نہیں کہ تم صراطِ مستقیم پر ہو (اور لامحالہ اپنی مراد کو پہنچو گے)۔

خوف عذابِ الٰہ تھا! بیم روزِ جزا تھا!

وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ† فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ (۴۳:۶۱)

اور لوگو! اس میں شک نہیں کہ عیسیٰ (علیہ السلام) بھی بنی اسرائیل جیسی تفرقہ آرا اور فرقہ بند قوم کے لئے ہلاکت اور موت کی یقینی اور قطعی، آخری اور قرار واقعی دلیل تھے (عِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ)؛ اُن کا آنا اور جھٹلایا جانا، اتحاد کی تبلیغ کرنا اور ناکام رہنا یہود کے لئے صلائے اجل تھا، پیامِ موت تھا، ہلاکت کی علی الاعلان شہادت تھی (عِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ)۔ پس اے لوگو! اُس روزِ بد کے آنے میں کبھی شک کرو، اس سے اہل یہود کی طرح بے پروا نہ ہو جاؤ، لمبی تان کر نہ سو رہو (فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا)، اور میرے احکام کی تعمیل کرو کہ یہی صراطِ مستقیم ہے! (دیکھو علم کی تعریف تحت الحق صفحہ ۲۰۰، ۲۴۴۔ گویا حضرتؑ کا آنا یہود کی ہلاکت (السَّاعَة) کا علم (نشان) تھا)۔

وہ صراط تھا جس پر چل کر تعزز اور نعمت ہی، خدا کے دنیوی انعام، اور بے حساب بخششیں ہیں، صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (۱:۶)؛ وہ خوف تھا جس کا اٹل نتیجہ انعام و اکرام ہے، يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى

† السَّاعَة اور یوم آخر وغیرہ کے متعلق بحث نہ ہو سکنے کے باعث یہاں آیۂ شریفہ کے صرف ایک شق معنی بیان کر دیئے گئے ہیں۔ کامل مفہوم کیلئے ابھی انتظار کرنا چاہیئے یا عربی انشائیہ صفحہ ۱۳۶ دیکھیں۔

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ؀ (۱۳:۴۹) ۵۱ - جس سے ہٹ کر قہرِ خدا نازل ہوتا ہے، اُمتیں مغضوب علیہ ہو جاتی ہیں، ذُلّ و مسکنت، موت و افلاس صدیوں اور قرنوں تک پیچھا نہیں چھوڑتے: غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّاۗلِّيْنَ؀ (۱:۷) ۵۲ - وہ سیاست تھی جس پر چلکر ہر سو امن ہے، امتوں اور نسلوں کا امن ہے، افراد اور قبیلوں کا امن ہے، گھروں اور محلّوں کا امن ہے! وہ "مذہب خدا" اور راہ مالک الملک تھی جس پر دنیا کی سب زندہ اور انعام یاب قومیں آج چل رہی ہیں اور اختلافِ مناسک کے باوجود، اپنے اپنے دائرے کے اندر قانونِ خدا اور "الامر" میں نزاع پیدا نہیں کرتیں، لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ؀ (۶۷:۲۲) ۵۳ - نہیں! "صراطِ مستقیم" وہ تلوار سے سوا تیز اور بال سے سوا باریک راہ تھی جس پر چلتے رہنا کمال حزم و احتیاط کا کام ہے، جس سے ذرا ادھر ہٹ کر ضلال ہے، شکست و انتشار کا جہنم ہے، محکومیت کا دوزخ ہے، افلاس کی آہ و بکا ہے! وہ دراصل سعی اور امن، تلاش اور مقصود، طالب اور مطلوب کے درمیان وہ خطِ مستقیم تھا جس کے سوا کوئی دوسرا خط راست نہیں، کوئی سعی مشکور نہیں، کوئی عمل نتیجہ خیز نہیں! وہ وہ تکیفِ قلب اور وہ ضبطِ نفس تھا جس سے قوم کے سب افراد تسلیم کے مجسّمے اور سعی و عمل کے فوارے بن جاتے ہیں، جس سے سینے قانونِ خدا کی اطاعت کے لیے یکسر کھل جاتے ہیں، جس سے دلوں کی تنگیاں اور حوصلوں کی پستیاں کالعدم ہو جاتی ہیں، ہر شخص

---

۵۱ اے ساکنانِ زمین! ہم نے تم سب کو ایک ہی نوع کے مرد اور اسی نوع کی عورت سے پیدا کیا، اب تم سب ایک ہی جنس کے ہو، اس لیے آپس میں اختلاف پیدا نہ کرو، ہمارے نزدیک تم سب برابر ہو اور تمہارے مختلف گروہ اور قبیلے محض اس لیے بنا دیئے کہ تم ایک دوسرے سے امتیاز کر سکو اور ایک دوسرے کے مصالحانہ حریف بنو۔ اور خدا کے نزدیک تم میں سے وہی گروہ عزت اور انعام کا مستحق ہوگا جو سب سے زیادہ قانونِ خدا سے خوف زدہ رہیگا، جو سب سے زیادہ متحد، سب سے زیادہ صابر، محافظِ نفس، اولوالعزم، اور متفق العمل بن کر رہے گا (اَتْقٰىكُمْ دیکھو اتقا کے معانی تحت المتن صفحہ ۱۵۴) اور استقلال سے احکامِ خدا پر عمل کرے گا۔ یاد رکھو کہ خدا تمہارے اعمال سے موبمو واقف، اور تمہاری نیتوں کو سربسر جاننے والا ہے۔

۵۲ ان قوموں کی راہ نہ دکھا جو تیرے قہر و غضب میں آ کر ہلاک ہو چکی ہیں، اور نہ اُن کی جو راہ راست سے بھٹک کر تیرے قہر و غضب کو دعوت دے رہی ہیں۔

۵۳ اے لوگو! ہم نے روئے زمین کی ہر اُمت کیلئے خدا کی عبودیت اور قانونِ خدا کی اطاعت کا ایک ظاہری نشان مقرر کر دیا ہے جس کو وہ شعارِ ربانی ہے لیکن قانون سب کیلئے ایک ہے تو لوگوں کو چاہیئے کہ اصل قانون (الامر) کے متعلق تم سے کوئی نزاع قطعاً قائم نہ کریں، اور وہ اصل قانون یہ ہے کہ تم تمام عالم کو اپنے پروردگار ہی کی اطاعت کی طرف بلاؤ۔ اور سب کو اس ایک مرکز پر ہی جمع کر دو۔ اس میں شک نہیں کہ اس اتحادِ معنوی قائم کرنے میں تم ضرور صراطِ مستقیم پر ہو۔

دوسرے ہمقوم اور ہم جماعت فرد کے لیئے اپنی آغوشِ مرحبا کھول دیتا ہے، کوئی سینہ بھچا ہُوا اور تنگ ظرف نہیں رہتا، پھر محبت اور اخوت کی نہر سلسبیل دلوں میں چل جاتی ہے، اور اِس حُسنِ عمل کے صلے میں امن وانبست کا "دار السلام" اُس قوم کے استقبال کے لیئے دوڑتا ہے!

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ† يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًاؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ○ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (۶: ۱۲۶-۱۲۸)

اے لوگو! جس قوم کی نسبت خدا ارادہ کرلیتا ہے کہ اسکو صحیح راہِ عمل دکھاوے تو اُسکے سینوں کو "الاسلام" اور تسلیم قانونِ خدا کے مطلق مذہبِ عمل کے لیئے یکسر کھول دیتا ہے، اور جسکو اپنی ہی بد اعمالی کے باعث گمراہ کردینے کا ارادہ کرلیتا ہے تو اُس قوم کے سینوں کو بھچا ہوا اور تنگ کردیتا ہے؟ اُن میں حوصلۂ عمل اور توفیقِ خیر مفقود ہوجاتے ہیں۔ باہمی مدد اور بھلائی کرنے کا یارا نہیں رہتا، اُن کی یہ حالت ہوجاتی ہے کہ احکامِ خدا کی تعمیل کرنا اُنکے نزدیک گویا آسمان پر چڑھنا، اور اپنے آپکو ناحق تکلیف میں ڈالنا ہے۔ جو لوگ ہمارے احکام کے مفید ہونے پر ایمان نہیں رکھتے اُن پر خدا کی پھٹکاریوں پڑا کرتی ہے!

اور اے پیغمبر! یہ اپنے سینے کسبِ عمل کے لیئے کھول دینا ہی تیرے آقائے جلیل کا بتایا ہوا صراطِ مستقیم ہے۔ یہی عینِ اسلام ہے، غور و فکر اور صحیح نتائج اخذ کرنے والی قوم کے لیئے ہم نے اپنے حکم کھول کھول بیان کردیئے ہیں۔ یہی وہ قوم ہے جن کے لیئے اِس دُنیا کے اندر، اُنکے پروردگار کے نزدیک اُن کے اعمال کے صلے میں امن و امان کا گھر ہے، اور وہی اِس دُنیا میں اُس کا نجات دہندہ اور خبر گیراں ہے۔

یہ آج اِس پہنائے زمین کے طول و عرض میں صراطِ مستقیم کے اِس مفہوم کے متعلق ایک شق باقی ہے جسپر اسلام کا کوئی فردِ بشر چل رہا ہے؟ کیا دن بھر میں بار بار اور خوش الحانی سے دُہرانے کے باوجود کسی متنفس کو

---

† یہاں یَشْرَحْ صَدْرَهٗ کے بالمقابل "یُضِلَّهٗ" کا آنا اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کلامِ الٰہی کی اصطلاح میں کسی قوم کے اندر الاسلام پر عمل کرنے کی توفیق کا ناپید ہوجانا (دیکھو تعریف "الاسلام" تحت المتن صفحہ ۱۹۱) احکامِ خدا پر عمل کرنے سے ناقابلِ برداشت تکلیف کا محسوس ہونا ہی ضلال ہے۔ ضلال کے پہلے تشریح شدہ معانی میں نے صفحہ ۲۴۳ کے تحت المتن میں درج کردیئے ہیں، یہ ایک نئی قسم ہے۔ مسلمانوں کو سوچنا چاہیئے کہ وہ آج خود اِس ضلال کے مصداق کس شدت سے ہیں!

اِس بات کا احساس رہ گیا ہے کہ صراطِ مستقیم یہ ہے، نماز میں پنجوقتہ اسی کی گذارش ہو، اسی سے ہٹ جانے کا ہر لحظہ ڈر ہے، اِسی کی آرزو اور اِسی کی تڑپ ہے، اِسی کے لیئے اُٹھنا اور بیٹھنا ہے، اِسی کی درخواست میں رکوع وسجود ہیں، قومے اور قعدے ہیں، جُھکنا اور سرنگوں ہوجانا ہے؟ کیا دلوں میں اِسکے متعلق ذراسی چوٹ، رتّی بھر حس، ادنیٰ سی سنسناہٹ، یا اُرد کی سفیدی کے برابر سعی وعمل باقی ہے؟ نہیں، کیا اِس مفہوم کی آج سرے سے خبر بھی ہے! کیا گذشتہ ایک ہزار برس کے اندر ہزار در ہزار فرقہ بندیوں اور شرک آرائیوں، تفریقِ عمل اور عصیانِ امیر، عدمِ تمرکز اور تشتت آرا، حُبِّ نفس اور محبت مال، عبادتِ طاغوت اور ملازمتِ شیطان✝ کے مہلک اثرات کے باوجود ہر مسلمان اس زعم میں نہیں کہ وہ "دینِ اسلام کے صراطِ مستقیم" پر چل رہا ہے، وہ خدا کو خدا مان رہا ہے، رسول کو رسولؐ کہہ رہا ہے، اُس کے حلال حرام کو نباہ رہا ہے، "خیر الاُمم" کا رکن اعظم ہے، اسلیئے اسکو کسی اصلاح کی ضرورت نہیں، کسی مزید راہ ڈھونڈنے کی حاجت نہیں۔ کیا وہ اس مہلک گراں خوابی، کوتاہ نظری اور آشوبِ چشم کا مریض نہیں کہ دنیا کی سب انعام یاب اور خدا کی نعمتوں سے مالا مال اُمتیں اُسکی نگاہ میں ٹیڑھے راستوں پر چل رہی ہیں، جہنّم کی مکین ہورہی ہیں، دوزخ کا ایندھن بن رہی ہیں، مگر اسلام کی لاڈلی مگر بے نوا اُمت صراطِ مستقیم پر چل رہی ہے، "اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ" کی مصداق ابدالآباد تک ہے! کیا آج ارضی نعمتوں کے چھن جانے کے بعد کسی "روحانی نعمتوں" کی تاویل کرکے، یا "دار السلام" کے بے ضرر لفظ کو اسلامی بہشت بنا بنا کر دل کو تسکین دے دینا قہرِ خدا کو کم کرسکتا ہے؟ کیا صاحب القرآن ؑ کی اس حیرت انگیز اور ناقابلِ انکار، اس نصی اور صریح شہادت کے ہوتے ہوئے کوئی انسانی لغت، کوئی قیاس ورائے کوئی اجماعِ اُمت، کوئی یونانی حکمت، کوئی مُلّائی تاویل، یا خود ساختہ حدیث "صراطِ مستقیم" کی اس سے بہتر اور صحیح تر تشریح کرسکتی ہے؟ کیا قربانیوں کے حشر سے بکروں کے مینڈھے اور مینڈھوں کے گھوڑے بنا بنا کر اُمت کو "پلصراط" پر سے گذار دینا، سُنّتِ خدا اور قانونِ ربّ العالمین کو بدل سکتا ہے!

✝ یہ سب اعمال صراطِ مستقیم پر چلنے کے نقیض ثابت کردیئے گئے ہیں (دیکھو اصل کتاب در صفحہ ۲۲۶ تا ۲۳۸)۔

کیا حالاتِ حاضرہ کے ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں میں دھول ڈالکر نصرانیوں کو مغضوب علیہم کہہ دینا اور آپ اس غضب سے ہمیشہ کے لیئے بچے رہنا، اس نعمت کو عالمِ خیال میں اجارے پر لے لینا، آئینِ زمین و آسمان میں تغیّر پیدا کر سکتا ہے؟ کیا صدرِ اسلام کا صراطِ مستقیم، آجکل کے اسلام کی مانند ہی منہ سے خدا کہہ چھوڑنا، حلال و حرام میں فرق کرنا، سوٗر سے پرہیز کرنا، اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کر اپنی خانہ بربادی کو دیکھتے رہنا ہی تھا جسکے صلے میں چند برسوں کے اندر اندر روئے زمین کی سرداری مِل گئی تھی!

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (۶: ۱۵۲-۱۵۴)

اے محمدؐ! اِن حلال و حرام پر لغو بحثیں کرنے والوں (۶: ۱۴۶) کو کہدو کہ آؤ! میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ اصل حرام کیا چیز ہے، اور تمہارے پروردگار نے تم پر فی الحقیقت کیا حرام کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اطاعت گذاری اور محکوماری میں خدا کے ساتھ کسی دوسری شئے کو ہم مقام نہ کرو، اور اپنے ماں باپ کے ساتھ حُسن سلوک کرتے رہو، اور مفلسی کے ڈر سے اپنے بچوں کو قتل نہ کرو کیونکہ ہم ہی تمہارے رزق کے اسباب پیدا کرتے ہیں، اور انکی روزی کے وسائل بھی ہم ہی پیدا کر دینگے، اور تمام ظاہری اور باطنی بداعمالیوں سے بچو، اور انسانی جان جسکا مارنا اللہ نے تم پر حرام کر دیا ہے۔ ناحق (یعنی ماسوا جہاد کے) نہ لو۔ یہ وہ عظیم الشان معاشرتی اصول ہیں جنکا حکم خدا نے تمہیں اسلیئے دیا ہے کہ تم دنیا میں مِل جُلکر رہنے کا طریقہ سیکھو۔ اور یتیم اور بیکس شخص کے مال میں مداخلت بیجا ہرگز نہ کرو، ہاں اگر اسکے حق میں مفید ہے تو اسمیں ہمدردانہ تصرف کرو یہانتک کہ وہ اسکو خود سنبھالنے کے قابل ہو جائے، اور تمام کاروبار اور لین دین میں انصاف، راست روی، اور پورے ماپ تول کو ملحوظ نظر

رکھو۔ ہم کسی شخص کو اُسکی استطاعت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتے، اسلئے تجارت کے متعلق اور کوئی بندش نہیں کرتے۔ اور جب کسی کے متعلق کچھ کہو تو انصاف کو مدِنظر رکھکر کہو، گو وہ تمہارا عزیز ہی کیوں نہو، اور سب سے بڑھکر یہ کہ عہدِ خدا (وعدے) کے پابند ہر دم رہو۔ یہ سب کچھ تمہیں اسلئے کہا گیا ہے کہ تم اُس کے نتائج پر غور کرو۔ اور بیشک یہی میرا صراطِ مستقیم ہے، جس میں امتوں کی سلامتی اور امن ہے، اور اسی کی پیروی کرو۔ اور دوسرے رستوں پہ نہ پڑلینا کہ تم کو امن اور حفظِ نفس کے راستے سے بھٹکا کر تمہاری طاقت کو منتشر اور جماعت کو تتر بتر کردیں۔ یہ تم کو خاص طور پر اِس لئے کہا گیا ہے کہ تم شکست و انتشار کے خوفناک نتائج سے بچتے رہو۔

الغرض صراطِ مستقیم کی اِس شق میں بھی ایمان اور تقوے، صبر اور توکل کے اجتماعی اغراض اور استقلالی مصالح کی طرح، جماعتی استحکام، تمدن اور سیاست کے جراثیم مخفی تھے[+]۔ اِس تمام اصلاحی ترغیب و تاکید کا مآل کار بھی مسلمانانِ عالم کو جہانگیری سے قطعِ نظر جہانبانی اور جہانداری کے سیاسی رموز، اور بادشاہت اور حکومت کے دقیق آداب و قواعد سے باخبر کردینا تھا؛ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝ (۶: ۱۵۲)۔ انصاف پسندی اور بے رُو و ریا عدل، ضبطِ نفس اور حُسنِ سلوک، حُسنِ معاملت اور اعتمادِ باہمی ہی قیامِ سلطنت کے وہ عبرت آموز اور نصیحت آمیز اصول تھے جن پر سختی سے عمل کرنا ناگزیر اور جنسے تغافل روا رکھنا مجرمانہ خودکشی تھی؛ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝ (۶: ۱۵۳)۔ خدائے بیمثال نے کلامِ پاک

---

[۱] یہ نصیحت تم کو خدا نے اسلئے کی ہے کہ تم معاشری اور اجتماعی، سیاسی اور تمدنی اصولوں کو سمجھ جاؤ۔ دیکھو آیہ (۶: ۱۵۲) صفحہ ۲۴۰۔

[۲] اِن باتوں کا حکم خدا نے تمہیں اسلئے دیا ہو کہ تم اس سے نصیحت اخذ کرکے اُسکے مطابق عمل پیدا کرو۔ دیکھو آیہ (۶: ۱۵۳) صفحہ ۲۴۰۔

[+] ایک موقع پر احکام خدا کی اجتماعی اور سیاسی مصلحتوں کو متذکرہ صدر آیات (۶: ۱۵۲-۱۵۳) سے زیادہ واضح الفاظ میں ادا کیا ہے اور انکی سیاسی حکمت عملی بھی بالصراحت بیان کردی ہے۔ سورۂ نساء میں ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا۝ (۴: ۵۸)

اے مسلمانو! خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالے کردیا کرو، اِس کارگاہ سعی و عمل میں خائن ہونے کے مجرم ہرگز نہ ہو۔ اور جب تم اپنی رعیت کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو نہایت دیانت داری اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ اس میں شک نہیں کہ خدا جو یہ نصیحت تم کو کررہا ہے تمہاری معاشری اور اجتماعی ترقی کے حق میں بہت اچھی ہے کیونکہ بلاشبہ وہ اس کارگاہ فنا و بقا کے قانون کو خوب سمجھنے والا (سَمِيْعًا) اور اس کی باریکیوں کو خوب پرکھنے والا ہے (بَصِيْرًا)۔

میں قرونِ خالیہ کی کئی ایک متمدن اور متسلط قوموں کی ہلاکت آفریں غلط کاریوں اور سہل انگاریوں کی مثالیں دے کر، اِن اعمال کی اہمیت کو بصراحت تمام بیان کر دیا تھا، مگر بایں ہمہ نماز کے صراطِ مستقیم کا فوری اور پیشِ نظر مفہوم تقوے کا وہی التیام آفریں اثر، اور توحید کا مجتمع القلوب احساس تھا: وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ[۱۵۱] ○ (۶: ۱۵۴) ۔ متحد اور متفق قلوب کی یہ اسلامی جماعت، بارگاہ خداوندی میں اپنے دن بھر کے جلیل القدر کارناموں کی خاموش شہادت اور حوصلہ افزا سند پیش کر کے، اپنے آپ کو سزاوار انعام، اور مستحق اجر سمجھتی تھی۔ اعلائے حق کے متعلق ان کے مخلصانہ اعمال، اور ربِ عظیم کی غائبانہ خدمتیں، انہیں تحسین و آفرین کا بسملانہ اضطراب اور حضوری خدا کی اضطراری تڑپ پیدا کر دیتی تھیں۔ عمروں کے سُلجھے ہوئے یہ مخلص ملازم اپنی روز روز کی نئی اور خوش کن خدمتوں کے بعد اُس واتائے نہان و عیاں کے حضور میں لپک لپک کر پہنچتے اور دست بستہ کھڑے ہو جاتے! ان کو روئے زمین کی سلطنتیں اور حفظ و امان کی راہیں اُن کے شبانہ روز جہاد اور متواتر عمل کے صلے میں ملا کرتی تھیں: وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ[۱۵۲] ○ (۲۹: ۶۹)۔ اُنہیں اتمامِ نعمت کا راہ راست اور حصولِ قوت کا صراطِ مستقیم، صلح حدیبیہ جیسی اہم حکمت عملیوں، اور فتح خیبر و فتح مکہ جیسے مہتم بالشان کارناموں کے عوض میں ملتا تھا: إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا[۱۵۳] ○ (۴۸: ۱-۲)

---

[۱۵۱] اور مسلمانو! مختلف رستوں کا اتباع ہرگز نہ کرنا، کہ یہ تفریق و انتشار تم کو خدا کے اصلی رستے سے ہٹا کر منتشر کر دے گا، تمہاری ہیئت اجتماعی کو کمزور، اور قوت کو سلب کر دے گا۔ یہ نصیحت تم کو خاص کر اس لیے کی گئی ہے کہ تم اجتماعی ہلاکت سے بچے رہو۔ سلسلے کے لیے دیکھو آیہ (۶: ۱۵۴) صفحہ ۲۴۰۔

[۱۵۲] اور جن لوگوں نے ہمارا نام بلند کرنے کی غرض سے جہاد کیے اُن کو ہم ضرور دنیا میں امن سے رہنے کے اپنے طریقے بتلا دیں گے، اور بیشک اللہ تو حسن عمل کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے (مُحْسِنِينَ کی تعریف صفحہ ۱۳۰ کے تحت اللفظ میں ہو چکی ہے اور یہاں بھی صاف ظاہر ہے کہ جہاد کرنا ہی احسن عمل ہے)۔

[۱۵۳] اے پیغمبر! یہ معاہدہ حدیبیہ کیا ہوا حقیقت میں ہم نے تم کو دشمن پر کھلم کھلا فتح دی۔ اور یہ اس لیے ہے کہ اللہ تیری اگلی اور پچھلی عملی واماندگیوں اور کمزوریوں پر پردہ ڈال دے، اور دشمن کے بالمقابل تم اس دنیا میں اور بھی مضبوط ہو جاؤ۔ اور تاکہ یہ آئندہ نعمتوں کے اتمام کا پیش خیمہ بنے، اور تمہیں حفظ نفس کی حکمت عملی اور غلبے کا صراطِ مستقیم دکھلا دے۔ (ذنب سے یہاں صاف طور پر وہ عملی واماندگیاں مراد ہیں جو ہر بنائے قوم سے کسی اہم اجتماعی معاملے کے متعلق صراط مستقیم نہ ملنے کی وجہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔)

اُنہیں نگہبانیٔ زمین کا انعام عظیم ایثارِ جان، ترکِ وطن، اور شدائدِ سفر کے پیہم تحمل کے عوض میں میدان جنگ کی روح گسل مصائب کے بطیبِ خاطر برداشت کے صلے میں، اور اولوالامر کے احکام کی فوری اور قطعی تعمیل کی شاباش میں ملا کرتا تھا: وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ أَوِ اخْرُجُوا مِن دِيَارِكُم مَّا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِّنْهُمْ ۖ وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيتًا ۝ وَإِذًا لَّآتَيْنَاهُم مِّن لَّدُنَّا أَجْرًا عَظِيمًا ۝ وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ۝ ذَٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ عَلِيمًا ۝† (۴: ۶۶-۷۰)

لیکن صراطِ مستقیم کے ان تمام شقی اور قسمی، ان وقتی اور مقامی معانی سے قطع نظر، نماز اور فاتحۃ الکتاب کے

---

۱ اور اگر ہم اُن کمزور ایمان والے مسلمان نما منافقوں کو حکم دیتے کہ تم اپنی جانوں کو اللہ کی حمایت میں لڑا دو، یا اپنے وطن سے ہجرت کر جاؤ مگر دشمن سے کمزور صلح نہ کرو تو ان میں سے چند آدمیوں کے سوا بقیہ ہمارے اس حکم کی تعمیل نہ کرتے۔ اور اگر جو کچھ ان کو سمجھایا جاتا ہے کرتے تو اُن کی اپنی ہی بہتری کی بات تھی کیونکہ ان کی جماعت اور بھی مضبوط اور طاقتور بن جاتی۔ اور اس صورت میں ہم اُن کو ضرور اپنی طرف سے بڑا اچھا بدلہ دیتے۔ اُن کی جماعت غالب رہتی، اور حفظِ نفس کا صراطِ مستقیم انکو ہم دکھا دیتے۔ پس جس نے ہمہ تن اپنے آپ کو احکام خدا کی متابعت کے لیے وقف کر دیا اور جنھوں نے اپنے امیرِ جماعت رسول کریمؐ کا کہا مانا تو یہی وہ لوگ ہیں جو اُن لوگوں کے دوش بدوش چل رہے ہیں جنہیں اللہ نے اپنی نعمتیں بخشیں، مثلاً وہ انبیائے کرامؑ جنھوں نے راہِ حق میں جہاد کیے، یا وہ صادق لوگ جنھوں نے اپنے اعمال سے اپنے ایمان کی تصدیق کی یا وہ شہدائے راہِ خدا جو خدا کا بول بالا کرتے کرتے ہلاک ہو گئے، یا وہ صالح العمل لوگ جنھوں نے اپنی جماعت کی حالت کو درست کیا اور یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔ یہ توفیق عمل محض اللہ کی طرف سے ہو اور اللہ ہر شخص کی نیت دل جاننے کے لیے بس ہے۔

---

† شارحینِ قرآن نے ان آیات کے سیاق کو نظر انداز کر کے آیۂ (۴: ۶۹) کے مطالب پر جو عجیب و غریب اور ظلمت انگیز بحثیں کی ہیں: بقائے خدا و رسول کو روحانی مجاہدے فرض کر کے بہشت اور آخرت میں انبیاءؑ و صالحینؒ کی مصاحبت کے متعلق افسانوں کا وہ طومار عظیم مطالب کے گرد اگرد کھڑا کر دیا ہے کہ انکی طرف نوازی کو دیکھ کر بعض اوقات عقل حیران ہو جاتی ہے۔ اصل کتاب میں آخری آیتیں (۴: ۶۹-۷۰) پہلے مضمون کے تسلسل میں پیش کی گئی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ آیۂ (۴: ۶۶) میں بودے ایمان والے منافقوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اُنکے حوصلے اسقدر بلند نہیں کہ وہ خدا و رسول کے حکم سے اعلائے جماعت کی خاطر اپنی جانوں کو لڑا دیں، یا اپنے گھروں کو چھوڑ کر جہاد بالسیف کریں، حالانکہ یہ جہاد اور ترکِ وطن اُن کی اپنی بہتری کی خاطر ہی ہے، اور جماعتی حفظِ نفس کا صراطِ مستقیم ہے (۴: ۶۶-۶۸)۔ آیۂ (۴: ۶۹) میں صرف اس قدر کہا ہے کہ نبیؑ اور صدیق اور شہدا اور صالحین کا بلند مقام حاصل کرنیکے لیے جان و مال کی ایسی ہی انتہائی قربانی کی ضرورت ہے۔ ورنہ اسکے بغیر جنت کا حاصل کرنا شہدا و صالحینؒ وغیرہ کے برابر اجر پانا محال ہے۔ صفحہ ۱۷۱ کے تحت المتن میں واضح کر دیا گیا تھا کہ مَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ کا قرآنی مفہوم صدر اسلام میں رسول خداؐ کے وقتی اور مقامی احکام کی تعمیل تھی۔ علیٰ ہذا القیاس یہاں پر بھی یہی مطلب ہے کہ رسولؐ جو اُنکو وقتاً فوقتاً حسب موقع لڑائیاں لڑنے اور مال و اولاد سے مفارقت اختیار کرنے کا حکم دیتا رہتا ہے اور وہ ان احکام کی تعمیل سے اکثر کتراتے ہیں، اگر ان میں اطاعت رسولؐ کی توفیق پیدا ہو جاتی تو ان کے درجے بھی ایسے ہی بلند ہو جاتے جیسے کہ انبیائے کرام کے جنھوں نے اپنی تمام عمر اصلاحِ انسانی میں صرف کر دیں: یا ان صدیق

اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا جامع اور مانع مفہوم دراصل انبیائے اولوالعزم اور اجلۂ رہنمایان زمین کی اُن مزلزل الارض اور مقلب الانام مہموں، انکی اُن بلند نظر اور وسیع الاثر تحریکوں، اُن لشکر انگیز اور بیخ برانداز

(بقیۂ تحت المتن صفحہ ۲۴۳) اور شہداء اور صالح اعمال لوگوں کے جنہوں نے جماعت کی خاطر قربانیاں کیں۔ اس سے زیادہ ان آیات کا کچھ مطلب نہیں۔ رہا یہ امر کہ اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ سے کس طرح کی معیت اور رفاقت مراد ہے۔ اسکے متعلق بحث کرنا عبث ہے۔ کیونکہ آخرت کی کیفیت کا علم خدا ہی کو ہے۔ انسان کو اسمیں پیش از وقت دخل دینے کی ضرورت نہیں (دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۸۲ آیہ (۴: ۶۹) 'جمعت' کے تحت التعلیق میں صفحہ ۲۲۱ پر بھی آچکی ہے اور وہاں پر عیاں کردیا ہے کہ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ سے مراد توفیق عمل ہے۔ جو ہر با ایمان شخص کے شامل حال ہوتی ہے اور یہ استعداد سعی و عمل کا حسب موقع موجود ہونا ہی صراط مستقیم پر چلنے کے مترادف ہے۔

'اَلصِّدِّيْقِيْنَ' کے صحیح مفہوم کی مکمل تشریح صفحہ ۱۱۰ کے تحت المتن میں آیہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ (۴۹: ۱۵) کے ضمن میں کردی تھی اور عیاں کردیا تھا کہ از روئے قرآن 'صدیق' وہ شخص ہے جو اپنے 'ایمان' کی تصدیق ہر لحظہ اور بہرحال عمل سے کرتا ہے۔ 'ایمان' کی اہم قرآنی شرائط بھی اصل کتاب میں بالتفصیل آچکی ہیں اور صفحہ ۱۵۳ کے تحت المتن میں جمع کردی گئی ہیں۔ 'الشُّهَدَآءِ' کی توضیح بھی صفحہ ۱۲۲ تحت المتن اور صفحہ ۲۲۱ کے متن میں آچکی ہے جس سے ظاہر ہے کہ 'شاہد خدا' وہی شخص ہے جو اپنے کاموں کے ذریعہ سے خدا کے نوکر ہونے کی شہادت ہر وقت دیتا رہے، اور جان و مال کو آقا کی خدمت میں پیش کرتے رہنا اس نوکری کی اہم شرط ہے (دیکھو آیہ (۲: ۱۴۳) صفحہ ۱۲۲)۔ اَلصّٰلِحِيْنَ کا مفہوم ذہنی بھی علیٰ ہٰذا القیاس کچھ کچھ صفحہ ۲۲۱ کے متن آیہ (۴۸: ۲۹) میں، کچھ صفحہ ۱۵۳ کے تحت المتن میں آچکا ہے۔ صلاحیت کی مکمل تشریح اندروئے قرآن ابھی نہیں ہوئی، اور اسکی تکمیل کے لیے ابھی بہت دیر بھی ہے تاہم اس اجمال سے ظاہر ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ اور رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ہونا (دیکھو آیہ (۴۸: ۲۹) صفحہ ۲۲۱)، وہ اجتماعی اعمال کرنا جس سے قوم کے ہر عضو میں بیداری اور حیات پیدا ہو (دیکھو آیہ (۸: ۲۴) صفحہ ۲۸۸)، وارث زمین بننا (دیکھو آیہ (۲۱: ۱۰۵) صفحہ ۲۶)، استخلاف فی الارض کا مستحق بننا (دیکھو آیہ (۲۴: ۵۵) صفحہ ۸)، وغیرہ وغیرہ صلاح ہے۔ آیہ (۴: ۶۹) کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ 'الصّٰلِحِيْنَ' کا درجہ تعبّد کا کمترین درجہ ہے اور یہی عامۃ الناس کے اتباع کے لائق ہے، اس سے بلند تر درجہ 'الشُّهَدَآءِ' کا ہے جس میں مال و جان کی انتہائی پیشکش شامل ہے، اس سے بلند درجے کے لوگ 'الصِّدِّيْقِيْنَ' ہیں جن کا سعی و عمل اور بھی جانگزا اور روح فرسا ہونا چاہیے مثلاً حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے رتبے کے لوگ جن پر خدا راضی ہو چکا ہے۔ 'النَّبِيّٖنَ' کا درجہ سب سے بلند اور منیع الحصول ہے، اسکے مفہوم کی تشریح حسن اتفاق سے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے متعلق آیندہ آیات (۲۰: ۱۱۴-۱۲۰) صفحہ ۱۳۴ میں آرہی ہے جس سے ظاہر ہے کہ 'النَّبِيّٖنَ' وہ لوگ تھے جو ایک مجبور زدہ اور شکست خوردہ، ایک مضمحل اور محکوم قوم کو اپنے زہد و گداز اور مزلزل الارض عمل سے اقل قلیل مدت میں ترقی اور اوج کے فلک الافلاک تک پہنچا گئے۔ اور اب ملک کون و مکاں بھی اُنہیں سلام بھیج رہا ہے۔ 'نبوت' کی ماہیت کے متعلق میں نے چند اشارے دیباچہ کتاب (صفحہ ۱۰۲-۱۰۴) میں بھی کیے ہیں جن سے نبوت کا کیف ایک حد تک واضح ہوجاتا ہے۔ گرچہ یہ موضوع کسی آیندہ بحث کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔

اس امر کی تصدیق کہ ان آیات میں 'يُطِعِ الرَّسُوْلَ' سے مراد صدر اسلام میں رسول کے بالمشافہ یا وقتی احکام کی فوری یا حسب موقع تعمیل ہی تھی۔ اور آج جبکہ رسول خدا اُمت کے درمیان بالمشافہ حکم دینے کے لیے موجود نہیں تو اُس کا بدل امیر جماعت کے احکام کی فوری اطاعت ہی ہے اس سے کم و بیش کچھ نہیں، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (۴: ۵۹) کے الفاظ سے ہوتی ہے جو آیات زیر بحث سے کچھ پہلے آئے ہیں اور جن میں ایمان والوں کو کہا گیا ہے کہ خدا، رسول اور امیر جماعت کے احکام کی تابعداری کریں۔ اسی اطاعت پر متعدد آیات زیر بحث (۴: ۶۶-۷۰) سے دو آیتیں پہلے ان الفاظ میں دیا گیا ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ

سکون کوششوں کا اجرا، تسلسل و تکمیل ہی تھا جنکے لیئے وہ اپنی زندگیاں وقف کر گئے تھے، اور جسکی ذمہ داری کا بوجھ وہ اخلاف عالمین پر قاطبۃً چھوڑ گئے تھے:

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ۝ وَنَجَّيْنَاهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ۝
وَنَصَرْنَاهُمْ فَكَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ ۝ وَآتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ ۝ وَهَدَيْنَاهُمَا
الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْآخِرِينَ ۝ سَلَامٌ عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ۝

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۴۴) تَوَّابًا رَّحِيمًا (۴: ۶۴) "یعنی ہم نے آجتک کوئی رسول ہی نہیں بھیجا مگر یہ کہ اسکے بھیجنے سے ہمارا مقصود ہمیشہ یہی رہا ہے کہ لوگ ہمارے حکم سے اسکی اطاعت بے چون و چرا کریں، اور اگر یہ منافق بھی علی ہذا القیاس اُس ظلم کے بعد جو اُنہوں نے تمہاری نافرمانی کے باعث اپنی جانوں پر کیا تھا اللہ سے معافی مانگتے اور تم بھی اس درخواست میں انکے شریک حال ہوتے تو اُن کو معلوم ہو جاتا کہ خدا بھی فی الحقیقت بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور ظلم کار انسان پر بڑا ہی رحم کرنے والا ہے"۔ گویا رسول کا مقام من حیث الجماعت کسی سپہ سالار یا حاکم اعلیٰ کا مقام ہے۔ اور اسکے اس دنیا میں بھیجے جانے کی غرض و غایت اکثر یہی ہوئی ہے کہ سب لوگوں کو ایک حاکم اور ایک حکم کے حلقۂ اطاعت میں لا کر منظم اور منسلک کر دے، اور جب وہ آپ اس دنیا سے رخصت ہو جائے تو یہ اطاعت کا مادہ ارکان اُمت میں بدستور جاری رہے۔ اور اسکی بجائے اولو الامر منکم کی طرف منتقل ہوتا رہے۔ اس مقام نظر سے رسالت کا مقصود افراد اُمت میں اطاعت پیدا کرنا ہے اور بس، لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (۴: ۶۴)۔ مطاع کی ذات اس اطاعت میں مخصوص اسلیئے نہیں کہ ہر رسول اپنے اپنے وقت میں خدا کی اجازت سے لائق اطاعت ہی ہوا جیسا کہ مثلاً آیہ (۴۳: ۶۳) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ سے ظاہر ہے جو اصل کتاب صفحہ ۳۳ پر آئے ہیں۔ رسول کے بعد وہ أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (۴: ۵۹) جو اُمت کی شیرازہ بندی اور نظم کو قائم رکھنے کے لیئے بِإِذْنِ اللَّهِ مقرر ہوتے ہیں۔ اس اطاعت کے اہل ہیں، اور ازروئے قرآن ان کی اطاعت کرنا فی الحقیقت خدا کی اطاعت کرنا ہے۔ متذکرہ صدر آیت (۴: ۶۴) کے الفاظ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ سے بھی ظاہر ہے کہ عصیان امیر درحقیقت وہ شکست انگیز فتنے ہیں جنکے بُرے نتائج نافرمانوں کے اپنے حق میں مضر ہوتے ہیں گویا اس حکم عدولی کے باعث تمام جماعت کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا ہے اور بدیر یا بزود سب اُمت کو موت کے گھاٹ اُترنا پڑتا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۱۰۱ کی آیات میں عصیان رسول کو ظلم سے تعبیر کر کے صاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ امیر اُمت کی نافرمانی کرنا وہ فتنۂ عظیم ہے جسکی سزا تمام جماعت کے افراد کو بھگتنی پڑتی ہے۔ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً (۸: ۲۵)۔

† قرآن حکیم کے تمام طول و عرض میں سورۃ فاتحہ سے قطع نظر صرف یہی ایک موقع ہے جہاں پر الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کے الفاظ واقع ہوئے ہیں باقی سب قصوں پر صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا[۵] بالتنوین موجود ہے اور مطالب کی تنکیر عیاں ہے۔ اس نادر اور معنی خیز تخصیص اور آیات کے سباق و سیاق سے صاف ظاہر ہے کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی بے لوث حیات زندگیوں کا تمام سعی و عمل، انکی اپنی جماعت کی خاطر مسلسل تکلیف برداریاں، اُن کے دشمنوں سے جہاد بالسیف، اُن کا ترک وطن، اُنکی قربانی مال و جان، اُن کا فرعون پر غلبہ حاصل کرنا، انکی وادی سینا اور عین قادیش میں جماعتی تنظیم و تنسیق، اور بالآخر مسلسل تعلیم و تلقین کے بعد بنی اسرائیل جیسی غلام اور محکوم، ذلیل اور نامراد، پست اخلاق اور نامرد قوم کو اقل قلیل مدت کے اندر غالب اور متمکن، حکومت کے اہل اور بادشاہت کے لائق قوم بنا دینا ہی وہ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ تھا جو قرآن عظیم کے رو سے اس دنیا کو بنا لینے کا واحد اور سچا دستور العمل ہے۔ یہی وہ عزیز القدر اور پسندیدہ خدا لائحۂ عمل ہے جسکے مطابق چل کر عرب کے پیغمبر جلیل اور سرور انبیاء نے تیئیس ۲۳ برس کے جانگزا اور روح فرسا سعی و عمل کے بعد وہ فقید المثال کامیابی حاصل کی کہ دنیا ابد الآباد تک اس کارنامے پر سر دھنتی رہے گی۔ یہی اُسوۂ عمل اور انبیائے کرام کا

۵ یا بعض جگہ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ہے۔

إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۳۷: ۱۱۴-۱۲۲)

اور ہم نے موسیٰ اور ہارون پر بھی بہت سے احسانات کیے، ایک بڑا احسان یہ تھا کہ ہم نے اِن دونوں بھائیوں کو اور اُنکی قوم کو فرعون کی مصیبت عظمیٰ سے بالآخر نجات دی، اور فرعون کے بالمقابل اُنکو کامیاب طریق عمل کی ہدایت دیکر اُن کی مدد کی، اور پھر آخر کار یہی لوگ غالب رہے اِس کے علاوہ ہم نے اُنکو ایک واضح اور بلیغ فی البیان دستور العمل کتاب کی صورت میں دیا، اور اُنکو دنیا میں خوش اسلوبی سے اور غالب بنکر رہنے کا صراط مستقیم دکھایا، اور پھر ان دونوں بھائیوں کے عظیم الشان اعمال کا اثر اُنکے اخلاف میں بھی باقی رکھا۔ موسیٰ اور ہارون پر ہمارا اور اُن کے بعد کی اُمتوں کا سلام ہو! بیشک ہم حسن عمل کرنے والوں کو اِسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اور اسمیں کچھ شک نہیں کہ وہ دونوں ہمارے ایمان والے بندوں میں سے تھے!

ان نتیجہ خیز، صبر آزما، اور بلند پایہ اعمال کے بعد پیہم انعام ہی نماز کی اصلی محرک، اور پنجوقتہ حاضری کی روحِ رواں تھی: تَتَجَافٰى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ[۱] (۳۲: ۱۶) یہ لطف وکرم کی اُمید، اور غضب خدا کا ہول ہی تھا جو اُس علۃ العلل، اُس قادر مطلق اور مسبب الاسباب خدا

---

[۱] یہ وہ صاحب سعی و عمل لوگ ہیں کہ احکام خدا کی تعمیل، اور بہبودی اُمت کی جدوجہد میں اُن کے پہلو بستروں سے آشنا نہیں ہوتے، اور خدا کی تعمیل میں اُنکی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں، وہ اپنے پروردگار کی جناب میں اجتماعی ہلاکت کے خوف اور غلبۂ اُمت کے طمع سے کراہتے ہیں، اُسکے لطف و کرم کے امیدوار اور سزا سے خوفزدہ رہکر دعائیں مانگتے ہیں، اور حتی الامکان اسمیں سے جو ہم نے اُنکو دے رکھا ہے ایثار مال بھی کرتے ہیں۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۴۵) تھا، نوح، ابراہیم، لوط، صالح وغیرہم علیہم السلام سب اِسی الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ پر چلتے رہے، اسی الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ پر چلکر نعمت اور دنیوی تعزز ہے (صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ) اِسی سے آخرت اور عقبیٰ کا چھٹکارا ہے، یہی فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۳۰: ۳۰) (صفحہ ۲۴) ہے، اِسی سے غضب خدا کی بندش یکسر ہو جاتی ہے۔ خدا کے فرشتے اور بادشاہ زمین و آسمان سلام بھیجتے ہیں (سَلٰمٌ عَلٰى مُوسٰى وَهٰرُونَ) اور رب ذوالمنن کی نگاہیں مہر آلود بن جاتی ہیں (وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوسٰى وَهٰرُونَ) یہی تھا حسن عمل جس سے إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ؛ یہی اُس آقائے نامدار کی صحیح عبادت ہے، یہی اصل ایمان اور عین اسلام ہے۔ اسی کا محاسبہ اور اسی کی درخواست پنجوقتہ دن میں تھی، اسی کی ترتیب کے اظہار میں قومے اور قعدے تھے۔ اِسی عمل کو قائم کرنا أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ تھا۔ مگر آہ! کہ مسلمان آج اِس الٰہی اور نبوی سبق کو قطعاً بھول گئے ہیں!

✝ ایمان کے متعلق وہ تمام قرآنی اعمال جنکا ذکر اُس وقت تک اِس کتاب میں آچکا تھا صفحہ ۱۰۲-۱۰۴ پر جمع کر دیے گئے، اُنکے مطالعے سے ظاہر ہو کہ موسیٰ اور ہارون پر الْمُؤْمِنِينَ کا لفظ کسقدر صادق آتا ہے نہیں بلکہ اُن مقدس پیغمبروں کے جانکاہ اور عہدگداز اعمال کو دیکھکر جو اُنھوں نے بنی اسرائیل کو تمکن فی الارض تک پہنچانے کیلئے کیے، اِس امر کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایمان فی الحقیقت کس انتہائی سعی و عمل کا نام ہے اور اسکا منتہا یہی وحید کس حد تک اِس دنیا کے اندر قوت و زور سے رہنا ہے، جو شخص اپنے آپکو اور اپنی قوم کو دشمن کے دست تطاول سے نجات دلاکر وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ، اور نَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوا هُمُ الْغٰلِبِينَ، کا مصداق بنتا ہے وہی قرآن کی اصطلاح میں مومن ہے، کلمۂ شہادت کو پڑھ کر مومن بننا حقیقت کا منہ چڑانا ہے۔ ان آیات الٰہی سے اِس امر کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ایمان کا اصل نتیجہ اِس دنیا میں سیاسی غلبہ ہی ہے، "روحانی غلبے" کا کہیں ذکر نہیں۔ "حَسَنٰت" کے صحیح مفہوم پر بحث صفحہ ۱۳۱-۱۳۲ میں آچکی ہے جس سے ظاہر ہے کہ الْمُحْسِنِينَ سے مراد صفحہ ۱۳۰ کی آیت (۱۰: ۱۰) کے لفظ اَحْسَنُوا کی طرح یہاں بھی وہ اجتماعی جدوجہد ہے جسکا اصل نتیجہ غلبہ قوم ہے، گویا یہی سیاسی غلبہ حاصل کرنا اصلاح عمل ہے۔

کی جناب میں اِن وقف عمل اور اسلام کے سچے خادموں کو ضرب دل اور خشوع و خضوع سے آمادہ رکوع و سجود کردیتا تھا: اِنَّھُمْ کَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ* وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَھَبًا وَکَانُوْا لَنَا خٰشِعِیْنَ۝[1] (۲۱: ۹۰)، یہ دستگیری رب پر اعتماد، اور نصرت خدا کا یقین ہی تھا جو تملق کی رحم آفریں اور مضطر انعام حالت میں خدا کی سچے دل سے تحمید و تقدیس کراتا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۝ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۝ اِیَّاکَ نَعْبُدُ** وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۝ (۱: ۱-۴)

اے پروردگار عالمین! سب تعریف اور شکرانے کا مستحق تو ہی ہے۔ تو بڑا ہی رحم کرنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔ روز جزا و سزا کا بھی تو ہی حاکم ہے۔ ہم اپنے سب اعمال میں تیری ہی خدمت اور تیری ہی چاکری کرینگے، اور ہر معاملے میں تجھی سے مدد مانگیں گے۔

یہ دوستی حق پر اعتماد، اور تائید خدا کا انتظار ہی تھا کہ انعام کی آس پر سب کی سب جماعت یکدم گھٹنوں پر، اور ماتھوں کے بل گر پڑتی! پھر اٹھتی اور بار بار گرتی! اِس نماز میں روح تھی، اِسمیں مقصد تھا، اِسمیں غرض کی دلچسپی تھی، اِسمیں انعام کی لم اور رکوع و سجود کی منطق تھی، اِس میں ایمان کے شعلے تھے، اِس میں عصبیت کی یک رنگی تھی، اِسمیں سچا خشوع و خضوع تھا، اِسمیں محبت کی جنبشیں اور مواخات کے باہمی تلاطم تھے! اِسمیں اطاعت کا پیہم احساس، اور نظم و نسق کا سچا سبق تھا! اِس میں توحید کا عملی اور نتیجہ خیز منظر تھا: اِسمیں خدا کی سچی خوشامد، اور متفقہ جماعت کی ہمقدم عجز و زاری کے بعد طمانیت دل اور تسکین قلب حاصل ہوتی تھی، اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۝[2] (۱۳: ۲۸)۔ یہی وہ مسکن روح اور مفرح قلب دوا تھی جو

---

[1] اِسمیں شک نہیں کہ یہ لوگ خدا کے قوت افزا اور مفید قوم اعمال (الخیرات) کیطرف لپک لپک کر پہنچتے تھے، اور ہمکو اجتماعی انعام کی رغبت سے اور اجتماعی سزا کے خوف سے پکارا کرتے تھے، اور یہ احساس بیم و رجا کے تکلیف کو دل میں رکھکر ہماری جناب میں سچا خشوع و خضوع کیا کرتے تھے۔

[2] لوگو! بگوش دل سُن رکھو کہ دلوں کو کامل تسلی خدا کے سچے احساس سے ہوا کرتی ہے۔

---

* الخیرات کے صحیح مفہوم کے بارے میں ایک طول و طویل بحث صفحہ ۱۲۴-۱۳۱ کے تحت المتن میں گذر چکی ہے، وہاں پر یہ آیت بھی آئی ہے۔ متذکرہ صدر مطالب کی تصدیق کے لیے وہاں دیکھنا چاہیئے۔

** صفحہ ۰۰ کے تحت المتن میں عبادت کا صحیح مفہوم واضح کردیا تھا۔ نماز کے عین وسط میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا اقرار بادشاہ زمین و آسمان کے سامنے کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ وعدہ پیہم ملازمت اختیار کرنے کا ہے نہ نماز پڑھنے کا۔ یہ نکتہ ہم نے صفحہ ۱۱۲ پر بھی واضح کردیا ہے۔

مشکلات کے آسان کرنے میں معین خاص ہوا کرتی تھی: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِينَ۝۵۱ (۲: ۱۵۳)۔ آج یہی نماز جسکے ہر قومے اور قعدے پر خدائے بے نیاز کی رگِ لطف و رحمت میں مسلسل اور متصل جنبشیں ہوا کرتی تھیں، جسکے ہر کیفِ سجود پر منشیانِ لطف و کرم کے قلم محشرستانِ صریر بنجاتے تھے: لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ۝۵۲ (۱۴: ۷)، جسکی ہر تہلیل جراحتِ عشق کی بے اختیار ٹیس، اور ہر تکبیر کسی نمک پختِ ناسور کی جگر شگاف چیخ تھی، جسکے ہر زمزمۂ اذان اور ہر مضرابِ دعا پر لطفِ الٰہی کے لاانتہا سازیکدم بجنے شروع ہو جاتے تھے: وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ۝۵۳ (۴۰: ۶۰)، جسکی جاذب القلب صدائیں پردۂ زنگاری کے اُس بے نیاز، سیر چشم، اور پُرکار معشوق کو بھی مجبورِ یاد اور آمادۂ جواب کر دیتی تھیں! وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ۝۵۴ (۲: ۱۸۶)، فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ۝۵۵ (۲: ۱۵۲)، آہ! یہی نماز آج اُمت کی بے حسی اور ایمان کی سطحیت، مطالب کے نسیان اور مقاصد کی فروگذاشت کے باعث ایک بے معنی اٹھک بیٹھک بنگئی ہے! غرض تو درکنار، اِسکے لفظی معانی بھی آج سو میں پانچ نماز گذاروں کو میسر نہیں! اِسکی اہمیت، غرض و غایت کی ناواقفیت کے باعث روز بروز ذہنوں سے اٹھ رہی ہے! مقصود کے فقدان اور کساد بازاری کی وحشت نے اِسمیں بے مطلبی کا تنفر، اور بے سبب فرضیت کا اکراہ پیدا کر دیا ہے! نصب العین کے سقوط، اور

---

۵۱ اے ایمان والو! مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیئے استقلال اور خدا کی سچی یاد سے مدد لیا کرو بے شک خدا اُنھی کا ساتھ دیتا ہے جو مستقل رہتے ہیں (گویا اوّل مرحلہ سعی و عمل میں استقلال (الصَّبْرُ) ہے اور آخری مرحلہ دعا (الصَّلٰوة) ہے)۔

۵۲ اگر تم میری نعمتوں کا صحیح استعمال اور اُن کی سچی قدر کرکے میرا شکریہ ادا کرتے رہو گے تو میں تم کو اور بھی زیادہ کرونگا (شکر کے ان معانی کے لیئے دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۴۰)

۵۳ اللہ فرماتا ہے مجھے بلاؤ اور صدق دل سے بلاؤ میں تمہاری مدد کروں گا اور تمہاری درخواست کو قبول کروں گا۔

۵۴ اور اے محمدؐ! جب ہمارے بندے تم سے ہماری بابت پوچھیں تو اُن کو کہدو کہ ہم اُن کے پاس ہر وقت موجود ہیں۔ ہم پکارنے والے کی پکار کو سنتے ہیں بلکہ اگر اُس کا دل کراہنے لگے تو جواب بھی دیتے ہیں۔ پس اُنکو چاہیئے کہ سرتاپا ہمارے حکموں اور اشاروں پر چلیں، اور بہر حق الوسع سعی کرکے ہم پر اعتماد بھی کریں۔ ممکن ہے کہ انکو راہ مل جائے

۵۵ تو تم کو ہر وقت سچے دل سے محسوس کرتے رہا کرو پھر ہم بھی تمہارا خیال رکھیں گے۔

طپشِ دل کے زوال نے اِسکے بہے سہے نباہنے والوں اور خدا دوستی کے بڑے دعوے داروں اور شب زندہ داروں میں ایک المناک دوریٔ دل اور پریشانیٔ خیال پیدا کردی ہے؛ اِسکا ہر رکوع و سجود، درحقیقت ایک غیر دلچسپ اور مضحکہ انگیز بیگار بن گیا ہے؛ اِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ (۲ : ۴۵)، بڑے بڑے رسمی اولیاء اللہ اسکو برسوں تک نباہ کر اپنے آپ کو خدا سے ویسا ہی دور پاتے ہیں جیسا کہ روزِ اول میں تھے! اُدھر مجدّدینِ دینِ کُہن، اور بعض شناسانِ عہدِ حاضر، اِس نماز کو یورپ کے فراعنہ کبر و تمکنت اور مبلغینِ فسق و شیطنت کے آبگینۂ تہذیب و وجاہت کو ٹھیس نہ لگ جانے کی خاطر، ازمنۂ مظلمہ کی ایک جاہلی رسم اور لغو حرکت خیال کر رہے ہیں! اِسکی اذانیں، محفل آرایانِ طرزِ جدید کے لطیف اور نازک دماغوں میں، بے ہنگام اور تکلیف دہ صدائیں بن گئی ہیں! یورپ کا شیوۂ حکومت آج اپنے بے مثال تمکن اور خاموش تبلیغ سے اپنی مخصوص طرزِ تعلیم اور مصالحانہ دخل سے، اپنی باطنی بدنیتی اور ظاہر احسان سے، اصلاح کے دلفریب بہانوں اور تہذیب کے مشہور عُذروں سے محکوم مسلمانوں میں تفریح کا رنگ پیدا کرکے، اُنکی محبوب روایات اور مہتم بالشان شعائر کی بیخ و بُنیاد کو کھوکھلا، اور اسلام کی خانہ براندازی کا تماشا نہایت ٹھنڈے دل سے کر رہا ہے! اِسکی پُرفن اشاعتی تعلیم محکوم مشرق میں مذہب اور جماعت کو عمداً کالعدم کر رہی ہے۔ نئی پود کی اکثر عصبیت، اُن کے امتیازی نشان، اُنکی ملّی خصائص اور اخلاقی بزرگیاں حرفِ غلط بن بن کر مٹ رہی ہیں! اسلام کی مسخ شدہ تصویر کے بقیۃ الموت سب خط و خال علمِ جدید کی عاریتی اور خانہ سوز شعاع کے بالمقابل برف بن بن کر گھل رہے ہیں۔ مغرب کی شانِ مکر و تمکنت آج مشرق کی ہر خوبی کے متعلق اپنے معنی خیز استخفاف اور عیارانہ سکوت سے ہی سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں پر مصالحانہ استیلا کرکے اُن کو اپنے دین سے، اپنی روایات سے، اپنے اعمال سے، اپنے ابطال اور اعاظم الرجال سے، اپنے خدا سے قطعاً شرما رہی ہے! مرو تو در کنار، اسلام کی محفوظ اور محافظ مردِ صنفِ لطیف، یورپ کی آغوشِ لطف و مرحبا میں اِس حیا سوز

لہ اِسمیں شک نہیں کہ یہ نماز ماسوا اُن لوگوں کے جنکا سب بیم و امید ہمارے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے باقی لوگوں کے نزدیک بیگار ہو بیگار ہے۔

سرعت سے ہمکنار ہو رہی ہے کہ ہر صاحب نظر کی نگاہیں زمین میں گڑی جا رہی ہیں! ناانجام شناس مسلمان نشو و تبلیغ کے ان مقلب القلوب مرکزوں میں ایک ناقص اور سطحی، نظری اور بیکار کُن علم کی پتلی سی تہ چڑھا کر تعلیم کے خوشنما تبر سے اپنی ہی جسڑ کاٹ رہا ہے۔ اُدھر علمائے دین کی ماتم انگیز کم علمی، علم و شہادت کے اِس عہد حکومت میں اسلام کی ایک قطعاً ناقابل تسلیم اور مضحکہ خیز تصویر پیش کرنے میں بڑھ بڑھ کر قدم مار رہی ہے۔ الغرض دنیائے اسلام کے اکثر اہم حصّوں میں خدائے زمین و آسمان کے اِس لشکر انگیز اور جہاں کشا دین کا ہر باقی ماندہ اصول مغرب کے ائمۃ المکر کی ہُشیار فریب چالبازیوں، اور مشرق کے اجلۃ الجہل کی ناروا ضد کے باعث عجب ہنسی مخول بن رہا ہے!

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخَذُوهَا هُزُوًا وَلَعِبًا ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ۝ (۵: ۵۷-۵۸)

---

* اِن احکام الٰہی میں اُن اعدائے اسلام کے ساتھ جو ہنسا سکے دین کا تمسخر اُڑاتے ہیں، جو اُن کی تخفیف و توہین کر کے مسلمانوں کو اس سے بیزار کرنے کی سعی کریں، کسی قسم کی دوستی اور موالات نہ رکھنے کو اتقائے الٰہی اور ایمان پر محمول کیا گیا ہے، اور صاف لفظوں میں بیان فرمایا ہے کہ ایسا کرنا ایمان کا جزو لاینفک ہے۔ گویا جو شخص یا جماعت اُن سے موالات اختیار کرتی ہے اسکے ایمان میں خلل ہے، اور اُسکے مومن ہونے کا دعویٰ محض باطل ہے (اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ)۔ جو جماعت اِس صورت حال کو دیکھکر بھی ایسی جماعت سے مفر کا ر رکھتی ہے، جو اس کے ساتھ تجارتی کاروبار یا معاذانہ تعامل، مراسم حُب یا تعاون برقرار رکھنا کچھ عیب نہیں سمجھتی وہ لامحالہ شدید العقاب خدا کی ہولناک سزاؤں کا کچھ خوف دل میں نہیں کرتی، اُسکو اُس اجتماعی ضعف و شکست کا کچھ باک نہیں رہا جسکا ایسی حالت میں اُمت پر خدا کے ہاں سے نازل ہونا قطعی ہے، اور اسی لیے یا اگر وہ کچھ متقی بلکہ کچھ مومن نہیں۔ جو قوم اَعْقِلُوْنَ کے نصب العین سے پرے ہٹ رہی ہے، جسکے اعمال اُمت کی اجتماعی قوت کو ضعف پہنچا رہے ہیں اُس کا ایماندار رہنا از روئے قرآن بہت مشکوک ہے۔ مسلمانوں نے آج موالات کے معانی میں بھی عافیت وہ تاویلیں پیدا کر لی ہیں حالانکہ آیۂ (۵: ۵۷) سے صاف ظاہر ہے کہ اس ترک دوستی سے غرض دشمن قوم کی مُضر تلقین و تعلیم کے اثرات سے محفوظ رہنا اور ضمناً اُن کو اس ترک دوستی کے باعث انتہائی مالی اور اقتصادی نقصان پہنچا کر اپنی قوت کو محفوظ رکھنا ہی ہے۔ حفظ نفس کا یہ اصل اصول قرآن حکیم کے ہر ورق پر لکھا ہے۔ یہی اسلام کی اصلی تعلیم ہے، یہی ایمان و تقویٰ ہے اپنی انتہائی حفاظت کرنا اور دشمن کو انتہائی ضرر پہنچانا، اس دنیا کو خوش اسلوبی سے نباہنے کا وہ صراط مستقیم ہے جو جریدۂ کائنات کے ہر شعبہ پر جلی حروف میں لکھا ہے۔ ادنےٰ مخلوق سے لیکر اعلےٰ مخلوق تک سب اسی پر عمل پیرا ہیں، قانون فطرت کا لب لباب یہی ہے، یہی فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ہے، یہی دین اسلام ہے اور یہی دفاعی حکمت حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة کے قیام میں مضمر ہے! مگر اس موضوع پر مبسوط بحث کسی آیندہ صحبت میں کیجائے گی۔

اے ایمان کے دعوے دارو! اُن اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) میں سے، جن کو تم سے پہلے کتاب الٰہی دی جا چکی ہے، جن لوگوں نے تمہارے دین اسلام کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے، نیز اُن لوگوں کو جو خدا کے سرے سے منکر ہیں، اپنا دوست نہ بناؤ، اور اگر تم سچے ایمان والے ہو تو خوف خدا کر کے اُن سے الگ تھلگ رہو، اور اُن سے میل ملاپ پیدا کر کے خودکشی نہ کرو! اور یہ بالتخصیص وہ قومیں ہیں کہ جب تم لوگوں کو نماز کی طرف بلاتے ہو تو یہ لوگ اُسکو ہنسی اور مخول بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے، اور یہ اس لئے کہ ان نا سمجھوں اور بے وقوفوں کو نماز کی عظیم الشان اہمیت کا کچھ اندازہ ہی نہیں، (یا محض تجاہل عارفانہ کر کے تمہارے دلوں میں اسکی اہمیت کو کم کرنا چاہتے ہیں)۔

خود مساجدِ خدا کی معنوی حالت اس ملحدانہ لاابالیت سے کہیں ابتر ہے! اُن کے صحنوں میں دردناک خموشیاں، اور حجروں میں ہولناک ویرانیاں ہیں۔ خدا کے نام لیواؤں کی ایک تعداد کثیر بے حسی کے موت آفریں ماحول میں خانہ نشین رہکر، اس نماز کو، نہیں اس صراطِ مستقیم کی متفقہ درخواست کو! گھروں کے اندر ہی اندر نپٹا لیتی ہے، لیکن رب زمین و آسمان کیلئے دس قدم چلنا گوارا نہیں کرتی! سینوں کی کپٹ اور دلوں کی سیاہی کا یہ حال ہے کہ مساجد میں حاضر ہونے کے باوجود، نماز کی جماعتی حیثیت حتماً اور معناً نابود ہو گئی ہے، وہ مسجدیں اور الٰہی دربارگاہیں جو کسی زمانے میں مسلمانوں کے سیاسی اجتماع اور دینی مواخات کی پنجوقتہ انجمنیں ہوا کرتی تھیں، جن میں اسلامی بہبودی کے ہر ممکن موضوع پر بے تکلف مباحثے، اور دشمن سے عہدہ برآ ہونیکے بے خوف و خطر منصوبے سوچے جاتے تھے، وہ اعلانِ خدا کے نقارخانے آج باہمی رنج و حسد کے باعث خموشوں کے مقبرے بن گئے ہیں! ہر مسجد دوسری مسجد کے مقابل صف آرا، اور ہر دل دوسرے دل سے جُدا ہے! فرعی اختلافات ہیں، عقائد کی ہولناک تفریق ہے، الفاظ اور لغات پر فرقہ بندیاں ہیں، پیش امام کا جہل محیط ہے، بیحسی کی بیکاری اور نامرادی کا جمود ہے! پھر پریشانیٔ دل اور فکر معاش ہیں چندپے درپے سجدے ہیں، برسوں کی بھولی ہوئی باتوں کی یاد دہانیاں وسط نماز میں ہیں، پھر منافقت کے رسمی علیک سلیک، یا دو ایک سطحی مصافحے ہیں، پھر خانۂ خدا سے نکلکر ان سجدوں کی رعونت، اور اس عبادت کا

غرور ہے! فاحش اور منکر خیالات بیش از پیش ہیں، تمام باقی وقت استیصال حریف، تنگ دلی اور تنگ ظرفی، ایذائے خلق اور مدِّ مقابل سے جھڑپ مول لینے میں صرف ہو رہا ہے گویا فلاح و نجات کا منشورِ ایزدی خانۂ خدا کی دہلیز پر مل چکا ہے!

زبادہ ہائے صبوحی بدامنِ عصمت
چہ داغ شرم کہ نہادہ ۔ صنع از تو!

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝
وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝† (۱۰۷: ۴-۷)

تو اے لوگو! حیف ہو اُن نمازگذاروں پر جو اپنی نماز کی اصلی غرض و غایت کو فراموش کر چکے ہیں، اور یہ وہ لوگ ہیں جو محض دکھلاوے کیلئے نمازیں پڑھتے ہیں اور باہمی مصالحت اور اتحاد و رافت اور رحمت کے سبق کو پیش نظر نہیں رکھتے۔ انکی باہمی کاوشیں اسقدر بڑھ گئی ہیں، اور دل ایسے تنگ ہو گئے ہیں کہ محبت تو در کنار، وہ ایک دوسرے کو روز مرہ کے برتنے کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے مدد کرنا بھی گوارا نہیں کرتے!

---

† آیۂ (۱۰۷: ۴-۵) سے ظاہر ہے کہ نماز کے ارکان ادا کر دینا اور اسکی غرض و غایت یعنی سماحت اور مصالحت بین الناس کو فراموش کر دینا وہ عمل ہے جس کی خدا کے نزدیک کچھ وقعت نہیں، ایسی نماز محض ہو کا اور دکھلاوا ہے۔ ورنہ الصَّلٰوۃ وہ نیتوں کو نیک، ارادوں کو بلند اور وصلوں کو فراخ کر دینے والی شئے ہے کہ اُسکے ذریعے انسان دوسرے انسان کے لیے ہر ممکن ایثار کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ ایسا تھڑدلا اور کم حوصلہ ہو جائے کہ ادنیٰ سی سماحت (مثلاً ایک دوسرے کو روز کی برتنے والی اشیاء سے مدد دینا) بھی روا نہ رکھے۔ الصَّلٰوۃ کی اس صلاحیت و استعداد کا ذکر سورۃ المعارج میں بھی ہے؛

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ؕ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ؕ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ؕ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ؕ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ؕ (۷۰: ۱۹-۲۳)

(یعنی) اس میں شک نہیں کہ آدمی بڑا ہی کم حوصلہ اور تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے۔ اگر اسکو کسی طرح کا نقصان پہنچتا ہے تو ہائے واے کرنے لگتا ہے اور اگر ذرا سا فائدہ پہنچ جاتا ہے تو پہلے درجہ کا بخیل اور خسیس بن جاتا ہے۔ البتہ وہ الصَّلٰوۃ کو قائم رکھنے والے لوگ جن کا پیش نہاد اپنی فراخ حوصلگی سے دلوں کو موہ لینا ہے اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں اور یہ لوگ ہیں جو دم بھر کے لیے الصَّلٰوۃ کے پیش نہاد کو نظر انداز نہیں کرتے۔ (الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ کے) الصَّلٰوۃ پر مداومت کرنیکے یہی معنی ہیں کہ ایک لمحے کے لیے بھی اسکی اصلی حکمت کو بھولا نہ جائے، ہر دم نماز پڑھتے رہنا نہ ہو سکتا ہے اور نہ مقصود ہی ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس زیر بحث آیات (۱۰۷: ۴-۷) میں الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ سے مراد نماز کے مضمون کو بُھلا دینا یا اُسکے ادا کرنے میں غفلت کرنا نہیں بلکہ نماز کی اصلی غرض و منتہا کو بھول جانا مراد ہے۔ دونوں جگہ لِّلْمُصَلِّينَ کا ذکر ہے بے نمازوں سے بحث نہیں اور اسی لیے آیۂ (۱۰۷: ۶) میں يُرَاءُونَ کہا ہے یعنی نمازیں تو پڑھتے ہیں مگر محض دکھلاوے کی۔ شارحین قرآن نے ان معنی خیز آیات کا نہایت لغو ترجمہ کر دیا ہے اور اصلیت سے دور جا پڑے ہیں۔

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ ✝ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ
يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ مُذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذَٰلِكَ لَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ
وَلَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ ۚ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ۝ (۴: ۱۴۲-۱۴۳)

اسلامی جماعت میں نفاق ڈالنے والے اور فرقہ بند لوگ تو گویا اپنی ظاہر داری سے خدا کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں خدا ہی اُن کی بداعمالیوں کو انکی نظروں میں اچھا دکھا دکھلا کر انکو دھوکا دے رہا ہے۔ انکی نشانی یہ ہے کہ جب نماز کے لیئے کھڑے ہوتے ہیں تو بیدلی سے اور الکسائے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں محض دکھلاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں اور نہ خدا کا احساس اُن کے دلمیں فی الحقیقت بہت ہی کم ہے۔ انہیں خدا کا یقین تو ہے نہیں، کفر اور ایمان کے بین بین کھڑ مذبذب رہتے ہیں۔ نہ پورے اِدھر کے نہ اُدھر کے۔ سو جن کو خدا گمراہ کر دے انہیں کوئی مستقل طریق عمل کبھی نہیں ملتا۔

جب اسلام کے اِس بہترین شعار، اور قیام جماعت کے اِس بہترین چارۂ کار کے متعلق مسلمانوں کی کارفرمائی کے یہ عنوان ہوں، افراد میں یہ تفریق وانتشار، اور اتحاد میں یہ سطحیت اور نمائش ہو، یہ بے توجہی اور خدائے ذوالجلال کی جناب میں بنجو قتہ یہ صریح گستاخی ہو، بندگانِ خدا میں کفر و الحاد کی یلغار اور خودداری کی یہ وضع بن گئی ہو، اللہ کے آگے ماتھا رگڑنا یہ باعث ننگ و عار، اور بے سوچ سجدوں میں کبر و ادعا کی یہ شان ہو، جب نصب العین مفقود، اور مدعائے سوال کالعدم ہو، نہیں، جب مسائل کو

✝ یہاں پر الصلوٰۃ کا پیش نہاد وہی اتحاد اور اصلاح بین الناس ظاہر کیا ہے۔ نفاق پیدا کرنے والے لوگوں کی بابت کہا ہے کہ نماز میں الکسائے ہوئے شامل ہوتے ہیں اسلیئے کہ الصلوٰۃ کا مطمح نظر اتحاد ہے اور یہ لوگ تفریق پیدا کرنیکے درپے ہیں، بدیں وجہ نماز اُن کو کچھ بھلی نہیں لگتی۔ اُن کی نمازیں بھی اسی لیئے محض دکھلاوے کی ہیں۔ یعنی غرض لوگوں کو دھوکا دینا ہے۔ یُرَاءُونَ کا لفظ یہاں آیا ہے۔ اور صاف ظاہر ہے کہ اس سے مراد یہاں وہی دکھلاوے کی نماز پڑھنا مراد ہو جیسا کہ پیشتر کی آیت (۶:۱۰۷) میں ذکر کیا تھا۔ عبرت کا مقام ہے کہ آج عالم اسلام میں کتنے لوگ ہیں جو نماز میں الکسائے ہوئے شامل ہوتے ہیں، اور اندروئے قرآن وہ کس گروہ میں شامل ہیں جن کی بابت اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے، إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۴:۱۴۵) یعنی جماعت میں نفاق پیدا کرنے والے لوگ جہنم کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔ فاعتبروا۔

ضمناً یہاں اس بات کا فیصلہ بھی ہو گیا کہ منافقوں کی سی نماز پڑھنا اگر خدا تعالیٰ نہیں ہے اور لَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا (۴:۱۴۲) میں بھی ذکر سے مراد تسبیح چلانا بھی نہیں بلکہ وہی خدا کا کشادہ دل میں لگائے رکھنا ذکر ہے۔

سوال کی خبر اور منعم سے سوال کا خ بھی نہو، جب اعمال قطعاً نابود، انعام کا حس زائل، اور سعی سے استغناء گریز ہو تو پھر خدا سے کیا شکایت ہو کہ یہ کیسی ہے اور صدیوں کی خواب آفریں مہلت، اور شوکت و حشم کے بعد یہ ناگہاں عذاب کیا ہے!

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۶: ۴۴-۴۵)

پھر جب یہ اُمت رفتہ رفتہ اُس تمام دستور العمل کو بھول گئی جو ہم نے انکو کبھی اچھی طرح یاد دلایا تھا۔ تو ہم نے بھی اُنکو اور مغالطے میں ڈالنے کی غرض سے اُنپر تمام دنیاوی نعمتوں کے دروازے چوپٹ کھول دیئے، یہانتک کہ جب وہ اُن نعمتوں کے نشے میں اچھی طرح مست ہو گئے اور یقین کرنے لگے کہ یہی طریق عمل فرمودۂ خدا ہے، اور ہم ہی اِس دنیا کے اندر خدا کے چاہیتے ہیں، تو ہم نے یک لخت اُنکو آ دبوچا۔ اور عذاب کا آنا تھا کہ اب وہ بے آس ہیں اور ہمارے حضور میں کراہ رہے ہیں۔ پھر کیا تھا اُس ظالم قوم کی جڑ کاٹ کر رکھدی گئی اور اس پروردگار عالم کا شکر ہے کہ اِن نااہل لوگوں کا قصہ پاک ہو گیا!

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ۝ (۶۰:۴۰)

لوگو! پروردگار فرماتا ہے کہ ہمیں پکارا کرو۔ اگر ضرب دل سے ہمیں پکاروگے تو ہم تمہاری درخواستیں بھی قبول کر لیا کرینگے لیکن جن لوگوں نے اپنے آپ کو بڑا سمجھکر اور غرور کے مارے ہم سے سرتابی کی اُنکو ہم عنقریب ذلیل وخوار کر کے جہنم میں داخل کر دینگے۔

لیکن الصّلوٰۃ کی ماہیت کے متعلق جو عبرت انگیز تنبیہی حکم رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کو منافقین دین کی ریشہ دوانیوں سے آگاہ کرنے، اور مساجد کو تفریق سے باز رکھنے کی غرض سے نازل ہوا تھا بجائے خود نماز کے فلسفے کی بہترین تشریح تھا۔ مدینے سے چار میل باہر قصبۂ قبا میں بنی عمرو بن عوف کے محلے میں ایک

٭ ظلموا کے صحیح مفہوم کے متعلق ایک مبسوط حاشیہ آگے چلکر صفحہ ۲۰۵ پر آرہا ہے۔ یہاں صرف اسقدر کہنا ہے کہ فقطع دابر القوم الذین ظلموا کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ ظالم قوم کی ہلاکت قطعی ہے جیسا کہ مثلاً صفحہ ۸۱ (صدا ۲۱ اپر آچکا ہے۔

سجد تھی جسکے محل وقوع پر پیغمبرِ اسلام نے مکے سے ہجرت کے چند روز بعد تک نماز پڑھی تھی اور بعد ازاں یہ مقام تعظیماً مسجد میں تبدیل کر دیا تھا۔ محلہ والوں کی ایک شریر مسلمان نما جماعت نے اسلام میں نفاق ڈالنے کی غرض سے ایک اور جماعت اِس مسجد قبا کے بالمقابل اِس عذر پر کھڑی کی کہ بیماروں اور معذوروں کو آسانی ہو، مگر نماز اول کی امامت بطور افتتاح خود صاحبِ شریعت سے کرانی چاہی کہ ضد میں کسر باقی نہ رہے۔ اللہ کے اُس نکوکار و نکوسگال رسولؐ نے وعدہ کیا کہ جنگ تبوک سے واپسی پر اسی مسجد میں نماز پڑھ کر شہر میں داخل ہونگے، مگر وہ دانائے اسرار قلوب اور محافظِ اسلام خدا جسنے نماز کی بنیاد مومنوں کے تالیف قلوب اور حقیقی اتحاد کی اہم حکمت عملی رکھی تھی، جسنے نماز کو استحکام جماعت اور عالم آرا اخوت کا بہترین پیش خیمہ قرار دیا تھا، اِس غیر مجاز وعدے پر برہم ہو گیا، اور ارشاد ہوا کہ جس مسجد کی وجہ بنا پراگندگیٔ امت اور تفریق جماعت ہو، جو مسجد تقوے کے حقیقی منتہا اور عبودیت کے صحیح مطمح نظر کے مخالف ہو، اور اسلامی جماعت کو اشتات و انتشار کے جہنمی گڑھے کی طرف لیجاوے اسمیں تیرا ایک لمحے کے لیئے بھی کھڑا ہونا مہلک ہے!

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ
حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ
لَكٰذِبُوْنَ ۝ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ
تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ اَفَمَنْ
اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى
شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ✣
لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ
عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (۹: ۱۰۷-۱۱۰)

✣ اِن آیاتِ الٰہی سے ظاہر ہے کہ جماعت کے اندر نفاق پیدا کرنے والے اور فرقہ بند لوگ قرآن حکیم کی مطلق اصطلاح میں ظالم ہیں، اور اسلیئے آیات (۲: ۱۲۸، ۵۹) و (۶: ۱۹۴) صفحہ ۱۸ یا آیت (۲۶: ۵۲) صفحہ ۲۰۴ کے رو سے اُنکی اجتماعی ہلاکت قطعی ہے۔ ایسے لوگوں کو ظالم اِس لیئے کہا ہے کہ وہ

اے محمدؐ! تمہاری اُمت کے جن منافق مسلمانوں نے آج اِس غرض سے ایک مسجد بنا کر کھڑی کی
ہے کہ اسلام کو نقصان پہنچائیں، خدا و رسول کے منکر بنیں، مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر دیں، اور
اِن دشمنانِ اسلام کو پناہ دیں جو اِس سے پہلے خدا اور رسول سے لڑ چکے ہیں، اور اگر ان سے پوچھا
جائے تو قسمیں کھانے لگیں گے کہ ہم نے تو نیکی کے سوا اور کوئی ارادہ ہی نہیں کیا تھا، تو آج

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۵۵) تمام جماعت پر، اور پھر اسکی وساطت سے اپنے آپ پر 'ظلم' کرتے ہیں اور نا اتفاقی کے باعث سب کو شکست و ریخت کی طرف گھسیٹتے ہیں۔ لائقِ غور بات یہ ہے کہ یہاں 'ظالمین' کا اطلاق اُس جماعت پر ہوا ہے جو اپنے آپ کو رسماً مسلمان کہتی تھی گویا از روئے قرآن خود اسلام کے اندر فرقہ بندیاں پیدا کرنا بھی حتماً ممنوع ہے اور بلا لحاظ امت رسمی مسلمانوں کو نارِ جہنم کا مستوجب بنا دیتا ہے۔ جو عافیت پسند مسلمان 'کلمہ گو' مسلمانوں کو انتہائی بداعمالی کے باوجود 'نارِ جہنم' سے مستثنیٰ قرار دے کر آج مکر کی نیندیں سو رہے ہیں اُنکے لیئے یہ آیات اور بالخصوص یہ 'نَارِ جَهَنَّمَ' کے الفاظ (۹: ۱۰۹) از بس قابلِ غور ہیں۔ یہ دوسری دفعہ ہے کہ خدائے عظیم نے انسانی تفرقے کو نار سے تشبیہ دی ہے، پہلا موقع 'كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ' (۳: ۱۰۲) کے الفاظ میں صفحہ ۲۲۲ پر گذر چکا ہے گویا تفرقہ ڈالنا یا متفرق ہو جانا جہنم کے گڑھے پر کھڑے ہونے کے مترادف ہے!

'ظلم' کی جامع و مانع اصطلاح کے الٰہی مفہوم کے بارے میں ابتدائی بحثیں مختلف مواقع پر آ چکی ہیں جن کے مطالعے سے ظاہر ہے کہ از روئے قرآن میدانِ جنگ میں جم کر نہ لڑنا اور نامردی ظاہر کرنا 'ظلم' ہے (آیہ ۳: ۱۳۹) و تحت المتن صفحہ ۱۲۰ الخ) کچے ایمان والے اور بدعمل بننا ظلم ہے (آیہ ۱۴: ۲۷) و تحت المتن صفحہ ۱۴۳)، امیرِ جماعت کی نافرمانی کر کے جماعت کو شکست و ریخت کی طرف گھسیٹنا 'ظلم' ہے۔ (آیہ ۸: ۲۵) صفحہ ۱۷۱، تحت المتن صفحہ ۱۷۲ و آیت (۱۴: ۴۶) تحت المتن صفحہ ۲۴۴)، جماعت کے اندر تفریق و انتشار پیدا کرنا 'ظلم' ہے (آیت زیرِ بحث یعنی ۹: ۱۰۹) جو قوم اِن اجتماعی جرائم کی مرتکب ہے اُسکی ہلاکت کا ایک نہ ایک دن واقع ہونا قطعی ہے۔ اور اسی بنا پر 'هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ' (۶: ۴۷) کا حکم قرآن میں بالالتزام موجود ہے۔ 'ظلم' کے الٰہی مقصود کی باقی شقیں بھی اپنے اپنے موقع پر آتی رہیں گی۔ لیکن اتقا بمعنی اتحاد کے بالمقابل 'ظلم' بمعنی تفرقہ انگیزی اس استقلال کے ساتھ قرآن حکیم میں مستعمل ہوا ہے کہ اسکی کئی مثالیں آگے چل کر اس کتاب میں پیش ہونگی۔ یہاں پر گذشتہ حوالہ جات کو اسلیئے یکجا کر دیا ہے کہ آگے چل کر صفحہ ۲۰۹ پر ایک اہم آیت (۲: ۱۲۴) امامت کے منصب کے متعلق آ رہی ہے اور اُس میں 'الظّٰلِمِيْنَ' کا لفظ واقع ہوا ہے چنانچہ اس تصریح سے وہاں کے مطالب صاف ہو جاتے ہیں۔

آج عالمِ اسلام کے قریب قریب ہر قریے اور قصبے میں محلوں اور کوچوں کی اکثر مسجدیں صحیح معنوں میں مساجدِ ضرار ہیں۔ وہ سب کی سب دینِ اسلام کے اندر ہولناک تفرقے ڈال رہی ہیں۔ اُمت کی اجتماعی قوتوں کو منتشر کر رہی ہیں۔ ہر پیش امام اپنی اپنی دکان سجائے سرِ بازار بیٹھا ہے حتی الامکان اپنے حلقۂ اثر کے مٹھی بھر افراد کو جمہور سے الگ رکھنے کی سعی کرنے میں منہمک ہے، جا بجا اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدا مسجد کو سراہتا ہے۔ اور اپنے ٹکڑوں اور ریزگی کو محفوظ رکھنے کی غرض سے شہر کے کسی بڑے سے بڑے پیش امام کا مقتدی اور مطیع بننا گوارا نہیں کرتا۔ رہنمایانِ امت اور پیش اماموں میں یہ اطاعت کا فقدان اور یہ عصیانِ امیر فی الحقیقت وہ ظلمِ عظیم ہے جس کا سم آلود اثر مقتدیوں کی رگ رگ میں بھی اثر کر چکا ہے۔ آج مسلمانوں کے ہر محلے میں اُمرا اور غربا کی الگ مسجدیں ہیں، ذاتوں اور پیشوں پر مسجدیں ہیں، اماموں اور پیروں پر مسجدیں ہیں، حدیث اور قرآن پر مسجدیں ہیں، آمین اور غیر آمین پر مسجدیں ہیں۔ الغرض ہر طرف ضرار ہے، تفریق بین المسلمین ہے، کفر ہے، خدا سے محاربہ ہے، رسولؐ سے لڑائی ہے، 'اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ' دشمن خدا کی حمایت ہے ہاں لیکن جب اُمت کے دشمن خدا اور رسول بن چکے ہوں اسکی موت کا پیغام جلد سے جلد نہ آنے کو ہو تو کیونکر ہو!

میرے نزدیک اگر آج اِن مساجدِ ضرار کا کوئی علاج ہے، اگر ان مارہائے آستین کے مہلک اور سم آلود اثر کا کوئی حکمی تریاق ہے، اگر امت کی اس دردناک پراگندگی اور ریزش کو اتحاد میں پھر بدلنے کی فی الحقیقت کوئی سبیل باقی رہ گئی ہے، نہیں اگر اُس شدید العقاب خدا کے زمیں بر انداز ملائکہ زمینِ خدا پر

اس بات کا خدا گواہ ہے کہ یہ جھوٹے ہیں! تم اس مسجد میں ہرگز کبھی نماز نہ پڑھانا بلکہ کھڑے بھی نہ ہونا۔ وہی مسجد جسکی بنیاد روزِ اول سے ہی ائتلافِ اُمت اور خوفِ خدا (تقویٰ) کو پیشِ نظر رکھکر ڈالی گئی تھی اسکی اہل ہے کہ تم اُسمیں امامت کیا کرو۔ اسی مسجد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو طہارتِ نفس کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ تو حقیقت میں دل صاف رکھنے والے لوگوں کو پیار کرتا ہے۔ بھلا جس شخص نے اپنے تمام اعمال کی بنیاد خوف احکم الحاکمین اور خوشنودی خدا پر رکھی وہ اچھا ہے یا وہ کم بخت جس نے اپنی عمارت کی بنیاد تفریق و انتشار کے ایک کھوکھلے گڑھے کے کنارے پر رکھ دی؟ اور جو بعد میں اُسکو جہنم کی آگ میں لے گری۔ اور اللہ تو تفریق پیدا کرنے والی ظالم قوم کو کسی مستقل طریقِ عمل کیطرف ہرگز راہنمائی نہیں کرتا۔ یہ مسجد جو اِن لوگوں نے تفرقہ آرائی کی غرض سے تیار کی تھی اب مومنوں کی بجائے خود اِنہی کے دلوں میں چور پیدا کردیگی۔ یہاں تک کہ اِن سب کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے۔ اور ایک ایک کا دشمن بنجائے گا، اور اللہ تو بڑا واقف حال اور صاحب حکمت ہے۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۵۶) اُترنے سے روکنے کا کوئی مؤثر ذریعہ رہ گیا ہے تو وہی جو خود فخرِ رسل اور سیدِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی عینِ حیات میں تجویز کیا تھا اور وہ یہ کہ ایسی سب مساجد کو بالا تفاق آتشین اصطباغ دے کر اُمت کو نفاق کی شیطانی آلائش سے ایک دفعہ پھر پاک صاف کردیا جائے، اور فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُوا ۚ (۹: ۱۰۸) کا مصداق بن کر از سرِ نو وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ ۝ (۹: ۱۰۸) کا انعام حاصل کیا جائے۔ اگر نہیں تو اُمت کے منافقوں کو نَارِ جَهَنَّمَ ۚ کا اصطباغ تو لگے چلکر ملنا ہی ہے۔

لیکن بڑی بات جو متذکرہ صدر آیات ضرار (۹: ۱۰۷-۱۱۰) اور بالخصوص آیہ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ ۚ (۹: ۱۰۸) سے مستنبط ہوتی ہے یہ ہے کہ اندروئے اسلام خدائے عظیم کے نزدیک سچی طہارت دلوں کے تفریق و نفاق سے پاک صاف ہونیکی طہارت ہی ہے، اور یہی اُسکے ہاں محبوب بھی ہے۔ بدنی صفائی کا ذکر اِن آیات میں حتیٰ نہیں آیا۔ تمام بحث صرف تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ کے متعلق ہورہی ہے۔ اسلئے طہارت کا الٰہی مفہوم صاف ہے۔ جن لوگوں نے وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ ۝ سے صرف طہارت بدن مقصود سمجھکر اپنی زندگیاں استنجاؤں کے درست کرنے اور ڈھیلوں کو نہایت خوش اسلوبی سے آر پار کرنے میں وقف کردی ہیں، اور ائتلاف قلوب اور اتحاد کی اہم حکمت کو غیر ضروری سمجھ لیا ہے۔ اُن کو یہ آیات بہ امعانِ نظر دیکھنی چاہئیں! اسمیں شک نہیں کہ بدنی صفائی اور بالخصوص طہارت ایک نہایت ضروری، اور نفعمند شے ہے۔ جسمانی صحت کا اکثر انحصار اسی پاکیزگی پر ہے، اور جن قوموں نے اس کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں کی وہ آج اسکے بُرے نتائج نہایت التزام سے بھگت رہی ہیں؛ بلکہ بدن صاف رکھنے والی قوموں کی عام جسمانی بہتری کو دیکھکر اُنپر رشک کھارہی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ اِن فروعات کو نفسِ اسلام سمجھکر ساری زندگی رسمی تکمیل پر صرف کردینا اور اہم اوامر کے متعلق خالی الذہن ہوکر اصلِ دین سے غافل ہوجانا بھی وہ غلو فی الدین ہے جسکا نتیجہ آج مسلمانوں کے حق میں بُرا ثابت ہورہا ہے۔ قرآن حکیم نے دن میں پانچ وقت وضو کرنے کی حکمت کو اتمامِ نعمت کہا ہے (دیکھو تحت المتن صفحہ ۲۱، آیہ (۵: ۶))۔ اور ظاہر ہو کہ پاکیزگیٔ بدن کی توفیق بھی ایک خداداد انعام ہے جو ہر قوم کو حاصل نہیں۔ قرآن کی تمام تعلیم کا نفاذ بہر نوع اور بہر حال قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ ۖ (۷: ۲۹) صفحہ ۲۰۱) اور كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ (۴: ۱۳۵) صفحہ ۲۰۲) کی عام حکمت کے ماتحت رکھا ہے۔ نیکی کسی امر دینی میں قسط و اعتدال کو ہاتھ سے چھوڑ دینا، یا اُسکی تکمیل میں حد سے متجاوز ہونا بھی فی الحقیقت اُس تعلیم کے منتہا کی تغلیط کرنا ہے۔ آج جہاں اقوامِ مغرب و دا ایشیائی نا مسلموں کو بعض مخفی اور ہولناک بیماریاں طہارت بدن کے نہ ہونیکے باعث لاحق ہورہی ہیں، ایک دانتوں میں لازماً مسواک نہ کرنے اور کھانیکے بعد کلی نہ کرنے ہی کا جرمانہ محکمۂ فطرت نے یوں وصول کرلیا ہو کہ

عــــہ اتمامِ نعمت؛ سوچئے کہ کہاں امت عظیم الشان احکام دینے کا کیا نتیجہ نہایت عزیز اللہ [illegible]

جب تبوک سے واپس پھرے تو سرور کائنات ؐ نے مالکؓ اور معنؓ بن عدی کو حکم دیا کہ جاکر اس مسجد میں آگ لگادیں!

امامت جس کا جلیل القدر اور عالم انگیز منصب کسی زمانے میں نبوت کا شائبہ خاص الخاص ہوا کرتا تھا جسکو اس زمین پر خوش اسلوبی سے نباہنے کیلئے آسمان سے تقرری ہوتی تھی! جسکا منتہائے زحید خلق خدا کو اس دنیا میں اسلام کے بال سے باریک اور تلوار سے سوا تیز صراط مستقیم پر بحفظ تمام چلائے رکھنا تھا، جسکے حاصل کرنے کی شرط فرید امتحان خدا میں کامیابی تھی! جس مسند اعلیٰ پر ابراہیم ایسا صاحب الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ (۳۸: ۴۵) نبی مدۃ العمر سعی و عمل اور روح فرسا بصیرت کے بعد متمکن ہوا تھا، جس مقام منیع کو وہؑ اور بے زور عمل یا لیبنا رب امتحان طلب کو اپنے دوستؑ کی اولاد کے لیئے گوارا نہ تھا!

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۝ (۲: ۱۲۴)-

اور اے ساکنان زمین! کیا تم کو وہ لشکر انگیز زمانہ یاد ہے جب خلاق زمین و آسمان اور صناع کون و مکان تعالیٰ نے بعض مہمات امور میں ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا، اور اس آزمائش کو پیش نظر رکھکر انکو سخت ابتلا میں ڈالا، لیکن اُس جلیل القدر نبی کے عزم صمیم نے اُن سب امور کو بوجہ احسن پورا کر دکھایا۔ تو رب ذوالجلال نے خوش ہو کر اپنی جناب سے حکم دیا کہ اے ابراہیم! میرے ان تمہارے سعی و عمل کو دیکھکر فیصلہ ہو چکا ہے کہ میں تم کو ساکنان زمین کا امام اور پیشوا بناؤں، (تم کو یہ منصب مبارک ہو اور تم اس پر تا ابد مدید تک فائز رہو) ابراہیم نے فرط انبساط کے اضطراب میں عرض کیا کہ اے حضور! یہ منصب بدستور میری اولاد میں بھی جاری رہیگا؟ خدا نے امتحان طلب نے فرمایا کہ ہمارے اس اقرار میں وہ حصہ دار نہ ہونگے جو ہماری اصطلاح میں ظالم نہیں گے۔

(تتمہ تحت المتن صفحہ ۲۵۷) تمام مغرب کے دانت ہمیشہ کیلئے بگڑ گئے ہیں، وہاں سلمانوں کے احکام طہارت میں توغل کا اکثر یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ہر شخص فقہ کے چند مسئلے مسائل پر عمل کر کے اپنے آپ کو پکا مسلمان سمجھ لیتا ہے اور اصل دین سے قطعاً غافل ہو گیا ہے۔ امام مسجد کے نزدیک آج مسلمانی یہی وضو کو نہایت صحت سے کر لینا، پانی کو بغلوں کی جڑوں تک پونہچانا، ضروری بالوں کو دور کرنا، اور استنجاؤں کی نہایت بداہت اور بیحیائی سے تکمیل کرنیکا نام رہگیا ہے، اسلام کی روح انکی تعلیم سے اصلاً نکل چکی ہے۔

† سورہ ص کی آیہ وَاذْكُرْ عِبَادَنَا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ (۳۸: ۴۵) کیطرف اشارہ ہے۔ یعنی اے محمد! ہمارے بندوں ابراہیم اسحق اور یعقوب کے ذکر اذکار کیا کرو کہ یہ لوگ فی الحقیقت بڑے صاحب دست قدرت (اولی الایدی)، بڑے اولوالعزم صاحب علم و فضل بصیرت (ذا الابصار) تھے اگویا کہ بیمثال علم و عمل کی وجہ سے انکو یہ لقب ملا۔

‡ جس حیرت انگیز عقلی نادانی اور طاغوتی تجاہل سے شارحین قرآن نے آسمانی وحی کے ان الفاظ کا مفہوم بیان کیا ہے، جو حیا سوز اور شرم پامال تشریح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے منصب امامت پر مقرر ہونے کی بیان کی ہیں، جس درد انگیز بے رحمی سے اُنہوں نے فاطر زمین و آسمان کی نسل انسانی کی طرف

ہاں جس عہد جلیل پر صدیوں کے عزل و التوا کے بعد عرب کا اولوالعزم نبی اور آلِ ابراہیم کا بہترین رکن فائز المرام ہو کر ختم رسالت کی مُہر ابد الآباد تک ثبت کر گیا جس اوج مرتبت اور معراج اتم کا اہل نبوت کے بعد فاروق اعظم جیسا عدیم المثال شخص قرار پایا تھا، جو مقام بلند کسی زمانے میں مجاہدین اسلام اور سپاہیانِ خدا کے لیے مختص ہو چکا تھا، آہ! اُس امانت عظمیٰ اور اُس موہبت کبریٰ کو آج اُمّت کے گدیہ گر سنبھال رہے ہیں؛ اجل زدہ قوم کا سب سے ناکارہ، سب سے بزدل، کم حیثیت اور کم علم، فرقہ بند اور محتاج تر ظالم، اِس عہدے پر فائز القنوط ہے۔ عجز و مسکنت کا ماحول پیدا کر رہا ہے، جہل و جمود کا اشتہار دے رہا ہے، تفریق و انتشار کو ثواب سمجھ رہا ہے، شدید العقاب خدا کی سزا کو جزا کہہ رہا ہے، عذاب کو انعام بتا رہا ہے، اور کذب و غلط کی بیجا منادی کر کے اُمّت کو ہلاکت کے قعرِ عمیق کی طرف گھسیٹ رہا ہے؛ اُمّت مرحومہ کا فقدان فہم و عقل اِس غلط انتخاب کے بارے میں آج اِس اوج کمال تک پہنچ چکا ہے کہ جہاں کسی ادنیٰ سی ادنیٰ دنیاوی حکومت سے تعبد کا اظہار حاکمِ وقت کے بڑے منظور نظر اُس کے بڑے سے بڑے کارندے، اُس کے بااثر کارکن، اُسکے مشہور تر جاں باز اور سرفروش کی سیادت میں کرتے ہیں؛

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۵۸) اِس آخری مکتوب، اِس ذِکرٌ لِّلعٰلَمِین کی مٹی پلید کی ہے، اسکو دیکھکر اگر آسمان و زمین کپکپا اُٹھیں تو کچھ عجب نہیں؛ رسولِ خدا کی اِس نام لیوا اُمّت پر آسمان ٹوٹ پڑے تو کچھ دور نہیں! شارحین کا ایک بڑا گروہ ابتلیٰ ابراہیم ربّہٗ بکلمٰت کی تشریح میں اپنی حیاسوز جہالت اور مُلّائی تکبّر کے باعث اِس طرف گیا ہے کہ حضرت اپنے بدن کو خاص احتیاط سے پاک صاف رکھا کرتے تھے، زیرناف کے بال نہایت صفائی سے دور کرتے تھے، وضو کے سب ارکان خوش اسلوبی سے ادا کرتے تھے، داڑھی کو شریعت ابراہیمی کے مطابق کترواتے تھے، مونچھوں کو بڑھا کر نہ رکھتے تھے، ناخن ترشواتے تھے، ختنہ اُنہوں نے کرا رکھا تھا، پانی سے استنجا کرنا اُن کا شیوہ خاص تھا، اِن امور مہمّہ کے علاوہ حضرت کو توحید کے کلمے اور عقائد ابراہیمی خوب نوکِ زبان تھے، وغیرہ وغیرہ۔ ابراہیم علیہ السلام نے اُن احکام کی تعمیل ایسی عمدگی سے کی، بدن کو زائد بالوں سے اِس خوش اسلوبی اور حکمت سے صاف رکھا داڑھی ایسی خوب صورت اور متشرّع بڑھائی، اسکی پرورش اور اُسکی بچگی میں اِسطرح دن رات مشغول رہے کہ خدا نے رضامند ہو کر اُن کو لوگوں کا امام بنا دیا!! اِس منصب اعلیٰ کو خوش بجوش منظور کرتے ہوئے حضرت نے بتقاضائے جبلّت چاہا کہ ان کی نسل بھی اِس انعام سے محروم نہ رہے۔ خدا نے (ایک تفسیر کے مطابق ہی) اِس رعایت کو بھی منظور فرمایا لیکن صرف ظالموں کو مستثنیٰ کر دیا! چنانچہ اُسوقت سے آجتک امامت کی یہ شرطیں برابر چلی آرہی ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کی (ایک تفسیر کے مطابق ہی) قدیت ہر مسجد کے حجروں میں موجود ہے۔ اگر مالکِ زمین و آسمان کے اوصاف میں حلم و درگذر کا ناپیدا کنار عنصر شامل نہ ہوتا تو صرف اِس آیت الٰہی کی تشریح شارحین قرآن کی سطح زمین پر سے بیخ و بنیاد اُکھیڑ دینے کیلئے کافی تھی لیکن یہ اسکی شان حلیمی کا ایک منظر ہی ہے جو اسکے باوجود فوری گرفت نہیں ہوتی اور ہر شخص جو چاہتا ہے اُسکی شان میں بے خوف و خطر بکے دیتا ہے۔ یہاں نیز ابتلیٰ کے لفظ سے صاف ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا آسمانی امتحان کوئی بڑی سے بڑی اور کڑی سے کڑی آزمایش ہوگی، کوئی صبر آزما اور تاب گسل تکلیف ہوگی، وہ آزمایش بھی لا محالہ اِس قطع کی ہوگی کہ اُسمیں پورا اُترنا (فَاَتَمَّهُنَّ) انکو خلق خدا کی پیشوائی اور رہبری کا اہل بناتا ہوگا، پس جب وہ ایک طولانی طویل اور صبر گداز سعی و عمل کے بعد قوم کو شرک کے ظلم عظیم سے نجات دلا چکے، جب قوم غفلت اور نا انجام شناسی کی

اُسی کو سرخیل اور رئیس وفد بنا کر اپنی معروضات پیش کرتے ہیں، اُسیکو پیش پیش رکھکر اپنی لرزش انگیز اور دل آسا نیاز مندیوں کا اظہار کرتے ہیں، وہاں حاکمِ زمین و آسمان کی اِس زبانی اور سطحی، دودلی اور مشرکانہ عبادت کو ٹرخانے کی غرض سے اپنی نگاہوں میں سب سے کم مایہ اور بینوا، محتاج اور ذلیل شخص کو اکرمُٰ اور اَتقیٰ فرض کرکے اُسکی پنجوقتہ پیشی اور عرض گذاری کے لیے منتخب کر رہے ہیں! ہاں لیکن جس قوم کا نصب العین جہانبانی اور خداوندی، قوت اور عزت سے ہٹ کر گداگری اور غلامی محکومیت اور خوشامد تعبد ماسوا اور تملق غیر کی طرف منتقل ہوگیا ہو۔ اُس کے مرشد و رہبر بالآخر یہی بھک منگے نہ بن جائیں تو اور کیا ہو!

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝ (۱۶۲:۷)

تو لوگو! اِس اُمت میں سے ناحقیقت شناس اور اپنے اوپر ظلم کرنیوالے گروہ نے خوشحالی اور امن کے اِس سرِّ عظیم کو جو اُنکو سکھا دیا گیا تھا بدلکر کچھ اور ہی رویہ اختیار کر لیا، اور اُس تعلیم کو یکسر فراموش کر دیا تو ہم نے بھی اُنکے اِس ظلم عظیم کی پاداش میں آسمان سے بلا اُتاری اور اُنکی سب عظمت خاک میں ملا دی۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۵۹) ظلمتوں سے نکلکر علم و عمل کے نور کیطرف آنکلی اور اُنکے رہنما نے بھی قوم کی ایذا رسانیوں کو صبر و تحمل سے برداشت کیا، دشمن سے پیہم جہاد بالسیف کیئے، جان کھینچ کھینچکر حلق تک پہنچی مگر سعی و عمل کو نہ چھوڑا تو خدا نے بھی انکو اپنی قوم کی پیشوائی اور امامت کا منصب عطا فرمایا، بادشاہت زمین دی، نبوت سے سرفراز کیا۔ اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ (۳۸: ۴۵) صفحہ ۲۰۰ کے الفاظ سے یاد فرمایا غرض ابراہیم علیہ السلام نے امامت کی اِس موہبت عظمیٰ کو پاکر طبعاً یہ چاہا کہ پیشوائیِ خلق کا یہ منصب اعلیٰ اُنکی اولاد میں بھی برقرار رہے لیکن خدا نے ظالم قوم کو اِس منصب سے ہمیشہ کیلئے محروم کر دیا۔ ظلم کی بعض اہم شقوں کی تشریح کافی طور پر صفحہ ۲۵۵ و ۲۵۶ کے تحت المتن میں گذر چکی ہے جس سے ظاہر ہے کہ خدائے عزّ و جل نے فرمایا کہ اے ابراہیمؑ! تم بلاشبہ اِس منصب کے اہل ثابت ہوئے ہو لیکن میدان جنگ میں جم کر نہ لڑنے والے اور نامردی ظاہر کرنیوالے ظالم، کچے ایمان والے اور بزدل بنے رہنے والے ظالم، امیر جماعت کی نافرمانی کرکے جماعت کو شکست و ریخت کی طرف گھسیٹنے والے ظالم، جماعت کے اندر تفریق پیدا کرنے والے ظالم وغیرہ وغیرہ۔ اِس عہد خداوندی اور امامت کو ہرگز نہ پا سکینگے۔ بادشاہت کا منصب مجھ سے وہی قوم لیتی ہے جسمیں یہ خامیتیں نہ ہوں اور ظلم کار قوم کی ہلاکت تو ایک طے شدہ امر ہے! (دیکھو صفحہ ۲۰۶ تحت المتن)۔

صدر اسلام میں مسجدوں کے اندر امامت کا منصب بھی اسی ابراہیمی امامت کی تجدید کا ایک مظہر تھا، قرن اول کے مسلمانوں کی فدائی فوج دن میں پانچوقت کسی جلیل القدر مجاہد کی پیشوائی اور امامت میں سپہ سالار اعظم کے روبرو پیش ہوتی، اُسکے آستانۂ علیہ پر حاضر ہوکر اطاعت کے ولولے میں جُھک جُھک پڑتی، بہتر سے بہتر شخص اِس امامت کیلئے منتخب ہوتا، مسجد نبوی کے اندر رسول خدا صلعم اپنی حین حیات میں اِس منصب کے فرائض خود ادا کرتے رہے، باقی مسجدوں کی امامت کیلئے اکثر وہی صحابہ کرام ہے جنکا علم و عمل بیمثال ہوتا تھا، وفات سے کچھ مدت پہلے رسولِ خدا صلعم کا حضرت ابوبکرؓ کو امامت نماز کیلئے مقرر کرنا بھی عوام کی نظروں میں اُنکے بعد اُنکے جانشین بننے کا ایما سمجھا گیا تھا۔ الغرض اُن قرنوں میں بادشاہت، خلافت اور امامت ایک شئے تھی، خلیفۂ وقت خود امام اعظم ہوتا تھا، اُسکے مقرر کیئے ہوئے امام صحیح معنوں میں اولوالامر تھے نہیں بلکہ جو شخص اولوالامر مقرر ہوتا تھا اُسپر امامت کا فرض بھی ادا کرنا ضروری تھا۔ بادشاہان سلف نے صرف ایک حد تک اِس اہم رواج کی متابعت کی لیکن رفتہ رفتہ امامت کی

آج شدید العقاب خدا کی یہی آسمانی رجز مسلمانانِ جہان کو سانپ بن بن کر ڈس رہی ہے، خدا کے ناقابل بدل قول کو بدل دینے اور مشکل سے پڑھائے ہوئے سبق کو بھلا دینے کے جرم میں مسکنت کے گھٹا ٹوپ بادل سروں پر چھا رہے ہیں، اُنکی قوت اور امن کی سب کرشت زاریں وقف خزاں ہو چکی ہیں، جہانبانی کا زادِ راہ سب لٹ چکا ہے، اُمت کی سب شیرازہ بندی، اُسکا تعبّد سے پیدا کیا ہوا نظم و نسق، اُسکا الصّلوٰۃ سے بنایا ہوا نظام اُسکا خوف احکم الحاکمین سے نکلا ہوا بھائی چارہ معنًا کالعدم ہے! اب ہر طرف غیروں کی عمّاز اور غلامی کی جوت پیزار ہے، مظلومیت کی چیخیں اور لکد زنی کی کراہیں ہیں، مُلک یک بیک ہاتھوں سے نکل رہے ہیں، زمین خدا تنگ ہو رہی ہے، ظالم اور نااہل مسلمان اِس پاکبازی میں مست ہیں، خانۂ خدا کو مار کر لمبی تان رہا ہے اور گھر پھونک اپنی بربادی کا تماشہ نہایت مزے سے دیکھ رہا ہے!

مُنتہائے الصّلوٰۃ

وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ (۲: ۴۵)

(اور بیشک وہ صلوٰۃ جن کا خشوع ہم سے پیدا ہو کے اعتبار تو سبکے لیے بیکار ہی بیکار ہے)

الغرض الصّلوٰۃ کی الٰہی حکمت کی تہ میں اُمتِ اسلام کا لاینفک اتحاد تھا، باہمی رافت اور رحمت تھی، قوم کو پنجوقتہ اطاعت کا مکرر سبق تھا، شاہ و گدا کی مساوات کی یاددہانی تھی، وقت کی پابندی تھی، انتہاء عن الفحشاء والمنکر تھا، شب و روز خدا کی ملازمت اور اطاعت میں صرف کر کے پانچوقت آقائے نامدار کو سلام تھا، اُسکے حضور میں مؤدبانہ پیشی اور عرضمندانہ حاضری تھی، اُسکی خدمت میں دست بستہ عرض معروض تھی، صراطِ مستقیم† کی استدعا تھی، حصولِ نعمت کی گذارش تھی، بادشاہت زمین کی تڑپ

(بقیہ تحت المتن صفحہ ٢٦٠) ماہیت کو بھول گئے۔ آج اگرچہ خلیفۃ المسلمین سلاملیک کی رسم ادا کرنیکے لیے مسجد ایا صوفیہ میں جاتا ہے مگر خود امامت نہیں کراتا۔ لیکن سیاسی اقتدار کے کم ہوجانیکے باعث اسکا مذہبی مقام خود اسقدر مُلّایانہ ہوگیا ہے کہ عالم اسلام پر اسکی شخصیت کا فی الجملہ کچھ اثر باقی نہیں رہا۔

† صراطِ مستقیم کے الٰہی مفہوم کے بارے میں جو کچھ اب تک حاصل ہوا ہے اُسکو یہاں پر یکجا جمع کر دیا جاتا ہے۔ صفحہ ٢٢٤-٢٤٦ کے مباحث سے ظاہر ہے کہ (١) اعتصام بحبل اللہ کرنا اور فرقہ بندنہ بنانا (آیات ٣: ١٠٠-١٠٢) صفحہ ٢٢٦) صراطِ مستقیم ہے (٢) توکل بخدا کر کے صبر و استقلال سے مصائب کا مقابلہ کرنا اور دشمن پر غالب آکر رہنا (آیت ١٤: ١٢) صفحہ ٢٢٧) صراطِ مستقیم ہے، (٣) ایمان کے اعمال (دیکھو تحت المتن

تھی، منعم علیہ بنجانے کی طمع تھی، مغضوب علیہ نہ بننے کا خوف تھا! اسی بیم و رجا کی تڑپ میں قومے اور قعدے تھے، اسی کے اضطراب میں رکوع و سجود تھے، اسی کی تڑپ میں شام و سحر، فراغت اور شغل میں، سوتے جاگتے سلام تھا، اسی اجتماعی ہلاکت کے خوف میں شب و روز سعی و عمل تھا، دنوں کو جہاد بالسیف تھے، چیتھڑوں کے پرتلوں میں حمائل کی ہوئی تلواریں تھیں، رسیوں سے مرمّت کیئے ہوئے نیزے تھے، راتوں کو کوچ اور اسکی جناب میں کراہیں تھیں، بستروں سے پہلو آشنا نہ ہوتے تھے: تَتَجَافٰی[سلہ] جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ

سلہ مطالب کیلئے دیکھو تحت المتن صفحہ ۲۴۶۔

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۶۱) صفحہ ۱۸۲-۱۸۳) اپنے اندر قائم رکھنا (آیہ (۲۲: ۵۴) و (۴۳: ۵۳) صفحہ ۲۲۷) صراط مستقیم ہے (۴) قوم کی بہتری کے لیئے ایثار مال کرنا (آیات (۲۳: ۷۲-۷۳) صفحہ ۲۲۷) صراط مستقیم ہے (۵) قانون خدا کے مطالب و مقاصد کے بارے میں اختلاف پیدا نہ کرنا (آیہ (۲: ۲۱۳) صفحہ ۲۲۸ اور آیات (۴۳: ۶۳-۶۵) صفحہ ۲۲۳) صراط مستقیم ہے، (۶) خدا کی ملازمت میں شیطان کی عبادت کو حائل نہ کرنا (آیہ (۳۶: ۶۰) صفحہ ۲۲۸ اور آیۂ (۴۳: ۶۴) صفحہ ۲۲۳) صراط مستقیم ہے، (۷) الامر اور قانون خدا میں نزاع نہ پیدا کرنا (آیہ (۲۲: ۶۷) صفحہ ۲۲۸) صراط مستقیم ہے، (۸) ایک مرکز پر عملاً اور معناً قائم ہو جانا آیۂ (۲: ۱۴۲) صفحہ ۲۲۹) صراط مستقیم ہے، (۹) سب اعمال انسانی کو خدا کیلئے وقف کر دینا اور ان اعمال میں کسی غیر کی اطاعت کو شریک نہ کر کے ابراہیم علیہ السلام کی توحید پر چلنا آیات (۶: ۱۶۲-۱۶۴) صفحہ ۲۲۹-۲۳۱) صراط مستقیم ہے، (۱۰) نعمتہائے خدا کی کما حقہٗ قدر کرنا خالصتہً قانون خدا کے مطیع رہنا، آیات (۱۶: ۱۲۰-۱۲۲) صفحہ ۲۳۲) صراط مستقیم ہے، (۱۱) دشمن کو اپنے سعی و عمل سے بے دست و پا کر دینا، اُسکے وسائل حفظ و دفاع پر قابض ہو کر اُسکو تباہ کر دینا، اور حتی الوسع اپنے آپ کو اُسکے دست تعدّی سے بچائے رکھنا (آیہ (۲۰: ۴۸) صفحہ ۲۳۳) صراط مستقیم ہے، (۱۲) اس دنیا کے اندر قوّت اور زور سے رہنا، دنیا جہان سے بڑھ چڑھ کر اور برگزیدہ ہو کر رہنا (آیات (۶: ۸۷-۸۸) صفحہ ۲۳۴) صراط مستقیم ہے، (۱۳) بادشاہ زمین ہو کر رعیت پر عدل و انصاف سے حکومت کرنا (آیہ (۳۸: ۲۶) صفحہ ۲۳۴) صراط مستقیم ہے، (۱۴) اس دنیا کے اندر سلامتی اور بقا کے رستوں پر چلنا، قانون خدا کے عدم تعقّل کی تاریکیوں سے نکلکر علم و عمل کے نور کیطرف آنا (آیات (۵: ۱۵-۱۶) صفحہ ۲۳۴-۲۳۵ اور آیہ (۱۰: ۲۵) صفحہ ۲۳۵) صراط مستقیم ہے، (۱۵) خدا کی عملی ملازمت اور اتقا اور اطاعت امیر کرنا (آیات (۴۳: ۶۳-۶۴) صفحہ ۲۳۵) صراط مستقیم ہے، (۱۶) قانون خدا سے استمساک کرنا اور اُسپر ہمیشہ چلتے رہنا (آیہ (۴۳: ۴۳) و (۴۳: ۶۱) صفحہ ۲۳۶) صراط مستقیم ہے، (۱۷) اپنے سینے سعی و عمل کیلئے پر کھول دینا اور اُنکے اندر احکام خدا کی تعمیل کے بارے میں کوئی تنگی نہ رکھنا (آیات (۶: ۱۲۶-۱۲۸) صفحہ ۲۳۹) صراط مستقیم ہے؛ (۱۸) ملازمت خدا کی تعمیل میں غیر خدا کے حکموں کو حائل نہ کرنا، والدین کے ساتھ احسان، اولاد کے ساتھ رافت، مکارم اخلاق پر عمل، قتل سے پرہیز کرنا، مال یتیم کی نگہداشت، پورے ماپ، پورے تول، عدل، ایفائے عہد پر قائم رہنا اور متحد بنے رہنا (آیات (۶: ۱۵۲-۱۵۴) صفحہ ۲۴۰) صراط مستقیم ہے، (۱۹) راہ خدا میں جہاد بالسّیف کرنا، دشمن سے متارکہ حفظ نفس کی خاطر کرنا (آیات (۴: ۶۹) و (۴: ۱۴۸-۱۴۹) صفحہ ۲۴۲) صراط مستقیم ہے؛ (۲۰) قوم کی بہتری اور تثبیت کیلئے جہاد بالسّیف کرنا، ہجرت وطن اختیار کرنا، اطاعت امیر بے چون و چرا کرنا (آیات (۴: ۶۶-۶۷) صفحہ ۲۴۳) صراط مستقیم ہے، (۲۱) اور سب سے اہم یہ کہ موسٰی اور ہارون علیہما السلام کے اعمال کر کے ایک ذلیل اور مجبور زدہ قوم کو جابر بادشاہ کے ظلم و ستم سے آزاد کرنا، اور بالآخر قانون خدا کا پابند بنا کر اُسکو زمین کا حکمران اور بادشاہ بنا دینا وہ الصراط المستقیم ہے جسکی تعریف سورۂ فاتحہ میں اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کے الفاظ میں کیگئی ہے۔ مسلمانوں کو سوچنا چاہیئے کہ آج وہ ان اکیس شقوں میں سے ایک پر بھی صحیح معنوں میں عامل ہیں؟ نہیں بلکہ دیکھنا چاہیئے کہ مغربی قوموں کا اس صراط مستقیم پر کسقدر انسانی عمل ہے۔ اور انکے اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ہونے کی کیا وجہ ہے اور نماز کی اس دعا پر کسقدر عامل ہیں۔ جو احکام یہاں جلی قلم سے لکھے ہیں ان میں سے اکثر پہ مغربی اقوام کا بیشتر عمل ہے۔

وَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۳۲:۱۶) اِسی مجموعی نعمت کی طمع میں اجتماع اُمت تھا، قیام جماعت تھا، دلوں کے اندر خوف خدا کی مشترک جنبشیں اور باہمی محبت کی مشترک لہریں تھیں، کسی کو کسی سے کچھ دریغ نہ رہا تھا، بخل، حسد، دلوں کے کینے، کم ظرفی کی رنجشیں سب مٹ گئی تھیں، مسجدیں ایک منظم اور پُرامن، ایک طاعت آموز اور عصبیت خیز انجمنیں بن گئی تھیں، اِسی اَلصَّلوٰة کا قیام اور لرزشِ قلب یہی تعمیل احکام خدا اور پیہم سعی و عمل، یہی اطاعت رب اور استجابت رسول، قربانی مال اور طاعت امیر، آپس میں اتحاد اور علی اللہ التوکل عمل قرن اوّل میں سچے مومن بننے کی نشانی تھی، اِسی ایمان کا اٹل نتیجہ اُمت کی واماندگیوں پر پردہ پوشی اور اس دنیا میں عزت اور آبرو کی روزی تھی۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا
ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ
الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ
عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۸:۱-۴)

اے محمدؐ! مسلمان تم سے مالِ غنیمت کے متعلق دریافت کرتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ مالِ غنیمت صرف خدا اور اُسکے رسول کا ہے، وہ جس طرح مناسب سمجھے اُسکو تقسیم کر دے تو تم لوگ مالِ غنیمت کی تقسیم میں

٭ ان آیات الٰہی میں چند امور بغور طلب ہیں (۱) پہلی آیت یعنی (۸:۱) میں متحد ہو کر رہنے (وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ) اور بہر نوع اطاعت امیر کرنے (وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ، دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۰۱) کو صرف اتقائے الٰہی پر محمول کیا گیا ہے بلکہ انکو ایمان کی شرط لاینفک قرار دیا ہے، گویا جو قوم متحد ہو کر نہیں رہتی اور امیر کی اطاعت سے کسی امر کے متعلق (خواہ وہ معاملہ مال غنیمت ہی کا کیوں نہ ہو) نزاع پیدا کرتی ہے، انکا ایمان یکسر ساقط ہے۔ قرآن حکیم میں صرف چند موقعے ہیں جہاں اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کے الفاظ آئے ہیں، ایک اطاعت بکر رہنا ہے (دیکھو صفحہ ..، آیہ (۳:۱۳۹)) دوسرا اتقائے خدا کا ہے (دیکھو صفحہ ۱۰۹، آیہ (۸:۱)) تیسرا یہی اتحاد و اطاعت امیر۔ یہ تمام آیتیں جنکے اندر اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کی شرط ہے اپنے اپنے مرتبے پر اہم ہیں۔ افتتاحیہ کتاب صفحہ ..۔ ایمان میں سے بعض اہم امور کی کچھ کمی کر دی ہے (۲) اسی (۸:۲) میں آیہ (۸:۲، ۴۹) کی طرح اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ کے الفاظ آئے ہیں اور یہ آیت خود صفحہ ۱۰۳ پر آچکی ہے۔ گویا ایمان کی باقی لاینفک شرطوں صفحہ ۱۰۱ کی جہاد بالمال اور جہاد بالسیف کی شرطوں کے علاوہ لرزشِ قلب یعنی اتقائے خدا (وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ)، اور تعمیل احکام الٰہی میں استقامت (زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا)، اور توکل یعنی نتائج کے معاملے میں خدا پر اعتماد کرنا بھی ہیں۔ (۳) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا کے الفاظ قرآن حکیم میں صرف دو جگہ آئے ہیں (دیکھو تحت المتن صفحہ ..)۔ ایک آیہ (۸:۴)، صفحہ ۱۱۲ پر اور ایک یہ جس پر (۸:۷۴) میں گویا ایمان کی شرط لاینفک تقویت قوم کیلئے ہجرت وطن، جہاد بالسیف یا نصرت باہمی کے علاوہ (دیکھو صفحہ ۱۰۱) اقامت الصلوٰة اور جہاد بالمال بھی ہے (آیہ ۸:۳) الغرض یہ تمام آیات الٰہی کو پیش نظر رکھکر ظاہر ہے کہ ایمان بانداز قرآن وحدت امت ہے، اطاعت امیر ہے، انما میرا علون بنکر رہنا ہے، جہاد بالمال ہے، جہاد بالسیف ہے، استقامت فی التقویٰ ہے، توکل فی النتائج ہے، ہجرت ہے، باہمی نصرت و مساعدت اور رواداری ہے، اور ان سب کے علاوہ اقامت الصلوٰة بھی ہے، یہ سب ایمان کی لاینفک شرطیں ہیں اور تاوقتیکہ الصلوٰة کو وسیع معنوں میں قائم کرنیوالے وہی شخص ہو سکتے ہیں جو یہ سب باتیں موجود ہوں، نماز محض گویا يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ نہیں ہوگا۔ فقط

اپنے مابین جھگڑا نہ کرو اور اُس غضب خدا سے ڈرو جو فساد کرنے والی قوم پر نازل ہوتا ہے اور اپنے باہمی تعلقات کو درست کر کے متحد بنے رہو اور اگر تم فی الحقیقت صاحب ایمان لوگ ہو تو خدا کے حکموں اور اُسکے رسول کے فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کرو۔ اصلی ایماندار تو وہی لوگ ہیں کہ جب خدا اُنکو یاد دلایا جاتا ہے تو اُنکے دل کانپ اُٹھتے ہیں اور جب احکام خدا (اٰیٰتُہٗ) اُنکو بتائے جاتے ہیں تو اُن کا اُنکی تعمیل پر یقین اور آمادگیٔ عمل (اِیْمَانًا) اور بھی بڑھ جاتی ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو حتی الوسع تعمیل کے بعد نتائج کے بارے میں خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں (یَتَوَکَّلُوْنَ) جو اس تمام اتحاد اور اطاعت اور لرزش اور مصالحت اور توکّل اور سعی و عمل کو پیش نظر رکھ کر الصلوٰۃ کو قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُنکو دے رکھا ہے اُسمیں سے حتی الامکان ایثار مال بھی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہی فی الحقیقت سچے ایمان والے ہیں، اور یہی وہ ہیں جنکے لئے اُنکے پروردگار کے ہاں عزو کرامت کے درجے ہیں، جنکی واماندگیوں اور اجتماعی بدحالیوں پر خدا کی طرف سے پردہ پوشی (مَغْفِرَۃٌ) ہے اور جنکو بالآخر اس دنیا میں عزت اور آبرو کی روزی ہے۔

یہی وہ قوت انگیز اور غلبہ اندوز "الصلوٰۃ" تھی جس کا الٰہی میثاق بنی اسرائیل سے جب بندھا تو امت چشم زدن میں نہال ہوگئی، اُسکی اجتماعی بدحالیاں یکسر کافور ہوگئیں، جنات زمین قدموں پر نثار ہونے لگے نیچے سے نہریں پھوٹ بہیں، قوت اور حکومت، عزت اور امن قوم کے گہوارے ہوگئے، خدا دوست بن گیا، وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ (۵: ۱۲)[۱]۔ لیکن جب قوم اس عہد خداوندی کو بھول گئی، جب اُن کی

---

[۱] اور لوگو! بنی اسرائیل سے عہد اُس خدائے پاک ہی نے لیا تھا اور ہم ہی نے اُنہی میں کے بارہ سردار اُنپر مامور کر دیئے تھے اور وہ خدا ہی تھا جس نے اپنا قول دیا تھا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہارا دوست اور رفیق ہوں، اگر تم الصلوٰۃ پر قائم رہے، الزکوٰۃ کو دیتے رہے، میرے پیغمبروں کو منجانب اللہ یقین کر کے اُن کے بتائے ہوئے احکام پر عمل کرتے رہے (اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ) وقتاً فوقتاً اُنکی بدل و جان مدد بھی کی حد کہ احکام کی تعمیل میں اپنے آرام اور مال و اسباب کا بہترین حصہ کاٹ کر الگ کر دیا (اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۳۰–۱۳۲) تو میں تمہاری سب اجتماعی بدحالیوں کو تم سے دور کر دونگا (لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۳۱)، اور تمکو ایسے خوشگوار باغوں اور سرسبز ملکوں میں لیجا داخل کر دونگا جنکے نیچے نہریں پڑی بہہ رہی ہونگی، پھر جسنے ان نعمتوں کے حصول کے بعد کفران خدا کیا اور اس عہد کو توڑا تو وہ راہ راست سے یکسر بھٹک گیا۔

✚ صفحہ ۲۶۳ کے تحت المتن میں اور نیز سورہ انفال کی آیتوں (۸: ۱-۴) کے متذکرہ صدر ترجمے میں یہ بات ظاہر کر دی گئی تھی کہ اقامت الصلوٰۃ کا قرآنی مفہوم

زمینیں تنگ ہو ہو کر سخت ہو گئیں، جب مسامحت اور رواداری، خوف خدا اور ہدایت، اتقا اور ایمان کا آب زلال باقی نہ رہا اور قلوب کے اندر حسد اور نفاق کا چور، کبر اور ریا کا چور، تھڑدلی اور بے مرادی کا چور، بخل اور کم ظرفی کا چور، الفحشاء اور المنکر کا چور گھر کر گیا۔ ہاں جب قوم خدا کے اُس دیئے ہوئے درس کو بھول گئی، جب غرضمند رہنما اور کبرائے خلق ضد اور بغاوت سے مقصود خدا کو محرف کرنے لگے، احبار اور رہبان نے لوگوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنے اپنے پیچھے صفیں کھڑی کر لیں، مشترک خدا کے مشترک خوف اور اطاعت کو چھوڑ کر آپ رب بن بیٹھے اور پیغام خدا میں خیانت کرنا قوم کا شعار بن گیا، اُسی دن سے میثاق ٹوٹ گیا، جنات زمین چھین لیئے گئے، ذلت اور محتاجی لیس دی گئی لعنت مونہوں پر برسنے لگی، آوارہ جہاں ہو گئے، مردود زماں بن گئے، قسمت بگڑ گئی، خدا دشمن بن گیا: فَبِمَا

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۶۴) نہ صرف رسمی نماز کی رکعتوں کو مسجد میں جا کر بصحت تمام ادا کر دینا ہو بلکہ اُن تمام اعمال (مثلاً وحدت اُمت، اطاعت امیر، جہاد بالمال، ہجرت، جہاد بالسیف، استقامت فی التبی، توکل فی المشاکل، نصرت باہمی، اطوعیت، وغیرہ وغیرہ) کو جو ایمان کی بالا ئینگ شرائط ہیں اپنے اندر پیدا کر کے خدا کے حضور میں حاضر کر دینا ہو جو شخص مومن ہو ان میں ان اعمال کا بالکل بحت موجود ہونا اٹل ہو پس الصلوٰۃ کی اقامت ہی دراصل اسی کی ہے جسمیں (نماز کے علاوہ) مومن ہونے کی باقی شرائط بوجہ احسن موجود ہوں۔ سورہ مائدہ کی زیر بحث آیت (۵: ۱۲) میں وَاَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ کے اس مفہوم کی قطعی تائید ہوتی ہے کیونکہ موسوی شریعت کی نماز کے ظواہر اسلامی نماز کے ظواہر سے بالکل جدا تھے اور باوجود اس ظاہری اختلاف کے اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ کی مطلق اصطلاح کا استعمال اس امر کی دلیل ہے کہ اس میثاق سے مراد اُس قانون کی پابندی تھی جو الصلوٰۃ سے مقصود بالذات ہے، صرف ظواہر کی پابندی مقصود نہ تھی۔ دیباچہ کتاب صفحہ ۳۲-۳۳ میں قرآن حکیم کی اس مطلق لغت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اور اس اطلاق کی کئی مثالیں آگے چلکر ملیں گی۔

آیت زیر بحث (۵: ۱۲) میں وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کے الفاظ اس امر کی قطعی دلیل ہیں کہ جنّٰت سے مراد جنات زمین ہی تھے، اُخروی جنت کا ذکر یہاں پر قطعاً نہ تھا۔ عہد عتیق میں اسی میثاق ابدی کی جزا ابدی بادشاہت لکھی ہے (کتاب خروج باب ۶، آیت ۳-۸) بعض موقعوں پر ان الٰہی جنات کو شہد اور دودھ کی نہروں والی سرزمین کہا ہے (کتاب تثنیہ باب ۶ آیت ۲-۳)، کتاب ثانی سموئیل باب ۷ آیت ۲۳-۲۹ میں پھر وعدہ اسی ابدی سلطنت کا ہے، اور کتاب اوّل سلاطین باب ۹ آیت ۱-۹ میں اس سلطنت کو چھین لینے کی دھمکی بھی دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں بنی اسرائیل میں دنیاوی سلطنت کا قائم ہو جانا اس امر کی شہادت ہے کہ وعدہ جنات زمین ہی کا تھا اور اسی لیے فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ کی شرط بھی موجود ہے۔ خود آیۂ استخلاف میں مسلمانوں کے ساتھ وعدہ بھی دنیاوی سلطنت کا تھا جیسا کہ الفاظ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴: ۵۵) صفحہ ۰ سے ظاہر ہے اور وہاں بھی وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ کے الفاظ آئے ہیں۔ سورہ فاطر میں بھی اسی قطع کا اسلوب بیان ہے: هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۭ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا (۳۵: ۳۹) یعنی لوگو! وہ خدا ہی ہے جس نے تم کو اس زمین میں (تمہاری سعی و عمل کو پسند فرما کر) بادشاہ بنا رکھا ہے تو اس نعمت عظمیٰ کے حصول کے بعد جس قوم نے قانون خدا سے انکار کیا (کفر) تو اس انکار کی ذمہ داری کا بوجھ بھی اُسی کی گردن پر ہے اور قانون خدا سے منکر قوم کو تو ان کا انکار خدا کی نگاہ میں سوائے ناراضگی کے کسی شے کو نہیں بڑھاتا اور کفران نعمت کرنیوالی قوم تو سوائے اسکے کہ روز بروز گھاٹے میں رہے کسی اور شے میں ترقی نہیں کرتی۔ الغرض ان تمام شہادات کے بعد اس امر کا ناقابل انکار فیصلہ ہو جاتا ہے کہ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ سے مراد ہر جگہ جنات زمین ہی ہیں۔ آخرت کیلئے الجنۃ کی اصطلاح مخصوص ہے۔ جنت کی قرآنی اصطلاح پر مبشتر کی بحثیں صفحہ ۱۱۵-۱۱۶، ۱۳۱، ۱۴۲ وغیرہ پر گذر چکی ہیں۔ افتتاحیہ سے قطع نظر دیباچہ کتاب صفحہ ۴۶-۴۷ میں کئی مثالیں اسی قطع کی

نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ [۵۱] ۰ (۵:۱۳)۔ اگر مسلمان آج اس عہد خداوندی کو توڑ کر لعنت خدا کے مستحق بنے ہوئے ہیں، اگر آج اُن سے بھی سب کچھ چھین کر اُن لوگوں کو دیا جا رہا ہے جنہوں نے عمر بھر ایک رسمی نماز نہیں پڑھی، ایک اسلامی رکعت ادا نہیں کی، ایک شرعی سجدہ نہیں کیا، ایک محمدی کلمہ نہیں پڑھا تو اسکی وجہ بھی یہی قساوت قلب ہے، یہی تحریفِ دین اور نسیان درس ہے، یہی مقاصد خدا میں مجرمانہ خیانت ہے، یہی الصلوٰۃ کو معنًا اور صورتًا[+] بگاڑ دینا ہے، یہی خدا کو چھوڑ کر نفسانی خواہشات کی پیروی ہے۔ ایسی نمازیں پانچ نہیں پانچ ہزار ہوں خدا کے نزدیک سب ضائع ہیں، ان سے ضعف کے سوا کچھ حاصل نہیں، ان کا نتیجہ ہلاکت کے کچھ نہیں؛ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا [۵۲] (۱۹:۵۹)۔ پس اگر آج

---

[۵۱] لیکن بنی اسرائیل کے اس میثاق الٰہی کو توڑ دینے کے باعث ہم نے ان پر ذلت اور ادبار کی لعنت برسا دی، اُن کے دلوں کو اپنے احکام کی تعمیل کیلئے پتھر کر دیا، پھر وہ اسقدر مجبور ہو اور غافل ہو گئے کہ ہمارے کلمات اور احکام کو اُنکے مناسب محل سے ہٹا کر اُنکے الٰہی مقاصد میں حسب مطلب رد و بدل کرنے لگے (يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ)، اُنکو تاویلِ اپنے مطلب کیلئے اُن میں معنوی تحریفیں پیدا کیں (يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ)! اور یہی نہیں بلکہ اسی تن آسانی اور آرام پسندی کے باعث رفتہ رفتہ اس درس الٰہی کے ایک اہم حصے کو بھول گئے جو اُنکو اچھی طرح یاد دلایا گیا تھا، اور اے محمدؐ! تم ان میں سے معدودے چند کے ماسوا اب بھی روز کسی نہ کسی ایسے مکار کی اطلاع پاتے رہو گے جنہوں نے صریح خیانت اور بد باطنی سے احکام خدا کے مقاصد میں رد و بدل کر کے اپنی امت کو گمراہ کیا ہو تو ان خائنوں اور مکاروں کا علاج سوا اسکے کچھ نہیں کہ تم انسے پرے پرے ہٹے رہو۔ (فَاعْفُ عَنْهُمْ)، ان سے قطعاً کنارہ کشی اختیار کرو (وَاصْفَحْ)۔ (دیکھو ان معانی کی تائید میں دیباچہ کتاب صفحہ ۱۲۰ کا آخری سطر)، خدائے عز و جل تو انہی لوگوں کو پسند کرتا ہو جو سچی عمل کر کے اپنی اُمت کو قوت اور عزت کے مدارج علیا تک پہنچا دیتے ہیں (اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ دیکھو مُحْسِنِيْنَ کی تعریف صفحہ ۱۳۰ تحت المتن آیہ (۱۰:۷)، ہو صفحہ ۲۴۶ تحت المتن آخری دو سطریں و آیات (۳۷: ۱۲۱-۱۲۲)۔

[۵۲] پھر ان لوگوں کے بعد ایسے نابکار جانشین آئے جنہوں نے الصلوٰۃ کو بالکل ناکارہ کر دیا، اسکی حکمت کو اسقدر بھلا دیا کہ وہ بالکل ایک لاطائل شئے بن گئی (اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ) اور اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے لگے رہے تو یہی وہ لوگ ہیں جو عنقریب ہلاکت سے دوچار ہونگے۔

زیر تحت المتن صفحہ ۲۶۵) پیش کردی ہیں جنکے بغور مطالعہ سے اس امر کا فیصلہ ہو جاتا ہے کہ جَنّٰت سے مراد ارضی بادشاہت ہی تھی۔ شارحین قرآن نے بادشاہت زمین پر اللہ اور اپنے نفس کیلئے آسانیاں پیدا کر لیکے لئے اس سے مراد اخروی جنت لیلیا اور مذہب اسلام کو رفتہ رفتہ بے نتیجہ بنا کر رہبانیت کیطرف لے گئے!

آیت مذکورہ میں فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ کے الفاظ بھی نہایت قابل غور ہیں۔ گویا ارضی بادشاہت کا کفرانِ نعمت کرنا ہی صراط مستقیم سے پرے ہٹنا اور صحیح معنوں میں ضلال ہے۔ یہ مفہوم بعینہٖ وہی ہے جو صفحہ ۲۲۳ کے تحت المتن کے اخیر میں سورۂ فاتحہ کے لفظ الضَّآلِّيْنَ کی تشریح میں حاصل ہوا تھا۔

[+] الصلوٰۃ کے معنًا بگڑ جانے کے علاوہ اسکے صورتًا بگڑ جانے کے متعلق ایک ابتدائی بحث صفحہ ۱۱۱-۱۱۲ کے تحت المتن میں ہو چکی ہے جس سے کم از کم یہ ظاہر ہے کہ مساجد میں امام صاحبان کا خدا کے حضور میں نماز کو ترنم سے ادا کرنا وہ بدعت سیئہ ہے جو نص قرآن کے قطعًا برخلاف ہے، مساجد میں سنت اور نوافل کا ادا کرنا اور اس طرح ہر خانہ خدا کے اندر بے ترتیبی اور بدنظمی کا ماحول پیدا کرنا بھی (جسکا ذکر صفحہ ۲۰۶ کے تحت المتن میں ہو چکا ہے) رسول خدا صلعم کے اسوۂ حسنہ کے برخلاف صریحًا ہے

اُس مصادق الوعد خدا کی بتائی ہوئی الصلوٰۃ 'وہی قرنِ اوّل کے نتائج پیدا نہیں کرتی تو وہ الصلوٰۃ بگڑ چکی ہے، اُسکا کیف ودل بدل چکا ہے، مطمحِ نظر بدل چکا ہے، اُسکے ادا کرنے والوں کے دل بدل چکے ہیں، حوصلے اور جگر بدل چکے ہیں، نصب العین بگڑ چکا ہے، نہیں اُسکو ادا کرنے کا محرک باقی نہیں رہا، نعمت کا پیش نہاد نہیں رہا، خشوع پیدا کرنے والی غرض نہیں رہی، غرض کا پیدا کیا ہوا اضطراب نہیں رہا، صرف ڈھانچ یا الفاظ باقی رہ گئے ہیں، اُٹھک اور بیٹھک رہ گئی ہے، مصیبت کو کم کرنے کا ترنم رہ گیا ہے: اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ (۲:۴۵) یا پانی کو بالوں کی جڑوں تک پونہچانے کے وسوسے رہ گئے ہیں یا مسح اور قصر، غسل اور استنجا، تیمم اور وضو کے مسئلے رہ گئے ہیں یا خدا پر احسان اور سجدوں کا ادھار رہ گیا ہے، یا جنت کے سبز باغوں کے خواب رہ گئے ہیں ورنہ نماز کا الصلوٰۃ رہکر وہی قرنِ اوّل کے نتائج پیدا نہ کرنا ناممکن ہے! صراطِ مستقیم کے نصب العین کو ہر وقت پیش نظر رکھکر اُسکے لئے شبانہ روز سعی و عمل کرنا، سعی و عمل کرکے اُس راہِ راست کی وعدہ دی ہوئی نعمت کی تڑپ میں منعم لم یزل کے حضور میں لپک لپک کر پونہچنا، دست بستہ کھڑے ہو جانا اور نعمت کو مانگنا، بیٹھ جانا اور پھر اُٹھ اُٹھ کر بالحاح تمام مانگنا، ماتھا رگڑ رگڑ کر مانگنا، گھٹنوں پر جھک جھک کر مانگنا، اور ساتھ ہی باقی وقتوں میں صبر اور استقلال، تکلیف برداری اور مشقت، عزم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۶) آجکل مساجد کے اندر وضو کرنیکے لیئے حوضوں اور کنوؤں، حماموں اور غسلخانوں کا موجود ہونا بھی وہ بدعت اور تن آسانی کے شعبدے ہیں جو قرنِ اوّل کی مساجد میں قطعًا موجود نہ تھے۔ اُس زمانے میں لوگ مساجد کے اندر اپنے گھروں سے تیار ہو کر آتے اور خانۂ خدا کے اندر آجکل کی بد لحاظیاں اور بے تکلفیاں کرنا گناہ سمجھتے۔ فرقہ بند لوگوں نے جو اختلافات نماز کے ارکان میں از خود پیدا کر لیئے ہیں وہ اِنکے علاوہ ہیں اور آہستہ آہستہ نماز کی اصلی صورت کو بگاڑ رہے ہیں۔ التحیات کے بعد اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ یا کَمَا صَلَّیْتَ کے الفاظ جو پڑھے جاتے ہیں گمان غالب ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عین حیات میں امامت کے وقت خود نہ پڑھتے تھے۔ نہ معلوم کہ یہ درود شریف کب سے پڑھے جانے شروع ہوئے، کس کے حکم سے ہوئے اور خود رسول خدا انکی جگہ کیا پڑھا کرتے تھے! 'بلغ' اور 'حفد' کی مشہور آیتیں جو آجکل نماز عشا کے بعد وتروں میں پڑھی جاتی ہیں اگر بدستور صدر نبوت میں بھی پڑھی جاتی تھیں تو حیرت ہے کہ جمع قرآن کے وقت انکے کلام وحی ہونے میں شکوک کیوں پیدا ہوئے۔ الغرض ان سب امور کو پیش نظر رکھکر یہ کہنا کچھ غلط نہیں کہ نماز کی ظاہری صورت بھی بتدریج آہستہ آہستہ نامحسوس طور پر بگڑ رہی ہے اور یہ بگاڑ اس شئے میں پیدا ہو گیا ہے جسکی بابت ہر مسلمان کا دعویٰ ہے کہ وہ علی التواتر قرنِ اوّل سے بلکہ خود نبی آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت مؤکدہ سے ہم تک پونہچی۔ میرا یقین ہے کہ قرنِ اوّل والی موذن اور عورتوں کی مخلوط نماز جس کی امامت رسول خدا خود کیا کرتے تھے نہ صرف اپنے کیف و حال میں، خشوع و خضوع میں، اصلاح قلوب میں، تزکیہ نفس میں، انہاعن الفحشاء والمنکر میں، اتحاد اور اطاعت، مواخات اور مساوات کا نتیجہ خیز اخلاق پیدا کرنے میں اصلًا مختلف تھی بلکہ اسکے ادا کرنے کا اہتمام، اسکی قرأت کے الفاظ وغیرہ وغیرہ بھی کچھ نہ کچھ ضرور آجکل کی ترنم والی نماز سے ضرور مختلف اور جداگانہ تھے!

لہ صاحب کے نیچے دیکھو حاشیہ صفحہ ۲۶۱۔

اور محنت کو اپنا استعان بنالینا وہ شیوۂ مسلمانی تھا جس پر چلکر اسلام کو چند برسوں کے اندر وہ شوکت نصیب ہوئی کہ آج اُسکو پھر دیکھنے کیلئے آنکھیں ترس رہی ہیں: وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَي الْخٰشِعِيْنَ (۲:۴۵)۔ صاحب القرآن تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ کی اپنی باربار اور ضرب دل سے دُہرائی ہوئی آیتوں کی اہمیت کو اسی الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی ہدایت اور اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے راہ راست کے نصب العین کی ضرورت کو اسلامی اُمت پر کہکر واضح کردیا تھا کہ خدا کا اپنے بندوں پر سب سے بڑا احسان نہ صرف قرآن عظیم کو عطا کرنا بلکہ ساکنان زمین کے سامنے یہی سبع مثانی کا لشکر انگیز مطمح نظر دن میں پانچوقت پیش کردینا ہے!

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (۱۵:۸۷)

اور اے محمدؐ! سب سے بڑا احسان جو ہم نے تم پر اور تمہاری اجل زدہ قوم عرب پر کیا ہے یہ ہے کہ ہم نے سورۂ فاتحہ کی بار بار دُہرائی ہوئی آیتوں کا اہم اور عظیم الشان نصب العین پیش کر کے تمہاری قوم میں حصول نعمت اور الصراط المستقیم پر چلنے کی ایک لازوال ترغیب تحریک پیدا کردی ہے (اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ)، اُن کے دلوں میں اس نعمت کے حاصل کرنیکے ولولے پیدا کردیے ہیں (اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ)، انکے اندر اس دنیا میں قوت اور زور سے رہنے اور ہلاک شدہ قوموں (دیکھو آیات (۱۵:۶۴) تا (۱۵:۸۴)) کی طرح مغضوب علیہم اور ضالین نہ بننے کا ایک دائم اور قائم ہیجان پیدا کردیا ہے، اور یہی نہیں بلکہ ہم نے تم کو قرآن عظیم بھی دیا ہے جسکے اندر اُس الصراط المستقیم پر چلنے کا مکمل دستور العمل درج ہے۔

یہی وہ فراخور سعی اور درخور طلب نصب العین ہے جس سے بڑھ کر انسانی جماعت کے لیے اس دنیا کے اندر

سلہ اور اے لوگو! اس کار گاہ سعی وعمل میں مشکلات کا خاطر خواہ مقابلہ کرنیکے لیے استقلال سے استعانت کیا کرو (وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ) اور حتی الوسع سعی وعمل کر کے خدا کے حضور میں گڑگڑایا بھی کرو کہ اُس طلال مشکلات کے حضور میں حاضری حوصلوں کو بڑھانے میں خاص مدد دیتی ہے اور یہ نماز تو ماسوا اُن لوگوں کے جن کا خشوع وخضوع ہم ہی سے بیم ورجا ہونیکے باعث ہو باقی سب کے نزدیک بیکار ہی بیگار ہے۔

ف اس آیہ شریفہ کے الفاظ خاصکر قابل غور ہیں۔ خدائے عزوجل نے سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ یعنی سورۂ فاتحہ کو اسقدر اہمیت دی ہے کہ رسول صلعم کو اسکے وحی کرنیکا احسان قرآن عظیم کو عطا کرنیکے احسان سے الگ جتلایا ہے، بلکہ سورۂ فاتحہ کی اہمیت کو دلنشین کردینے کے لیے اسکو باقی قرآن سے الگ کردیا ہے۔ شارحین قرآن نے چنانچہ اس آیت کو پیش نظر رکھکر سورۂ فاتحہ کے الفاظ کی اہمیت پر ضخیم بحثیں کی ہیں۔ بِسْمِ اللّٰهِ سے لیکر الضَّآلِّيْنَ تک کے ایک ایک لفظ کو لیا ہے انہیں ظن واعتقاد کے طومار باندھکر فلسفہ انگیز مناظرے پیدا کئے ہیں۔ کہیں اَللّٰه کے لفظ کو کوئی اسم اعظم قرار دیا ہے جسکو دہرانے کے فضائل لاتعد ولاتحصٰی کہے ہیں، کہیں الرَّحْمٰنِ اور الرَّحِيْمِ میں فرق بتلایا ہے، کہیں الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ اور اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ پر متعدد مباحث چھیڑ دیے ہیں۔ الغرض جتنے منہ اتنی باتیں مگر ایک متنفس نے بھی ذہن کو کام میں لاکر اسطرف رجوع نہیں کیا کہ سورۂ فاتحہ میں خدائے عظیم نے کیا اہم نصب العین دن میں پانچوقت مسلمانوں کے سامنے پیش کردیا ہے۔ ایک فرد واحد کا خیال اسطرف نہیں دوڑا کہ وہ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کس عمل کا نام ہے اور اسکی صحیح قرآنی تعریف کیا ہے۔ میں نے تذکرہ صدر ترجمے میں اللہ صاحب کے سورۂ فاتحہ کو مثانی کہہ کر یاد فرمانے کی توجیہ، اسکے پیش کیے ہوئے نصب العین کی

کوئی نصب العین نہیں - یہ اُس خدا کی زمین پر نعمت خدا کو برقرار رکھنے کا علم حاصل کرنا ہی وہ نور ہے جس سے بڑھکر نفعمند کوئی نور نہیں - سعی و عمل کے اس کارگاہ عظیم میں اسی علم سے بیخبر رہنا اور حصول نعمت کیلئے اپنے ہاتھ پاؤں، تن من دھن وقف نہ کر دینا ہی وہ ظلمت عظمٰی ہے جس سے تاریک تر کوئی ظلمت نہیں، عزیز اور حمید خدا کا بتایا ہوا یہی وہ معزز اور محمود مقام، اور یہی وہ عزت افزا اور قابلِ ستائش صراط ہے جس سے مستقیم تر کوئی صراط نہیں - اسی الصراط المستقیم کو ہر دم پیش نظر کر دینے کیلئے سبع مثانی کا دُہرانا نماز میں تھا، اور اسی واحد غرض و مطلب کے لیئے خدائے علیم کا قرآن عظیم اس زمین پر نازل ہوا تھا؛

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ (۱۴:۱)

اے محمدؐ! یہ قرآن عظیم ایک مکتوب خدا اور حکمنامہ رب العلمین ہے جسکو ہم نے تمہاری طرف اس نیت سے بھیجا ہے کہ تم تمام عالم کو قانونِ خدا کے عدم تعقل اور اس دنیا میں نامراد اور مغضوب علیہ ہو کر رہنے کی ظلمتوں (الظُّلُمٰتِ) سے علم و عمل اور تنومند بنکر رہنے کے (النُّوْرِ) کیطرف نکال لاؤ اور قانون الٰہی کے عامل بنا کر انکے آقائے ملدار خدا و غیرہ سے انکو قوت اور عزت کے اُس صراط مستقیم کیطرف لیجاؤ جو صاحبِ عزت اور لائق ستائش خدا کا بتایا ہوا رستہ ہے۔

اگر یہ الصلوٰۃ مسلمانانِ عالم کے شرعی ملاؤں کی جہالت اور ناقرآن دانی یا مسلمانوں کی اپنی تن پروری

(بقیہ تحت المتن صفحہ ۲۶۸) اہمیت، اور انکے قرآن عظیم سے الگ ذکر کرنے کی وجہ اشارۃً بیان کر دی ہے، اور یہ مسلمانوں کے سامنے وراثت زمین کی موہبت کبریٰ اور ”غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ“ کی نعمت عظمٰی کا لازوال نصب العین پیش کر دینا یا الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اور الضَّآلِّيْنَ نہ بننے کا قلبی ہیجان پیدا کر کے قوم کو سعی عمل کیطرف متوجہ کر دینا ہی میرے نزدیک سورۂ فاتحہ کی واحد اور بے مثال فضیلت تھی جو آج نظروں سے نہاں ہو چکی ہے - صفحہ ۲۶۱-۶۲ کے تحت المتن میں صراط مستقیم کے الٰہی مفہوم کو یکجا جمع کر دیا تھا اور اُسکا بغور مطالعہ کرنے اور اُسکے متعلق تمام قرآنی آیات کو پیش نظر رکھنے کے بعد ہر صاحبِ غور و فکر اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ کلام الٰہی کی تمام تعلیم کا لب لباب دراصل اسی اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے الفاظ میں مضمر ہے - تمام اوامر و نواہی جو دین اسلام کے اصل اصول اور اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ والے صراط پر چلانے کے صحیح اوزار ہیں اسی صراط مستقیم کی جامع و مانع اصطلاح میں داخل ہیں - سورۂ فاتحہ اگر اس نصب العین کو قرآن کے ورق اول پر پیش کر رہی ہے تو باقی تمام قرآن اُس نصب العین کو حاصل کرنیکے وسائل بتلا رہا ہے - توحید کا اصل اصول بھی اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے الفاظ میں اسی سورۃ کے اندر ہے - ایمان، تقویٰ، صلاح، فسق، شرک، کفر، الغرض دین اسلام کی تعلیم تمام کمال اسی اِهْدِنَا سے لیکر الضَّآلِّيْنَ تک کے الفاظ میں مضمر ہے (دیکھو افتتاحیہ کتاب صفحہ ۹۵ تا صفحہ ۱۳۹) - انہی معنوں میں سورۂ فاتحہ تمام باقی قرآن کا ملخص، ام صحیح معنوں میں حاوی، بلکہ اسکی صحیح معنوں میں تفسیر ہے - یہی وجہ اسکی یہ بیمثال فضیلت بھی ہے جس قوم نے سورۂ فاتحہ کے علم فکر کو پا لیا اور اسکے بعد اُس پر عامل ہو گئی اُسکو فلاح دارین قطعاً حاصل ہے - اسکے ماسوا نہ اسکا اندر کوئی اسم اعظم ہے، نہ اسکو بار بار دُہرانے میں کوئی ثواب ہے؛ نہ اسکو صحیح طور پر پڑھ لینے کا کوئی اجر ہے، نہ اسکی ضخیم اور بے سند تشریحیں کر کے اسکے الفاظ کی وہمی فضیلتیں جتلانا خدا کو خوش کر سکتا ہے!

✤ یہ آیۂ جلیلہ سورۂ ابراہیم کے شروع میں واقع ہوئی ہے - اور صفحہ ۵۵ پر آ چکی ہے - یہاں پر صرف اس بات کا قطعی فیصلہ کرنا ہے کہ الظُّلُمٰتِ اور النُّوْرِ سے انکی مراد

اور ناخداشناسی کے باعث ایک نابکار اور ناکار برآر، ایک مضحکہ انگیز اور بے مطلب، ایک ناقوت انگیز اور سکنت خیز، ایک بیگار اور مصیبت بن چکی ہے تو اسمیں قرآن اور اسلام یا خدا اور رسولؐ کا کیا گناہ ہے!

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِیْرًا (١٧:٩)

(بیشک نہیں کہ یہ قرآن عظیم اپنے عاملوں کو اُس راہ پر لے جاتا ہے جو سب سے زیادہ راست اور قیام آفریں ہے اور ان صاحب ایمان لوگوں کو جو ایمان کے لوازم پیش نظر رکھکر مناسب سعی و عمل کرتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیئے دنیا اور آخرت دونوں جگہ بڑا اجر ہے۔

(بقیہ تحت المتن ٢٦٩) بعینہ کس قسم کی تاریکیاں اور کس قطع کی روشنی ہے۔ شارحینؒ قرآن حسب معمول ان الفاظ سے علی الحساب روحانیت کی روشنیاں" یا ناخدا دانی کی تاریکیاں" لے لیتے ہیں لیکن یہ سب غیر معین اور بے نتیجہ باتیں ہیں جو در اصل قرآن حکیم کو بغور مطالعہ نہ کرنے کا نتیجہ ہیں ایک آیت (٣٣:٤٣) جسمیں الظُّلُمٰتِ اور النُّوْرِ کے الفاظ آئے ہیں صفحہ ١٣٣ کے تحت المتن میں آچکی ہے، دو آیتیں (٥: ١٥-١٦) جن میں یہی الفاظ آئے ہیں صفحہ ١٧٦ پر آچکی ہیں۔ صفحہ ١٧٦ والی آیتوں سے کم از کم اسقدر مستنبط ہوتا ہے کہ صاحب القرآن تعالیٰ نے قرآن عظیم کو نُوْرٌ کہا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ قرآن وہ نور ہے جسکے ذریعہ سے خدا اقوام عالم کو سلامتی، امام فی الارض، اور بقا کی راہوں پر لیجاتا ہے اور انکو الظُّلُمٰتِ سے النُّوْرِ کی طرف نکالکر صراط مستقیم کی طرف لیجاتا ہے۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ۙ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ یَهْدِیْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (٥: ١٥-١٦) (دیکھو صفحہ ١٧٦ اور ٢٣٤) گویا اس آیۂ کریمہ سے صاف ظاہر ہے کہ الظُّلُمٰتِ کا اصلی مفہوم وہ تاریکیاں ہیں جو اقوام کو سلامتی اور بقا کے رستوں سے پرے ہٹادیتی ہیں اور اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ والے صراط مستقیم سے دور ہٹاکر الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ اور الضَّآلِّیْنَ بنادیتی ہیں۔ اور النُّوْرِ وہ روشنی ہے جو اقوام کو اس دنیا میں بے خوف و خطر کر دیتی ہے اور صراط مستقیم پر چلائے رکھتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے الظُّلُمٰتِ در اصل قانون خدا کو نہ سمجھنے یا اُسپر عامل نہ ہونے کی تاریکیاں ہی ہیں اور النُّوْرِ وہ قانون خدا تعقل اور اسکی تعمیل ہے جسکا نتیجہ اجتماعی دوام و بقا ہے۔ اور اسی لحاظ سے خود قرآن (یعنی قانون خدا) کو یہی نُوْرٌ کہا گیا ہے۔ زیر بحث آیت (١:١٤) میں بھی یہی دونوں الفاظ آئے ہیں اور صِرَاط کا معنی خیز لفظ بھی وارد ہوا ہے بلکہ صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ کہکر کنایۃً یہ بھی کہدیا ہے کہ وہ صراط عزت اور حمد کا صراط ہے ذلت اور مغلوب ہوکر رہنے کا صراط نہیں۔ الظُّلُمٰتِ اور النُّوْرِ کے ان مطالب کی قطعی اور ناقابل انکار تائید اسی سورۂ ابراہیم کی آیت (١٤: ٥) سے ہوتی ہے جس میں صاف طور پر فرمایا ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنے احکام دے کر بھیجا کہ وہ ان احکام کے ذریعہ سے اپنی قوم کو الظُّلُمٰتِ سے النُّوْرِ کی طرف نکال لائیں اور حکم دیا کہ اس غفلت زدہ قوم کو اَیّام خدا کی یاد دہانی کراؤ، اسمیں شک نہیں کہ اس یاد دہانی جہاد میں ہر مستقل مزاج (صَبَّار) عامل اور نعمت خدا کے قدردان (شَكُوْر) بندے کے لیے بہت سے ارشادات موجود ہیں: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰیٰتِنَاۤ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (١٤: ٥)۔ ایک ہی سورۃ میں چار آیتوں کے وقفے کے بعد الظُّلُمٰتِ اور النُّوْرِ کے مطالب کی یہ آئینی تشریح اس بات کی حتمی دلیل ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو یہی کہا گیا تھا کہ قوم کو محکومیت اور بیچارگی، خوف اور ضعف، قانون خدا کے عدم تعقل و ناانجام شناسی کی ظلمتوں سے نکالکر بادشاہت اور امن، قوت اور عزت کے سُبُلَ السَّلٰمِ پر لے آؤ، اور جہاد بالسیف (اَیّام اللّٰہ) کے ولولے

(بقیۂ تحت المتن صفحہ ۲۷۰)

ان میں پیدا کرکے اُنکے اندر صبر اور استقلال، بادشاہت کی صحیح قدر شناسی یعنی حصّہ دار اور شکر گذار بننے کا اخلاق جاری و ساری کر دو۔ یہی وہ نتیجہ تھا جسکے لیئے موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے اور یہی انہوں نے کر دکھایا۔ چنانچہ اسی سورۃ کے سیاق میں نوح علیہ السلام وغیرہ کے بارے میں بھی وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ (۱۴: ۱۵) آیا ہے، یعنی انھوں نے وہ ملک فتح کر لیا اور ہر معاند اور ظالم گروہ منہ دیکھتا رہ گیا؛ بلکہ (۱۴: ۲۳) میں ہے: وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۝ (۱۴: ۲۳) یعنی عمل صالح کرنے والے ایمان دار سرسبز باغوں میں داخل کر دیئے گئے، وہ جب تک خدا ان کا راضی رہے گا وہ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اس میں ہمیشہ رہیں گے اور انکے اندر سب طرف سے یہی دعائے خیر ہوگی کہ امن سے رہو! (ضمناً اُدْخِلَ کا ماضی کا صیغہ اس امر کی ناقابل انکار دلیل ہے کہ جنّٰت سے مراد ارضی بادشاہت ہی تھی)۔

الغرض سورۃ ابراہیم کی مذکورۂ صدر آیت (۱۴: ۵) الظُّلُمٰتِ اور النُّوْرِ کے معانی کی صحیح تعیین خود کر دیتی ہے۔ اور قرآن حکیم کی یہ بات بھی سورۃ ابراہیم کے شروع میں بھی کہا گیا تھا کہ یہ وہ کتاب ہے جو اقوام کو محکومیت اور افلاس کی ظلمتوں سے نکال کر قوت اور عزت، غلبہ اور امن، بادشاہت اور جنّات زمین حاصل کرنیکے نور کی طرف جو عزیز و حمید خدا کا بتایا ہوا صراط مستقیم ہے نکال لاتی ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی دنیاوی قوت اور غلبے کو قرآن حمید میں کئی جگہ بالصراحت نور کہا گیا ہے۔ مثلاً يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۹: ۳۲) اور يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۶۱: ۸) میں جو صفحہ ۱۸۳ پر آچکی ہیں اور جہاں نور سے مراد سیاسی تمکن اور دنیاوی قوت کے سوا کچھ اور لینا ناممکن ہے (دیکھو تحت المتن صفحہ ۱۸۳ علیٰ ہٰذا القیاس سورۂ حدید کی آیات (۵۷: ۱۲-۱۵) اور سورۂ تحریم کی آیت (۶۶: ۸) میں يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ (۵۷: ۱۲) اور نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ (۶۶: ۸) کے الفاظ بلکہ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کے الفاظ بھی آئے ہیں اور وہاں مراد صاف یہ ہے کہ جب مسلمان جنّات زمین میں داخل ہونگے تو بادشاہت اور غلبے کا نور اُنکے آگے آگے دوڑتا ہوگا، منافق عرب جنہوں نے اس بادشاہت زمین کے حاصل کرنے میں روڑے اٹکائے تھے حسرت کے مارے مسلمانوں کو کہیں گے کہ ذرا ٹھہرو ہم بھی اس نور سے کچھ لے لیں اور جب جواب نفی میں ملے گا تو گھتمیں کرینگے کہ کیا ہم تمہارا ساتھ نہیں دیا کرتے تھے؟ پھر جواب ملے گا کہ نہیں، تم منتظر رہا کرتے تھے، ہمارے فتحمند ہونے میں شک کیا کرتے تھے، تم کو تمہاری من مانی آرزوؤں نے دھوکا دے رکھا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان آیات کو یہاں پر نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ جس وقت ان کا موقع آئے گا ان کا پورا مفہوم بیان کر دیا جائے گا۔ لیکن نور کے مفہوم کے لیئے صفحہ ۹۶ کی آیت (۷: ۱۵۷) پر بھی غور کرنا چاہیئے۔

تمّ الجلد سوم

من کتاب

تذکرہ

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ

وَلَا الضَّاۗلِّيْنَ

ربنا ظلمنا انفسنا و

ان لم تغفر لنا وترحمنا لنكونن من الخسرين

ربنا لا تؤاخذنا ان نسينا او اخطانا ربنا ولا تحمل

علينا اصرا كما حملته على الذين من قبلنا

ربنا ولا تحملنا ما لا طاقة لنا به و

اعف عنا واغفر لنا وارحمنا انت مولنا فانصرنا على القوم

الكفرين ربنا انك اتيت فرعون وملاه زينة واموالا في الحيوة الدنيا

ربنا ليضلوا عن سبيلك ربنا اطمس على اموالهم واشدد على قلوبهم فلا يؤمنوا حتى يروا

العذاب الاليم ربنا لا تجعلنا فتنة للقوم الظلمين ونجنا برحمتك من القوم الكفرين

ربنا اغفر لنا ذنوبنا واسرافنا في امرنا وافرغ علينا صبرا وثبت اقدامنا وانصرنا على

القوم الكفرين ربنا اننا سمعنا مناديا ينادي للايمان ان امنوا بربكم فامنا ربنا

فاغفر لنا ذنوبنا وكفر عنا سياتنا وتوفنا مع الابرار ربنا واتنا ما وعدتنا

على رسلك ولا تخزنا يوم القيمة انك لا تخلف الميعاد فاستجاب لهم ربهم

اني لا اضيع عمل عامل منكم من ذكر او انثى بعضكم من بعض

فالذين هاجروا واخرجوا

من ديارهم واوذوا في سبيلي وقتلوا و

قتلوا لاكفرن عنهم سياتهم ولادخلنهم جنت

تجري من تحتها الانهر ثوابا من عند

الله والله عنده حسن الثواب

● حضرت علامہ المشرقیؒ نے فرقہ بندی کو ازروئے قرآن شرک قرار دے کر اسے وحدت اور اخوت کے زور سے مٹانے کا اعلان کیا۔

● حضرت علامہ مشرقیؒ نے روزانہ نو۔ نو شہروں اور قلعوں کو فتح کرنے والے عسکری اسلام کو پھر زندہ کیا۔

● حضرت علامہ مشرقیؒ نے صدیوں سے مختلف عقیدوں اور فرقوں میں بٹی ہوئی قوم کو پھر اخوت کا پیغام دیا۔

● حضرت علامہ مشرقیؒ نے خاکسار تحریک کے ذریعے ایک دوسرے سے نفرت اور دشمنی کرنے والی قوم میں محلّہ وار نظام کے ذریعے بلا اجرت خدمت کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔

● حضرت علامہ مشرقیؒ نے مروجہ مغربی جمہوریت کو مسترد کرتے ہوئے تین طبقاتی طرز انتخاب کا نیا فارمولا دنیا کے 20 ہزار سائنسدانوں کے سامنے پیش کیا جس کے ذریعے دنیا میں ہر جگہ 95 فیصدی غریبوں کی حکومت قائم کی جا سکتی ہے۔

● حضرت علامہ مشرقیؒ نے موجودہ علم کو غیر فطری اور اس لیے غلط قرار دیتے ہوئے تسخیر کائنات کے لیے سائنسدانوں کو فطری علم تلاش (ایجاد) کرنے کا پیغام دیا۔

● حضرت علامہ مشرقیؒ نے غلط اور خود ساختہ مذہب کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا اعلان کر دیا۔

● حضرت علامہ مشرقیؒ نے خاکسار تحریک کے نام سے غلبہ اسلام کی تحریک شروع کی جس کی ابتدا انہوں نے ہندوستان سے کی اور 17 سال کے اندر اندر انگریز کو ہندوستان سے نکل جانے پر مجبور کیا۔

● حضرت علامہ مشرقیؒ نے پوری دنیا کو عالمگیر اخوت' عالمگیر وحدت اور عالمگیر اتحاد کا عملی پیغام دیا۔

● حضرت علامہ مشرقیؒ نے قرآن کی رو سے ہر مسلمان پر جہاد فرض قرار دیا۔ اور ہر مسلمان کو پھر غازی اور مجاہد بنانے کی غرض سے خاکسار تحریک شروع کی جس میں لاکھوں مسلمان بھرتی ہوگئے۔

● حضرت علامہ المشرقیؒ نے تمام سابقہ علمی ریکارڈ توڑ کر رینگلر اینڈ سکالر آف دی ورلڈ کا خطاب حاصل کیا۔

تحریر: محمد حنیف خان

حضرت علامہ مشرقی کی معروف تصنیف

* قرآن حکیم کے عظیم ترین نصب العین اور پروگرام کی تشریح پر جامع مستند کتاب
* قرآن کو صحیح اور علمی نقطہ نظر سے سمجھنے کے لئے ایک بلند پایہ تفسیر
* قید سلاسل کے بیس روز کی ایک انتہائی تحقیقی علمی کاوش

علم کا بے بہا سمندر........ آیات قرآن اور ان کا گراں قدر اور زہرہ گداز علم

حدیث القرآن

سائنسی و مذہبی مفکر و فلاسفر بین الاقوامی شہرت یافتہ ریاضی دان اور نقیب فطرت حضرت علامہ محمد عنایت اللہ خان المشرقیؒ کی وہ معرکتہ الآراء تصنیف جس میں:

* مصنف نے قرآن کی تعلیمات کو انتہائی سادہ اور آسان لفظوں میں واضح کر کے قرآن کی علمی حیثیت کو اجاگر کیا ہے۔
* مصنف کی یادگار عالم نوبل انعام یافتہ تصنیف "تذکرہ" کی دس جلدوں کا اختصار۔
* مصنف کا سورہ سجدہ اور سورہ جاثیہ کا مکمل مربوط اور ناقابل رد ترجمہ۔
* قرآنی نقطہ نظر سے مقام خدا' مقام انبیاءؑ' مقام الکتاب' مقام انسان' مقام فطرت' تمکن فی الارض کی علمی تشریح۔
* فردی مساوات کے لئے "زکواۃ" اور "الصلواۃ" کا عمل' موجودہ نسلی و مالی تفریق کا حل' عقائدی تفریق کے حل کے لئے عالمی مرکز کے قیام کی تجویز' علم کے ذریعے سے وحدت مذہب کا حل۔
* صحیفہ فطرت کی حقیقت اور اہمیت' طریق پیدائش' انسانی اعضاء میں انقلاب و ارتقاء --- اعضائی ارتقاء کے متعلق تین قرآنی واقعات۔
* قرآن کے آخری آسمانی کلام ہونے کا قطعی ثبوت' مسئلہ ملاقات رب اور انجام کائنات' انجام کائنات کی جانب اقدام اور انسان کا آئندہ لائحہ عمل۔
* قرآن کو سمجھنے کے لئے بلندی نگاہ کیا ہو' صلائے عام بہ ساکنان زمین' اور ہوشمندانان زمین کو ایک پر مغز خطاب۔

تخلیق کائنات اور تسخیر کائنات کا راز جاننا چاہتے ہیں تو پھر:

حدیث القرآن کا مطالعہ کیجئے ---- پہلی فرصت میں کیجئے

انہوں نے اپنے خدا کو چھوڑ کر مولویوں اور پیروں کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔ (القرآن)

* مسلمانان عالم کے مذہبی اختلافات اور مولوی کے بگڑے ہوئے مذہبی تخیل کا پُر تحقیق اور ناقدانہ جائزہ

* قرآن حکیم کی تعلیمات کا سائنٹیفک تجزیہ * دین اسلام کی ماہیت کی علمی نقطہ نظر سے وضاحت

عقلی استدلال ———— ***** ———— زوردار انداز بیان

***** ———— منفرد اسلوب ———— *****

ہر دلعزیز راہنما، اور سائنسی و مذہبی مفکر و فلاسفر حضرت علامہ مشرقی کی معروف تصنیف

مولوی کا غلط مذہب

ایک ہیجان خیز انکشاف ———— ایک عالم انگیز پیغام

مولوی کا غلط مذہب میں ———— بانی خاکسار تحریک حضرت علامہ محمد عنایت اللہ خان المشرقیؒ کے علاوہ نواب بہادر یار جنگ، خان حبیب اللہ خان (سابق چیئرمین سینٹ)، پیر رشید الدولہ، پروفیسر سید اللہ بخش، شیخ الفاضل مولوی شاکر اللہ نے مولوی کی جاہلانہ تعلیمات کے بخئے ادھیڑ کر مولوی کے تین سو سالہ مذہبی تخیل کو رد کیا ہے۔

وہ عظیم دستاویز جو پانچ سال کے عرصہ میں بیس لاکھ سے زائد چھپ کر فروخت ہوئی جو برصغیر کی تاریخ میں ریکارڈ ہے۔

آج ہی اپنے قریبی بک سٹال سے طلب کریں ----

مفکر اعظم اور نقیب فطرت حضرت علامہ محمد عنایت اللہ خان المشرقیؒ

کا پیغام ہر انسان تک پہنچا دو ---- پھر دیکھو!

دنیا قرآن کے آگے جھک جائے گی۔

○ التذکرہ پبلی کیشنز اچھرہ لاہور

روئے زمین پر تہلکہ مچا دینے والی کتب.... جن کی تعلیم زندہ اقوام کیلئے ابدالآباد تک پیام حیات

حضرت علامہ مشرقی کی شہرہ آفاق تصانیف

نمبر شمار	نام کتاب	زبان	سن اشاعت	بعنوان
(۱)	خریطہ	دیباچہ۔اردو شاعری۔فارسی	۱۹۰۲ تا ۱۹۰۹ء ۷ فروری ۱۹۲۴ء	۱۳ برس کی عمر میں ۳۶ رباعیوں اور ۱۷۰ شعروں پر مشتمل فارسی شاعری
(۲)	تذکرہ (جلد اول دوم سوم و دیگر جلدیں)	دیباچہ۔انگلش اردو عربی	۱۰ مارچ ۱۹۲۴ء ۱۰ رجب المرجب ۱۳۴۲ھ	مسلمانان عالم کو ان کی اجتماعی موت و حیات کے متعلق پیغام اخیر۔ الٰہی حکمت کا حیرت انگیز مرقع
(۳)	خطاب مصر	عربی اردو	۱۳ مئی ۱۹۲۶ء	امت مسلمہ کو آنے والے خطرات سے بچانے کے لئے عالمگیر پروگرام
(۴)	اشارات	اردو	یکم اگست ۱۹۳۱ء	مسلمانوں کو پھر طاقتور بنا دینے کا واحد طریقہ اور لائحہ عمل
(۵)	قول فیصل	"	۱۵ نومبر ۱۹۳۵ء	قوموں کا زوال اور اس کا علاج خاکسار تحریک کے پروگرام کی مکمل تشریح
(۶)	مقالات (جلد اول دوم)	"	جلد اول ۷ جنوری ۱۹۳۷ء جلد دوم ۱۹ ستمبر ۱۹۴۳ء	ہفت روزہ "الاصلاح" میں چھپے حضرت علامہ مشرقی کے وہ عظیم الشان مقالات جنہوں نے خاکسار تحریک کو ملک گیر کر دیا
(۷)	مولوی کا غلط مذہب (مقالات)	"	۲۵ ستمبر ۱۹۳۶ء تا ۸ اگست ۱۹۳۸ء	مسلمانان عالم کے مذہبی اختلافات اور مولویوں کے بگڑے ہوئے مذہبی تخیل کا پر تحقیق اور ناقدانہ جائزہ
(۸)	صراط المستقیم	(تصویری البم)	۱۹۳۸ء	غلبہ اسلام، تحریک آزادی اور خدمت خلق کے لئے خاکسار تحریک کی جدوجہد کا تصویری البم
(۹)	خاکسار آئین	(انگریزی)	۲۵ مارچ ۱۹۴۵ء اشاعت اکتوبر ۱۹۴۵ء	انگریزی اقتدار کا چیلنج کہ ایسا "سیاسی آئین" جس پر تمام عناصر متفق ہوں تو ہندوستان کو آزاد کر دیں گے کو قبول کرتے ہوئے تحریر کیا۔

نمبر شمار	نام کتاب	زبان	سن اشاعت	بعنوان
(۱۰)	حریم غیب	اردو (نظم)	۷ر اکتوبر ۱۹۵۲ء	مذہب کا آخری مقصد
(۱۱)	دہ الباب	" (نظم)	۱۰ر نومبر ۱۹۵۲ء	مسائل زمین، فراحیات
(۱۲)	حدیث القرآن	" (نثر)	۳۰ر مئی ۱۹۵۱ء ۲۵ر نومبر ۱۹۵۲ء	مقصد پیدائش کائنات ○ مقام خدا مقام انبیاء۔ مقام الکتاب۔ مقام فطرت
(۱۳)	ارمغان حکیم	" (نظم)	۲۳ر نومبر ۱۹۵۲ء	غزل پر آخری کلام
(۱۴)	انسانی مسئلہ	انگریزی / اردو	۱۹۵۵ء	بیس ہزار سائنسدانوں کے نام تسخیر کائنات کا عظیم الشان پیغام جس کے بعد وہ پیدائش کائنات اور تسخیر کائنات کی طرف رجوع ہوئے۔
(۱۵)	تکملہ (سیرت رسول اللہ ﷺ)	اردو	۴ر مئی ۱۹۴۰ء جلد اول (جلد دوم)	اقرا باسم ربک الذی کی پہلی وحی سے الیوم اکملت لکم دینکم کی آخری وحی تک رسالت مآب کی ۲۳ برس کی مکی اور مدنی زندگی اور قرآن کی تشریح
(۱۶)	علم القرآن	"	زیر طبع	قرآنی آیات کا ترجمہ حضرت علامہ مشرقی کے قلم سے
(۱۷)	سیاہ کار لیڈرز	"	۱۹۴۵ـ۴۶ء	جس میں واضح طور پر بتلایا گیا ہے کہ موجودہ سیاہ کار لیڈر قوم کو دھوکہ دے کر کس طرح مفادات حاصل کرتے ہیں ان کی سیاہ کاریاں کیا ہیں؟
(۱۸)	قرآن الارض	"	۱۹۵۲ء	جس میں زمین کے موجودہ دس اہم مسئلوں اور ان کے حل کا انکشاف کیا گیا ہے۔
(۱۹)	قرآن حکیم کی مسلسل کہانی	"	۱۹۵۱ء	قرآن حکیم کی تعلیم کے ماحصل کو مسلسل طور پر سمجھنے کی تشریح مع قرآن کو سمجھنے کے لئے بلندی نگاہ کیا ہو؟
(۲۰)	بیگم کے نام خطوط	"	(غیر مطبوعہ)	بیگم سعیدہ علامہ مشرقی کے نام جیلوں سے قید کے دوران تحریر کردہ خطوط

نمبر شمار	نام کتب	زبان	سن اشاعت	عنوان
(۲۱)	خاکسار تحریک کا دستور العمل	اردو	یکم دسمبر ۱۹۳۶ء	جس نے لکھو کھہا انسانوں میں اخوت' اتحاد' جہاد اور خدمت خلق کا جذبہ پیدا کر کے محلوں کی سطح پر روزانہ بلالحاظ مذہب و تفریق ایک قطار میں کھڑا کر کے انقلاب برپا کر دیا۔
(۲۲)	مقالات مشرقی	"	۱۹۳۷ء تا ۱۹۶۳ء	قیام پاکستان سے قبل اور بعد کے مقالات' تقاریر اور دیگر تحریریں۔
(۲۳)	قرآن حکیم کی تعلیم کا خلاصہ	"	۱۹۵۱ء	اس میں نوع انسان کو اس کا منتہائے مقصد بتایا گیا ہے اور فلسفہ تسخیر کائنات و لقائے رب کو تاریخ عالم میں پہلی بار قرآن حکیم کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔
(۲۴)	کشمیر اور علامہ مشرقی	"	۱۹۹۳ء	حضرت علامہ مشرقی کی کشمیر کے بارے میں تمام تجویزوں' کوششوں' تنبیہوں' حساسی اندازوں اور جدوجہد کو یکجا کر دیا گیا۔
(۲۵)	ارشادات علامہ مشرقی	اردو	۱۹۹۷ء	حضرت علامہ مشرقی کی تصانیف' خطبات اور مقالات کا اختصار۔

میری تصانیف کا مقصد اس قدر ہے کہ

قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی ادنیٰ سی عملی اور علمی آگ پاکستان کے زوال یافتہ مسلمان میں پیدا ہو جائے اور وہ آگے بڑھنے کے قابل ہو۔ یہی امید ہے جو مجھے کھینچے لئے جا رہی ہے اور کیا عجب کہ ایک گروہ یہاں یا کسی اور اسلامی ملک میں پیدا ہو جائے تو مسلمان کی بگڑی فوراً بن سکتی ہے۔ (حضرت علامہ مشرقی)

ناشر

التذکرہ پبلیکیشنز

المشرقی ہاؤس' ۳۴ ذیلدار روڈ، اچھرہ لاہور ـــــ ۵۴۶۰۰

فون نمبرز: ۴۱۱۲۲۸ ☆ ۴۱۵۱۱۶ ـ ۰۴۲ ○ فیکس: ۷۵۸۷۳۹۴